سلسلہ مطبوعات انجمن ترقی اردو پاکستان نمبر ۲۶۷

تاریخ ملت عربی

از پروفیسر فلپ حتی

*

ترجمہ جناب مولوی سید ہاشمی صاحب فریدآبادی

شایع کردہ:

انجمن ترقی اردو پاکستان۔ کراچی

سلسلۂ مطبوعاتِ انجمن ترقیٔ اردو۔ پاکستان

تاریخ ملّت عربی

از پروفیسر فیلپ کے حتّی

ترجمہ جناب مولوی سیّد ہاشمی صاحب فرید آبادی

شایع کردہ انجمن ترقیٔ اردو۔ پاکستان۔ کراچی

مطبوعہ انجمن پریس لارنس روڈ کراچی

جزو دوم: ظہور اسلام اور خلافت راشدہ

جزو سوم : اُموی اور عبّاسی سلطنتیں

نقشے اور تصویریں

صحت نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲	آخری	میری	حِمیَری
۱۸	۱۶، ۱۴	بسنے	بسے
۱۰۷	۴	تی قس	تی تس
۱۳۳	۶	سلہ	سٹہ
۱۴۲	۱۹	ادیسے	اُدیسے
۱۴۸	۶	نہ نہ	نہ
۱۵۳	۹	عزّیٰ اُ"	عُزیٰ اُ" (عُزیان)
۱۵۶	حاشیہ	کس حد	کسی حد
۱۶۰	۱۳	"مدنیتی"	"مدینتہ"
″	″	اِل مدنیہ"	آل مدینۃ
۱۸۷	۳	کے نظریے	کی روایات
۱۹۰	۲	نشان حاشیہ سلہ لفظ سورۂ نور پر ہونا چاہیے نہ کہ آگے کے عددِ آیات پر۔	
۲۰۵	۱۵	(نوین مترجم)	×
۲۴۴	عنوان	باب چہارم	باب چہاردہم
۲۹۱	″	اَموی	اُمَوی
۲۹۳	۸	عمر	عُمَرؓ
۳۱۵	۲۲	اِل بلاط	آل بَلاط
۳۴۰	۲	الیہ	مالیہ
۳۵۰	سلہ	خلدون	خلدُون
۳۵۱	سلہ	اِل کندی	آل کِندی
۳۵۵	سٹہ	اِل حاحظ	آل جاحِظ
۳۵۵	۱۰	قریشین	قریَشین
۳۷۴	۹	نامہ	نافِذ
۳۹۷	۱۲	الملّوح	آل مُلَوَّح
۵۲۲	۷	حَیّل	جِیَلؒ

مقدمۂ مترجم

اس کتاب کے مؤلف، پروفیسر حِتّی زمانۂ حاضرہ کے مشہور مستشرق ہیں۔ یہ شہرت زیادہ تر اُن کی اسی انگریزی کتاب "ہسٹری آف دی عربز" کا صلہ ہے کہ پہلی مرتبہ ۱۹۳۷ء میں طبع ہوئی تھی۔ ۱۹۴۹ء تک چار مرتبہ ہزاروں کی تعداد میں چھپ کر یورپ اور اسلامی ممالک میں پھیل گئی۔ طبع چہارم نظرثانی اور ترمیم ہو کے نکلی تھی۔ اسی نسخے سے اُردو میں ترجمہ ہوا۔ لیکن یہ ترجمہ چھپنے نہ پایا تھا کہ ۱۹۵۱ء میں اصل کتاب پانچویں مرتبہ طبع ہو کر آگئی۔ کئی دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ عربی میں دو خلاصے چھپے اور مختلف مدارس میں داخلِ نصاب کیے گئے۔ پوری کتاب کا عربی ترجمہ بیروت کے ایک اُستاد عمر فروخ صاحب نے شاید تین چار سال ہوئے تیار کیا تھا، مگر وہ ہم تک نہیں پہنچا۔ البتہ خود پروفیسر حِتّی نے دو رفیقوں کی مدد سے اپنی کتاب عربی میں منتقل کی، اس کے دو مطبوعہ حصے کراچی آئے اور ایک عنایت فرما نے مجھے لا کر دیے۔ اُردو ترجمے (جلد اول) کی اُس وقت کاپیاں کتابت کی جا چکی تھیں۔ ورنہ عربی ترجمے سے ہمیں بڑی مدد ملتی اور بہت سے اعلام نیز بعض عربی اشعار تلاش کرنے کی زحمت نہ اُٹھانی پڑتی۔ انگریزی میں یہ نام

(خصوصاً وہ جو کتاب مقدس میں مذکور ہیں) یونانی یا لاطینی سے نقل ہوتے ہیں اور اسلامی ادبیات کے عربوں ناموں سے بالکل مختلف ہیں۔ انگریزی کتاب میں فاضل مؤلف نے اشعار کا بھی صرف انگریزی ترجمہ لکھ دیا تھا۔ اُردو میں ضروری معلوم ہوا کہ اصل عربی متن تلاش کر کے درج کیا جائے۔

اُردو ترجمے کی اشاعت میں جو غیر معمولی تاخیر واقع ہوئی، اس کا سبب یہ تھا کہ ایک اور صاحب آٹھ دس برس پہلے پروفیسر حتی سے ترجمے کی اجازت لے چکے تھے۔ انجمن ترقی اُردو پاکستان کی طرف سے ترجمہ چھاپے جانے کی خبر سُن کر انھوں نے احتجاج کیا۔ انجمن کو چھپائی روک دینی پڑی لیکن طے پایا تھا کہ وہ صاحب گزشتہ سال (ماہِ مئی تک) اپنا ترجمہ چھپوا دیں ورنہ انجمن کو فاضل مؤلف کی طرف سے اجازت ہوگی کہ اپنا ترجمہ شائع کر دے۔ اسی قرار داد کے مطابق اب انجمن کا ترجمہ (جلد اوّل) شائع کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر حتی نے ملکِ عرب اور وہاں کے باشندوں کا احوال جتنا معلوم ہو سکا۔ قدیم ترین زمانے سے اجمالاً قلم بند کیا، پھر ماقبلِ اسلام عرب کی ریاستوں اور عہدِ جاہلیت کی کیفیت لکھی ہے۔ کتاب کے جزو ثانی (باب ہشتم) سے ظہورِ اسلام کی تاریخ شروع ہوتی ہے شمائلِ نبوی (علیٰ صاحبہا صلوٰۃ والسّلام) کے ساتھ اسلامی تعلیمات پر بھی دو باب تحریر کیے گئے ہیں۔ پھر خلافت راشدہ، بنوامیہ، بنوعباس اور بعد کے ملوک و سلاطین سے بحث کی ہے جو عربی ممالک میں حکم رانی

کرتے رہے۔ ان میں مصر و افریقہ کے وہ ملک بھی داخل ہیں جہاں علمی اور سرکاری زبان عربی ہو گئی ہے۔ پوری کتاب (طبع چہارم) جس سے اُردو ترجمہ کیا گیا، سات سو صفحات انگریزی پر چھپی تھی۔ طبع جدید (۵۱ء) میں عثمانی ترکوں کے عہدِ حکومت پر کوئی پچاس صفحے کا اضافہ کر دیا ہے۔ انجمن کی طرف سے اُردو ترجمہ ایک جلد کی بجائے دو جلدوں میں چھاپنا تجویز ہوا جس کی پہلی جلد اب پیش کی جاتی ہے۔

مؤلف کا علمی تبحر، تحقیق و تلاش داد کے لائق ہے۔ وہ بے شمار مغربی مآخذ و مصادر سے کام لیتا ہے۔ اسلامی تاریخ و تہذیب اور مذہبی تعلیمات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے اُسے صدہا عربی کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے جن میں بہت سی ہنوز غیر مطبوعہ یا عسیر الحصول ہیں۔ اس قدر تفحّص اور محنت سے مسالہ جمع کرنے کے علاوہ لکھنے کا طرز ایسا شُستہ اور شگفتہ ہے کہ اس موضوع پر انگریزی میں کوئی لکھنے والا اس سے بہ مشکل بازی لے جائے گا۔ حالاں کہ وہ خود شام کے مسیحی خاندان سے ہے۔ ولایاتِ متحدہ امریکہ میں صرف متوطن ہو گیا ہے۔ اسی نسلی نسبت کا اثر سمجھیے کہ ملّتِ عربی کے عظیم سیاسی اور دماغی کارناموں کی وہ کسی قدر فخر سے یا کم سے کم کشادہ دلی سے تحسین کرتا ہے۔ یورپ کے مستشرقین خصوصاً برطانیہ کے اہلِ قلم اس باب میں اکثر تنگ دل مانے جاتے ہیں۔

مذکورۂ بالا وجوہ سے پروفیسر حِتّی کی تاریخ اسلامی ملکوں میں خوب مقبول ہوئی۔ بایں ہمہ یاد رکھنا چاہیے کہ فاضل موصوف نے انگریزی زبان میں کتاب لکھی اور اس کے اصلی مخاطب انگریزی بولنے والے

فرنگی یا متعزبجین ہیں۔ لا محالہ اُن کے مذاق یا خیالات کا مصنّف کو لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ دوسرے وہ خود مسیحی اور تعلیم و تربیت کے اعتبار سے بھی فرنگی دُنیا کا پروردش یافتہ ہے جو صلیبی محاربات سے لگاکر آج تک ملّتِ اسلامی کے خلاف جنگ کرتی رہی۔ پس کچھ تعجب نہیں اگر ہمارا مصنّف بھی دینِ اسلام کی تعلیم یا مسلمانوں کی تاریخ لکھنے میں کہیں کہیں انہی تعصّبات کا اظہار کرتا ہے، جو مستشرقین یا لامذہب فرنگیوں کی تصانیف میں نمایاں ہوجاتے ہیں۔ ہر شخص یا قوم کو اختیار ہے جو چاہے رائے اور عقیدہ رکھے۔ ان کے اظہار کی بھی اُسے پوری آزادی ہونی چاہیے۔ لیکن تعصب کے معنی یہ ہیں کہ وہ جس بات کو پسند نہیں کرتا اُسے جان کر غلط یا مسخ صورت میں پیش کرے افسوس ہے کہ پروفیسر حتی کی تاریخ بھی اس عیب سے کُلیتاً بَری نہیں پائی گئی۔ اُردو ترجمے میں ہمیں مجبوراً ذیلی حواشی لکھنے پڑے اور قرآنِ مجید کے معانی یا بزرگانِ اسلام کے متعلق جہاں متن میں صحت و تحقیق سے تجاوز نظر آیا، اس پر مختصر الفاظ میں گرفت کرنی ضروری معلوم ہوئی۔ تین چار ایسے مقام بھی آئے جن کا ترجمہ اسلامی آداب کے خلاف تھا۔ اِن کلمات کو حذف کر دیا گیا اور حاشیے میں مصنّف کا مطلب اور حذف الفاظ کی وجہ بتادی گئی ہے۔ راقم الحروف کا گمان تھا کہ مصنّف بعض باتیں فقط فرنگی قارئین، یا انگریز مستشرقین کے مذاق کے مطابق لکھ گیا ہے۔ حالاں کہ اُن کے تاریخی سُقم سے خود ناواقف نہ ہوگا۔ عربی ترجمے سے مقابلہ کرنے پر اس خیال کی بہت کچھ تصدیق ہوگئی۔ یہ عربی ترجمہ خود پروفیسر حتی اور اُس کے دو مسیحی

رفیقوں نے کیا ہے۔ چوں کہ حواشی لکھتے وقت وہ میرے سامنے نہ تھا اس لیے اب مقدمۂ کتاب میں ان موقعوں کی صراحت کر دینا مناسب ہوگا۔ میں نے صرف انہی مقامات پر عربی ترجمے کا اصل انگریزی سے مقابلہ کیا، جن پر خود تنقیدی حاشیے لکھے ہیں۔ ممکن ہے دوسری جگہ بھی عربی مترجمین نے انگریزی متن کی پابندی نہ کی ہو۔ لیکن ان اختلافات کو یہاں یک جا نقل کر دینے کا مقصد یہ ہے کہ اوّل تو ناظرین کو معلوم ہو جائے کہ اردو مترجم نے جو نکتہ چینیاں کی تھیں، کئی جگہ خود مصنف کو وہاں اپنی غلط نگاری بالواسطہ تسلیم کرنی پڑی۔ دوسرے تحقیق پسند مسلمان طلبہ اس بات کا اندازہ کریں کہ پروفیسر حِتّی جیسے نامی محقق جو مشرق نژاد ہونے کے باعث عربیت سے اُنس و قرابت بھی رکھتے ہیں، اسلامیات کے میدان میں کیا کیا اینچ پیچ کھیلنے لگتے ہیں اور قدیمی تعصب کس کس طرح جدید تحقیقات کی روشنی کو دھندلا کر دیتا ہے:۔

۱۔ انگریزی صفحہ ۱۲۴ کے حاشیے ۱۰ میں آیۂ کریمہ اللّٰہ نور السمٰوٰت۔ الآیہ کا حوالہ دے کر مصنف لکھتا ہے کہ قرآن کے اِس سورہ (نور) کی آیات مجوسی اثرات کا پتہ دیتی ہیں! یہ رائے تاریخی اور معنوی اعتبار سے اس درجہ حقیقت کے برعکس ہے کہ قرآن پڑھنے اور سمجھنے والا کوئی شخص ایسی بے تکی بات نہیں کہہ سکتا۔ غالباً اسی احساس کی بنا پر عربی ترجمے (صفحہ ۱۷۱) سے آیت کا ذکر اور یہ تعریضی حاشیہ حذف کر دیا گیا ہے۔

اردو ترجمے میں یہ مقام ہمارے حاشیہ بر حاشیہ کے ساتھ صفحہ ۱۹۰ پر آیا ہے۔

۲۔ صفحہ ۱۴۴ کے حاشیہ ۳ میں مصنف نے ایک حالیہ مصری کتاب سے کسی بدو عورت کی عجیب حکایت نقل کی ہے جس میں وہ خانہ کعبہ کو "لیلہ خاتون" کے نام سے پکارتی تھی۔ بظاہر مصنف یقین دلانا چاہتا ہے کہ عربوں میں قدیم بت پرستی کے تصورات ابھی تک موجود ہیں۔ یہ لایعنی حاشیہ عربی ترجمے (ص۱۸۵) سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اُردو میں یہ حکایت ص۲۰۶ کے ذیلی حاشیہ میں ہم نے ملخصاً ترجمہ کی ہے۔

۳۔ صفحہ ۱۴۸ (اُردو ترجمہ ص۲۰۹) پر خیر و شر کے من جانب اللہ عقیدے کو وثوق سے لکھا اور قرآن مجید کی تین آیتوں کے حوالے دیے گئے جن میں سے دو اُردو مترجم کو بالکل غیر متعلق معلوم ہوئے۔ عربی ترجمے (ص۱۸۷) سے یہ عبارت اور حوالے غائب ہیں۔

۴۔ صفحہ ۱۹۱ (اُردو ۲۹۴) میں لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ نے خلافت کے لیے حضرت علیؓ سے تنازعہ کیا تھا۔ حالاں کہ تاریخ سے کہیں ایسا ثابت نہیں۔ غنیمت ہے کہ عربی ترجمہ (ج ۲۔ ص۲۵۴) سے یہ افترا خارج کر دیا گیا ہے۔

۵۔ مصنف نے صفحہ ۲۳۷ (اُردو۔۲۔۳۷) میں قدیم اہل مدینہ پر یہ شرم ناک تہمت لگائی ہے کہ وہاں عیش خانوں میں شراب کے دور چلتے تھے! اس قسم کے جھوٹے بیانات پر اُردو مترجم نے تنقیدی حاشیے لکھے ہیں لیکن عربی ترجمے (۲ ص۳۰۶) سے خود مصنف نے شراب خواری کی مذکورۂ بالا روایت حذف کر دی

جس سے ظاہر ہی کہ وہ اسے غیر معتبر جانتا ہی۔ عربی داں ناظرین
کے سامنے لانے کی جرأت نہیں کرتا۔

۶۔ صفحہ ۲۷۸ (= اُردُو ترجمہ ۴۳۳) پر تحریر کیا تھا کہ بنی امیّہ کے زمانے سے مسلمانوں میں آج تک گانے بجانے کے ساتھ شراب نوشی لازم و ملزوم ہوگئی ہی۔ یہ کذبِ صریح عربی ترجمے (۲ صـ۲۴۸) بلکہ کتاب کی تازہ ترین طبع ۱۹۵۱ء سے بھی مصنف کو خارج کر دینا پڑا ہی۔

۷۔ صفحہ ۳۲۷ (= اُردُو ۵۳۹ حاشیہ ۳۔) پر خمر و نبیذ کی بحث میں مصنّف یہاں تک بڑھا کہ احادیث کے حوالوں سے لکھتا ہی کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبیذ کا استعمال فرمایا تھا۔ جیسا کہ اہلِ علم بہ خوبی جانتے ہیں، اس نبیذ کو سُکر و تخمیر سے کچھ تعلق نہ تھا۔ بظاہر اسی وجہ سے عربی ترجمے (۲ صـ۲۹۱) سے یہ جملہ اُڑا دیا ہی۔ اُردُو مترجم نے پہلے ہی اُسے متن میں لکھنے کے قابل نہیں سمجھا تھا۔

یہ تو صریحی ترک و حذف کی چند مثالیں تھیں لیکن اسی سرسری مقابلے میں دس پندرہ مقام ایسے نظر آئے جہاں عربی ترجمے میں الفاظ کے ردّ و بدل سے معنوی فرق کیا گیا، یا بیان کا پیرایہ نرم و معتدل بنا دیا گیا ہی۔ اصل عبارت اور ترجمہ نقل کرنا طوالت سے خالی نہیں، لہذا ایسی دو تین مثالیں دینے پر اکتفا کرتا ہوں :۔

صفحہ انگریزی ۱۲۱۔ از سطر ۱۳۔ ترجمہ عربی۔ ج ۱ صفحہ ۱۶۷

"This Contrast.......w   وُ بید و الاختلاف .... فی کلمات

vividly drawn by the apocryphal words put in the mouth of J'afar-ibn-abi Talib.........

صفحہ انگریزی ۱۳۱ - سطر ۱۵

"Sur. 4: 46 seems to suggest that the limitation and later interdiction of the use of wine may have owed its origin to the necessity of keeping the divine service free from undue disrurbance"

صفحہ انگریزی ۲۳۶ سطر ۲۷

حضرت عبداللہ ابن عباس کے متعلق

" Modern criticism,

نسبتها الرواۃ الی جعفر ابن ابی طالب قیل کلم بها النجاشی ......الخ

(اپوکرایفل، یعنی جعلی کا لفظ چھوڑ دیا ہے۔)

عربی ترجمہ - ۱ ص ۱۸۰

"ویجوز الاستدلال بسورۃ النسا الآیہ ۴۶ - علی ان استنکار الخمر وتحریمہا من بعد قد دفعت الیہ الرغبۃ فی حفظ الوقار والسکینۃ فی مواعید الصلاۃ والعبادہ۔"

(محولہ آیہ کریمہ (صحیح نشان ۴۳) یہ ہے: "یا ایہا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوۃ وانتم سکاریٰ۔ حتیٰ تعلموا ما تقولون" استدلال کے غلط سلط ہونے سے قطع نظر، انگریزی کے لفظ "ڈس ٹربنس" کو بدل کر ترجمے کو نرم اور ظاہرا معقولیت سے قریب لایا گیا ہے۔)

عربی ترجمہ ۲ ص ۳۰۵

"الا ان النقد العلمی اظہر انہ قد اسند الیہ کثیر من

الاحادیث الملفقہ "

(یہاں سارا الزام راویوں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہی!)

however, has exposed him as a first class fabricator of hadiths. "

دوسرے مقامات جہاں عربی ترجمے میں فرق نظر آیا، حسب ذیل ہیں:-

انگریزی صفحہ:	۹۹	حاشیہ	-	عربی	:	۱	ص۱۳۷
"	۱۱۲	مؤخر		"		۱	ص۱۵۷
"	۲۷۵	وسط		"		۲	ص۳۴۶

وغیرہ وغیرہ ۔

مصنّف سے یہ شکایت نہیں کہ وہ قرآن کو بزعم خود بشری تصنیف سمجھتا ہی۔لیکن اس اعتقاد (یا بد اعتقادی) سے اُسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ قرآن کے مطالب کو غلط اور بدنُما صورت بنا کے کتاب اللہ سے منسوب کر دے۔اس کی کئی مثالیں، خصوصاً معراج کتاب مبین وغیرہ کے بیان میں آئیں گی جن پر مترجم نے ذیلی حاشیوں میں تنبیہ کی ہی۔آیاتِ قرآنی کا حوالہ دینے میں مصنّف یا اہلِ مطبع سے بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں۔وہ قرآن مجید کے اس نسخے سے جسے فلوگل نے چھپوایا تھا، کام لیتا ہی اور اس نسخے کے نشانات میں ہمارے متداول نسخوں سے ایک دو عدد کا فرق پایا جاتا ہی۔لیکن اس اختلاف سے قطع نظر آیات کی نشان دہی میں جابہ جا سہو پایا گیا۔جس کی اُردو ترجمے میں حتی الامکان تصحیح کر دی گئی ہی۔

مصنف کا ایک اور رجحان یہ ظاہر ہوتا ہی کہ مسلمان اُمرا اور اہلِ ثروت

میں فسق و فجور کے واقعات کو رنگین بنا کے پیش کیا جائے۔ ایسی روایات کے لیے اس کا سب سے بڑا ماخذ کتاب الاغانی ہی جس کے افسانوی اور نامعتبر ہونے کا وہ خود اعتراف کرتا ہی (ملاحظہ ہو صفحہ ۱۲۷، ح ۴ انگریزی = اُردو صفحہ ۳۵۴) یہ دُرست ہی کہ دولت و حکومت کے آنے سے مسلمان ملوک و امرا میں عام طور پر عیش پسندی پھیل گئی اور اسی کی افراط کے نتیجے میں وہ، اُن کے خاندان اور آخر میں ساری قوم ذلیل و تباہ ہوئی لیکن ان کے بیان سے مصنف کا منشا یہ معلوم ہوتا ہی کہ اسلام نے جس تقویٰ کی تعلیم دی تھی اور جن فواحش و نواہی سے مسلمانوں کو روکا تھا، ان احکام ربانی کو بے کار و دشوار بتایا جائے اور شوقِ شاہد و شراب وغیرہ نفسانی ترغیبات کو مغربی تہذیب کے مطابق فنونِ لطیفہ کے پیرایے میں جائز و خوش نما دکھایا جائے؛ یہ باتیں مذہب اسلام کے خلاف ایک تبلیغ خفی کا انداز رکھتی ہیں اور ملتِ اسلامی کی خیر سگالی پر محمول نہیں کی جا سکتیں۔ ہمیں اندیشہ ہی کہ مسلمان مبصرین کی نظر میں مصنف کی بے لاگ تاریخ نویسی کی توقیر گھٹا دیں گی۔

ان اسقام و قبائح کے باوجود پروفیسر حِتّی کی تاریخ مِلّتِ عربی مفید معلومات کا ذخیرہ اور انشا پردازی کا عمدہ نمونہ ہی۔ مضامین کی ترتیب بہت سلیقے سے کی گئی ہی۔ پھر بہت سے عربی اور مغربی مآخذ ایسے لائے گئے ہیں جن سے آیندہ تحقیق کرنے والوں کو بڑی رہ نمائی اور مدد مل سکتی ہی امید ہی کہ مسلمان اہلِ علم پسند کریں گے اور طلبہ اس سے مستفید ہوں گے۔

الراقم سید ہاشمی فرید آبادی، نزیل کراچی

۲۲ رجنوری ۱۹۵۴ء

جزو اوّل

عہد ما قبل اسلام

باب اوّل

عربوں کی سامی نسل

سامی نسل کا گہوارہ: عرب

کوئی ملک جس کا رقبہ عرب کے لگ بھگ ہے، اور کوئی قوم جس کی تاریخ، عظمت و افادیت میں قوم عرب کے ہم سنگ ہے۔ زمانۂ حاضرہ میں اہل علم کی تحقیق و توجہ سے اتنی محروم نہ رہی ہوگی جتنی قومِ عرب اور ملکِ عرب محروم رہے۔

یہ خطۂ بزرگ کہ رقبے میں یورپ کے ایک چوتھائی اور ولایات متحدہ امریکہ کے ایک ثلث کے قریب ہے، اس کے بارے میں اتنا کچھ "نامعلوم" ہے کہ جو کچھ معلوم ہے، وہ نسبتہً کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ حد یہ کہ عرب کے اکثر اقطاع کی نسبت ہمیں اتنی بھی واقفیت نہیں جتنی آج کل قطبین کے برفانی خطوں کے متعلق ہوتی جاتی ہے۔ حال آں کہ قرائن غالب کی رو سے جزیرہ نمائے عرب، سامی نسل کا گہوارہ تھا اور یہیں اُن قوموں کی پرورش ہوئی جو یہاں سے اُٹھ اُٹھ کر "ہلالِ خصیب" یعنی شمال کے

سر سبز خطے میں پہنچیں اور بعد کی تاریخ میں بابلی، اشوری، فنیقی، اور عبری مشہور ہوئیں۔ اگر عرب کو خالص "سامیت" کا سرچشمہ مان لیا جائے تو پھر دین یہود (اور اس کے نتیجے میں مسیحیت) کے بنیادی عناصر تلاش کرنے کے لیے اور اُن خصائل کی تخم ریزی دیکھنے کے لیے جو آئندہ نشو و نما پاکر سامی نسل کا واضح اور جداگانہ کردار بن گئیں، اسی ریت کی سرزمین میں بادیہ پیمائی کرنی پڑے گی۔ پھر یہی عرب ہی، جس نے قرونِ وسطیٰ میں ایک قوم پیدا کی جو اُس وقت کی متمدن دنیا کے بہت بڑے حصّے پر فاتحانہ مسلط ہو گئی اور جس نے ایک دین (اسلام) کو خلعتِ وجود پہنایا کہ آج بھی کم سے کم ۲۷ کروڑ انسان اِس دین کے حلقہ بگوش ہیں اور ان میں قریب قریب سبھی نسل اور بیسیوں ملکوں کے افراد شامل ہیں ہماری دنیا کا ہر آٹھواں آدمی محمدؐ عربی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پیرو ہے۔ کرۂ ارض کی گرم پٹی میں قریب قریب آٹھوں پہر اسلامی اذان کی صدا حیّ علی الصلوٰۃ، حیّ علی الصّلوٰۃ گونجتی رہتی ہے؛

عربوں کے نام اُسی روشنی سے جگمگاتے ہیں جو فاتحانِ عالم کے گلے کا ہالا بناتی ہے۔ اپنے ظہور سے ایک صدی کے اندر یہ قوم سرحد چین سے لےکر سواحل اوقیانوس تک ایک عظیم سلطنت کی مالک بن گئی کہ رومۃ الکبریٰ کی سلطنت انتہائی عروج کے وقت بھی اتنی وسعت نہ حاصل کر سکی تھی، اور اس غیر معمولی پھیلاؤ کے دوران میں اتنے اجنبی لوگوں کو اپنے دین، اپنی زبان، حتیٰ کہ اپنی شکل صورت میں شریک وسہیم بناتی چلی گئی کہ کوئی قوم گذشتہ

آیندہ خواہ وہ یونانی تھے یا رومی، اور انگریز (اینگلو سیکسن) وں یا روسی، اتنی بڑی تعداد میں اجانب کو کبھی نہ اپنا سکی[۱]۔

اور عربوں نے فقط سلطنت ہی تعمیر نہیں کی بلکہ ایک نئی ثقافتگی تیار کی۔ وہ قدیم تمدن جو کبھی دجلہ و فرات کے کنارے، بھی وادیٔ نیل اور کبھی بحر ابیض کے مشرقی سواحل پر پھولا پھلا تھا، عرب اس کے وارث ہوئے۔ یونان نہاد رومی تہذیب کے گل ہائے سرسبد سے اُنھوں نے اپنی جھولیاں بھریں۔ پھر عہدِ وسطیٰ کے یورپ تک اُن ذہنی محرکات کو پہنچانے کا واسطہ بنے جن سے مغربی دنیا میں بالآخر بیداری پیدا ہوئی اور وہ جدید حیاے علوم کے راستے پر چل پڑی۔ ان وسطی صدیوں میں کسی قوم نے انسانی ترقی کے لیے اتنا کام نہیں کیا جتنا عرب اور عربی بولنے والی قوموں نے انجام دیا[۲]۔

موسوی اور عیسوی مذہب کے بعد، توحید کا تیسرا دین عربوں کا دین ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ پہلے دو مذہبوں ہی کی ایک نئی شاخ اور ان کا سب سے قریبی رشتہ دار ہے۔ تینوں ایک ہی روحانی زندگی، یعنی سامی زندگی کی پیدا دار ہیں۔ ایک متدین مسلمان مسیحیت کے بہت سے عقائد کی بلا تامل تصدیق کر سکتا ہے۔

مراکش سے ہندستان تک، اسلام ایک جیتا جاگتا مذہب ہے

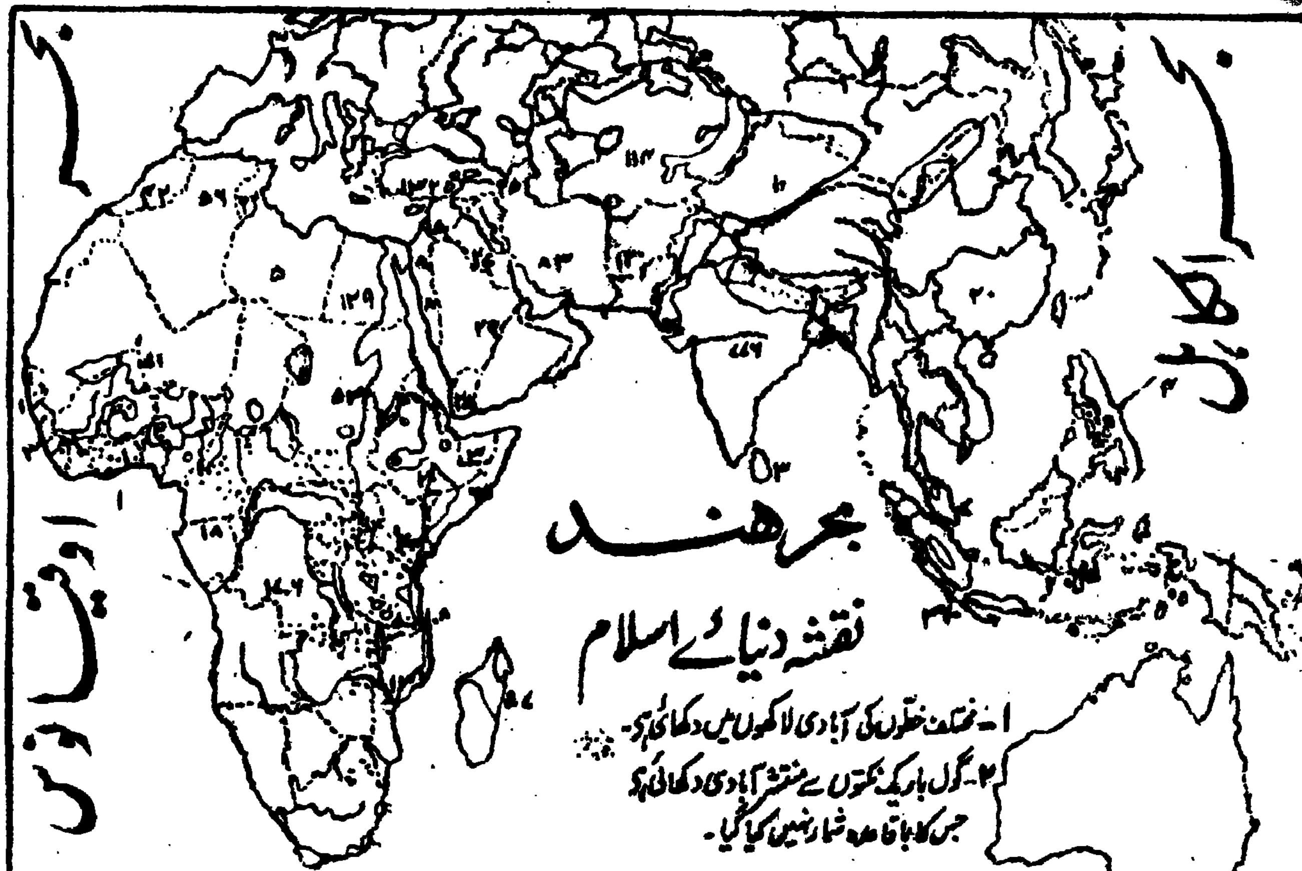
---

[۱] ہوگارتھ: "دی پینی ٹریشن اوف اریبیا" (نیو یارک سنہ ۱۹۰۴) ص۔

[۲] عرب اور عربی بولنے والوں کے فرق پر دیکھو باب چہارم۔

اور ابھی تک زندہ طاقت اور کروڑوں انسانوں کا اصولِ حیات ہے؛ عربی زبان آج بھی کوئی ساڑھے چار کروڑ اشخاص کی روزمرہ ضروریات کی زبان ہے۔ کئی صدی تک ساری مہذب دنیا میں علم و شائستگی اور ترقی پذیر افکار کا ذریعہ وہی رہی۔ نویں اور بارہویں صدی عیسوی کے درمیان، فلسفہ، طب، تاریخ، مذاہب، ہیأت اور جغرافیے پر جتنی کتابیں عربی میں لکھی گئیں، دنیا کی کسی زبان میں نہیں لکھی گئیں۔ مغربی یورپ کی السنہ میں صدہا لفظ عربی سے مستعار لئے گئے جو اس کے گہرے اثرات کی شہادت دیتے ہیں۔ عربی کا رسم الخط، لاطینی کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ ایرانی، افغانی، اُردو اور بہت سی ترکی، بربر، ملایائی السنہ انہی عربی حروف سے کام لیتی ہیں؛

بابلی، کلدانی، حطّی، فنیقی تومیں کبھی تھیں مگر اب نہیں ہیں۔ اہل عرب اور عربی بولنے والی قومیں جو پہلے تھیں، آج بھی موجود ہیں! جنگی اور جغرافی اعتبار سے تجارتی دنیا کی ایک بڑی شہ رگ پر جس طرح پہلے وہ قابض تھے، آج بھی قائم ہیں۔ ۵
عالمگیر جنگ نے ان میں سے کئی قوموں کو جھنجوڑا اور اب وہ ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ مصر کے آزاد و خود مختار ملک ہونے کا اعلان کردیا گیا ہے۔ عراق کے دارالحکومت بغداد میں، جہاں عباسی خلافت کے بعد سے اب تک کوئی تاج دار نہ تھا، ایک بادشاہ تخت نشین ہوا ہے۔ عرب جدید کا مردِ جری ابن سعود ہے جس نے اپنے لیے ایک بڑی مملکت تراشی اور مستحکم کرلی۔ وسطی


بحر اوقیانوس
بحر الکاہل
بحر ہند
نقشہ دنیائے اسلام
۱- مختلف خطوں کی آبادی لاکھوں میں دکھائی ہے۔
۲- گول باریک نکتوں سے منتشر آبادی دکھائی ہے جس کا باقاعدہ شمار نہیں کیا گیا۔

اور شمال مغربی عرب کا بڑا حصہ اس مملکت کا جزو ہے۔ شام اور فلسطین کے باشندے قومی شعور و خود شناسی کے مدارج طے کر رہے ہیں۔ لبنان عربی بولنے والوں کی پہلی مملکت ہے جس نے جمہوریت ہونے کا اعلان کیا۔ غرض عرب کا پرند ققنس دوبارہ اپنی خاکستر سے سر ابھار رہا ہے۔

جدید اکتشافات

قدیم علمی یورپ کو جنوبی عرب کا علم تھا۔ ہرودوٹس ان مصنفین میں ہے جو عرب کے مغربی ساحل کا ذکر کرتے ہیں۔ یونانیوں رومیوں کی خاص دلچسپی کی بات یہ تھی کہ عرب اُن علاقوں کے رہنے والے تھے جو مصالحے اور عود کی سرزمین تھی اور وہی ہندستان اور سمالیہ کی منڈیوں سے مال لاتے، لے جاتے تھے۔ لیکن قرون وسطیٰ اور عہد جدید کی ابتدا میں یورپ والے عرب کے جزو اعظم کو ایسا بھول گئے تھے کہ قریبی زمانے میں از سرنو اُس کی دریافت کرنی پڑی۔ اس میں رہنمائی کرنے والے کچھ تو آوارہ گرد سیلانی تھے، کچھ مسیحی مبلغ، تاجر اور کچھ فرانس و برطانیہ کے فوجی، جن کا سنہ ۱۸۱۱ء سے ۱۸۳۶ء تک کی مصری مہمات سے تعلق تھا؛ یا سفارتی قاصد اور چند علمی محقق۔ ان میں پہلا فاضل جس نے ملک عرب کی کیفیت لکھی کارسٹن نے بوہر (Carsten Niebuhr) گزرا ہے۔ سنہ ۱۷۶۱ء میں شاہِ ڈن مارک نے جو تحقیقاتی وفد بھیجا یہ اُس کا رکن تھا۔ سب سے پہلے الیمن کی جدید تحقیق کی گئی کیوں کہ جنوبی عرب کے اس ملک سے قدیم یورپ کو سب سے

زیادہ واقفیت تھی۔ شمالی عرب اور الحجاز بھی یورپ سے قریب تر
ہونے کے باوجود آخر تک نذرِ تغافل رہا۔ اس شمالی ریگستان میں
بمشکل ایک درجن فرنگی جنھوں نے کوئی تحریر چھوڑی، اندر پہنچ سکے۔
۱۸۱۲ء میں جوہان لُڈوِگ برکھارٹ نے بِترا کا علمی دنیا
پر انکشاف کیا۔ یہ سوستان کا باشندہ تھا اور ابراہیم ابن عبداللہ
کے نام سے مکہ (معظمہ) اور جدّے گیا۔ وہ ان مقامات کی ایسی
کیفیت لکھ گیا ہے کہ شاید اس سے بہتر ابھی تک کسی نے نہیں لکھی۔
اس کی قبر قاہرہ کے اسلامی قبرستان میں موجود ہے۔ ۱۹۲۵ء تک
کسی دوسرے فرنگی کو مکہ (معظمہ) کی سیاحت اور روزمرہ زندگی کے 7
مطالعہ کرنے کا موقع نہ مل سکا، بجز لائےڈن کے پروفیسر سنوک
ہُرگرونژ کے جو ۸۶-۱۸۸۵ء میں وہاں تھا۔ ایک فنستانی سُوِیڈ
فاضل جورج اگسٹس والِن نے ۱۸۴۵ء میں لسانی تحقیقات
کے لیے نجد کی سیاحت کی۔ نپولین ثالث نے ۱۸۶۰ء میں لبنان
سے اپنی فوجیں ہٹائیں تو وسطی عرب میں نفوذ کرنے کی فکر کی اور
دو سال بعد ولیم جی فرڈ پال گریو کو وہاں بھجوایا۔ یہ شخص یہودی نژاد
انگریز تھا اور اُن دنوں "عیسوئی" (=جے سوٹ) فرقے کے رُکن
کی حیثیت سے لبنان کے شہر زحلہ میں مقرر کیا گیا تھا۔ پال گریو
نے جنوبی نجد کے اُن قطعات کو بھی طے کرنے کا دعویٰ کیا جن تک
اس کی رسائی نہ ہوئی تھی۔

۱۸۵۳ء میں سر رچرڈ ایف برٹن نے الحاج عبداللہ کے
نام سے حرمین شریفین کی زیارت کی۔ برٹن، الف لیلہ کے انگریزی

ترجمے کی وجہ سے مشہور ہے۔ دو فرنگی عورتوں نے بھی عرب کی سیاحت کی ہے۔ ان میں ایک لیڈی این بلنٹ ۱۸۷۹ء میں نجد پہنچی۔ اس کے کئی مقصد تھے جن میں عرب گھوڑوں کی تلاش بھی شامل ہے۔ ۱۸۷۶ء میں چارلس ایم ڈروٹی نامے انگریز نے شمالی عرب کا سفر کیا۔ وہ نصرانی اور "انگلیسی" ہی کہلاتا تھا۔ اس کا سفرنامہ "ٹریولز ان ارےبیا ڈیزرٹا" انگریزی زبان کی ادبیات عالیہ میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طرح ٹی ای لارنس کی کتاب "سیون پلرز اوف وِس ڈم" کا خیر مقدم ہوا کہ یہ پہلی عالمگیر جنگ کی ممتاز ترین تصنیف ہے۔ تازہ تحقیق کرنے والوں میں ایک چیکوسلوواک مستمی ایوالش موزِل لائق ذکر ہے جس نے شمالی قطاع کا خصوصی مطالعہ کیا۔ اور حالیہ سیاحوں میں، شامی نژاد امریکی امین ریحانی نے جزیرہ نما کے تمام عرب بادشاہوں سے ملاقات کی۔ نیز، اِل ڈون رٹر جو ۱۹۲۵-۲۶ء میں حرمین شریفین گیا۔ نوجوان انگریز مستشرق برٹرام ٹامس کا دلیرانہ کارنامہ خاص طور پر تحسین کا مستحق ہے کہ جنوری ۱۹۳۱ء میں پہلی مرتبہ جنوبی صحرائے عرب الربع الخالی کو طے کر گیا اور اُس خطّے کو منکشف کیا جو دنیا کے چند عظیم نامعلوم قطعات میں سے ہے۔ اس کارنامے کا جواب سینٹ جون فلبی (معروف بہ الحاج عبداللہ) کی سیاحت تھی کہ خلیج فارس کے قریب الھفوف سے ۷ جنوری ۱۹۳۲ء کو شروع کی اور ربع الخالی کے مشرق سے مغرب تک نوّے روز میں پار کر لیا۔

حمیری کتبات برآمد ہوئے تو پہلی مرتبہ ہمیں یہ سننے کا موقع ملا

کہ جنوبی عرب کے لوگ اپنی نسبت کیا کہتے ہیں۔ ان کتابت کا
اکتشاف زیادہ تر ایک فرانسیسی یہودی جوزف ہلاوی (۱۸۶۹ء)
اور ایک آسٹروی یہودی ادوارد گلازر (۱۸۹۲ء تا ۱۸۹۴ء) کی
سعی کا ممنون ہے۔ (تشریح کے لیے دیکھو باب پنجم ذیلی عنوان ۲)۔
اس باب میں ایک عرصے بعد مسلمانوں نے بہت کچھ لکھا، اگر چہ
پوری طرح مستند نہ تھا۔ یونانی اور لاطینی کتابوں میں بھی کہیں کہیں ۵
ذکر آجاتا ہے۔ اسی طرح فراعنہ کے ہیروغلیفی اور شاہان اشور و بابل
کے پیکانی کتبات میں بعض عبارتیں ملی ہیں۔ عرب قدیم کی نسبت
ہماری معلومات کے یہ ماخذ تھے جن کا تکملہ حمیری کتبات اور زمانۂ
حال کے سیاح اور اہل تفتیش کی اطلاعات سے ہوتا ہے۔ کتبات
کی تحریر کو قریب زمانے میں پڑھ لیا گیا ہے۔

سامی اقوام کا نسلی رشتہ

سامی نسل کے دو نمایندے باقی رہے۔ ان میں بھی یہودیوں
کی نسبت عربوں نے اس نسل کی امتیازی خصوصیاتِ جسمانی و
دماغی کو کہیں زیادہ محفوظ رکھا ہے۔ ان کی زبان، تحریری ادب
کے لحاظ سے سامی زبانوں میں سب سے کم سن ہے پھر بھی اصل
سامی بولی کی خاص نشانیاں، گردانوں سمیت، عبرانی اور اس
کی دوسری بہنوں کی نسبت کہیں زیادہ عربی میں سلامت رہیں
نظر برایں سامی السنہ کے مطالعے کی سب سے اچھی کلید یہی ہے۔
اسی طرح دین اسلام اپنی اصلی صورت میں، سامی مذہب کی

لازمی تکمیل ہو۔ مگر یورپ و امریکہ میں "سامی" لفظ کا اطلاق زیادہ تر یہود کے متعلق ہوگیا ہو اور یہ اس لئے کہ ان تبرہاے اعظم میں وہ ہر جگہ پھیل گئے ہیں۔ "سامی خال وخط" جن میں اونچی ناک بھی شامل ہو، ذرا بھی سامی نہیں بلکہ حقیقت میں خاص وہ نقوش ہیں جن سے یہودی، اصلی سامی نمونے سے الگ ہوگئے ہیں۔ یہ ضرور انھوں نے حتّی (حطّی) حوری قوم سے ابتدا ہی میں شادی بیاہ کرکے بہم پہنچائے ہوں گے[۱]۔

عرب العاربہ، خصوصًا بدو زبان و معاشرت اور جسمانی اور حیاتیاتی اعتبار سے سامی نسل کے بہترین قائم مقام کیوں ہیں؟ اس کے اسباب ملک عرب کے دور دست، الگ تھلگ ہونے اور صحرائی زندگی کی مسلسل یکسانی میں تلاش کرنے چاہئیں۔ وسط عرب دنیا سے جدا [illegible] زندگی کا خلاصہ ہو۔ مگر اسی کو بسر کرنے کا انعام نسلی نجابت ہو۔ عرب اپنے وطن کو جزیرۃ العرب کہتے ہیں اور واقعی وہ جزیرہ ہو کہ تین طرف پانی اور چوتھی طرف ریت سے گھرا ہوا ہو۔ یہ جزیرہ اپنی زمین اور اس کے بسنے والوں میں انقطاع تعلق کی ایسی مثال ہو کہ شاید اور کہیں نہ مل سکے گی۔ اس سرزمین میں اگر باہر کی قومیں کبھی پے در پے اتنی تعداد میں آئی ہوں کہ پہلے باشندے نکال دئے گئے یا جذب ہوگئے، جیساکہ ہند، یونان، اطالیہ، انگلستان یا ریاست ہاے امریکہ میں ہوا، تو تاریخ نے

---

[۱] دیکھو: "سے سوشیہ بیشن اوری جنز۔ دی بے سک پاپ پولیشن اوف دی میڈ ٹیرانیسٹ" (فلیڈل فیا۔ ۱۹۳۰ء) صفحہ ۱۳۲ وغیرہ۔

اُس کی کوئی شہادت نہیں چھوڑی۔ اور نہ ہمیں کسی ایسے حملہ آور کا علم ہے جو ریت کے سب مرحلے طے کر کے ملک میں جبراً داخل اور مستقل طور پر قابض ہو گیا ہو۔ جہاں تک تحریری تاریخ سے پتہ چلتا ہے قوم عرب ہمیشہ سے قریب قریب وہی چلی آ رہی ہے[۱]۔

لفظ "سامی" تورات (آفرینش - ۱۰-۱) کے لاطینی (ول گیٹ یعنی) عوامی نسخے کے ذریعے رائج ہوا۔ یہ روایتی تاویل کہ نام نہاد سامی نسل کے لوگ حضرت نوحؑ کے بڑے بیٹے کی اولاد میں اور ایک ہی خاندان سے تھے، اب مسلّم نہیں رہا۔ لہذا یہ سوال حل طلب ہے کہ سامی کون ہیں؟

مغربی ایشیا کے لسانی نقشے پر نظر ڈالئے تو آج کل عرب خاص، فلسطین، شام اور عراق عرب عربی بولنے والوں کے ملک ہیں۔ تاریخ قدیم کی ورق گردانی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ مسیحؑ سے ۳½ ہزار برس قبل دجلہ و فرات کی وادی میں بابل والے (جو اپنے پایۂ تخت اکدو یا اکاد کی نسبت سے اوّل اوّل اکادی کہلاتے تھے) پھر اشوری اور آخر میں کلدانی بسے ہوئے تھے۔ سنہ ۲۵۰۰ ق م کے بعد عموری، کنعانی (جن میں فنیقی بھی شامل تھے) شام میں آباد تھے اور سنہ ۱۵۰۰ ق م میں یہاں ارامی اور فلسطین میں یہودی آ بسے۔ حقیقت میں یہ سب قومیں قریبی رشتہ رکھتی تھیں اگرچہ یہ بات ازمنہ وسطیٰ اور زمانۂ حاضرہ میں بھی انیسویں صدی تک غیر منکشف رہی۔ انیسویں صدی

---

۱ ملاحظہ ہو برٹرام ٹامس کی کتاب: "دی نیئر ایسٹ اینڈ انڈیا" صفحہ ۱۶ اور سی رت ژان کا مضمون، ژورنال ایشیاتیک کے شمارہ اوّل ۱۹۲۹ء میں۔

عیسوی کے وسط میں جب بیکانی خط پڑھ لیا گیا تو اشوری، عبری، ارامی، عربی اور حبشی زبانوں کے تقابلی مطالعے سے معلوم ہوا کہ ان سب زبانوں میں نمایاں مشابہت ہے اور وہ لازماً ایک دوسرے کی بہنیں ہیں۔ ان میں سے ہر زبان کے فعل کا مادہ سہ حرفی، اور زمانے صرف دو، یعنی ماضی اور مضارع ہوتے ہیں اور تصریف کا اصول بھی یکساں ہے۔ ابتدائی الفاظ میں متکلم کی ضمیر، رشتوں اور کئی اعضائے جسم کے نام اور اعداد قریب قریب ایک ہیں۔ جو قومیں یہ زبانیں بولتی ہیں ان کے عمرانی ادارے، مذہبی عقائد اور اعضائے جسمانی میں بھی مقابلہ کرنے سے مماثلت کے ایسے پہلو سامنے آتے کہ آدمی کو قائل ہونا پڑتا ہے کہ یہ لسانی رشتہ دراصل ایک ممتاز نسلی وحدت کا آئینہ دار ہے۔ اس نسل کی خصوصیات گہرا مذہبی وجدان، قوی متخیلہ، واضح انفرادیت اور صریح خوں خواری تھیں۔ لامحالہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ مختلف اقوام، یعنی بابلی، اشوری، کلدانی، عموری، ارامی، فنیقی، یہودی، عرب اور حبشی جدا ہونے سے قبل کسی زمانے میں ضرور کہیں ایک قوم بن کر رہتے تھے۔

سامی نسل کا گہوارہ عرب ہے

ان لوگوں کا اصلی وطن کہاں تھا؟ جواب میں اہل علم نے مختلف مفروضات قائم کئے ہیں۔ ایک گروہ سامی اور حامی اقوام کی تھوڑی بہت نسلی مناسبت کو دیکھ کر مشرقی افریقہ کو اصلی وطن بتاتا ہے۔ بعض حضرات توراۃ کی روایات کے زیر اثر عراق عرب کو

ابتدائی مسکن قرار دیتے ہیں لیکن جزیرہ نمائے عرب کے حامیوں کی دلائل اور اُن کی مجموعی قوت پر غور کیجیے تو یہی نظریہ سب سے زیادہ قابل قبول نظر آئے گا۔ عراق عرب والے نظریئے میں بڑی خامی یہ ہے کہ اس میں دریا کے کنارے بسنے والی قوم کا زراعت جاننے کے بعد خانہ بدوشی کے مرحلے میں پہنچنا، فرض کرنا پڑتا ہے جو تاریخی زمانے کے عام عمرانی قانون کی معکوس صورت ہے۔ رہا افریقی نظریہ' وہ مشکلات حل کرنے سے کہیں زیادہ نئے عقدے پیش کر دیتا ہے ؛

جزیرہ نمائے عرب کی سطح بیش تر ریگ زار ہے۔ صرف زیریں پہلوؤں پر قابل سکونت زمین کی پٹی ملتی ہے۔ ان کناروں کو سمندر گھیرے ہوئے ہے۔ جب آبادی اتنی بڑھ جاتی کہ مسکونہ پٹی میں بسر اوقات نہ کر سکتی تو لازمًا زائد آبادی کو باہر جگہ ڈھونڈنی پڑتی تھی۔ اندر کے رخ تو ریگستان اسے بڑھنے نہیں دیتا اور بیرونی جانب سمندر راستہ روکتا جو گزشتہ زمانے میں قریب قریب ناقابل عبور حائل تھا۔ ایسی صورت میں فاضل آبادی کے سامنے مغربی ساحل کی طرف سے آگے چلنے کا ایک ہی راستہ کھلا تھا جو شمال میں جزیرہ نمائے سینا پہنچ کر نیل کی زرخیز وادی کی جانب مڑ جاتا ہے۔ سنہ ۳۵۰۰ ق م کے آس پاس سامی مہاجرین اسی راستے سے گزرے یا مشرقی افریقہ کا شمالی راستہ چل کر مصر کی سابقہ حامی نسل کی آبادی میں آن دھنسے۔ انہی کے میل سے تاریخی عہد کی وہ مصری قوم پیدا ہوئی جس نے تمدن کے بہت سے مبادی کی بنیاد ڈالی۔ انہی نے سب سے پہلے پتھر کی عمارتیں بنائیں اور شمسی

تقویم کی ابتدا کی ؛ مہاجرین کا ایک اور گروہ اسی کے قریب زمانے میں مشرق کے راستے شمال کی طرف چلا اور دجلہ و فرات کی تری میں ڈیرے ڈال دیئے، جہاں پہلے سے سمیریوں کی نہایت متمدن قوم آباد تھی۔ سامی لوگ یہاں آئے تو خانہ بدوش بدوی تھے لیکن فراتی تہذیب کے بانیوں (یعنی سمیریوں) سے انھوں نے مکان بنا کے رہنے، کھیتوں میں پانی دینے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لکھنے کا فن سیکھا۔ سمیری، سامی نسل سے نہ تھے۔ ان دونوں کی آمیزش سے بابلی قوم وجود میں آئی جو ہمارے تہذیبی ورثے کا قوام تیار کرنے
کے فن میں مصریوں کی شریک ہے۔ دوسری جدتوں کے علاوہ لداؤ ۱۱
کی چھت اور محراب بنانا، (غالباً سمیریوں کی ایجاد سے) پہیے کی گاڑیاں اور وزن و پیمائش کا طریقہ، انہی سے ہمیں ترکے میں حاصل ہوا ہے ؛

حضرت مسیحؑ سے قبل تیسری ہزاری کے وسط کے قریب ایک اور سامی قوم، یعنی عموری، اٹھ کر پہلے اور "ہلالِ خصیب" کی سرزمین (یعنی شام و عراق کے سرسبز علاقے) میں پہنچ گئے۔ ان کے گروہ
میں کنعانی بھی تھے کہ ۲۵۰۰ ق م کے بعد شام و فلسطین میں بسنے ۱۲
اور وہ ساحلی قوم بھی، جسے یونانی "فنیقی" کے نام سے یاد کرتے تھے۔ یہی فنیقی وہ لوگ ہیں جنھوں نے سب سے پہلے خالص صوتی حروف سے لکھنے کا طریقہ نکالا جس میں بائیس شکلیں یا حروف تھے۔ اس طریق کو نوع انسانی کی سب سے بڑی ایجاد کہا گیا تو یہ کچھ بے جا نہ تھا۔ (نیز دیکھو باب ششم، فصل دوم)

سنہ ۱۵۰۰ء اور سنہ ۱۲۰۰ ق م کے درمیان یہودی جنوبی شام اور فلسطین میں اور آرامی شمالی شام، خصوصاً نشیبی خطے میں آ بسے جسے آج کل البقاع کہتے ہیں۔ یہود سب سے پہلی قوم ہے جس نے دنیا کو خدائے واحد کا واضح تصور دیا۔ یہی یہودی توحید مسیحی اور اسلامی عقیدے کی اصل بنی ہے۔

سنہ ۵۰۰ ق م کے قریب نبطیوں نے جزیرہ نمائے سینا کے شمال مشرق میں قدم جما لئے۔ آگے چل کر ان کی تہذیب نے، رومی اثرات کے ماتحت جو بلند درجہ حاصل کیا اس کا اندازہ ان کے کوہ تراش شہر پیٹرا کے آثارِ عظیمہ سے کیا جا سکتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی میں سب سے آخری رو اسلام کے جھنڈے کے نیچے امنڈ کر چلی جس نے بند کو توڑ دیا اور نہ صرف خلیج فارس اور بحرِ روم یا (ابیض) کے درمیان کی قوسِ ارضی پر پھیلی جو "ہلالِ خصیب" کہلاتی ہے، بلکہ مصر، شمالی افریقہ، اندلس، ایران، وسط ایشیا کے اقطاع تک کو تہ آب کر گئی۔ یہ مہاجرت تاریخ کی پوری روشنی میں ہوئی تھی۔ اسے وہ لوگ جو سامی نسل کا وطن عرب کو قرار دینے کے موئید ہیں تاریخی دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے نظریے کو مزید قوت اس مشاہدے سے پہنچاتے ہیں کہ عربوں نے سامی خصائص کو بہت خالص شکل میں محفوظ رکھا۔ اور اس نسل کی دوسری شاخوں کی نسبت انھیں زیادہ نمایاں کر دکھایا۔ اور تیسری بات یہ کہ عربوں کی زبان اس بولی سے نہایت اقرب ہے جسے اہلِ تحقیق سامی زبان کی ابتدائی صورت قرار دیتے ہیں۔

مذکورۂ بالا سنین کا مقابلہ کرنے سے سامیات کے بعض ماہروں کو یہ خیال بھی آیا کہ ملک عرب ایک عظیم ذخیرۂ آب کی طرح تقریبًا ہزار سال کے دور کے ختم پر آبادی سے اس طرح لبالب ہوتا رہا کہ پھر اس کا چھلک جانا ناگزیر ہو جاتا تھا۔ چنانچہ یہ حضرات اِن ہجرتوں کو "امواج" کے استعارے میں بیان کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ ابتدا میں اس نقل مکانی کی صورت ایسی تھی جیسے اہل یورپ کی ہجرت امریکہ کو۔ کہ پہلے چند اشخاص روانہ ہوتے۔ کچھ اُن کے ساتھ ہو جاتے پھر اور لوگ دیکھا دیکھی چل پڑتے یہاں تک کہ ترک وطن کا یہ سلسلہ ایک مقبولِ عام تحریک بن جاتا۔ چراگاہی علاقوں سے اٹھ اٹھ کر زرعی خطوں میں گروہ در گروہ جا بسنے کا عمل مشرقِ قریب میں بارہا دیکھنے میں آیا ہے اور ان ممالک کی طویل و بوقلموں تاریخ کے اہم سراغ کا کام دیتا ہے۔ کسی ہجرت پسند قوم کا پسے لبائے باشندوں میں آگھسنا عمومًا اس پر منتج ہوتا رہا کہ حملہ آور سابقہ تمدن کے خاص خاص رسم و رواج کو ایک حد تک اپنا لیتے اور پرانی آبادی میں نئے خون کی کسی قدر آمیزش ہو جاتی۔ لیکن ان قدیم باشندوں کا کلی استیصال شاید ہی کبھی ہوا ہو۔ مشرق قریب کی تاریخ ایک حد تک اسی کشمکش کی سرگزشت ہے جو "ہلال خصیب" کی جمی جمائی آبادی اور خانہ بدوش عربوں میں ہزاروں برس پہلے جاری رہی کہ وہ جنوب سے اٹھ اٹھ کر آتے اور سابق باشندوں کو ہٹا کر اپنا قبضہ جماتے تھے۔ کیوں کہ کسی نے خوب کہا ہے کہ مہاجرت اور آبادکاری بھی

فوج کشی کی ایک ہلکی قسم ہے۔

اس پے در پے مہاجرت کے سلسلے میں یہ بات لکھنے کے لائق ہے کہ قریب قریب ہر صورت میں سامی زبان سلامت رہی۔ یہ ایک فیصلہ کن واقعہ ہے۔ ورنہ، مثالاً اگر عراق عرب میں زراعت پیشہ سُمیریوں کی زبان زندہ رہتی تو ہمیں اس وادی کے باشندوں کو سامی قرار دینا مشکل ہوتا۔ قدیم مصر کے معاملے میں سامی و حامی دونوں سے مل کر ایک مخلوط زبان تیار ہوئی، لہٰذا ہم اہل مصر کو سامیوں میں بے تکلف شامل نہیں کر سکتے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سامی کی اصطلاح میں نسلی سے زیادہ لسانی مفہوم مضمر ہے اور اشور بابلی، ارامی، عبرانی، فنیقی، جنوبی عربی، حبشی اور عربی سب کو ایک ہی ابتدائی بولی یا مورثِ اعلیٰ کی شاخیں سمجھنا چاہیے۔ اس کی ایک نظیر رومانی زبانیں ہیں جو لاطینی سے نکلی ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اصل لاطینی آج تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہ گئی، کتابوں ہی میں سہی۔ لیکن اصل سامی جو محض بول چال کی زبان تھی، بالکل مفقود ہو گئی اگرچہ اُس کی نوعیت کا ایسے عناصر سے جو اُس کی تمام سلامت رہنے والی شاخوں میں پائے جاتے ہیں، پتہ چل سکتا ہے۔

اگر ملک عرب (نجد ہو یا یمن) سامی اقوام کا اصلی وطن مان لیا جائے جہاں سے وہ اِدھر اُدھر پھیلیں، تو بھی یہ لازم نہیں آتا کہ ہم اس اِمکان سے انکار کر دیں کہ کبھی بہت پہلے وہ ایک اور گورے رنگ کی نسل یعنی حامیوں کے ساتھ ایک ہی کنبے کی حیثیت سے مشرقی افریقہ کے کسی علاقے میں رہتے تھے اسی کنبے سے

الگ ہو کر، شاید باب المندب سے انھوں نے سمندر کو پار کیا[1] اور جزیرہ نمائے عرب میں چلے آئے اور بعد میں سامی کہلانے لگے۔ اس نظریئے سے افریقہ اُن دونوں کی مشترک "سامیو حامی" نسل کا بہ ظنِ غالب وطن ٹھیرے گا اور ملک عرب سامی نسل کا گہوارہ اور نشر و تقسیم کا مرکز قرار پائے گا۔ سامیوں کے تمدّن کی جلوہ گاہ "ہلالِ خصیب" کے علاقے تھے۔

[1] جورج اے بارٹن: "سیمیٹک اینڈ ہیمیٹک اوریجنز" (فلاڈلفیا ۱۹۳۴ء - ص ۲۷)

بابِ دوم

جزیرہ نمائے عرب

ابتدائی تیاریاں

14

عرب، جنوب مغربی ایشیا کا جزیرہ نما ہے۔ دنیا بھر میں اتنا بڑا جزیرہ نما کوئی نہیں ۔ لیکن اس کی کل آبادی کا تخمینہ صرف اسّی لاکھ کیا گیا ہے۔ ان میں سے دس لاکھ باشندے حجاز میں، پندرہ لاکھ یمن میں، پچیس لاکھ نجد اس کے توابع الحسا اور الجوف میں، پندرہ لاکھ عسیر میں اور ساڑھے سات لاکھ عمان میں رہتے ہیں۔(الحسا کو پہلے البحرین کہتے تھے)؛ ماہرینِ ارضیات کہتے ہیں کہ یہ سرزمین ایک زمانے میں صحرائے افریقہ کا قدرتی حصہ تھی۔ اب ایک تو وادیٔ نیل کی کیل بیچ میں آگئی اور دوسرے بحرِ قلزم کی دراڑ نے اسے صحرا سے کاٹ دیا۔ ورنہ وہی ریگستان کی عظیم پٹی وسطِ ایران سے صحرائے گوبی تک ایشیا میں مسلسل چلی جاتی تھی۔ اور بھی قدیم زمانوں میں بحرِ اوقیانوس کی مغربی ہوائیں جو سمندر سے پانی لاتیں اور لبنان شام و فلسطین کی بلندیوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ضرور بحری بھاری

عرب تک پہنچتی ہوں گی اور عصر جلید (آئس ایج") کے ایک حصے میں یہی ریگستان خوب بسنے بسانے کے قابل سبزہ زار ہوں گے۔ اصل میں برف کی چادر جو کرۂ ارض پر چھائی، ایشیائے کوچک کے پہاڑوں سے آگے جنوب میں کبھی نہیں بڑھی اور ملک عرب تجلید کی وجہ سے کبھی ناقابلِ سکونت نہیں ہوا۔ اس کی گہری وادیاں کہ اب خشک پڑی ہیں، شہادت دیتی ہیں کہ مینھ کا پانی، جو ایک زمانے میں ان کے اندر سے بہتا تھا، کٹاؤ ڈالنے کی کیسی قوت رکھتا ہے۔ عرب کی شمالی حد فاصل اچھی طرح معین نہیں ہے لیکن خلیج عقبہ (بحر قلزم) کے بالائی سرے سے سیدھے مشرق میں فرات تک خط کھینچئے تو یہی سرحد کا (مفروضہ) خط سمجھا جائے گا؛ ارضی نوعیت کے اعتبار سے عراق وشام کا تمام صحرائی علاقہ بے شبہ عرب میں داخل ہے؛

جزیرہ نما کا ڈھلان مغرب سے خلیج فارس کی طرف ہے۔ اوپر کے رُخ وہ عراق عرب کے جوف پر منتہی ہوتا ہے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی وہ پہاڑ ہیں جو مغربی ساحل کے متوازی چلے جاتے ہیں۔ شمال میں یہ مدین کے مقام پر نو ہزار فیٹ تک بلند ہو گئے ہیں۔ جانب جنوب یمن میں بارہ ہزار فیٹ سے زیادہ[1] اور حجاز میں السراۃ پر دس ہزار فیٹ اونچے ہیں۔ ان پہاڑوں سے مشرق کی طرف ڈھلان بہت تدریجی اور طویل اور مغرب میں بحر قلزم

---

[1] کارل راٹ جنز اور ہرمن ورہمن (جرمن اہل تحقیق کی) پیمائش کے مطابق یمن کی سب سے اونچی چوٹی ۱۲۳۳۶ فیٹ بلند ہے؛

کی جانب فاصلہ تھوڑا اور ڈھال زیادہ سلامی دار ہی۔ جزیرہ نما کے جنوبی کناروں سے سمندر بہتر فیٹ سالانہ کے حساب سے پیچھے ہٹ رہا ہی۔ اِن کا نشیبی حاشیہ تہامہ موسوم ہی؛ شمال میں 15 وسطی سطح مرتفع یعنی نجد کی بلندی کا اوسط ڈھائی ہزار فیٹ، لیکن اس کے پہاڑ شمر کی ایک سُرخ ساق کی چوٹی، اجاع، سطح بحر سے ۵۵۵۰ فیٹ بلند ہی۔ تینوں طرف نشیبی ساحلوں کے عقب میں مختلف بلندی کے پہاڑ ہیں۔ مشرق میں عمان کے جبلِ اخضر کی چوٹیاں ۹۹۰۰ فیٹ تک اٹھی ہوئی ہیں۔ زمین کی جانب مشرق عام ڈھلان سے یہ ایک نمایاں استثنیٰ ہی؛

مذکورہ بالا پہاڑ اور فراز کو چھوڑ کر باقی سارا ملک صحرا یا سنگستانی میدان ہی یہاں عموماً پہاڑیوں کے درمیان مدوّر قطعات ہیں۔ پہاڑیوں پر ریت چڑھی ہی مگر نیچے پانی کے سوتے ہیں۔ شام کا نام نہاد صحرا، بادیۃ الشام، اور اسی طرح عراقی صحرا بیش تر پتھریلے میدان ہیں۔ بادیۃ الشام کا جنوبی حصہ عوام میں الحماد معروف ہی اور عراق کا جنوبی میدان اکثر بادیۃ العراق یا السماوہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہی؛

صحرائی قطعات کی تین قسمیں کی جاسکتی ہیں:

۱- بڑا "نفود" یعنی سفید یا بھوری ریت کا خطّ، جس کے بڑے بڑے ٹیلے یا کراڑے بن گئے اور شمالی عرب کا وسیع رقبہ گھیرے ہوئے ہی۔ عربی ادبیات میں اسے البادیہ اور کبھی کبھی الدہنا سے یاد کیا گیا ہی۔ اس میں کہیں کہیں نخلستان ورنہ تمام (ریت کا)

خشک علاقہ ہے تاہم بعض دفعہ جاڑوں میں اتنا مینہ برس جاتا ہے کہ سطح زمین پر سبزے کی چادر سی بچھ جاتی ہے اور خانہ بدوش بدو کے اونٹوں بھیڑوں کو جنت کا مزا آجاتا ہے۔ دس بارہ فرنگی جنہوں نے سب سے اول نفود کو پار کیا، ان میں فرانس کا شارلے ہیوبر (۱۸۷۸ء) انگریز سیاست داں شاعر ولفرڈ بلنٹ (۱۸۷۹ء) اور وُرٹمبرگ کا مستشرق جولیس یوٹنگ (۱۸۸۳ء) تھے۔

۲۔ الدہناء (= سرخ زمین) لال ریت کا علاقہ جو شمال میں نفود سے جنوب میں ربع الخالی تک پھیلا اور جنوب مشرق میں چھ سو میل سے زیادہ لمبی قوس بناتا ہے۔ اس کے مغربی حصے کو کبھی کبھی "الاحقاف" (یعنی ریت کے ٹیلے) کہتے ہیں۔ زیادہ قدیم نقشوں میں اسے عموماً ربع الخالی بتایا گیا ہے۔ یہاں جب موسمی بارش ہوتی ہے تو کثرت سے چارہ پیدا ہوتا اور کئی حیثے بدوؤں اور ان کے مویشی کی کشش کا سبب بن جاتا ہے لیکن گرمیوں میں کوئی متنفس یہاں نہیں رہتا ہے
برٹرام ٹامس[1] سے پہلے ربع الخالی یعنی "[illegible]" زمین کو
17 کسی فرنگی نے پار کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ہوا [illegible] کسی نے اسے عبور کرنے کی کوئی اطلاع تحریری شکل میں آئی۔ ٹامس نے کمال کیا کہ بحر عرب سے چلا اور اس خطے کو طے کر کے ۵۸ دن میں خلیج فارس کے کنارے پہنچ گیا۔ راستے میں گاتی ریت کے کرشمے سے سابقہ پڑا نمک کی نئی جھیل دریافت کی [illegible] خلیج فارس کی [illegible]

---

[1] "آرے بیا فی لکس: ایکروس دی ایمپٹی کوارٹر آف عربیا" (نیویارک ۱۹۳۲ء)

نقشہ نمبر ٢



شمالی عرب کی ریاستیں
اور قبائل (قبل از اسلام)

قطر کے جنوب میں، شاخ ثابت ہوئی ؛ اس سے پہلے جنوبی عرب کے اس پر اسرار وخوف انگیز ویرانے کی نسبت ہمیں کچھ علم نہ تھا، سوائے اس معلومات کے جو دسویں صدی کے جغرافیہ نویسوں نے فراہم کی تھی؛

۳۔ ال حرّہ، بھورے پتھر کا رقبہ ہے جس پر لاوا کی کٹی پھٹی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ ایسے برکانی (یعنی آتش فشانی) قطعات وسطی اور مغربی عرب میں کثرت سے موجود اور شمال میں مشرقی حوران تک جاتے ہیں۔ یاقوت نے ایسے پورے تیس قطعات کے نام گنوائے ہیں[1] آخری آتش فشانی جس کا ایک عرب مورخ نے ذکر کیا ۶۵۴ھ/۱۲۵۶ء میں واقع ہوئی تھی؛

ان رملی اور حجری حلقوں کے درمیان، ایک اُٹھے ہوئے گوشے پر وہابیوں کا ملک نجد ہے۔ اس کے کلسی احجار ایک زمانے سے بادو باراں کے ہدف ہیں۔ اِدھر اُدھر ریت کے میدان پڑے ہیں۔ کوہ شمر سنگ سیاہ وسماق سے بنا ہے؛

موسمی حالات

عرب نہایت گرم وخشک ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ مشرق و مغرب میں دونوں طرف سمندر ہے لیکن عرض میں اتنا کم کہ افریقہ و ایشیا کے عظیم اور متصلہ غیر بارانی خطّوں کی موسمی یکسانی میں فرق نہیں ڈال سکتا۔ جنوب کا سمندر بے شک بارش لاتا ہے لیکن ہر سال سموم کے تھپیڑے اتنی نمی نہیں چھوڑتے کہ اندرون ملک تک پہنچ سکے

[1] معجم البلدان۔ (لائپ زگ۔ ۱۸۶۶-۷۳ء) دیکھو اشارہ۔

البتہ مشرقی ہوا (جسے صبا کہتے ہیں) ایسی صحت بخش و خوش گوار ہوتی ہے کہ ہمیشہ سے عرب شعرا کا مقبول موضوع ہے۔ اسلام کے مولد الحجاز میں تین تین سال بلکہ اور زیادہ مدت تک خشک سالی کوئی نئی بات نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تھوڑی دیر کی سخت طوفانی بارش مکہ اور مدینہ میں جا برسے اور کبھی کبھی خانۂ کعبہ کو مخدوش بنا دے کے کی ان اتفاقی طغیانیوں (یا سیلول) پر بلاذری نے پورا ایک باب تحریر کیا ہے[1] انہی بارشوں سے صحرا کی سخت جاں چراگاہی ہریاول نمودار ہوتی ہے۔ شمالی حجاز میں کہیں کہیں نخلستان آگئے ہیں۔ ایسے سب سے بڑے قطعے کا رقبہ کوئی دس میل مربع ہوگا۔ انہی پر بستیوں کا گزارا ہے ورنہ اسّی فی صدی سے زیادہ آبادی بدوی ہے۔ بعض نخلستان، جیسے فدک، جن کا اسلام کے قرون اولیٰ میں ذکر آتا ہے، بالکل مفقود ہو گئے ہیں۔ عہد رسالت میں اکثر نخلستانوں میں ۱۴
یہودی زراعت کرتے تھے۔ حجاز کے نشیبی علاقے میں حرارت کا اوسط نوّے درجے کے قریب ہے۔ مدینہ (طیبہ) میں ستر درجہ سے کچھ اوپر۔ یہ اپنے جنوب کے بھائی مکہ (معظمہ) سے زیادہ صحت بخش مقام ہے۔

صرف یمن اور عسیر میں اتنی موسمی بارشیں ہوتی ہیں کہ باقاعدہ کھیتی کی جا سکتی ہے۔ یہاں کی بہتر وادیوں میں ساحل سے دو سو میل تک بارہ مہینے روئیدگی پائی جاتی ہے۔ یمن کا جدید دارالحکومت صنعا سطح بحر سے سات ہزار فیٹ سے کچھ زیادہ بلند، اور اسی لئے عرب

[1] فتوح البلدان ۔ ص۵۳

کے سب سے صحت بخش اور خوش نما شہروں میں داخل ہے۔ ساحل پر اور بھی سرسبز قطعات ہیں اگرچہ مسلسل نہیں۔ حضرموت کی سرزمین پر گہری گہری وادیاں نمایاں ہیں اور ان میں زیر زمین پانی کی کچھ کمی نہیں مشرقی سرے پر عمان میں خاصی اچھی بارش ہوتی ہے۔ قتادہ، حدیدہ، مسقط خاص طور پر گرم و مرطوب ہیں۔

عرب کسی بڑی ندی پر جس میں سال بھر پانی رہے اور بہہ کر سمندر تک پہنچے، فخر نہیں کر سکتا۔ کشتی رانی کے قابل بھی کوئی ندی نہیں۔ کبھی کبھی جب طغیانی آتی ہے تو پانی ندیوں کی بجائے، بیچ در بیچ پہاڑی وادیوں میں ہو کر نکل جاتا ہے۔ ان وادیوں سے ایک اور فائدہ یہ ہے کہ قافلوں اور حاجیوں کا راستہ متعین کرتی ہیں۔ آغاز اسلام سے عرب کو بیرونی دنیا سے ملانے والی بڑی کڑی یہی حج ہیں۔ ان کے خاص (بری) راستے، عراق سے یہ ہیں:۔ نجد میں بُریدہ پہنچ کر وادئ رُمہ سے۔ اور شام کی طرف سے: وادئ سرحان سے گزر کر ساحلِ قلزم کا چکر لگا کے حجاز پہنچتے ہیں۔ اندرونی راستے یا تو ساحلی ہیں کہ قریب قریب سارے جزیرہ نما کا کنارہ طے کرتے ہیں یا عبوری، کہ جنوب مغرب سے شمال مشرق تک وسطی نخلستانوں کی راہ سے ربع خالی کو بچاتے ہوئے، پار ہوتے ہیں۔

دسویں صدی کا جغرافی، الاصطخری، حجاز میں طائف کے قریب صرف ایک مقام کا ذکر کرتا ہے، جہاں سردی سے پانی جم جاتا ہے[1]۔ الہمدانی کے ہاں صنعا میں منجمد پانی کا تذکرہ آیا ہے۔

---

[1] مسالک الممالک (دے خوین ۱۸۷۰ء) ص۱۹ وغیرہ۔

عہد حاضر میں ایک مقام، یعنی یمن کے کوہ حضور الشیخ کا گلازر نے اضافہ کیا ہے کہ وہاں قریب قریب ہر سرما میں برف گرتی ہے۔[۱] پالا اور بھی زیادہ مقامات میں پڑتا ہے۔

نباتات

خشک موسم اور شور زمین کی وجہ سے کثرت اشجار کا امکان ۱۹ نہیں۔ لیکن حجاز کھجوروں سے مالا مال ہے۔ یمن اور بعض نخلستانوں میں گیہوں ہوتا ہے۔ گھوڑوں کے لیے جو بوتے ہیں۔ کہیں کہیں جوار باجرہ (ذرّہ) اور عمان والحسا میں چاول ہو جاتا ہے۔ جنوبی ساحل کے برابر، سطح مرتفع پر، خاص کر ظفرہ میں اب تک لوبان کا درخت خوب ہوتا ہے جو قدیم زمانے میں بھی جنوبی عرب کی تجارتی زندگی کا خاص عنوان تھا۔ عسیر کی خصوصی پیداوار صمغ عربی ہے۔ قہوے کا درخت چودھویں صدی میں حبشہ سے جنوبی عرب لایا گیا اور اب یمن کی شہرت کا باعث ہے۔ یہ "اسلامی شراب" سب سے پہلے سولھویں صدی کی تحریروں میں مذکور ہوئی ہے۔[۲]

یورپ کے مصنفوں میں سب سے اول ۱۵۹۲ء کی ایک کتاب میں قہوے کا نام آتا ہے۔

صحرائی درختوں میں کیکر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ جیسے اَثل، غضا، جس کا کوئلہ بہت اچھا بنتا ہے، اور طلح جس سے گوند نکلتا ہے۔

---

[۱] الاکلیل (پرنسٹن ۱۹۴۰ء) ص ۷ نیز دیکھو "رسالہ فی بلاد العرب السعیدہ" (قاہرہ)

[۲] اے پارمن کا (جرمن) جغرافیہ۔ ڈگرشا ۱۸۹۶ء جلد ۴۲۔ ص ۲۴۳

[۳] دیکھو دی باتی کی طاعات عن الیمن ...، ص ۱۳۶

سمح بھی صحرا کی پیداوار ہے۔ اس کے آٹے سے دلیا بناتے ہیں۔ ترفاس (یعنی کھمبی یا کلاہ باراں) اور سنا کی لوگوں کو بڑی تلاش رہتی ہے۔ یہ بھی صحرا کی پیداوار ہیں ‫؛ باغی درختوں میں انگور چوتھی صدی عیسوی کے بعد شام سے لایا گیا اور طائف میں خوب ہوتا ہے۔ اس سے "نبیذ الزبیب" بناتے ہیں جس میں الکحل ہوتی ہے۔ لیکن شعرائے عرب کی خمر یا شراب انگوری حوران و لبنان سے لائی جاتی تھی۔ شام کا خاص درخت زیتون حجاز میں بالکل نہیں ہوتا۔ عربی نخلستانوں کے دوسرے پھل، انار، سیب، خوبانی، آلوچہ، سنترا، لیمو، نے شکر، خربزہ، اور کیلا ہیں۔ ایسے پھلوں کو غالباً نبطی اور یہودی شمال سے لانے کا سبب ہوئے ‫؛

کھجور

عرب کے درختوں کی سلطانہ کھجور ہے۔ اسی کا پھل اصلی پھل (تمر) ہے جو نہایت کثرت سے ہوتا اور سب سے مرغوب ہے۔ بدو کے دسترخوان کی رونق دو ہی چیزیں ہیں: دودھ اور کھجور۔ غذائیت میں بھی اونٹ کے گوشت کے علاوہ کھجور ہی اس کا پیٹ بھرتی ہے[۵۱]۔ اسی کے خمیر سے من بھاتی نبیذ بناتے ہیں۔ گٹھلیاں پیس کر ٹکیاں تیار کرتے ہیں جو اونٹ کی روزانہ کی خوراک ہے۔ "دو کالیاں" (= الاسودان) یعنی پانی اور کھجور کا ہاتھ آنا ہر بدو کی عین آرزو ہے۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا یہ ارشاد مروی ہے[۵۲] کہ اپنی پھپھی کھجور کی

---

۵۱ دیکھو ابن قتیبہ: عیون الاخبار۔ ج ۳ ص ۲۰۹

۵۲ سیوطی کی حسن المحاضرہ (قاہرہ ۱۳۲۱ھ) ج ۲۔ ص ۲۵۵

حرمت کردہ وہ اسی مٹی سے بنائی گئی ہے جس سے آدم بنا ؛ عرب مصنفوں نے مدینہ (طیبہ) اور اس کے آس پاس کی کوہی سو قسمیں (کھجور کی) 20 تحریر کی ہیں ؛ مگر یہ ملکۂ اشجار بھی شمال یعنی عراق عرب ہی سے یہاں لائی گئی ہوگی۔ کیوں کہ زمانۂ قدیم کے انسان کو عراق میں کھینچ لانے کا بڑا سبب وہاں کی کھجوریں تھیں ؛ نجد و حجاز میں زراعت سے متعلق ایسے الفاظ، جیسے "بعل" (بہ معنی باراتی)[ل] "اکار" یعنی ہل والا، وغیرہ شمال کے سامیوں خصوصاً ارامیوں سے مستعار لئے جانے کا پتہ دیتے ہیں ؛

حیوانات

عرب کے حیوانات تیندوا (نمیر) چیتا (فہد) چرخ، بھیڑیا، لومڑی، گوہ (خاص کر ضب) ہیں۔ شیر ببر کا قدیم شاعر اکثر حوالہ دیتے ہیں، وہ اب نابود ہوگیا ہے۔ یمن میں بندر پائے جاتے ہیں۔ شکاری پرندے عقاب، شاہین، شکرا، اُلّو، ہیں۔ کوّوں کی بڑی کثرت ہے۔ عام پرندے ہدہد، بلبل، چنڈول، کبوتر، تیغ دار (= حبار) اور ایک قسم کا تیتر جو عربی ادب میں قطا کے نام سے مشہور ہے ؛ اہلی جانوروں میں اونٹ، گدھا، رکھوالی کے معمولی اور تازی (= سلوقی) کتے، بلی، بھیڑ بکری زیادہ پائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں خچر ہجرت کے بعد رسول اللہ (صلعم) نے مصر سے منگوایا۔ آپ گھوڑے کی نسبت اس کی سواری کو ترجیح دیتے تھے ؛

صحرا میں ٹڈیاں ہوتی ہیں اور بدو کی دل پسند غذا ہیں خصوصاً

ل دیکھو آیندہ باب ہفتم۔ عنوان "قدیم بدوؤں کی بت پرستی"

جب کہ نمک لگا کے بھون لی جائیں۔ مشہور ہے کہ ہر ساتویں برس ان کا دل نمودار ہوتا ہے؛ کیڑوں میں، جملہ مشاہدین کے بیان کے مطابق، نفود کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہاں شاخ دار افعی ہوتا ہے۔ اور وادیٔ سرحان کے سانپوں سے لارنس کو سابقہ پڑا تھا جسے کمال خوف سے اپنی کتاب (سیون پلرز .... ص ۲۶۹) میں تحریر کرتا ہے؛

عربی گھوڑا

اسلامی ادبیات میں عربی گھوڑے کی شہرت محتاج بیان نہیں۔ اس کے لیے نجد شہرۂ آفاق ہے۔ بایں ہمہ عرب میں وہ بہت عرصے کے بعد لایا گیا۔ قدیم سامیوں کو اس کا علم نہ تھا۔ ازمنہ ماضیہ میں بحر خزر کے مشرق میں کہیں یہ جانور ہلایا گیا۔ یہ خانہ بدوش انڈو یورپی گلہ بانوں کا کام تھا۔ بعد میں اسے کسّی اور حطّی قومیں کثیر تعداد میں لائیں اور دوسری ہزاری قبل مسیح میں، انہی کی وساطت سے وہ مغربی ایشیا میں پہنچا۔ مسیحی سمت کے آغاز سے کچھ پہلے وہ شام سے عرب آیا، جہاں خون کو خالص اور آمیزش سے بری رکھنے کا اُسے بہترین موقع حاصل تھا۔ ہی کسوس (حملہ آور) اُسے شام سے مصر لے گئے اور قوم لدّ (= لی ڈیہ والے) ایشیائے کوچک سے یونان میں لائے جہاں فی دیاس (بُت
21 تراش) نے اس کی لافانی تمثال بارتھنوں میں تیار کی۔ سابقہ مصری، اشوری اور ایرانی کتبوں میں عربوں کا ذکر شتر سوار کی حیثیت سے آیا ہے نہ کہ شہسوار کے طور پر۔ اشوری فاتحین نے "آربی"[1] (قوم) سے جو

[1] دیکھو آیندہ باب چہارم۔ زیر عنوان: بابلی اور ایرانی تعلقات۔

خراج وصول کیا اس میں گھوڑوں کی بجائے زیادہ تر اونٹوں کا نام آتا ہے۔ زرک سینز (ایرانی ، زرِیر) کی فوج میں جو یونان فتح کرنے چلی، عرب شتر سوار تھے[1] اس ترابو جغرافیہ نویس رومی سپہ سالار گالوس کا دوست تھا جس نے نسبتاً قریب زمانے یعنی ۲۴ ق م میں ملک عرب پر حملہ کیا اور بظاہر اسی کی سند پر اس ترابو نے لکھا ہے کہ عرب میں گھوڑا نہیں ہوتا[2]

بہر حال، اصیل عرب گھوڑا (= کحیلان) اب اپنے جسمانی حسن، جفاکشی ، فراست اور آقا کی جاں نثاری میں ضرب المثل ہے اور اہل یورپ اچھی نسل کے گھوڑے کے جو اوصاف سوچتے ہیں یہ سب تصورات اسی اسپ تازی نے انہیں دئے ہیں۔ آٹھویں صدی میں عرب اسے اندلس لائے اور وہیں سے وہ ممالکِ فرنگ میں آیا۔ جہاں وہ بربری اور اندلسی نسل کے گھوڑوں میں اپنے مستقل نشان چھوڑ گیا ہے[3] حروب صلیبیہ کے زمانے میں عربی نسل کے میل کی بدولت انگریزی گھوڑوں میں اس کے تازہ خون کا امتزاج ہوا ؛

عرب میں گھوڑا ، عیش و تنعم کی چیز ہے جس کی کھلائی اور خبرگیری مرد صحرا کے لئے ایک پیچیدہ مسئلہ بن جاتی ہے۔ گھوڑے کی ملکیت دولت مندی کا نشان ہے۔ اس کی اصلی قدر و قیمت تیز پائی کی وجہ سے ہے جس پر بدو کے چھاپے (= غزو) کی کامیابی منحصر ہوتی ہے۔

---

[1] ہیرودوتس - تاریخ - ج ۷ - باب ۸۶ -

[2] جغرافیہ (اس ترابو) جز ۱۶ - باب چہارم -

[3] ولیم آر براؤن : "دی ہارس آف دی ڈیزرٹ" (نیویارک ۱۹۳۶ء) صفحہ ۱۲۳

مردانہ کھیلوں میں جو جرید کہلاتے ہیں اور شکار اور گھڑ دوڑ میں بھی کام لیتے ہیں۔ عرب کی خیمہ گاہ میں پانی کم ہوجائے تو ابھی تک یہی معمول ہے کہ خواہ اس کے بچے روتے ہوں، مالک پروا نہ کرے گا اور آخری جرعہ تک گھوڑے کی کنڈالی میں اُلٹ دے گا۔

اونٹ

اگر گھوڑا انسان کی سب سے امیرانہ فتح ہے تو کچھ شک نہیں کہ اونٹ ایک صحرانورد کی نظر میں سب سے مفید جانور ہے۔ وہ نہ ہو تو صحرا میں رہنے کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ وہ بدو کا پیٹ بھرتا ہے اور بار برداری اور مبادلۂ اجناس کا ذریعہ ہے۔ دلہن کا جہیز، خوں بہا یا دیت، قمار باز کی کمائی اور شیخ کی حیثیت، غرض ہر چیز اونٹوں کی تعداد سے تخمین کی جاتی ہے۔ وہ بدو کا دائمی رفیق، بلکہ ہم زاد اور دایہ ہے۔ بدو، پانی کو مویشی کے لیے بچاتا اور خود اسی کا دودھ پانی کی بجائے پیتا ہے۔ اسی کے گوشت سے ضیافتیں کھلاتا ہے۔ اسی کی کھال سے بدن ڈھانکتا اور بالوں سے خیمے بُنتا ہے۔ مینگنی ایندھن کا کام دیتی اور پیشاب، دوا یا بال بڑھانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بدو کے حق میں وہ "جہاز صحرا" سے بڑھ کر خدا کی خاص نعمت ہے[۵۱] اس پرتگر کے دل کش الفاظ میں،
22 "بدو، اونٹ کا طفیلی ہے"[۵۲] آج کل بدو اپنے لیے 'اہل البعیر' (یعنی اونٹ والی قوم) کا کلمہ سن کر خوش ہوتے ہیں۔ موزل کا بیان ہے کہ قبیلۂ

---

۵۱ دیکھو قرآن مجید۔ سورہ ۱۶ (النحل) آیہ ۵ تا ۸۔ دیگر آیات کریمہ میں صرف اونٹ نہیں بلکہ دوسرے مویشی بھی مذکور ہیں۔ مترجم)

۵۲ "زیٹ شرفٹ ...... گے زل شافٹ" (مطبوعہ ۱۹۰۱ء) میں۔ باب ۵۵۔ ص ۳۴۱ وغیرہ۔

زوال کا شاید ہی کوئی فرد ہوگا جس نے کبھی نہ کبھی اونٹ کے پیٹ سے پانی نکال کر نہ پیا ہو[1]- یہ پانی اگر ایک دو دن کا پیا ہوا ہو تو آدمی خاصی طرح اسے پی سکتا ہے + عرب کی معاشیات میں اونٹ نے جو حصہ لیا، اُس کا یوں بھی اندازہ کیجیے کہ عربی زبان میں اُس کی مختلف اقسام اور سن وسال کے لحاظ سے کوئی ایک ہزار نام بتائے جاتے ہیں، اور کوئی چیز سوائے تلوار کے مترادفات کے اس تعداد کا مقابلہ نہیں کرسکتی - عرب کا اونٹ جاڑوں میں کم وبیش پچیس اور گرمیوں میں پانچ دن بغیر پانی کے چل سکتا ہے۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کو سہل بنانے میں اونٹ بھی ایک معاون تھا جس نے شہری لوگوں کی نسبت حملہ آوروں کو سرعت حرکت لہٰذا چیرہ دستی میں فوقیت دلوائی - حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا جاتا ہے کہ جہاں اونٹ آسودہ رہے گا، وہیں عرب آسودہ رہ سکتا ہے" جزیرہ نمائے عرب ابھی تک دنیا میں اونٹ کی افزائش نسل کا سب سے بڑا مرکز ہے۔ نجد کے گھوڑے، الحسا کے گدھے اور عمان کی سانڈنیاں آفاق میں مشہور ہیں۔ زمانۂ گذشتہ میں عمان اور خلیج فارس کے مرواریدبرآری کے خطے، خاص خاص علاقوں کی نمک کی کانیں اور اونٹ کی پرورش اور تجارت ہی آمدنی کے خاص وسیلے تھے۔ البتہ ۱۹۳۳ء سے چشموں سے تیل نکالا جانے لگا تو اس صنعت کے سلسلے

---

[1] "دی ٹامے ٹرز اینڈ کس ٹمز اوف دی ورلڈ ٹو ڈے" (نیویارک ۱۹۲۸ء) ص ۳۶۵ نیز دیکھو برٹرام ٹامس کی کتاب "دی نیئر ایسٹ - اینڈ انڈیا" ص ۱۱۵

میں بہت کام ہونے لگے اور وہ سب سے بڑا ذریعۂ معاش بن گئی - الحسا کے روغن خیز قطعات کا دنیا کے سب سے سیر حاصل چشموں میں شمار ہوتا ہے ؛

گھوڑے کی طرح اونٹ بھی اصلاً امریکی جانور ہے - گیارہویں صدی قبل مسیح میں اہل مدین کے حملے کے وقت شمال مغربی عرب سے فلسطین و شام میں لایا گیا (توراۃ - قضاۃ - ۶ - ۵) کتابی تحریر میں یہی اس کا سب سے پہلا مذکور معلوم ہوتا ہے - مصر میں اونٹ کا تعارف ساتویں صدی قام میں اشوریوں کی فتح کے ساتھ اور شمالی افریقہ (کے دوسرے ممالک) میں مسیح ؑ سے سات صدی بعد مسلمانوں کے حملے کے وقت ہوا ؛

باب سوم
بدوی زندگی

23 جس طرح سرزمین عرب کی دو نوعیتیں ہیں اسی طرح یہاں کی آبادی دو قسم کی ہے: خانہ بدوش بدو اور مستقل بسنے والے۔ ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کبھی کبھی دشوار ہو جاتا ہے کیوں کہ بعض لوگ نیم خانہ بدوشی کی حالت میں ہیں اور بعض فقط نام کے شہری ہیں۔ پھر ان میں بھی مختلف مدارج ہیں۔ وہ شہری جو ایک زمانے میں بدو تھے، ان کی بدویت ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اور اُدھر ایسے بھی بدو ملتے ہیں۔ جو مستقل سکونت اختیار کرنے کی حالت میں ہیں ؛ اس طرح شہری آبادی میں تازہ صحرائی خون کی آمیزش کا سلسلہ برابر جاری ہے ؛ مگر عرب کے بدو اُن بے گھرے لوگوں میں نہیں ہیں جو محض گھومنے کی خاطر پڑے پھرتے ہیں۔ حقیقت میں وہ بہترین مثال ہیں اس بات کی کہ آدمی، صحرای زندگی کس طرح بسر کر سکتا ہے۔ جہاں کہیں ہریاول ملتی ہے وہ چراگاہ کی تلاش میں وہاں پہنچ جاتے ہیں نفود کے علاقے میں خانہ بدوشی بھی ایسا ہی باقاعدہ فن ہے جیسے ڈٹ روانٹ (امریکہ) یا مانچسٹر میں صنعت کاری!

شہری اور صحرای افراد کے درمیان کشاکش کی وجہ اپنی اغراض اور بقا کے ناگزیر محرکات ہیں۔ صحرای، اپنے نسبتہً آسودہ حال ہمسایے سے وہ سامان لینے پر مُصر ہے جو اسے میسّر نہیں اور یہ استحصال یا جبرًا، چھاپے مار کر کیا جاتا ہے یا رضامندی سے مبادلۂ اشیا کے ذریعے۔ وہ بری قزاق ہے یا دلّال، یا دونوں ایک ہی وقت میں۔ صحرا میں جہاں بدو قزاقی کا کھیل کھیلتا ہے بحری قزاقی کی کئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔

بدو کا نمونہ دیکھیے تو آج بھی وہی ہے جو کل تھا اور آیندہ بھی ایسا ہی رہے گا۔ اس کی تربیت کا سانچہ سدا سے یکساں رہا۔ تبدیلی، ترقی، تنوع کے آئین وہ خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ اجنبی خیالات اور عادات کے سیلاب سے وہ مامون رہا اس لیے آج بھی اونٹ بکری کے بالوں کے خیمے میں اسی طرح زندگی گزارتا ہے جس طرح اس کے باپ دادا گزارتے تھے اور انہی چراگاہوں میں، اُسی طرح اپنی بھیڑ بکریاں چراتا ہے۔ اونٹ، بھیڑ، بکری اور کم تر تعداد میں گھوڑوں کی پرورش، شکار کھیلنا، چھاپے مارنا، یہ اس کے خاص پیشے ہیں اور اس کے خیال میں مرد کے قابل پیشے ہی یہ ہیں۔ کھیتی باڑی، ہر قسم کی تجارت اور دستکاری سب گھٹیا، اُس کی شان کے خلاف ہیں۔ جب کبھی وہ اپنے ماحول سے نکل جاتا ہے تب وہ بدو نہیں رہتا۔ ورنہ (شمال میں) کیا کیا سلطنتیں نہیں بگڑیں، اپنے غیر آباد صحرا میں بدو وہی رہا جیسا ہمیشہ سے تھا۔[1]

---

[1] ابن سعود کی معاشی اور عمرانی اصلاحات کا ایک بنیادی عنوان خانہ بدوشوں کو زمین دے کر بسانا ہے۔

وہ اور اونٹ اور کھجور، یہی اُمرائے ثلاثہ ہیں جن کی دشت عرب پر حکم رانی ہی۔ ریت کو شامل کر لیجیے تو انہی چار تماشاگروں پر ہستیٔ صحرا کی رونق کا انحصار ہی۔ یہاں کے باشندوں کے لیے صحرا فقط ان کا مسکن ہی نہیں بلکہ ان کی دیرینہ رسم و روایات کا امین، ان کی نسل و زبان کی طہارت کا محافظ اور بیرونی دنیا کے مقابلے میں ان کا پہلا اور آخری مورچہ ہی۔ پانی کی کم یابی، گرمی کی آتش ناکی، راستوں کا گُم اور رسد رسانی کا دشوار ہونا، کہ عام حالات میں بہت ستاتے ہیں، خطرے کے وقت پکے حلیف بن جاتے ہیں۔ اسی لیے، اگر عرب نے اپنی گردن اجنبی حکومت کے سامنے شاید کبھی نہیں جھکائی تو کیا تعجب کی بات ہی۔

بدو کی ذہنی اور جسمانی ساخت میں بھی اس کے صحرائی مسکن کا تسلسل، یکسانی اور یبوست بعینہ جھلک دکھاتے ہیں۔ عضوی اعتبار سے وہ رگ پٹھے اور استخواں کی گٹھی ہوئی پوٹ ہی۔ اس کے وطن کی خشکی اور بنجرپن، تن بدن سے ظاہر ہوتا ہی۔ کھجوریں، رِلا مُلا آٹا یا بُھنا ہوا غلہ، دودھ یا پانی کے ساتھ، اس کی روزانہ کی خوراک ہی۔ جیسی غذا ویسی ہی اس کی پوشاک قلیل و مختصر ہی: لمبا کرتا (= ثوب) کمر کے پٹکے سے بندھا ہوا۔ ڈھیلی، پھڑپھڑاتے دامنوں کی عبا جسے تصویروں نے مانوس بنا دیا ہی۔ سر پر شالی رومال (= کوفیہ) ایک رسّی یا عقال سے باندھ لیتے ہیں۔ پاجامہ نہیں پہنتے اور پاؤں میں جوتی بھی شاذ و نادر ہوتی ہی۔ لیکن صبر و استقامت بدو کا خاص وصف ہیں۔ انہی کی بدولت وہ ایسی جگہ زندہ رہتا ہی جہاں ہر چیز فنا

ہو جاتی ہے۔ انہی صفات کا دوسرا رُخ جمود کو سمجھیے۔ صبر سے ایک حال میں رہنا خواہ کتنی ہی تکلیف ہو، اُسے پسند ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی تبدیلی کے لیے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ دوسری خصوصیت، "انفرادیت" اس کے مزاج پر اتنی غالب ہے کہ بدو بین الاقوامی قسم کے آدمی کے درجے تک کبھی بلند نہ ہوسکا اور اپنے قبیلے کی حد تک سوچ بچار کرنے کے سوا، انسان کی فلاح عامّہ کے خیال پکانے کی کبھی اسے توفیق نہیں ہوئی۔ قانون یا حکومت کا احترام اور قاعدے ضابطے کی، صحرائی زندگی میں پوجا نہیں کی جاتی۔ ایک بدو دعا کرتا تھا:
اے اللہ رحم کر، مجھ پر اور محمد (صلعم) پر۔ مگر اور کسی پر نہیں![لہ]
25 حضرت اسماعیلؑ کے وقت سے لے کر آج تک بدو ساری دنیا کا اور ساری دنیا بدو کی دشمن چلی آتی ہے۔

"رزّیہ"

غزو (یا رزّیہ) کہ دوسروں کی نگاہ میں رہزنی کی قسم سمجھی جائے گی لیکن صحرائی زندگی کی معاشیات و معاشرت میں قومی آئین کا مرتبہ پاگئی ہے۔ بدو کی گلہ بان قوم کا معاشی نظام ہی اس پر قائم ہے۔ صحرا کے علاقے میں آمادہ بہ جنگ رہنا ایسی خو ہے جسے ذہن کا دائمی عارضہ سمجھنا چاہیے۔ لہذا وہاں کے معدودے چند مردانہ پیشوں میں قزاقی بھی شامل ہے۔ مسیحی قبیلے بھی جیسے بنو تغلب بلا پس و پیش یہ کام کرتے تھے۔ ابتدائی اموی دور کا شاعر قطامی دو بیتوں میں اس زندگی کا اصول بیان کر گیا ہے:۔

لہ ابوداؤد: سُنن (قاہرہ۔ ۱۲۸۰ھ) ج ۱ ص ۵۹

"اغزن من الضباب علی حلول   وضبة اند من حان حانا
واحیانا علی بکر اخینا   اذا مالم نجد الا اخانا"

(ترجمہ) "ہمارا کام ہی یہ ہو کر چھاپہ ماریں دشمن پر، ہمسائے پر۔
اور اگر کوئی اور نہ ملے تو خود اپنے بھائی پر!"[1]

سعودی عرب میں اب ایسے غزوات خلاف قانون قرار دئے گئے ہیں ؛

غزو ایک قومی کھیل ہو۔ اس کے قاعدوں کے مطابق سخت ضرورت کے سوا، خوں ریزی نہ ہونی چاہیئے۔ تاہم یہ کھانے والوں کی تعداد کچھ نہ کچھ کم کرنے میں ممد ہو اگرچہ اس کے ذریعے خوراک کے جو ذخیرے میسر ہیں ان میں کوئی بیشی نہیں ہوسکتی ۔ کم تعداد قبیلے یا صحرا کے قریب کی بستیاں طاقت ور قبیلے کی حفاظت خرید سکتی ہیں۔ انھیں جو معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہو وہ آج کل خُوّہ کہلاتا ہو ؛ غزو کے یہ اصول اور ان کی اصطلاحات عربوں نے اسلامی فتوحات میں بھی پھیلادی تھیں ؛ بایں ہمہ مہمان نوازی کا آئین غزو کی قباحتوں میں فی الجملہ تخفیف کردیتا ہو۔ دشمنی کے وقت کیسا ہی خوف ناک سہی، دوستی میں اپنے قاعدوں کی حدود کے اندر بدو نہایت سیر چشم اور سچا دوست ہو۔ جاہلیت کے شعرا جنھیں اپنے زمانے کا اخبار نویس سمجھنا چاہیئے، مہمان نوازی مع مروت و حماسۃ (یعنی دلاوری، جوش خروش) کے گیت گانے سے کبھی نہیں تھکتے اور نسل عرب کی اعلیٰ ترین صفت ہی یہ (مہمان نوازی) سمجھی جاتی تھی ۔ پانی اور چراگاہ لینے کی سخت مسابقت

---

[1] ابو تمام، اشعار الحماسہ (بون ۱۸۲۸ء) صفحہ ۱۲۵

لڑائی کی اصلی بنیاد ہے جس نے صحرائی آبادی کو جنگ آزما قبیلوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ لیکن سب کو یہ احساس ضرور ہے کہ فطرت کے شدید اور بے رحم قوانین کے سامنے کسی کا زور نہیں چل سکتا۔ یہی انسان کے بے دست و پا ہونے کا احساس انھیں ایک مقدّس فرض کی اہمیت سکھاتا ہے۔ اور وہ مہمان نوازی ہے۔ ایسے ملک میں جہاں نہ سرائے ہے نہ اقامت خانہ، کسی اجنبی مسافر کو مہمان بنانے سے انکار کرنا، یا مہمان بنانے کے بعد آزار پہنچانا، نہ صرف اخلاق اور شرافت کے مسلّمات کے خلاف، بلکہ خود حافظِ حقیقی، خدا کو ناراض کرنا ہوگا۔

مذہبیت

26 سامی مذہب کے بنیادی اصول ریگستان میں تو کیا نشو و نما پاتے زیادہ تر سرسبز قطعات ہی میں مرتب ہوئے اور پتھر اور چشموں سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں جنھیں توراۃ کے "بیت ال"[1] اور اسلام کے حجر اسود اور زمزم کا پیش رَو سمجھنا چاہیے۔ جہاں تک بدو کا تعلق ہے۔ مذہب اس کے دل میں نہیں اترتا۔ قرآن مجید ان کی نسبت اشد کفرا و نفاقاً، کا فتویٰ دیتا ہے (سورۂ توبہ، ۹)[2] ہمارے زمانے تک وہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر فقط زبانی اعتقاد رکھتے ہیں[3]۔

---

[1] (بیت المقدس کے قریب ایک پہاڑی مقام جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے مقدّس بتایا جاتا ہے بعض فرنگی مصنفوں نے یہ قیاس چلایا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی چٹانوں کی وجہ سے اسے یہ تقدّس حاصل ہوا ہوگا۔ ! مترجم)

[2] مصنف نے سہواً آیت کا نشان ۹۸ لکھا ہے۔ دوسرے قرآن حکیم کا یہ فتویٰ سب "اعراب" کی نسبت نہیں ہے (مترجم)

[3] (مصنف نے اس عمومی قیاس کی سند میں امین ریحانی کی تاریخ نجد (بیروت ۱۹۲۸ء) صفحہ ۲۳۳ کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ وہ عیسائی تاریخ نویس نہ بدوؤں میں کبھی رہا نہ اپنے تعصبات کی بنا پر لائق اعتبار ہے۔ مترجم)

"بدو" "قومیں"

بدوی معاشرت کی بنیاد "قوموں" کی تنظیم پر ہے۔ ہر خیمہ ایک گھر یا خاندان ہوتا ہے۔ خیموں کا یک جائی پڑاؤ "حی" کہلاتا ہے اور اس کے افراد سے "قوم" یا برادری بنتی ہے کئی برادریاں مل کر "قبیلہ" موسوم ہوتی ہیں۔ برادری کے افراد ایک دوسرے کو ہم خاندان سمجھتے اور ایک سردار، یعنی بزرگِ قوم کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔ ان کا نعرۂ جنگ ایک ہوتا ہے برادری کے مشترک نام کا اظہار لفظ "بنو" یا "بنی" سے کیا جاتا ہے۔ بعض برادریوں کے نسائی ناموں سے پتہ چلتا ہے کہ کسی قدیم تر زمانے میں نسل ماں سے چلتی تھی؛ قبیلے کے نظام کو قائم رکھنے میں، فرضی یا اصلی خون کا رشتہ، تقویت پہنچاتا ہے؛ خیمہ اور اس کا موٹا جھوٹا اثاث البیت ذاتی ملکیت ہوتے ہیں لیکن پانی، چراگاہ اور مزروعہ اراضی قبیلے کی مشترکہ میراث سمجھی جاتی ہے؛ برادری کا کوئی فرد اگر برادری والے کو قتل کر دے تو اس کی کوئی حمایت نہیں کرے گا اور وہ بچ کر فرار ہو جائے تو مباح الدم، "طرید" کہلائے گا۔ برادری کے باہر کوئی کسی کو مار ڈالے تو ساری برادری انتقام کی سزا وار قرار پائے گی اور مقتول کے وارث اس برادری کے کسی آدمی کو بھی مار کر بدلہ نکالیں گے؛ صحرائی قانون کی رو سے خون کا بدلہ خون سے ہوتا ہے کوئی دوسری سزا انتقام کے لئے کافی نہیں مانی جاتی۔ سب سے قریبی رشتہ دار پر انتقام کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ انتقامی جنگ چالیس برس تک رہ سکتی ہے جیسے بنو بکر اور بنو تغلب کی جنگِ بسوس میں رہا۔ ظہور اسلام سے پہلے کی قبائلی جنگوں میں تاریخ نویس ندرت دیتے

ہیں کہ بنائے فساد اسی قسم کے انتقامی جذبات تھے اگرچہ اکثر تنازعات کی تہ میں ضرور اقتصادی اسباب کارفرما ہوں گے۔ قبائل میں کبھی کبھی دیت یا خون بہا بھی قبول کر لیا جاتا ہے؛

بدو کے لیے قبیلے سے خارج ہونا، سب سے بڑی مصیبت ہے۔ ایسے ملک میں جہاں اجنبی اور دشمن ہم معنی لفظ ہیں، ایک لاقبیلہ آدمی ایسا ہی بے دست و پا رہ جاتا ہے جیسے جاگیرداری انگلستان میں وہ لوگ تھے جن کی کوئی زمین نہ ہوتی تھی۔ ایسا شخص حفاظت اور سلامتی کی حدود سے باہر، بالکل بے پناہ رہ جاتا ہے کہ جس کا جی چاہے اُسے لوٹ لے یا ہلاک کر دے؛

برادری کی بنیاد تو پیدائشی حق ہے لیکن ایک بیرونی شخص برادری کے کسی فرد کے کھانے پینے میں شریک ہو جائے یا اس کے خون کے چند قطرے چوس لے تو وہ بھی برادری میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ قدیم یونانی مورخ ہرودوتس تبنیت کی اس رسم کا ذکر کرتا ہے[۱]؛ آزاد کئے ہوئے غلام اکثر اپنا فائدہ اس میں دیکھتے کہ سابقہ آقا کے گھرانے سے تعلق قائم رہے لہٰذا اسی ترکیب سے وہ اکثر اُن کے مولیٰ بن جاتے ہیں۔ اگر کوئی اجنبی یہ رشتہ قائم کرے تو اُسے دخیل کہتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی کم تعداد برادری، کسی بڑی برادری یا قبیلے کی حمایت اس تدبیر سے حاصل کرتی اور پوری پوری اسی گروہ میں گھل مل جاتی۔ بنی طے، غطفان، تغلب وغیرہ جن کا تاریخ میں نام نمایاں ہے اور جن کی اولاد ابھی تک عربی ممالک میں موجود ہے، اسی طرح شمالی عرب کی برادریوں کے اشتمال سے بنے تھے؛ اسی کے مماثل ایک مذہبی رسم سے یہ ممکن تھا کہ کوئی

[۱] جلد سوم - باب ۸

اجنبی شخص کسی معبد کی خدمت کے ذریعے وہاں کا مجاور یا مولیٰ مان لیا جائے[۱] مکّے کے حاجیوں کو آج بھی "اللہ کا مہمان" کہتے ہیں اور حرم شریف یا کسی دوسری بڑی مسجد میں رہنے والے طلبہ، (خدا کے) مجاور یعنی ہمسائے کہلاتے ہیں ؛

عصبیت

عرب برادری کی روح "عصبیت" ہے۔ اس کے معنی ہیں اپنی برادری والوں سے غیر مشروط، حد سے زیادہ وفاداری۔ اور مجموعی طور سے یہ آج کل کی پرجوش جارحانہ وطن پرستی کے مماثل ہے۔ ایک قدیم گیت تھا کہ "قبیلے کا ساتھ دے۔ قبیلے کا اپنے افراد پر حق اتنا زیادہ ہے کہ (جائز ہے) اس کی خاطر مرد، بیوی کو چھوڑ دے[۲]"

یہ برادری کی تخصیص کہ اصل میں افراد کے "انا" ہی کی ایک بسیط صورت ہے، بدو کے دماغ میں ایسی رچی ہوتی ہے کہ کسی طرح زائل نہیں ہو سکتی۔ اسی کے مضمرات میں یہ بات ہے کہ برادری یا قبیلہ (جیسی صورت ہو) بجائے خود ایک عالم ہے مکمل اور مکتفی، لہٰذا دوسری ہر برادری یا قبیلہ قتل و غارت گری کا بے تکلف ہدف بنایا جا سکتا ہے ؛ اسلام نے جنگی اغراض کے لئے قبائلی نظام سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اسلامی حکومت فوج کو قبیلے کی بنیاد پر تقسیم کرتی اور مفتوحہ علاقوں میں بھی ایک ہی قبیلے کے لوگ بسا دیتی تھی۔ وہاں کے نومسلم افراد سے انہی

---

[۱] دیکھو حوقل۔ ۲۳۔ ۲۲

[۲] مبرد ۔ الکامل لائپ زگ ۱۸۶۴ء، صفحہ ۲۲۹ (اصل شعر یہ ہے۔

فاحتملا حتی تلک الاذنین اتقہم ۔ حتی یفرق بین الزوج والمرء حزم)

قبائل کے موالی کا سلوک کیا جاتا تھا۔ عصبیت اور انفرادیت کے یہ اوصاف جو ملی وحدت کے مانع تھے، عرب کی سیرت میں کبھی پوری طرح مغلوب نہ ہوئے اور جب اسلام کا عروج ہوا، اور یہ سیرت بھی ترقی 28 کرکے بروئے کار آئی تو بالآخر یہی اوصاف اسلامی حکومتوں کے انتشار و پراگندگی اور انجام کار خاتمے کا ایک فیصلہ کن سبب ثابت ہوئے۔

شیخ

برادری کا نائب، اس کا رسمی سردار شیخ ہوتا ہے۔ امریکی سینما والوں نے اُسے کچھ سے کچھ مشہور کر دیا ہے ورنہ حقیقت میں وہ اپنے قبیلے کا بوڑھا آدمی ہوتا ہے جس کی سرداری، معتدل رائے اور جرأت وفیاضی کی بہ دولت اپنا حکم منواتی ہے۔ سن و سال کی بزرگی اور ذاتی اوصاف ہی کی بنا پر انتخاب ہوتا ہے۔ مگر عدالتی، جنگی یا دوسرے مشترکہ امور میں شیخ مطلق العنان نہیں ہوتا بلکہ برادری میں جتنے گھر ہیں ان سب کے بزرگوں کی پنچائت سے، اُسے مشورہ کرنا لازمی ہے۔ وہ اپنے منصب پر اسی وقت تک فائز رہتا ہے جب تک کہ برادری کے حلقے میں اسے قبولیت حاصل ہو۔ اہل عرب عموماً اور بدو خصوصیت سے پیدائشی جمہوریت پسند ہوتے ہیں۔ وہ شیخ سے مساویانہ بات کرتا ہے۔ اس کی قومی معاشرت ہی ہر امتیاز کو چھیل کر لوگوں میں یکسانی پیدا کرتی رہتی ہے۔ عربوں میں مَلِک (یعنی بادشاہ) کا خطاب کبھی استعمال نہ ہوتا تھا بجز بیرونی حکمرانوں یا رومی اور ایرانی رنگ میں رنگے ہوئے غسان اور الحیرہ کے خاندان والوں کے لیے

البتہ اس قاعدے سے بنی کِندہ کے ملوک مستثنیٰ تھے۔ جمہوریت پسندی کے ساتھ عرب خاندانی امیروں کا سا مزاج رکھتا ہے وہ اپنے تئیں تخلیق انسانی کا کامل ترین نمونہ خیال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک عرب قوم "افخر الامم" یعنی تمام قوموں سے زیادہ شریف ہے۔ عرب کا بدو تک، متمدن آدمی کو اپنے پندار میں بہت گھٹیا اور بدقسمت سمجھتا ہے۔ نسل کی طہارت، فصاحت و شاعری، اپنی تلوار، اپنے گھوڑے اور سب سے بڑھ کر اپنے بزرگ اسلاف یعنی نسب پر اہل عرب کو بے حد ناز ہے۔ انھیں بڑے بڑے شجرے نہایت مرغوب ہیں جن میں وہ اکثر اپنا نسب آدم علیہ السلام تک پہنچا دیتے ہیں۔ واقع میں عربوں کے سوا کسی دوسری قوم نے نسب کو ایک باقاعدہ علم کے درجے تک ترقی نہیں دی۔

بدو عورت کو اسلامی، اور قبل اسلام زمانے میں آزادی کا ایک ایسا درجہ حاصل تھا اور اب تک ہے جو اس کی شہری بہن کو میسر نہیں یہ سچ ہے کہ شوہر کو شادی میں آقای کا رتبہ اور کئی کئی بیویاں کرنے کا حق تھا، بایں ہمہ عورت اپنا شوہر منتخب کرنے میں آزاد تھی اور بدسلوکی کی صورت میں اسے چھوڑ سکتی تھی۔

اہل صحرا کی یہ قابلیت خاصی طرح نمایاں ہے کہ موقع ملے تو وہ دوسری تہذیبوں کو اپنا لیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا نسلاً بعد نسل کی سوئی ہوئی صلاحیتیں کافی تحریک پاتے ہی یک بہ یک بیدار ہو گئیں اور ترقی کر کے حرکت کی زبردست بن گئیں۔ مواقع کا میدان "ہلالِ خصیب" میں ملتا ہے۔ پھر کوئی حمورابی، بابل

29 میں، موسیٰ جزیرہ نمائے سینا میں، زنوبیہ، تدمر (= پامیرا) میں، فیلپ العرب، روما میں اور ہارون الرشید، بغداد میں نمودار ہوجاتا ہے۔ شہر بترا کی طرح عظیم الشان عمارتیں بنائی جاتی ہیں، جنھیں دیکھ کر آج بھی دنیا عش عش کرنے لگتی ہے۔ اسلام کے قرنِ اوّل کا قریب قریب لاثانی اور آناً فاناً عروج بڑی حد تک بدوؤں کی انھی چھپی ہوئی قوتوں کا کرشمہ تھا، جنھوں نے سیدنا عمرؓ کے الفاظ میں "اسلام کا کچا مصالحہ فراہم کیا"[1]

---

[1] ابن سعد: طبقات الکبیر (لاسڈن - ۱۹۰۴) ج ۳ ص ۲۴۶

باب چہارم

قدیم بین الاقوامی تعلقات

جنوبی عرب والے

30

ابھی تک ہم تمام جزیرہ نما کے باشندوں پر، جغرافی تخصیص کے بغیر، لفظ "عرب" بولتے رہے۔ اب ہمیں جنوبی اور شمالی عربوں میں فرق کرنا پڑے گا۔ شمال میں نجد اور وسطی عرب بھی شامل ہے۔ یہ تقسیم ریگستان سے ہوتی ہے جہاں منزل وراہ کا نشان نہیں، اور ملکی تقسیم کی طرح اہلِ ملک بھی دو حصّوں میں بٹ جاتے ہیں؛

شمالی عرب زیادہ تر خانہ بدوش یا "بالوں کے گھر" میں رہنے والے، حجاز ونجد کے لوگ ہیں۔ جنوبی عرب عموماً شہری، یمن، حضرموت اور قریبی سواحل کے متوطن ہیں۔ شمالی عرب والے قرآن کی زبان، عربی مبین بولتے ہیں۔ جنوب میں ایک علاحدہ سامی بولی مروج ہے جسے سبائی یا حمیری کہنا چاہیے کہ حبشہ کی افریقی زبان اس سے قریبی رشتہ رکھتی ہے۔ دونوں قسم کے باشندے بحرِ متوسط کی دراز سر نسل کے افراد ہیں تاہم اہلِ جنوب میں ساحلی "گول سر" کی خاصی آمیزش ہے جن کے چوڑے جبڑے، خمیدہ ناک، چپٹے رخسار

اور بالوں کی کثرت، آرمنی (: حطّی، یہودی) نمونے کی خصوصیات ہیں۔ ممکن ہو یہ غیر عنصر سمندر کے راستے شمال مشرق سے جنوبی عرب میں پہنچا ہو[1] بہر حال پہلے جنوبی عرب کے لوگ ہی شہرت کے میدان میں آئے اور انھوں نے ایک جداگانہ تمدن کو نشوو نما دی۔ شمالی عرب اسلام کے ظہور تک بین الاقوامی امور کی محفل میں نمودار نہیں ہوئے ؏

عربوں کی اس اندرونی تفریق کا ادراک اور اثر اُن کے قدیم نسب ناموں میں جھلکتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنی قوم کو دو گروہوں میں تقسیم کرتے ہیں: (۱) بعیدہ (جو اب مفقود ہو گئیں)۔ ان میں ثمود، عاد (جن کا قرآن مجید میں بار بار ذکر آیا ہے) طسم و جدیس، کو شمار کرتے ہیں۔ (۲) باقیہ، جو موجود ہیں ؏ ثمود تاریخی قوم تھی جس کا سارگن ثانی کے پیکانی
13 کتبات میں نام آیا ہے[2] قدیم یونانی مصنف اسے ثمودای کے نام سے جانتے ہیں[3] قوم عاد کی نسبت قیاس ہے کہ وہ قدیم حضرموت میں پھلی پھولی تھی ؏ پھر نساب، اقوام حاضرہ کو نسلاً دو خاندانوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک عرب العاربہ، دوسرے مستعربہ یعنی عرب بن جانے والے۔ اُن کے قول کے مطابق عاربہ قدیم نسل کے عرب ہیں جن کا وطن یمن اور مورث اعلیٰ قحطان (= توراۃ کا جوکتن یا یقطان) تھا۔ مستعربہ میں حجازی، نجدی، نبطی، تدموری عرب، حضرت اسمٰعیلؑ کی اولاد میں عدنان کی نسل سے ہیں کہ اس ملک میں آکر رس بس گئے۔ اس روایتی قحطان و

---

[1] کارلٹن ایس کون: "دی ریسز آف یورپ" (نیویارک ۱۹۳۹ء) ص ۴۰۳

[2] لکن بل: "اینشنٹ رکارڈز آف اسیریا اینڈ بابی لونیا" (شکاگو ۱۹۲۶ء) ج ۲ ص ۱۱۸

[3] پلنی: "نیچرل ہسٹری" جز ششم، باب ۳۲۔

عدنان میں بھی جنوب و شمال کا فرق جھلکتا ہے۔ اہل مدینہ جنھوں نے (پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ہجرت کے وقت جوش و خروش کے ساتھ مدد کی، اصل میں یمنی تھے اور خود آں حضرتؐ کا گھرانہ قریش یعنی شمالی عرب کی نزاری شاخ سے تھا۔ مشرقی شام کے غسانی اور عراق میں الحیرہ کے لخمی امیر جنوبی عرب تھے جو شمال میں آ بسے۔ عربوں کے ان دو گروہوں میں جو تفریق تھی وہ کبھی دور نہ ہو سکی۔ اسلام نے بہ ظاہر تمام عرب کو متحد کر دیا پھر بھی یہ پشت با پشت کا فرق برابر نمایاں ہو جاتا تھا۔

مصر سے تعلقات

تہذیب کے دو قدیم ترین گوشوں، یعنی مصر و بابل کے درمیان ایک چوڑی میخ کی طرح جزیرہ نمائے عرب آ گھسا ہے۔ ممکن ہے۔ تیسرا تہذیبی مرکز (مغربی) پنجاب (پاکستان[1]) ہو۔ اس صورت میں وہ مغرب و مشرق کے وسط میں ہوا۔ یہ درست ہے کہ وہ ایک دریائی وادی کے تہذیبی حلقے میں نہیں آیا نہ دوآبی تہذیب کے حلقے میں۔ تاہم ان کے اثرات سے بالکل ہی الگ نہ رہ سکتا تھا۔ کچھ نہ کچھ اثر پڑا ہوگا لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی تہذیب کی تہ زمین خالص مقامی تھی۔ وہ بحری قسم سے تعلق رکھتی ہے۔ عجب نہیں اس کے جنوب مشرقی[2] باشندے ہی قدیم ترین تجارت کے تین مرکزی نقطوں، یعنی مصر، عراق، پنجاب[2]، کے مابین توسط کی خدمت انجام دیتے ہوں اور اسی لیے بیچ کے وسیع سمندر

---

[1] (مصنف نے سابقہ نام "ہند" لکھا ہے، ہم نے لفظ بدل دیا۔ اور پنجاب سے یہاں اس کی مراد وادی سندھ ہے۔ مترجم)

[2] یہاں بھی مصنف کی مراد وادی سندھ سے ہے۔ مترجم)

کو اپنے نام سے موسوم کر گئے ہوں ؟

جزیرہ نمائے سینا پر ، براعظم افریقہ نے شمالی عرب کو چھوا ہی۔ یہاں سے ایک بڑی راستہ گزرتا ہی۔ اُدھر جنوب میں بھی یہ براعظم عرب کے قریب، یعنی باب المندب پر صرف پندرہ میل کے فاصلے پر، آجاتا ہی۔ اسی طرح مغربی عرب کے وسط میں آمد رفت کا راستہ وادی حمامات کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہی۔ یہ وادی القصیر پر بحر قلزم کے کنارے پہنچتی اور دریائے نیل کے اس موڑ کے مقابل واقع ہی جہاں وہ تھبز کے قریب سے خم کھا کے نکلا ہی۔ خاص ذریعہ اتصال یہی تیسرا راستہ تھا۔ شاہان مصر کے بارہویں خاندان (تخمیناً ۲۰۰۰ تا ۱۷۸۸ ق م) کے عہد میں بل بیس کے بالائی جانب ایک نہر نیل سے بحر قلزم تک گئی تھی۔ بطلی موسی بادشاہوں نے اسے صاف کرایا پھر اسلامی خلفا کے عہد میں اسے دوبارہ کھولا گیا اور نہر سویز کی یہ پیش رو اس وقت تک کام میں آتی رہی جب تک کہ (یورپ) سے ہندستان کا راس امید کا بحری راستہ دریافت ہوا (۱۴۹۷ء) ۔

سینائی تانبہ

مصریوں کو جزیرہ نمائے سینا سے اس لیے تعلق پیدا ہوا کہ اس کے جنوبی حصے میں جہاں جدید بستی الطور واقع ہی۔ وادی مغارہ میں تانبے اور فیروزے کی کانیں تھیں۔ مصری خاندان ہائے ملوک سے بھی ماقبل زمانے میں سینا کے بدو یہ قیمتی اشیا مصر کو دساور بھیجا کرتے تھے۔ پہلے خاندان کے فراعنہ نے کانوں کو کھدوایا مگر یہ کام تیسرے خاندان کے بادشاہ سنرفو (تخمیناً ۲۷۲۰ ق م) کے عہد میں بڑی سرگرمی سے

شروع ہوا ہو وہ بڑی شاہ راہ جو مصر کو شامی فلسطین سے ملاتی اور وہاں سے



قدیم مصریوں کے قلم کی عربوں کی شبیہیں
(تخمیناً ۲ ہزار تا ۱۵۰۰ ق م کی بنی ہوئی)

ہلال خصیب اور ایشیائے کوچک کے دوسرے اقطاع میں پہنچتی تھی، سب سے پہلی بین الاقوامی شارع تھی جسے بنی آدم نے استعمال کیا۔ اسی کی ایک شاخ سینا کی تانبہ اور فیروزہ کی کانوں تک تیار کی گئی سنہ ۱۹۰۰ء میں سیاح پتری کو مصر کے پہلے خاندان کے شاہی مقبرے میں ہاتھی دانت پر ایک تصویر بنی ہوئی ملی جس پر لفظ "ایشیائی" لکھا تھا۔ یہ سامی نسل کی ارمنی شکل و شباہت رکھتی ہے۔ اس میں ڈاڑھی نکیلی اور لبیں منڈی ہوئی ہیں۔ یہ صریحاً ایک جنوبی عرب کی شبیہ ہے۔ اسی شاہی خاندان کی ایک قدیم تر کھدی ہوئی تصویر میں کوئی سوکھا سا بدو سردار لنگوٹی میں دکھایا ہے کہ اپنے گرفتار کرنے والے مصری کے سامنے گڑگڑا رہا ہے اور وہ لمبے کا ڈنڈا بدو پر تانے ہوئے ہے یہ عربوں کے موجود ہونے کی سب سے پرانی تصویری شہادتیں ہیں۔ بدو کے لئے مصری لفظ "عمو" کے معنی خانہ بدوش، اور ایشیائی کے آتے تھے۔ ان کے قدیم وقائع میں یہ بارہا استعمال ہوا ہے اور بعض موقعوں پر

ملک عرب سے باہر والوں اور مصر کے گرد کے خانہ بدوشوں کے لیے آیا ہی ؎

لوبان

34

جب مصر کے تجارتی تعلقات نوبیہ اور پنت سے (جسے اب سمالیہ کہتے ہیں) قائم ہوئے تو جنوبی عرب گویا قریب تر آگیا۔ ہیرودوتس نے لکھا ہی کہ سِسوس ترس نے خلیج عرب کی قوموں کو مسخر کیا۔ اس کی مراد غالبًا بارھویں خاندان کے بادشاہ سنوسرت اوّل سے ہی جو ولادت مسیحؑ سے ۱۹۸۰ برس قبل تخت نشین ہوا اور ۱۹۳۵ ق م تک حکومت کی۔ مذکورہ بالا فتوحات کا مطلب بھی بحر قلزم کے افریقی سواحل ہی معلوم ہوتے ہیں۔ اس سمندر میں کچھ مدت بعد اٹھارویں خاندانِ شاہی کا ایک جنگی بیڑا رہا کرتا تھا لیکن اس سے بہت پہلے پانچویں خاندان کے شاہ ساہور کو ہم بحر قلزم سے "بخور کے ملک پر" جنگی مہم لے جاتے دیکھتے ہیں جس سے صریحًا ملک سمالی مراد ہی۔ جنوبی عرب میں بھی مصریوں کے لئے سب سے بڑی کشش لوبان کی تھی کہ وہ علاقہ اس خوشبو کے درخت سے مالامال تھا اور مصری اپنے مندروں میں اور ممیائی بنانے کے لیے لوبان کی نہایت خواہش و قدر کرتے تھے۔ نوبیہ فتح ہوا اور پنت (سمالیہ) مصری سلطنت کے تجارتی حلقے میں آگیا تو "مر، خوش بودار گوند، لکڑی اور رال" حاصل کرنے کی غرض سے کئی بار ان اطراف میں فوج کشی کی گئی۔ انھی میں سے ایک مہم ملکہ ہت شِپ ست (تخمینًا ۱۵۰۰ ق م) لے گئی تھی جو تاریخ کی پہلی نامور عورت ہے۔ اس کا جانشین تت موس ثالث مصر کا

مشہور فاتح بادشاہ گزرا ہے (۱۴۹۶ ق م) اس کے قاصد بھی اسی ملک سے "ہاتھی دانت، آبنوس، چیتے کی کھالیں اور غلام" جہازوں میں بھر کر لائے جیسا کہ معمول تھا۔ یہ اشیا یمن میں بھی ہوتی ہیں لہذا ممکن ہے کہ مصری پنت سے باب المندب کے دونوں کناروں کا علاقہ مراد لیتے ہوں۔ شاید سونا بھی عرب سے آتا تھا۔ مگر بخور کی تجارت کا راستہ جنوبی عرب سے وادی حمامات ہی سے گزرتا تھا اور یہ وسطی شاہ راہ اسے (مصر سے) ملانے کی اہم کڑی بن گئی تھی۔

36 حضرموت[1] میں اُن دنوں مہرہ اور الشہر[2] کے ساحل بھی شامل تھے، لہذا لوبان کا سب[3] سے مشہور علاقہ وہی تھا۔ اس کی سب سے بڑی منڈی ظفار میں تھی جو اُن دنوں شہر اور اب ساحل کا ضلع ہے۔ اسے آج کل ذفر کہنے لگے ہیں اور وہ رسماً سلطان عُمان کے تابع ہے۔ اس مقام کو یمن کے کے ظفار سے خلط ملط نہ کرنا چاہیئے جو حمیری پایۂ تخت اور اندرون ملک میں واقع تھا بحالے کہ یہ حضرموت کا ظفار جنوبی ساحل پر لوبان کے علاقے کا تجارتی مرکز تھا۔ لوبان کا درخت ابھی تک عرب کے ان جنوبی اقطاع میں ہوتا ہے اور عہد قدیم کی مثل اس کی تجارت کا مرکز بھی ظفار ہے۔

---

[1] توراۃ کی کتاب آفرینش میں یہ نام "حصرماوت" (صاد اور بیچ میں الف کے ساتھ) آیا ہے - ۱۰ - ۲۶۔

[2] ایک مدت بعد سے زمانہ حاضرہ تک الشہر تمام لوبانی ساحل کے لیے استعمال ہونے لگا جس میں مہرہ اور ظفار بھی داخل ہیں۔

[3] دیکھو یاقوت، ج ۳ ص ۵۷۷ و ۵۷۸

عرب سے صرف قدیم مصریوں کے تجارتی مفاد وابستہ نہ تھے بلکہ مصالحہ اور معادن میں اُن کے سب سے نمایاں حریف بابل والے تھے؛

۲- سمیری اور بابلی قوم سے تعلقات

مشرقی عرب، عراق کے کنارے پر ہی۔ وہاں کے قدیم باشندے سُمیری اور اکادی تھے۔ وہ قبلِ مسیح چوتھی ہزاری ہی میں اپنے "مغرب زمین" (= اَمَرو) کے ہمسایوں سے خوب واقف اور خشکی اور تری دونوں سے وہاں آمدرفت رکھنے لگے تھے۔ سُمیریوں کو تانبے کی رسد غالباً عمان ہی سے پہنچتی تھی اور یہ پہلی دھات ہی جس سے آدمی نے صنعتی کام لینا سیکھا؛

سامی تاریخ میں پہلا بزرگ نام سارگن کا آتا ہی۔ اسی بادشاہ کا جانشین پوتا نرام سین (تخمیناً ۲۳۰۰ ق م) تھا۔ اس کے ایک خمیدہ مجسمے پر ہم یہ کتابہ پڑھتے ہیں کہ اس نے مَگن کو فتح اور وہاں کے رئیس مَن یوم کو شکست دی[۱]۔ ایک سُمیری مقتدا مسمّی گُدیا کوئی پچاس برس پیش تر کی مہم (تخمیناً ۲۳۵۰ ق م) کا قصّہ سُناتا ہی جو اپنے مندر واقع لگش کے لیے مَگن اور مَلخا سے عمارتی پتھر اور چوبینہ لانے کے لئے وہ لے کر گیا۔ قرائن سے ثابت ہوتا ہی کہ یہ دونوں مقام، مشرقی اور وسطی عرب کے خطے تھے لیکن ایک عرصے بعد اشوریوں کے عہد میں سینا اور مشرقی افریقہ کے بعید قطعات پر اُن کا اطلاق ہونے لگا۔ یہ قیاس از روئے لغت درست نہیں کہ مَگن یا مَگان عربی کا موجودہ مَعان ہوگا جو کل

[۱] دیکھو فرانسوا تورو دین گان کی کتاب سمیری اور اکادی کتبات پر (پیرس، ۱۹۰۵) ۲۷۶

شرق اردن کے علاقے میں واقع ہے۔ یہ زمانہ ماضی میں حجازیوں کا شمالی نخلستان تھا اور ممکن ہے کہ معینی قوم کی کاروانی شارع پر قدیم نوآبادی ہو۔ بہر حال، ان بیکانی کتبات میں ہمیں عرب اور عربی قوم کا سب سے پہلا تاریخی حوالہ ملتا ہے۔ کتبات میں "ارضِ بحر" کا ذکر آتا ہے۔ یہ بھی
ایک نظریے کے مطابق عرب کا علاقہ ہے جس میں خلیج فارس کا مغربی 37
ساحل، ال بحرین تک، اور ممکن ہے کہ نفود کا خطہ مغرب میں ال عقبہ تک شامل ہو۔ (بحرین کا قدیم نام دِل مُن تھا)۔ اس ارض بحر کا بادشاہ نبوپلاصر بتایا گیا ہے جو آگے چل کر بابل کا فرماں روا ہوا۔

۳- اشوریوں کا نفوذ

مگر اہلِ عرب کا یقینی تذکرہ سب سے پہلے صحیح معنی میں اشوری بادشاہ شل منے سر ثالث کے ایک کتابے میں آتا ہے کہ جب وہ دمشق کے ارامی بادشاہ پر حملہ آور ہوا تو اس کے حلیفوں میں ایک عرب شیخ جندب بھی تھا۔ یہ جنگ ۸۵۳ ق م میں حماہ کے شمال جانب قرقر کے مقام پر ہوئی۔ شل منے سر کے الفاظ یہ ہیں:-

"اس کے شاہی شہر کرکر کو میں نے غارت کیا، پامال کر ڈالا،
آگ سے جلا دیا۔ ۱۲۰۰ جنگی رتھیں، ۱۲۰۰ سوار، ۲۰ ہزار
سپاہی ہدد ازر کے، ارم (= دمشق ؟) کے ......
ایک ہزار اونٹ گن دبو عربی کے[1]"

تحریری تاریخ میں سب سے پہلے عرب کا نام اونٹ کے ساتھ آنا بھی

---

[1] ہٹی: ج ۱ ص ۶۱۱۔

نہایت موزونیت رکھتا ہے؛

دوسری اشوری سلطنت کی بنا تگ لث پل سر ثالث (۷۴۵ تا ۷۲۷ ق م) نے رکھی۔ اُسے بڑی فکر تھی کہ سلطنت کے پھیلے ہوئے ممالک سے جو تجارتی راستے گزرتے اور بحر متوسط پر جا ملتے تھے، اُن کی خاطرخواہ حفاظت کی جائے۔ چناں چہ شام اور اس کے توابع پر کئی بار لشکر آرائی کی۔ عہد حکومت کے تیسرے سال "آربی" مُلک کی ملکہ زبیبی سے خراج وصول کیا۔ پھر نویں سال جلوس میں ایک اور "سمسی" (شمس یا شمسیہ) نام کی ملکہ کو مغلوب کیا۔ اس کے وقائع میں لکھا ہے کہ (۷۲۸ ق م میں) مسئی قبیلے اور تیمے کے شہر (= تیماء) اور شبئی (سبائی قوم) نے اُسے خراج میں سونا، اونٹ اور مصالحے پیش کئے۔ یہ قبیلے صحرائے سینا اور اس کے شمال مشرق کے صحرا میں رہتے تھے[۵۱]۔ غرض تگ لث پل سر ثالث نے سب سے اول عرب کی گردن پر حکومت کا جُوا رکھا تھا؛

شاہ سارگن ثانی (۷۲۲ تا ۷۰۵ ق م) فاتح کرکمیش و سامریہ اطلاع دیتا ہے کہ اپنے عہد حکومت کے ساتویں سال اس نے من جملہ دوسرے قبائل کے تمود (قرآن مجید کے ثمود) اور اِبادید کو مطیع بنایا جو صحرا میں رہتے ہیں اور اونچے نیچے کسی عہدے دار کو نہیں جانتے۔ انھیں شکست دی اور بقیۃ السیف کو سامریہ میں جلاوطن کیا[۵۲]۔ اسی کے ساتھ اسے ملکۂ عرب سمسی، سبائی امیر رات عمرا (= یث عی امرا)

---

۵۱ تاثیل سن: ہانڈ بخ - ج ۱ ص ۶۵۔

۵۲ لکن بل: ج ۲ ص ۱۷

اور مصر و صحرا کے دوسرے ملوک سے "سونا، پہاڑوں کی پیداوار، جواہرات، گوگل[۱] (؟) کا بیج، طرح طرح کی جڑی بوٹیاں، گھوڑے اور اونٹ خراج میں" وصول ہوئے[۲]۔ یہ سبائی امیر مزود اُنہی یث عی امرا نام کے ملوک میں سے کوئی ہوگا جن کو جنوبی عرب کے کتبوں میں "مکرب" کے شاہی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ علیٰ ہذا اس کے جانشین کریبی اِلو کو جس سے سناخریب بادشاہ خراج لینے کا دعویٰ کرتا ہے، کتبات کا "کریباِلو" شناخت کرتے ہیں[۳]۔ اگر یہ بات درست ہے، تو اشوری بادشاہوں نے جس خراج کا دعویٰ کیا ہے، وہ جنوبی عرب کے بادشاہوں کے محض تحائف ہوں گے جو اپنی خوشی سے بھیجے گئے جیسے برابر والوں کو بھیجے جاتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ شمالی عرب کے وحشی بدوؤں کے خلاف وہ حلیف کی حیثیت سے جنگ میں حصہ دار ہوں ؛

۶۸۸ ق م کے قریب سناخریب نے "عرب کے قلعے اُدموؔ" کو فتح کیا اور وہاں کے بُت اور ملکہ کو جو مذہبی پیشوا (یا کاہنہ) بھی تھی پکڑ کر لے گیا۔ یہ اُدمُو شمالی عرب کا وہی نخلستان ہے جس کا اسلامی فتوحات میں "دومۃ الجندل" کے نام سے ذکر آتا ہے۔ ملکہ کا نام تل خنو (یا تعل خنو) تھا۔ وہ اشوری بادشاہی کے خلاف بابل کے باغیوں سے مل گئی تھی اور قیدار قبیلے کا رئیس حزائل اسے مدد دیتا تھا جس کا مستقر علاقہ، تدمر میں بتایا گیا ہے ؛ حزائل کے جانشین فرزند اوے یتع نے

---

[۱] انگریزی "میپل" جس کی بہت سی قسمیں پھولوں اور مضبوط ہلکی لکڑی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ جاپان اور شمالی امریکہ میں کثرت سے ہوتا ہے ؛

[۲] لکن بل۔ ج ۲ ص ۱۴۱

[۳] ہائیل مین۔ ج ۱ ص ۷۵

سنہ ۶۷۶ ق م کے قریب سرکشی کی۔ شاہ اسارحدون نے اسے فرو کیا۔ "باغی امیر لشکر گاہ چھوڑ کر بھاگا اور بعید ملکوں میں بھاگ کر جان بچائی[۵۱]"۔ صاف معلوم ہوتا ہی کہ عرب بدو اشوری سلطنت کے لیے بغلی گھونسا بن گئے تھے اور مصر و بابل دونوں انھیں سرکشی پر اُبھارتے رہتے تھے۔ سنہ ۶۷۰ ق م میں اشوری بادشاہ نے مصر پر اپنی مشہور یلغار کی تو شمالی عرب کے صحرا میں ناقہ کشی کی وہ مصیبت اُٹھائی کہ سارے جلال و جبروت کے باوجود حواس بگڑ گئے اور اسے دوسر کے سانپ اور اسی قسم کے خوف ناک حشرات الارض نظر آے جو اپنے "پر پھڑپھڑاتے تھے[۵۲]"۔ ہرودوتس مورخ بھی ہمیں یقین دلاتا ہی کہ "افعی دنیا کے ہر حصّے میں پائے جاتے ہیں لیکن پردار سانپ اور کہیں نہیں ہوتے سواے عرب کے جہاں وہ جھلڑ کی شکل میں جمع ہو جاتے ہیں[۵۳]"۔

شاہ اشوربنی پال (۶۶۸ تا ۶۲۶ ق م) نے عربی قبائل پر نویں 39
حملے میں اوے تیع اور اس کی فوج کو سخت کشمکش کے بعد گرفتار کرلیا ہو

اشوریہ کے وقائع میں عرب رئیسوں کا اور جگہ بھی تذکرہ آتا ہی کہ وہ شاہانِ نینوا کی "قدم بوسی کر رہے ہیں" اور منجملہ دوسرے تحائف کے سونا، جواہرات، چشم و ابرو کا رنگ (کحل یا سرمہ) لوبان، اونٹ اور گدھے پیش کرتے ہیں۔ سارگن ثانی سے اشوربنی پال تک چار اشوری بادشاہوں کی نسبت ہم پڑھتے ہیں کہ ایک دو دفعہ نہیں پورے نو بار

---

[۵۱] لکن بل: ج ۲ ص ۹۴۶

[۵۲] ایضاً ص ۵۵۸

[۵۳] جزو سوم۔ باب ۱۰۹

باقاعدہ فوجی مہم لے گئے کہ بہادر، اطاعت ناپذیر بدوؤں کو اچھی طرح سزا دیں کیوں کہ وہ اشوریہ کے شامی مقبوضات میں برابر دست درازی کرتے، قافلوں کے راستے روکتے اور اشوریہ کے دشمن مصریوں اور بابلیوں سے امداد اور شاباشی لیتے رہتے تھے۔ ان مہمات میں "اُربی" سے زیادہ تر بدو ہی مُراد ہونے چاہئیں اور ان کے مُلک "اربی" سے یقیناً صحرائے شام و عراق، جزیرہ نمائے سینا اور شمالی عرب کا مطلب لینا چاہیے۔ سینا میں وہ لوگ جنھیں توراۃ میں مدین والے کہا گیا ہے، اشوریوں کے زیرنگیں آگئے تھے مگر نبطی ان میں شامل نہیں اسی طرح جنوب مغربی عرب کے اصلی سبائی کبھی اشوریہ سے مفتوح نہیں ہوئے اہل اشوریہ کو بجا طور پر دَورِ قدیم کا رُومی کہا گیا ہے لیکن یہ زبردست قوم شمالی عرب کے چند قبائل اور نخلستانوں کے سوا برائے نام بھی عربوں کو قابو میں نہیں لاسکی۔

۴۔ جدید بابل و ایران۔ تیماء

اس دور کی شمالی آبادیوں میں تے ماء نے خاص امتیاز حاصل کیا۔ (اشور و بابل کی تحریروں میں اسے تِما اور تے ماآ لکھا ہے) یہ آخری کلدانی بادشاہ نبونی دوس (۵۵۶ تا ۵۳۹ ق م) کا صوبائی مستقر تھا۔ کلدانی اشوری سلطنت کے وارث ہوگئے تھے۔ تگ لث پل سر ثالث کے زمانے سے شام اور شمالی عرب کے ایک حصّے پر اشوریوں کا قبضہ تھا۔ اسی سے کوئی دو سو برس بعد ایک بیکاتی کتابے کے لفظوں میں نبونی دوس نے "تِما کے امیر کو ہلاک کیا" اور اس سرسبز قطعے پر قابض

ہو گیا۔[1] پیکانی تحریروں میں تیما کا سب سے اہم ذکر وہاں آیا ہے جہاں ایرانیوں کے ہاتھوں بابل کے خاتمے (۵۳۹ ق م) کے واقعات لکھے ہیں۔ چنانچہ تحریر ہے کہ نبونی دوس اپنے عہد کے ساتویں اور نویں سے بارہویں سال تک "ال تیما" میں تھا جب کہ اس کا بیٹا (= بل شزر) اور سپاہی بابل میں تھے۔

ایرانی سلطنت کے بانی کا جانشین اس کا بیٹا کیم بی سس[2] مصر فتح کرنے چلا تو شمالی عرب سے گزرا اور وہاں کے لوگوں سے اتحاد کا معاہدہ
۴۵ کیا۔ اور داریوش کے حال میں ہرودوتس نے لکھا ہے کہ اہل عرب کو ایرانی کبھی اپنا مطیع نہیں بنا سکے۔[3]

تے ماء کا وہ پتھر جو ہیوبر نے (۱۸۸۳ء میں) خریدا اور اب لوار (پیرس) میں محفوظ ہے، سب سے بیش قیمت سامی کتبات میں سے جو اب تک مل سکے، ایک کتابے کا حامل ہے۔ اس کی قدامت پانچویں صدی ق م تک پہنچتی ہے۔ یہ ارامی زبان میں ہمیں خبر دیتا ہے کہ کس طرح ایک مہنت، ہجم کے صلم دیوتا کو تے ماء میں لایا اور نئے دیول کے لئے وقف کرنے کے ساتھ موروثی پجاری بھی نامزد کیا۔[4] دیوتا کی شبیہ اشوری طرز کی بنی ہوئی موجود ہے۔ اس کے نیچے وہ مہنت کھڑا ہے جس نے ستون کھڑا کیا تھا۔

---

[1] ڈوہارٹی: "نبونی دوس اور بل شزر" (نیو ہے ون ۱۹۲۹ء) ص ۱۰۲

[2] ایرانی تاریخ کا کے کاوس (مترجم)

[3] جز سوم۔ باب ۸۸۔

۵- یہود سے تعلقات

جغرافی لحاظ سے یہودی عرب کے قریبی ہم سائے اور نسلاً اور بھی قریبی رشتہ دار تھے۔ توراۃ میں یہودیوں کی صحرائی اصل نسل کی صدائے بازگشت جابہ جا موجود ہے[1] عبرانی اور عربی جیساکہ پہلے بیان ہوا سامی زبان کی بیٹیاں ہیں۔ توراۃ کے بعض یہودی نام عربی ہیں۔ جیسے عیسو کے سب بیٹوں کے نام۔ (آفرینش۔ ۳۶۔ ۱۰ تا ۱۴ وغیرہ) عبرانی کتاب آفرینش کی پہلی آیت سمجھنے میں جنوبی عربوں کو بہت کم دقت پیش آئے گی[2] جدید تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہودی مذہب کے مبادی، صحرائی آغاز کا پتہ دیتے ہیں؛ ۱۲۲۵ء ق م میں جب بنی اسرائیل مصر سے نکلے تو فلسطین پہنچنے سے قبل کوئی چالیس برس تک سینا اور نفود کے صحرا میں پھرتے رہے۔ سینا ہی کے جنوبی حصے میں مشرقی (یعنی عرب کے رُخ) علاقے میں آسمانی میثاق لیا گیا حضرت موسیٰؑ نے ایک مدین کے پیشوا[3] کی لڑکی سے جو عرب تھی شادی کی۔ یہ مذہبی پیشوا یہودہ کی عبادت کرتا تھا اور اسی نے موسیٰؑ کو نئے دین کی تلقین کی۔ یہو (= یہودہ، جہوداہ) بہ ظاہر مدین یا شمالی عرب کے قبائل کا معبود تھا۔ وہ ایک سیدھا سادہ خشک مزاج صحرائی

---

[1] جیسے ارمیا: ۲-۲ وغیرہ وغیرہ -

[2] دیکھو مارگولیتھ، "دی ریلے شنز بٹ وین ایریز اینڈ اسرائیلائٹس" (لندن ۱۹۲۴ء) ص ۵ وغیرہ - مونٹ گومری: "اریبیا اینڈ دی بائبل" (فلیڈلفیا ۱۹۳۴ء) ص ۱۴۰ نیز ہومیل کی جرمن "ذیبت شرفٹ ....." (مطبوعہ ۱۹۲۶ء) جلد سوم ص ۸۱

[3] توراۃ۔ کتاب الخروج ۳: ۱ وغیرہ

دیوتا تھا کہ خیمے میں رہتا تھا اور اس کی پرستش میں کوئی پیچیدہ رسوم نہ تھیں۔ ان میں قربانیاں، ضیافتیں اور گلّے سے بھیٹ چڑھانا کافی تھا۔[۱] فلسطین میں یہودی لوگ خانہ بہ دوش (بدّووں) کی طرح داخل ہوئے اور وہاں کی کنعانی آبادی میں بس جانے اور تمدن کے آئین سیکھ جانے کے بعد بھی زمانۂ دراز تک اُن کے صحرائی اجداد کی قبائلی خصائل الگ نظر آجاتی تھیں ؛

۴۱ پھر یہودی بادشاہی کے عروج کے وقت سینا ان کی سلطنت کا جزو رہا۔ حضرت سلیمانؑ کا بیڑا خلیج ال عقبہ میں رہتا تھا۔ اوفیر جہاں سے حیرام اور سلیمانؑ کے جنگی جہاز سونا، جواہرات، وغیرہ لاتے تھے (دیکھو توراۃ، کتاب ال ملوک: ۹ - ۲۷، ۲۸ وغیرہ) غالبًا عمان کا ظفار تھا۔ حضرت ایوبؑ کے وقت تک "اوفیر" کے معنی ہی زرخیز زمین کے ہوگئے تھے (توراۃ - کتاب ایوب: ۲۲، ۲۴) حضرت سلیمانؑ سے ایک صدی بعد جہوشافت (۸۷۳ تا ۸۴۹ ق م) کی ال ث (موجودہ ال عقبہ) اور اس کے تجارتی راستوں پر حکومت قائم تھی۔ وہ عربوں سے جو "گلّے لاتے تھے" خراج لیتا تھا۔ سناشریب فلسطین پر تیسری فوج کشی (۷۰۱ ق م) کے حالات میں خبر دیتا ہے کہ "رہے حزقیاہ اور اُربی (= عرب)، تو انھیں میری ہیبت و جبروت نے مغلوب کیا اور اس کے بھاڑے کے سپاہی (؟) جنھیں اپنے شاہی شہر یروشلم کے

ل۵ ایضاً - ۳ : ۸ - (یورپ والوں کی یہ تحقیقات مذہبی کتابوں کے حوالوں کے باوجود جیسا کہ مذہبی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ عقیدہ الوہیت کے متعلق ان کی رائیں محض عقلی ہوتی ہیں۔ مترجم)

استحکام کے لیے لایا تھا، اُسے چھوڑ کر چل دئے۔[۵۱] حزقیا (باب اول — ۲: ۴۱) اور اس سے پہلے عُزّیاہ، مناّی قوم سے نخلستان معین کے آس پاس لڑتے رہے۔ (اسی معین کو اب معان کہتے ہیں)۔ عُزّیاہ نے قریۂ الیث کو دوبارہ بنوایا اور یہودا کے حوالے کیا (ملوک۔ ۲۲:۱۴) کتاب وقائع میں روایت کی گئی ہے کہ جنوبی عربوں نے یہودا پر چھاپہ مارا اور شاہ یہورم (۸۴۸ تا ۸۴۴ ق م) کے بیوی بچے، مال و زر کو نقصان پہنچایا۔ اگرچہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ سبائی "عرب جو حبشہ کے قریب تھے" اتنی دُور پر کس طرح چھاپہ مار گئے؛ بہرحال، نہمیاہ کے عہد یعنی پانچویں صدی ق م کے وسط میں یہودی اپنے جنوب مشرقی ہم سایوں کو دشمن سمجھنے لگے تھے۔[۵۲]

٦- توراۃ کے حوالے

اصل مادّے کے لحاظ سے "عرب" ایک سامی لفظ ہے جس کے معنی صحرا یا اہل صحرا کے ہیں، خواہ وہ کسی قوم کے لوگ ہوں۔ ان معنی میں عبرانی "عرب" توراۃ کے صحائف میں مستعمل ہوا ہے۔[۵۳] قرآن مجید میں بھی "اعراب" بدووں کے واسطے آیا ہے۔ مکابیس (ثانی) میں عرب اور خانہ بدوش ہم معنی ہیں۔ توراۃ میں سب سے پہلی مثال جہاں یہ بطور اسم علم استعمال کیا گیا، اَرمیا، ۲۵: ۲۴ میں ملتی ہے۔ ان کی نبوت کا زمانہ ۶۲۶

---

۵۱ گلن بل۔ ج ۲ ص ۲۲۶۔

۵۲ نحمیاہ ۱۳ — ۱۹ — ۴ : ۷۔

۵۳ اشعیا ۔ ۱۳ : ۲۱ ، ۱۳ وغیرہ اَرمیا — ۳ : ۲۔

اور ۶۱۰ ق م کے درمیان تھا۔ آیہ مذکور میں "ملوک عرب" کے الفاظ موجود ہیں اگرچہ ملوک سے مراد غالباً شمالی عرب اور صحرائے شام کے شیوخ مراد ہیں۔ تیسری صدی قبل مسیح میں لفظ عرب تمام جزیرہ نما کے باشندوں کے لیے بولا جانے لگا تھا۔ اس کی شہادت توراۃ کے وقائع دثانی) ۲۱ : ۱۶ سے ملتی ہے جہاں "اہل عرب، اہل حبشہ کے قریب" بتائے گئے ہیں ان سے بلاشبہ لکھنے والے کا منشا جنوب مشرق کے عرب یعنی سبائی ہے۔

قدیم عرب کی چار بادشاہیاں تھیں: سبا، معین، حضرموت اور قطبان۔ ان میں سے پہلی تین کا توراۃ میں نام آتا ہے اور یہی تین زیادہ اہم تھیں۔ حزقیل کے باب متعلق بہ تجارت میں (۵۸۲ ق م کے بعد) عرب کو قیدار کے ساتھ لکھا اور انہی پیداواروں کی فہرست دی ہے جن کی ہم عرب کی اجناس میں توقع کر سکتے ہیں۔ باب کی ۲۷ ویں آیت میں ہم پڑھتے ہیں کہ چھٹی صدی قبل مسیح میں اہل عرب مویشی پالتے اور ہمسایوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے جیسا کہ آج کل ان کا پیشہ ہے۔ ارمیا ۳ : ۲، سے یہ بھی صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ رہزنی میں بدنام تھے۔ اسی صحیفے میں تحریر ہے (۲۵ ، ۲۳) کہ وہ سر منڈاتے اور صرف بیچ میں چوٹی چھوڑ دیتے تھے۔ بدوؤں میں اس قسم کا رواج آج بھی پایا جاتا ہے؛ توراۃ میں ددان (= عربی دے دان) کا بار بار حوالہ ملتا ہے۔ یہ حجاز کے شمال کا نخلستان العلا تھا جہاں سبا والوں نے کچھ عرصے شمالی عرب میں اپنا مستقر بنایا تھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ تجارتی عروج کے زمانے میں یہ لوگ قافلے کے راستوں پر جو حجاز سے گزر کر بحر متوسط کی بندرگاہوں تک جاتے تھے، قبضہ رکھتے تھے؛

حزقیل نے قیدار (عبرانی "قے دار") کا ذکر کیا ہے جو اشوری کتبات میں "کدری"[۱] اور قدیم یونانیوں کے ہاں "سیدری" مرقوم ہے[۲]۔ یہ قوم شمالی عرب کی حاکم اور تدمر کے علاقے (دمشق کے جنوب مشرق) میں سکونت گزیں تھی؛ شامی دوشیزہ جسے ایک (عبرانی) گیت نے جو حضرت سلیمانؑ سے منسوب ہے[۳]، لافانی بنایا، غالباً قیدار قبیلے کی عرب لڑکی تھی۔ ملکہ سبا (عربی میں بلقیس) کے بیش بہا تحائف جو وہ بنی اسرائیل کے دانا بادشاہ کے حضور میں لائی، خاص جنوبی عرب کی نادر اشیا تھیں[۴]۔ یہ قصہ اگر تاریخی ہے تو ماننا پڑے گا کہ اس ملکہ کا صدر مقام یمن یا حبشہ میں نہ تھا بلکہ وہ شمال میں قافلے کے راستے پر سبائیوں کی کوئی جنگی چوکی یا چھاؤنی تھی۔ (عبرانی) کتبات میں بھی یمنی بادشاہوں کا نام حضرت سلیمانؑ سے دو صدی بعد (کوئی ۸۰۰ ق م) میں آنا شروع ہوا ہے؛ صحیفۂ ایوبؑ (۶ : ۱۹) میں "شیبا" (عربی، سبا) تے ماء کے ساتھ مذکور ہوا ہے۔ قدیم سامی دنیا کے طبع زاد اشعار میں نفیس ترین کلام حضرت ایوبؑ کا نتیجۂ فکر ہے اور وہ یہودی نہ تھے، عرب تھے جیسا کہ

---

[۱] نیز دیکھو اشعیا۔ ۲۱ : ۱۶ اور تکوین (آفرینش)۔ ۲۵ : ۱۳

[۲] لکن بل ۔ ج ۲ ص ۸۲۰

[۳] پلنی ۔ جز پنجم، باب، باب ۱۲

[۴] (حضرت سلیمانؑ سے یہودیوں نے بہت سی غلط چیزیں بھی منسوب کر دی تھیں۔ مترجم)۔

[۵] تورات کی عبرانی شاعری میں تمثیلات وغیرہ عرب کے اسی وضع کے اشعار سے ملتی جلتی ہیں۔ ان کی بہت اچھی مثال حضرت ایوبؑ کے کلام میں نظر آتی ہے۔ ان میں دو مصرعوں میں ایک دوسرے کی اضداد لاکر شعر کی تکمیل کرتے ہیں۔ عبرانی صرف نحو، قرون وسطیٰ میں عربی قواعد کے اصول پر مرتب کی گئی تھی؛

2054

ان کے نام ("ای یوب" عربی ایوب) اور صحیفے کے مقام نزول یعنی شمالی عرب سے ظاہر ہوتا ہے۔[۵۱] کتاب امثال میں اسماعیلی قبیلے مسا کے دو بادشاہوں 43 کے حکمت آمیز اقوال بھی درج ہیں۔ ان دونوں کے نام، لموئیل اور اگور خلف جاکہ کسی نہ کسی صورت میں مناسی (معینی) اور جنوبی عرب کے قدیم کتبات میں آتے ہیں۔ بروک (کی کتاب "یمک" ۴ : ۲۳) میں بنی اگر (= ہاجر، شمالی عرب کی اسماعیلی قوم) کی نسبت لکھا ہے کہ وہ زمین پر حکمت کی تلاش کرتے ہیں۔ توراۃ کے انگریزی ترجمے میں قدم اور بنی قدم کا ترجمہ مشرق اور اہل مشرق سے کیا گیا ہے یہ عربی کے شرق اور شرقیوں کے مطابق ہیں۔ ان سے خاص طور پر فلسطین کے مشرق کے بدو اور عمومی معنی میں اہل عرب مراد لیتے ہیں۔ اسی عربی مادے (= شرق) سے "سارا سن" نکلا ہے۔ یہ ان معدودے چند عربی الاصل الفاظ میں ہے جو قدیم انگریزی میں عربی سے مستعار آگئے تھے۔ چنانچہ یہ بہت پہلے یعنی نویں صدی کی انگریزی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ گر اس کی ظہور اسلام سے قبل بھی ایک تاریخ ہے اور عربوں کے علاوہ دوسروں پر بھی اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔[۵۲] بہر حال، اسی بنی قدم کے ایک سردار حضرت ایوبؑ تھے (ایوب۔ ۱ : ۳) جن کا صحیفہ حکمت اور شاعری دونوں اعتبار سے ایک شہ کار سمجھا جاتا ہے صرف حضرت سلیمانؑ، اس قبیلے سے عقل و حکمت میں افضل مانے گئے ہیں۔

---

[۵۱] یہ حضرت لقمان کے اقوال کی یاد دلاتے ہیں۔ دیکھو سورہ لقمان (دوسرا رکوع)

[۵۲] اسی لئے ہم نے اس کتاب میں "سارا سنز" اور اس کے مرکب جملوں سے احتراز کیا ہے۔ بلکہ یہی کوشش کی ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے باشندوں کو عربی، اعرابی اور عربی زبان بولنے والوں کو، خصوصاً جب کہ وہ مسلمان ہوں، عرب لکھا جائے (اردو ترجمے میں اس کی پابندی ہم نے ضروری نہیں سمجھی۔ مترجم) مسلمانوں میں لفظ "محمڈن" ناپسندیدہ ہے۔

(ملوک اول ۴۰ : ۳۰) اسی لئے متی کی انجیل کا جملہ "مشرق کے صاحبانِ حکمت" جو ستارہ دیکھتے ہوئے یوروشلم پہنچے، ممکن ہو کہ ایرانی مجوس کی بجائے شمالی عرب کے بدوؤں کے لیے آیا ہو۔

یہود کی بادیہ گردی کے بعد کی تحریروں میں لفظ عرب عموماً نبطیوں کے لیے بولا گیا ہو (مکابیین (ثانی) ۵: ۸ - ، (اول) ۵ : ۳۹) مکابیین اول میں نبطیوں کو اسی نام سے یاد کیا ہو۔ (۹ : ۳۵) پاؤل کے عہد میں نبطی مملکت، شمال میں دمشق تک وسیع تھی۔ اُس کے عرب میں گوشہ نشین ہونے کا مطلب یقیناً اسی نبطی علاقے کا کوئی صحرائی قطعہ ہو۔ کتاب احکام، ۲ : ۱۱ میں بھی عربوں سے اغلب یہی ہو کہ نبطی مراد تھے۔

۴۴

۷۔ یونان و رومہ کے ادبیات میں

ملک عرب اور عربی قوم سے یونانی اور رومی خوب واقف تھے۔ یہ ملک ہندستان وچین کے (تجارتی) راستوں میں واقع تھا اور خود اس کی پیداواریں مغرب کی منڈیوں میں بڑی قدر وقیمت رکھتی تھیں۔ جنوبی سمندروں اور اُن کے درمیان وسیط یہیں کے باشندے تھے جس طرح ایک مدت پہلے، بحر متوسط کے آڑتی اُن کے ہم نسل فنیقی رہے تھے۔

قدیم یونان و رومہ کے مصنفین عرب کے تین حصے قرار دیتے تھے (۱) اربیا فلکس "(یعنی خوش بخت یا آزاد عرب) (۲) "اربے بیا پٹرئی" (یعنی پتھری عرب) اور تیسرے (۳) "اربے بیا ڈزرٹا" (= عرب صحرائی) اگر اس آخری سے ان کی مراد شام وعراق کا صحرا

(= البادیہ) تھی۔ اس پر برائے نام سلطنت فارس کا قبضہ تھا۔ دوسرے حصے کا صدر مقام بترا اور یہ نبطی مملکت رومیوں کے زیرنگیں آگئی تھی۔ باقی جزیرہ نما آزاد اور "فلکس" کی صفت سے موصوف کیا جاتا تھا۔ یہی پہلی صدی عیسوی کی سیاسی تقسیم تھی۔ اندرون ملک سے اُن دنوں زیادہ واقفیت نہ تھی۔ لیکن حصۂ اول کو یمن میں محدود کرنا، قرون وسطیٰ کی غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔ اصل لاطینی لفظ کے معنی خوش بخت کے ہیں عجب نہیں کہ عربی یمن (= جانب راست) کا یُمن (= خوش نصیبی) سے التباس کر دیا گیا ہو۔ حال آں کہ عربوں نے یہ نام مُلکِ شام سے (جو حجاز کے شمال یعنی دست چپ پر واقع ہے) محض تقابل کے واسطے رکھا تھا۔[1] مارکیان باشندہ ہراکلیہ جو غالباً چوتھی صدی عیسوی کا آدمی ہے "سارسینی" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔[2] اس سے پہلے بطلیموس نے دوسری صدی میں یہ لفظ لکھا ہے۔[3] یہ بات کہ اس سے شمالی عرب ہی مُراد ہوتے تھے، امیانوس مارسلی نوس کی صراحت سے ثابت ہے۔ یہ انطاکیہ کا باشندہ چوتھی صدی عیسوی کے آخری نصف میں گزرا ہے۔

یونان کی ادبیات میں عرب کا سب سے پہلا ذکر اِس کی لوس (۵۲۵ تا ۴۵۶ ق م) کی تحریر میں ملا۔ یہ زرک سیز کی فوج کے ایک ممتاز عرب سردار کے سلسلے میں ہے۔ اس کے بعد ہِرودوتس (تخ ۴۸۴ تا

---

[1] سبائی، بنائی، عمانی، ساحلی وغیرہ اکثر عربی اقوام کے نام یونانی، رومی تاریخ اور جغرافیے کی کتابوں میں جگہ جگہ آئے ہیں۔

[2] "پری پلوس اوف دی آوٹر سی" (فلیڈلفیا، ۱۹۲۶ء) ص ۱۷

[3] دیکھو رے کا جغرافیہ (لائپ زگ ۱۸۴۵ء) جز پنجم، باب ۱۷۔

۲۵ قبل م) زرکسیز کی فوج کے عربوں کا حوالہ دیتا ہے، جو غالباً مشرقی مصر سے آئے تھے۔

۳ دوسری صدی قبل مسیح سے، پہلی صدی عیسوی کے پلنی تک یونان و روم کے مصنف ملکِ عرب کو دولت و عیش کی سرزمین سمجھتے رہے۔ وہاں لوبان اور دوسرے مصالحوں کی کثرت تھی۔ وہاں کے لوگ آزاد، آزادی کے دل دادہ تھے۔ یہ آخری صفت خصوصیت کے ساتھ مغربی اہل قلم کو تعجب میں ڈالتی تھی۔ چنانچہ قدیم ترین زمانے سے لے کر مورخ گبن کے وقت تک عرب قوم کی آزاد مزاجی مصنفین یورپ میں تحسین و توصیف کا موضوع رہی[۱]۔ ایران کے خسرو پرویز سے، بای زنطہ اور ہند و چین کے سفیروں کے روبرو، عرب نمائندوں کا ایک مباحثہ ہوا جس میں انھوں نے اپنی قوم کے اسبابِ فضیلت کو کمال فصاحت و قوت سے پیش کیا[۲]۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خود اہل عرب ان فضائل کا جو قدرتی ماحول نے

۴ انھیں عطا کیے، بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ دیو دورس سی کو لوس نے دوسری صدی قبل مسیح کے نصف آخر میں فروغ پایا[۳]۔ وہ یقین دلاتا ہے کہ "عرب قوم اپنی آزادی کو نہایت عزیز دگراں بہا سمجھتی ہے"۔ اِس ترابو اپنے جغرافیے میں ایک قدیم تر یونانی مصنف کے حوالے سے بیان کرتا ہے کہ صرف عرب وہ قوم تھی جس نے سکندر اعظم کو کوئی سفارت نہیں بھیجی اور یہ کہ سکندر کا منصوبہ تھا کہ ملک

---

۱ دیکھو گبن کی تاریخ "سلطنت روم کا زوال اور خاتمہ" جلد پنجم ص۳۱۹

۲ عقد الفرید (قاہرہ ۱۳۰۲ء) جلد اوّل ص۱۲۵

۳ "جب لوٹھیکا ہس لوڈ ہوگا" ۲۔ باب اوّل۔

عرب کو اپنی سلطنت کا صدر مقام بنائے[1]

رومی مہم

اہل رومہ نے ساری دنیا پر غلبہ حاصل کیا لیکن عرب کی گردن کو اپنے سامنے نہ جھکا سکے۔ ان کی وہ مہم تاریخ میں مشہور ہے جب کہ قیصر اغطس کے عہد میں مصر کے رومی سپہ سالار ایلیوس گالوس نے دس ہزار سپاہی لے کر عرب پر فوج کشی کی (۲۴ق م) اور نبطی حلیفوں نے اسے کمک پہنچائی مگر قطعی ناکامی نصیب ہوئی۔ مہم کا مقصد علانیہ یہ تھا کہ وہ تجارتی راستے جن پر جنوبی عرب والوں کا بلا شرکت قبضہ تھا، ان سے چھین لئے جائیں اور یمن کے وسائل سے رومہ کو فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ جنوب میں مہینوں بڑھتے رہنے کے بعد صد ہا سپاہی کٹوا کر رومیوں کو نگرانا (= نجران) واپس آنا پڑا جس پر پہلے قبضہ کر چکے تھے۔ پھر بحر قلزم کے ساحل پر پہنچ کر کشتیوں میں پار اترے۔ مصر تک ساٹھ دن میں واپسی ہوئی۔ عرب کا آخری مقام جہاں تک وہ پہنچ سکے "مریابا" تھا۔ مگر یہ سبائیوں کا پایۂ تخت مآرب نہیں بلکہ غالباً جنوب مشرق کا موضع "مریا" تھا۔ شہرہ آفاق یونانی جغرافیہ نویس اِسترابو سپہ سالار گالوس کا ذاتی دوست تھا۔ اس نے مہم کی سرگزشت تحریر کی ہے۔ وہ رومیوں کے اکثر مصائب کا الزام نبطیوں کے وزیر سلّیوس کے سر ڈالتا ہے کہ وہ مہم کا رہنما تھا اس نے دغا کی[2]۔ بہر حال یہی سب سے پہلی اور بڑے معرکہ

---

[1] جز شانزدہم۔ باب ۴۔

[2] جز شانزدہم۔ باب ۱۔

کی لشکرکشی تھی جس میں کسی یورپی سلطنت نے اندرون عرب جنگ کی اور اس کا ذلت آمیز انجام ہوا۔ پھر آج تک کسی یورپی سلطنت کو عرب پر حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

بخور کی سرزمین

ہرودوتس[1] کو "ساری زمین عرب سے لطیف ترین خوش بو کی لپٹیں آتی ہیں" اس کی دالنست میں "صرف یہی ملک ہے جہاں لوبان، مُر، تج، دارچینی، خوش بودار گوند اور شیرۂ افیون پیدا ہوتے ہیں۔ لوبان کے درختوں کا پہرا پردار سانپ دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے، مختلف رنگ کے، جھلڑ کے جھلڑ ہر درخت میں لٹکے ہوے۔[2] جغرافیہ نویس استرابو زود یقین ابوالمورخین سے قدرے زیادہ محتاط ہے۔ وہ خوش بو اور مصالحوں کا خطہ جنوبی عرب کو بتاتا ہے "جس کے سانپ بالشت بھر کے، 47
آدمی کی کمر تک جست لگاتے ہیں[3] ڈیوڈورس نے پورے جزیرہ نمائے عرب کو مصالحہ خیز لکھا ہے "جہاں کی مٹی تک مہکتی ہے[4] یہی بات پلی نی نے اپنی تاریخ طبیعی میں خاص طور پر دہرائی ہے[5] جس میں مشرقی ملکوں کی نسبت رومیوں کی تمام ۵۰ء تک کی معلومات کا، خلاصہ کر دیا ہے۔ ایک اور موقع پر ضمناً یہ بھی لکھا ہے کہ سبائی "اپنے لوبان کی وجہ 48
سے عرب کی سب سے مشہور قوم ہے[6] صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوبان کا سب سے عمدہ علاقہ اُن دنوں حضرموت تھا۔ اور یونان و روم کے لوگ

---

[1] جز سوم باب ۱۱۲　　[2] ایضاً۔ باب ۱۰۷۔

[3] جز شانزدہم۔ باب ۴　　[4] ؍ ؍ ؍

[5] جز دوم۔ باب ۴۹　　[6] جز دوازدہم۔ باب ۳۰

صریحاً یہی سمجھتے تھے کہ عرب تاجر جو کچھ فروخت کرتے ہیں، وہ انہی کے وطن کی پیداوار ہے۔ یہ رشکِ رقابت تھا کہ عرب اپنے حبشہ اور ہندستان کے اصل وسائل کا پتہ نہ دیتے تھے اور وہاں کی اشیا پر بھی اپنی کامل اجارہ داری قائم کر رکھی تھی؛

یونان و روما کے یہ مصنف جنوبی عرب کے تموّل سے بھی بہت مرعوب تھے۔ اسٹرابو وہاں کے شہروں کا بیان کرتا ہے کہ وہ خوب صورت محلات و معابد سے مزیّن ہیں۔ مورخ پلِنی سپہ سالار گالوس کی سند پر اس قول کی تائید کرتا ہے؛

سونا

جس طرح لوبان اور مصالحوں کی نباتی پیداوار عرب کی شہرت کا باعث تھی، قریب قریب اسی قدر بیش قدر وہاں کی دھاتیں، خصوصاً سونا تھا، جس کی مِدیَن سے یمن تک مغربی ساحل پر، اور تھوڑی بہت وسطی اقطاع میں کانیں تھیں۔ ڈیوڈورس یقین دلاتا ہے کہ عرب کی معادن سے وہ طلائے خالص برآمد ہوتا ہے جسے صاف کرنے (سودھنے) کی ضرورت نہیں[1]۔ دسویں صدی عیسوی کے مقدسی اور ہمدانی عرب کی دھاتوں کی نسبت، خصوصاً سونے پر ایک ایک فقرہ تحریر کر گئے ہیں[2]؛ یونانی اور لاطینی کتابوں میں قیمتی معلومات کے بعض اور اجزا اِدھر اُدھر پاشاں مل جاتے ہیں۔ اسٹرابو اطلاع دیتا ہے[3] کہ جنوبی عرب میں تعدد ازواج کا طریقہ جس میں ایک عورت کے کئی بھائی شوہر ہوتے تھے، جاری

---

[1] جز دوم - باب ۱۵۔

[2] احسن التقاسیم (لاے ڈن) ص[۱۰۱] وصفت جزیرۃ العرب (لاے ڈن) ص[۱۵۳]

[3] جز شانزدہم - باب ۴۔

تھا۔ محرمات کی قید نہ تھی۔ خلف اکبر کی وراثت کا قانون تھا جس کی رو سے بڑا بیٹا گدی کا وارث ہوجاتا تھا۔ پھر وہ لکھتا ہے کہ ان کی شراب زیادہ تر کھجور سے کشید کی جاتی اور زیتون کی بجائے تل کا تیل استعمال ہوتا تھا۔

بطلیموس کا جغرافیہ ۱۵۰ء اور ۱۶۰ء کے درمیان تالیف ہوا اور دنیائے معلومہ کا جو نقشہ وہ کھینچ گیا تھا، اسی پر آئندہ کئی صدی تک یورپ والیشیا والوں کے اقلیمی تصورات قائم ہوتے رہے۔ اس میں بطلیموس نے اپنے زمانے کے سیاحوں اور سوداگروں کی تحریروں اور ذاتی تاثرات کو علمی شکل میں جمع کرنے کی کوشش کی تھی۔ انہی معلومات کی بنا پر اس نے عرب کا جو خاکہ تیار کیا وہ اس ملک کا سب سے پہلا نقشہ ہے۔

باب ۵ پنجم

سبا اور دوسری جنوبی ریاستیں

جنوبی عرب والوں کی سوداگری ۴۹

سبائی سب سے پہلے عرب تھے جنھوں نے تمدن کے میدان میں قدم رکھا۔ آخر زمانے کے پیکانی کتبات میں ان کا تذکرہ آتا ہے۔ یونانی ادب میں ان کا سب سے پہلا (صحت کے ساتھ) حوالہ تھیوفراسطوس کی تاریخ (۲۸۸ ق م) میں ملا ہے[۱] ان کا قدیم وطن جزیرہ نما کا جنوب مغربی گوشہ تھا۔ یہ علاقہ باران رحمت سے سیراب ہوتا تھا۔ سمندر کے قریب اور ہندستان کے راستے پر جنگی اعتبار سے باموقع تھا۔ اس کی سرسبزی اور یہی مناسب محل وقوع ترقی کا اصلی باعث ہوے۔ یہاں مصالحے اور مر وغیرہ خوش بودار چیزیں پیدا ہوتی تھیں جو کھانا پکانے میں یا مذہبی اور شاہی تقریبات میں دھونی دینے کے کام آتی تھیں۔ بخور ہی قدیم زمانے کی تجارت میں سب سے بیش قیمت جنس تھی؛ پھر خلیج فارس کے موتی، ہندستان کی تلواریں، پارچہ، مرچ مصالحے، چین کا ریشم، حبشہ کے غلام، بندر، گدھے، ہاتھی دانت، سی مرغ کے پر اور سونا، غرض نہایت قیمتی

---

[۱] ہسٹوریا پلان تورم ۹: جز نہم باب ۴۔

اور نادر اشیا پہنچتی اور اسی راستے مغربی منڈیوں میں بھیجی جاتی تھیں پہلی صدی عیسوی کے ایک مصنف نے "موزا" (جو آج کل مخہ کہلاتا ہے) کے بازار کی یہ جامع کیفیت یادگار چھوڑی ہے :-

" یہاں حسب ذیل سامان باہر سے آتا ہے : قرمزی کپڑا، باریک اور موٹا، دونوں قسم کا۔ عربی وضع کا آستین دار لباس۔ یہ سادہ، معمولی، کارچوبی یا زربفتی ہوتا ہے۔ زعفران۔ نیشکر۔ ململ، لبادے کمل (کم مقدار میں) بعض سادہ، بعض مقامی طرز کے۔ رنگ برنگ کے پٹکے۔ عطریات، تھوڑی مقدار میں۔ شراب اور گیہوں، مگر زیادہ نہیں "۱؎

سبائی گویا جنوبی سمندر کے فنیقی تھے۔ وہ اس کے راستوں، پہاڑیوں، لنگر گاہوں سے باخبر تھے اور اس کی خطرناک موسمی ہواؤں پر انھوں نے قابو پالیا تھا۔ اسی لئے حضرت مسیحؑ سے سوا ہزار برس پہلے اس سمندر کی تجارت کے بلاشرکت اجارہ دار بن گئے تھے۔ سکندر اعظم کے امیرالبحر نیارکوس نے خیال ظاہر کیا تھا کہ عرب کے گرد جہاز گھوم سکتے ہیں۔ سبائی اس قیاس آرائی کو عملی جامہ پہنا چکے تھے۔ یونانی ورومی ناخداؤں کی دانست میں لوبان کی سرزمین "پہاڑی اور بڑی زشت" تھی۲؎ کتاب پری پلوس کے مطابق "تمام عرب کا ساحل جہازرانی کے لیے خطرناک ہے کہ ایک تو بندرگاہیں نہیں، دوسرے لنگر ڈالنے کے مقام ہر جگہ بہت ہی خراب اور عذاب جان ہیں۔ چٹانوں اور بحری پشتوں کی وجہ سے اُن تک

۱؎ دی پری پلس آف دی اِری تھرائن سی" ترجمہ شوف (نیویارک ۱۹۱۲ء) ص ۳۲

۲؎ اِری تھرائن سی" ص ۲۹

پہنچنا بھی سخت دشوار ہو گیا۔[۱]

باب المندب سے بحر قلزم کے پار، وسطی مصر کے ساحل پر وادی حمامات پہنچتے تھے۔ اس سمندر کو، خصوصاً شمال میں، عبور کرنے کی قدرتی دشواری کے باعث سبائیوں نے یمن سے شام تک بری راستہ نکالا جو مکہ اور بترا سے گزر کر ایک طرف مصر اور دوسری طرف شام و عراق کو جاتا تھا۔ شام کی شاخ غزہ پر بحر متوسط کو جالیتی ہے۔ لوبان کثرت سے حضر موت میں پیدا ہوتا تھا۔ وہاں سے ایک راستہ سبائیوں کے پایۂ تخت مارب تک آتا اور شمال کی تجارتی شاہ راہ سے مل جاتا تھا۔ اس بڑی سڑک پر جنوب سے شمال تک کئی سبائی بستیاں جمادی گئی تھیں۔ اور انہی بستیوں کے سبائی تھے جن کا اشور و یہود کی قدیم تحریروں میں ذکر آتا ہے۔ تاریخ کی ایک جھلک کتاب آفرینش (۳۷ : ۲۵) کی اُن آیتوں میں محفوظ رہ گئی ہے جہاں "بنی اسماعیل کے قافلوں" کا "اپنے بلسان، مصالحے، مُر سے لدے ہوئے اونٹوں کے ساتھ" آنا مذکور ہے۔

جنوبی عربی کتبات

جنوبی عرب کے لوگوں نے داد و ستد اور تجارت میں فتوحات حاصل کیں لیکن اُن کی بنائی ہوئی ریاستیں جنگی نہیں تھیں۔ قدیم سامی، یونانی، رومی تحریروں یا نیم افسانوی روایات سے جو ابتدائی اسلامی کتابوں میں منقول ہیں، مگر سب سے بڑھ کر مقامی ذرائع سے ہم ان کی تاریخ کا مجمل خاکہ کھینچ سکتے ہیں۔ اسلامی مصنفوں میں وہب ابن منبہ

---

[۱] "اِرِی تھرایَن سی" ص۳۰

جو غالباً ۷۳۰ء میں صنعا میں تھا، ال ہمدانی[1] (م ۹۴۵ء) اور الحمیری (م ۱۱۷۷ء) کی کتابیں خاص طور پر مفید مطلب ہیں۔ مقامی ماخذوں تک ہماری رسائی جوزف ہلادی اور گلازر کے انکشافات کی بدولت ہوئی لیکن یہ ماخذ تمام تر پتھر یا دھات پر کندہ (کتبات) ہیں اور نہ لین دین یا محض ادبی اور تاریخی تحریر کے لیے کوئی تلف ہونے والی چیز استعمال کی گئی، تو وہ بالکل مفقود ہو چکی ہے۔ کتبات کی انتہائی قدامت ساتویں آٹھویں صدی قبل مسیح تک جاتی ہے۔ سبائی کتابے کئی قسم کے ہیں: ۱۱
(۱) نذر نیاز کے، جو برنجی لوحوں پر کھدے ہوئے مندروں سے برآمد ہوئے اور اِل مقہ، عثتر اور شمس سے انتساب رکھتے ہیں۔ (۲) عمارتی۔ جو مندروں یا سرکاری عمارات کی دیواروں پر تھے کہ بانی یا اس کے حصہ داروں کے نام محفوظ رکھیں۔ (۳) تاریخی۔ جن میں کسی جنگ یا فتح کا اعلان کیا ہے۔ (۴) ضابطے کی ہدایات جو دروازوں کے ستونوں پر کندہ ہیں۔ (۵) موتیٰ سے متعلق، جو مقابر پر ملے ہیں۔ مگر سب سے بڑھ کر لائق لحاظ وہ چند قانونی کتبات ہیں جن سے قدیم تر آئینی ارتقا کا پتہ چلتا ہے۔

سب سے پہلے کارستن نے بور نے ۱۷۶۲ء میں جنوبی عرب میں کتبات ہونے کا اعلان کیا پھر گالوس رومی (۲۴ ق م) کے بعد پہلا یورپی جو نجران میں ۱۸۶۹ء میں وارد ہوا جوزف ہلاوی (یہودی) تھا۔ وہ ۳۷ مختلف مقامات سے ۶۸۵ کتبوں کی نقلیں لے کر آیا۔ ۱۸۸۲ء اور

---

[1] ہمدانی کی کتاب مُلر نے وی آنا میں طبع کرائی (۱۸۸۱ء)۔ اسے فارس نے اس کا ترجمہ دی انٹی کوٹیز اوف ساوتھ ارے بیا کے نام سے شایع کیا (پرنسٹن ۱۹۳۸ء)

۱۹۱۴ء کے درمیان اِدوارد گلازر اہلِ علم کی چار بار جمعیتیں یمن لے گیا جن کی کوشش سے کوئی دو ہزار کتبے حاصل ہوئے کہ بعض ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ مجموعی طور پر تقریباً تین ہزار کتابے ہمارے قبضے میں آچکے ہیں۔ ان کی قدامت ساتویں صدی قبل مسیحی تک پہنچتی ہے۔ مآرب کے کھنڈروں کا سراغ تھامس آرنود نے چلایا تھا اور ۱۸۴۳ء میں اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر وہاں کے کوئی ساٹھ کتبے نقل کئے تھے مگر یورپ نے جنوبی عرب کی قدیم تحریر سب سے اوّل ۱۸۳۷ء میں دیکھی جب کہ ایک انگریز بحری سردار جیمس ویلِ اسٹڈ نے نقب الحجر کے کتبے کا ایک حصہ شائع کیا۔ تحریر کو ٹھیک ٹھیک پڑھنے کا کام روڈی گر (۱۸۳۷ء) اور گیسی نیوس (۱۸۴۱ء) کا شرمندۂ احسان ہے۔

۵۲ ان کتبات سے منکشف ہوا کہ جنوبی عربی یا مناوی وسبائی زبان میں جو حمیری بھی کہلاتی ہے، انتیس حروف ہیں۔ جملہ قرائن کہتے ہیں کہ یہ حروف ابتدا ہی میں سینائی رسم الخط سے جدا تراش لئے گئے تھے۔ اور خود سینائی فنیقی اور اس کے مورث یعنی مصری خط میں درمیان کی کڑی تھی۔ ان چوکور حروف کا تناسب پتہ دیتا ہے کہ یہ رسم خط ایک زمانے تک نشوونما پاتا رہا۔ اس کے حروف تہجی دوسری سامی زبانوں کی طرح صرف حروف صحیح پر مشتمل ہیں۔ اسماء کی ساخت، افعال کی گردان، متکلم کی ضمیروں اور لفظوں میں جنوبی عربی، اکادی (یعنی اشور و بابلی) اور حبشی زبانوں سے مماثلت رکھتی ہے۔ مگر جمع میں لفظ کا ٹوٹنا شمالی عربی اور حبشی کی خصوصی طرز کے مطابق ہے۔ شمالی عربی کو چھوڑ کر مذکورہ بالا تینوں زبانیں

۵۲ نمونے کے لئے دیکھو "کورپس اِنس کرپ تیونم سیمی تی کارم" جز چہارم (پیرس ۱۸۸۹ء)

ایک حد تک سامی کی قدیم بول چال کی قائم مقام ہیں جبکہ تمدن کو زوال آیا تو جنوبی عربی عملاً غائب اور شمالی اس کی جگہ مروّج ہوگئی۔ اس ردّ و بدل کی رفتار کو شمال کے ادبی اجتماعات نے جیسے سوق عکاظ کا میلا، کعبے کا (جاہلی) حج اور مکّے سے تجارتی روابط نے تیز تر کردیا۔

منائی ریاست

قدامت کے دھندلکے میں سب سے پہلے جنوبی عرب کی منائی قوم کی مملکت نمودار ہوتی ہے۔ عربیات کے وہ ماہرین جو قدیم ترسنین کے قائل ہیں اس کی سرسبزی کا زمانہ ۱۲۰۰ ق م سے ۶۵۰ ق م تک تخمین کرتے ہیں[۱]۔ قدیم یونان و روما کی کتابوں میں منائی نام اسی شکل میں آتا ہے۔ توراۃ کے لکھنے والے ماعون، معون، یا معین کو مقام کا نام بتاتے ہیں۔ یہ سمیری و بابلی کتبوں کا مگن نہیں ہے جس کا اوپر تذکرہ آیا، بلکہ جنوب مغربی بترا کا (قدیم آدوم کے علاقے میں) وہ قریہ تھا جس کی جگہ اب معان ہے۔ حقیقت میں پرانی عربی شکل یہی معان تھی پھر اسی عام زبان میں تلفظ بدل کر "معین" (بہ معنی آبِ رواں) ہوگیا۔

منائی ریاست نے نجران اور حضرموت کے درمیان "جوف الیمن" میں نشوونما پائی۔ عروج کے زمانے میں جنوبی عرب کا بڑا حصہ اس میں شامل تھا۔ یعنی حضرموت، قطبان، مُلّخ (دیکھائی کتبوں کا مَلحۃ) کا وہ خطہ جو غالباً وسطی اور شمالی مغربی عرب تک پھیلا ہوا تھا۔ اِسے عمالق سمجھنا چاہیے جسے توراۃ میں "اوّل الاقوام" بتایا گیا ہے (اعداد۔ ۲۴: ۲۰)۔

---

[۱] رسالہ ... سکولز نوٹ اور ... ۱۹۳۹ ... ص

معان علاقہ مدین میں بترا کے قریب معقول آبادی اور تجارت کی منڈی تھا۔ مدین جزیرہ نمائے سینا کا مشرقی ضلع ہے جسے جنوبی عرب کے کتبات میں "مصران" تحریر کرتے ہیں۔ اسی لئے سرکاری نام "معان مصران" ۵۴
تھا۔ سبائی حکومت سنہ ۶۴۰ ق م کے قریب معان کی وارث ہوئی پھر ملوک لحیان کا سارے جزیرہ نما پر قبضہ جم گیا (تقریباً سنہ ۵۰۰ ق م)۔ ان بادشاہوں کی حکومت کوئی دو صدی (سنہ ۳۰۰ ق م) تک چلی۔ ان کا دار الحکومت ددان پہلی مینائی چھاونی تھی۔ توراۃ میں اسے "ددن" کے نام سے یاد کیا ہے اور آج کل "ال علا" کہلاتا ہے۔ پھر نبطی، ملوک لحیان کے جانشین ہو گئے۔ مگر منائیوں کا رکھا ہوا نام ابھی اس حد تک برقرار ہے کہ معان کے جنوبی حصے کو "معان مصریہ" ہی کہتے ہیں۔

معان شمال مغربی عرب میں منائی قوت کا مرکز تھا مگر اس کے علاوہ معلوم ہوتا ہے وادئ فرات کے ساتھ ساتھ ساتویں صدی قبل مسیح میں ان کی اور سبائیوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بن گئی تھیں کیونکہ اس بستی میں ان کی مہریں اور کتابے ملے ہیں۔ اصلی منائی دار السلطنت قرناو، (صنعا کے شمال مشرق کی طرف) جنوبی الجوف میں واقع تھا۔ جدید قریہ معین اس کی یادگار ہے۔ جوزف ہلاوی نے سنہ ۱۸۷۰ء میں اس کی سیر کی۔ اسی الجوف میں ان کا دینی مرکز یثیل تھا جہاں (مآرب کے شمال مغرب جانب) اب براقش بستا ہے۔

منائی وہی زبان بولتے تھے جو بعد کے سبائیوں کی بولی تھی، صرف زیر زبر کا فرق تھا۔ ان کے کتبات میں قطبان کے شاہی کتبے اور حضرموت کے چند نوشتے بھی جواب تک مل سکے۔ شامل کر لئے گئے ہیں۔ یہ معان کے

بادشاہی دور سے شروع ہوتے ہیں اور میولر نے ۲۶ بادشاہوں کے ناموں میں بعض کی تکرار دیکھ کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہاں موروثی بادشاہی کے اصول پر عمل ہوتا تھا[1]۔ دوسرے اہل تحقیق نے اور کئی بادشاہوں کے نام اضافہ کئے ہیں۔

۲۔ سبائی بادشاہی

سبائی دور تقریباً ۹۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک رہا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آخری مِنائی بادشاہوں کے وقت میں ان کے بادشاہ بھی حکومت کرنے لگے تھے حتیٰ کہ کوئی تین صدی بعد وہی اپنے مِنائی رشتہ داروں کے وارث اور پورے جنوبی عرب کے حاکم ہوگئے۔ یہی اس علاقے کی تاریخ کا زرّیں دور تھا۔ اس کی پہلی فصل ۶۵۰ ق م میں ختم ہوتی ہے جس میں فرماں روا مذہبی پیشوا اور اس کا لقب "مکرب سبا[2]" ہوتا تھا۔ ایسے کوئی سترہ بادشاہوں کے کتبے ہم تک پہنچے ہیں جو اسی لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ مآرب سے ایک دن کی راہ پر خریبہ واقع ہے۔ اس کا پرانا نام صرواح تھا۔ سبائیوں نے سب سے پہلے یہی عمارت (ایک قلعہ) بنائی اور اسے اپنا دارالحکومت قرار دیا۔ ان کے اسی دور میں شمس (یا شمسیہ) اور یثعمی امرا حاکم تھے جنھوں نے سارگن ثانی (شاہ اشوریہ) کو خراج ادا کیا۔

---

[1] "ڈامی ہیدگن" حصہ دوم ص۱۸

[2] کتبات میں یہ لقب "م ک ر ب" لکھا ہے۔ اس کا قدیم تلفظ یقینی نہیں لیکن معنی میں بادشاہی اور مذہبی امامت دونوں خیال شامل ہیں۔

مآرب کا بند ۵۵

مآرب سطح بحر سے ۳۹۰۰ فیٹ بلند ہے۔ اب تک صرف تین یورپی سیاح یعنی آرنود، ہلاوی اور گلازر یہاں آئے ہیں۔ لوبان کے علاقے کے راستے اسی مقام پر شمال کی شاہ راہ سے مل جاتے تھے جو بحر متوسط کے ساحل، خصوصاً غزہ تک گئی تھی۔ ال ہمدانی نے اپنی کتاب "اکلیل" میں مآرب کے تین قلعوں کا ذکر کیا ہے لیکن وہ خاص طور پر پانی کے بند موسوم بہ "سد مارب" کے باعث مشہور تھا[۵۱]۔ یہ فن تعمیر کا کارنامہ اور سبائیوں کی دوسری عمارتیں ثابت کرتی ہیں کہ وہ امن دوست قوم تھی اور نہ صرف تجارت بلکہ صناعت میں بھی نہایت ترقی کر گئی تھی۔ بند کے پرانے حصے ان کے ابتدائی دور میں بنائے گئے۔ کتبوں میں یث عمی امرا بے این اور اس کے باپ ہی اصل بانی بتائے گئے ہیں لیکن ہمدانی پھر مسعودی اصفہانی اور یاقوت[۵۲] اس کی تعمیر لقمان ابن عاد سے منسوب کرتے ہیں جو اصل میں افسانوی شخص تھا۔

سبائیوں کے آخری دور (۶۵۰ تا ۱۱۵ ق م) میں بادشاہی کی مذہبی نوعیت بظاہر ختم ہو گئی اور فرماں روا صرف "مَلِکِ سبا" کہلانے لگے۔ اس عہد میں مآرب دار السلطنت بنا جو موجودہ صنعا سے کوئی ساٹھ میل مشرق میں واقع ہے۔ یاقوت اور اس کی تقلید میں بعد کے کئی مصنف مآرب کو "سبا" بتاتے ہیں حال آں کہ سبا قوم یا ملک کا نام تھا۔ شہر کا

---

۵۱ اس کے آثار قدیمہ کی کیفیت کے لیے دیکھو "الاعظم" حصہ دوم ص۹

۵۲ دیکھو مروج الذہب۔ جلد سوم ص۳۶۶ (طبع پیرس ۱۸۶۴ء) اصفہانی کی تاریخ سنی ملوک الارض والانبیا" (لائپ زگ، ۱۸۴۴ء) ص۱۲۶۔ اور معجم البلدان۔ ج ۴ ص۲۰۳

نام نہ تھا۔

اس عہد کے ایک حصّے میں معلوم ہوتا ہے حضرموت اور قطبان کے اپنے الگ بادشاہ ہو گئے تھے۔ پہلے کا دارالحکومت شبوہ تھا (جسے یونانی رومی مصنف سبوٹا لکھتے ہیں) اور قطبان کا تمنا۔ بہر حال جنوبی عرب کی سب سے ممتاز قوم سبائی تھے اور یہی آخری دور ان کی تاریخ میں انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔

۳۔ پہلی حمیری بادشاہی

۱۱۵ ق م کے بعد سے جنوبی عرب کا فرماں روا کتبوں میں "ملک سبا و ذو ریدان" کے نئے لقب سے نمودار ہوتا ہے۔ ریدان بعد میں جنوب مشرقی ساحل، ظفار موسوم ہوا۔ یہیں سے پہلی حمیری بادشاہی کا آغاز ہے جو تقریباً ۳۰۰ء تک قائم رہی۔ ممکن ہے یہ حمیری پہلے صرف قطبان کے حاکم ہوں۔ ان کا نام "ہومری تی" سب سے پہلے پری پلوس (تقریباً ۶۰ء) میں اور پھر پلی نی کے ہاں آیا ہے۔ حمیری، سبائیوں 56 کے عزیز قریب اور اسی نسل کی سب سے نئی شاخ تھے اسی لئے منائی و سبائی تہذیب و تجارت کے وارث ہو گئے۔ ان کی زبان بھی عملاً وہی تھی۔ پلی نی نے ان کی زراعت کے متعلق اشارات کئے ہیں ان کی تصدیق کتبات میں بار بار چاہ و تالاب اور بند کا تذکرہ آنے سے ہوتی ہے۔ ان کی سب سے بڑی دولت وہی لوبان رہا جس کا چنا جانا ایک مذہبی کام سمجھا جاتا تھا۔

ظفار کو قدیم یونانی و رومی کتابیں سپ پھر، سپفر لکھتی ہیں۔

توراۃ کی کتاب آفرینش میں سیفر تحریر ہے (۱۰-۳۰) یہ شہر اندرونی علاقے میں، مخہ سے کوئی سو میل شمال مشرق کی طرف واقع اور حمیری خاندان کا صدر مقام تھا۔ اس نے سبائیوں کے مارب اور منائیوں کے قرناو کی جگہ لے لی تھی۔ جدید قریہ یریم کے قریب ایک مدوّر پہاڑی پر ابھی اس کے کھنڈر موجود ہیں۔ جس زمانے میں کتاب پری پلوس تالیف ہوئی یہاں کا بادشاہ کری بالو وتر تھا۔

یہی حمیری زمانہ ہے جس میں رومیوں کے شکست نصیب لشکر نے گالوس کی قیادت میں مریبا تک پیش قدمی کی۔ بادشاہ کا نام اس نرابونے "الاسردس" لکھا ہے۔ کتبات میں یہ ابی شریحا یحذب مرقوم ہے۔

حبشیوں کی سامی نژاد

زیر نظر دور کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ اوائل ہی میں حضرموت اور یمن کے عرب "زمینِ کوش" میں آبسے اور حبشی حکومت وتمدن کی بنیاد رکھی جس نے ایک خاص تہذیب تیار کی کہ دیسی حبشی غالباً کبھی اس درجے تک نہ پہنچ سکتے تھے۔ پانچویں صدی عیسوی کے وسط میں بھی جب جنوبی عرب کے بہت سے قبائل گھروں سے اکھڑ گئے اور بعض شام و عراق میں جا بسے، تو عجب نہیں کہ حبشہ کی قدیم عربی بستیوں میں ان سے اضافہ ہو گیا ہو۔ عام روایت کی رو سے یہ نقل مکانی مارب کے بڑے بند کے ٹوٹ جانے سے تعلق رکھتی تھی۔ بہرحال مسلمانوں کے حملے سے کہیں پہلے مشرقی افریقہ کے سارے ساحلی خطے میں عرب خون کی آمیزش ہو چکی تھی۔ ریاست اکسوم کا آغاز پہلی صدی عیسوی میں ہوا اور آگے چل کر اسی خاکے سے رفتہ رفتہ حبشی سلطنت تیار ہوئی۔

قصر غمدان

یمن کو "سرزمین قصور" کہا گیا ہے مگر ان میں بھی صنعا کا قصر غمدان سب سے زیادہ مشہور ہوا۔ الی شریحا نام کا ایک دوسرا بادشاہ گزرا ہے جسے یاقوت لی شرح ابن یحصب تحریر کرتا ہے۔[1] قصر غمدان کی بنا اسی سے منسوب کرتے ہیں۔ اصل میں شہری حمیری امیروں کو بدووں کے ناگہانی حملوں سے حفاظت کے لئے مورچہ بند محلات بنانے پڑتے تھے۔ غمدان کی تفصیلی کیفیت ہمدانی اور اس کے بعد یاقوت نے لکھی ہے اگرچہ ان کے زمانے تک وہ بہت بڑا کھنڈر رہ گیا تھا۔ یہ جغرافیہ نویس بیان کرتے ہیں کہ اس قصر کی بیس منزلیں اور ہر منزل دس ہاتھ اونچی تھی۔ گویا دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی "فلک نما" (= "اسکای اس کرے پر") تھی! اسے سنگ سرخ و سماق و مرمر سے بنایا تھا۔ شاہی دربار سب سے اوپر کی منزل میں جمتا تھا اور اس کی چھت پتھر کی ایک ڈال سے تیار کی تھی جو اتنا شفاف تھا کہ اندر سے باہر کا آسمان دیکھ سکتے اور چیل اور کوے میں امتیاز کر سکتے تھے۔ عمارت کے چاروں رخ مختلف رنگ کے پتھروں سے بنائے اور ہر گوشے کے جوڑ پر برنجی شیر ببر لگائے تھے جو تیز ہوا چلنے کے ساتھ دھاڑنے لگتے تھے۔ ہمدانی نے ایک نظم میں بادلوں کو غمدان کی پگڑی اور سنگ مرمر کو اس کی پیٹی سے تشبیہ دی ہے۔ یہ عظیم عمارت ظہور اسلام تک سلامت رہی اور بظاہر اسی کشمکش کے دوران میں ٹوٹی جس کے نتیجے میں یمن پر مسلمانوں کی سیادت قائم ہوئی۔

حمیری خاندان کے پہلے دور میں ' بادشاہ ایک بڑا جاگیردار

[1] جلد سوم ص۸۱۱

معلوم ہوتا ہے کہ اپنے قصر میں رہتا اور سونے چاندی تانبے کے سکے جاری کرتا جن کے ایک رخ پر اُس کی شبیہ اور دوسری جانب بیل کا سر یا اُلو (ایتھنز کا نشان) بنا ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اور پُرانے سکوں میں آرتھینہ دیوی کا چہرہ موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار صدی قبل مسیح ہی سے جنوبی عرب کے لوگ یونان کے نمونوں کے مقلد ہو گئے تھے۔ سکوں کے علاوہ قدیم یونانی اور ساسانی ساخت کی برنجی مورتیں بھی کبھی کبھی یمن میں نکلی ہیں۔ مقامی فن بہت قدیم نہیں نظر آتا۔ سامی ذہانت کا اس ذریعے سے کہیں اظہار نہیں پایا گیا۔

58 سبائی و حمیری قوم کا نظام جو کتبات سے ظاہر ہوا وہ ایک عجیب و غریب مرکب ہے جس میں قبائلی نظام، جات پات کا جمود، موروثی جاگیرداری اور ملوکیت، سبھی کے اجزا پائے جاتے ہیں۔ الگ الگ ان عناصر کی مثال دوسری قوموں میں مل سکتی ہے لیکن ایسا مجموعہ شاید کہیں نہ ہوگا۔

رومیوں کا بحری تجارت میں غلبہ

حمیری خاندان کے اسی پہلے دَور میں جنوبی عربوں کا عہد عروج ختم ہوگیا۔ جب تک بحر قلزم کی تجارت پر اہل یمن کی اجارہ داری رہی وہ خوب پھلتی پھولتی رہی لیکن رفتہ رفتہ ان کا قبضہ سست پڑنے لگا اور پہلی صدی عیسوی میں جب "پری پلوس اوف دی اِری تھرائن سی" تالیف ہوئی (سنہ ۵۰ تا ۶۰ء) یہ تبدیلی بخوبی نمایاں ہونے لگی تھی۔ خود یہ کتاب اس بات کی پہلی تحریری شہادت ہے کہ ایک پوری سلطنت کے باشندے مشرق سے باقاعدہ تجارت کے لیے اپنے جہاز بنانے اور چلانے لگے ہیں۔

یورپ اور ہندستان کے درمیان بری راستے عراق و شام سے گزرتے تھے۔ ان پر پہلے سکندر (یونانی) نے ہاتھ ڈالا تھا، بعد میں پارتھیہ (فارس) اور اہل روما کی مدتوں ان کی خاطر کشاکش ہوتی رہی۔ لیکن جنوب کا بحری راستہ قریب قریب پہلی صدی عیسوی تک برابر عربوں کے قبضے میں رہا۔ ان کا کام یہ تھا کہ اپنے ملک اور ہند و حبشہ کی پیداوار جمع کرکے مآرب سے براہ مکہ اونٹوں پر شام و مصر لے جاتے اور بحر قلزم کے جھکولوں سے بچے رہتے تھے۔ لیکن اگر بحری سفر قابل ترجیح نظر آتا تو یا تو سارے قلزم کو طے کرکے دریائے نیل کی مشرقی نہر تک جہاز لاتے اور یا نیچے وادی حمامات کے ساحل پر مال اتارتے اور وہاں سے صحرائے مصر کے پار تھنبر تک یا دریائے نیل کے راستے ممفس تک پہنچا دیتے تھے پہلا بری راستہ حجاز سے گزرتا تھا اور اس پر مسلسل حمیری آبادیاں بستی چلی گئی تھیں[۱]۔ اس ترابو نے لکھا ہے کہ "مینیا سے الانا" (یعنی ال عقبہ) تک قافلے کی ستر دن کی راہ ہے[۲]۔ مغرب کے لوگوں میں مشرقی کپڑے، عطریات 59 اور مصالحوں کا شوق بڑھا تو جنوبی عربوں نے اپنی پیداوار، خاص کر لوبان اور مر کی قیمت بڑھا دی اور بیرونی مال جو ان کی وساطت سے جاتا تھا اس پر کر زیادہ لگا دی۔ اسی کے ساتھ راستوں پر کڑی نگرانی رکھنے لگے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا تمول ضرب المثل ہو گیا۔ بترا اور پھر تدمر اس تجارتی نظام میں حصہ دار اور اسی زنجیر کی کڑیاں بن گئے تھے لہٰذا منافع سے بھی متمتع ہوئے۔ مگر اب ساری بساط کا رنگ دوسرا ہوتا جاتا تھا۔

---

[۱] قرآن مجید۔ سورۂ سبا، ۱۷، ۱۸

[۲] جز شانزدہم۔ باب ۴

مصر میں خاندان بطلیموس کی حکومت قائم ہوئی اور وہ ایک مرتبہ پھر دُنیا کی مستقل سلطنت بنا، تو بحری سیادت کے لئے بھی اس نے جنوبی عربوں سے پہلی مرتبہ زور آزمائی کی۔ بطلی موس ثانی (۲۸۵ تا ۲۴۶ ق م) نے دریائے نیل کی قلزم تک وہ نہر پھر صاف کرائی جو اصل میں سترہ سو برس پہلے سسوترلیس نے کھدوائی تھی۔ اب مصریوں کے تجارتی جہاز قلزم تک پہنچنے لگے اور حمیری سرگرمیوں میں کمی آنے لگی۔ مصر کو رومیوں نے پہلی صدی قبل مسیح کے وسط کے قریب فتح کیا تو اس وقت بھی بطلی موسیوں کی یہ حکمت عملی جاری رکھی کہ جنوبی عربوں سے بحری تجارت میں مقابلہ کیا جائے کیوں کہ رومی حاکم بھی یہ چاہتے تھے کہ مصر اشیائے درآمد میں یمن کا دست نگر نہ رہے۔ پلی نی (مورخ) کے زمانے میں رومی شہری شاکی تھے کہ عرب تاجر اُن اجناس کی قیمتیں بہت چڑھاکر وصول کر رہے ہیں جنھیں نقد دام دے کر لینا پڑتا تھا۔ رومیوں کے ہاتھ میں ایسی اشیا بہت کم تھیں جنھیں وہ مبادلے میں دیتے اور عرب تاجر قبول کر لیتے[1] ادھر حبشہ والوں کو یہ عرب ہمسائے نفع میں صرف اتنا کم حصہ دیتے تھے کہ وہ خوش نہ رہ سکے اور اب رومیوں سے توڑ جوڑ کرنے لگے تھے ؛

بطلی موسیوں کے آخری زمانے میں ایک یونانی یا رومی، شاید حبشیوں کے بیڑے میں نوکر ہوکر بحری راستوں کے خطرات اور موسمی ہواؤں کے بھید سیکھ گیا اور جہاز پر وہ مال لے کر سکندریہ پہنچنے میں کام یاب ہوا جس کی یہاں بڑی مانگ اور بہت مہنگے دام تھے۔ اس

---

[1] پلی نی - جزو دوازدہم - باب ۴۱

میں ہندستان کی دارچینی اور مرچ بھی تھی جسے اہل مغرب، عرب کی پیداوار سمجھتے تھے۔ یہ جہازی مستی ہپالس، گویا بطلی موسیٰ مصر کا کولمبس تھا کہ پھر اسی تجارتی راستے پر اور لوگ بھی چل پڑے اور عربوں کی اجارہ داری توڑنے میں حصہ لینے لگے۔ تاہم بحری ہواؤں کے موسم اور ہندستان کے سیدھے بحری راستے کی دریافت کا اصلی فائدہ اس وقت اُٹھایا گیا جب کہ مصر پر رومیوں کی حکومت قائم ہوئی۔ رومی جہازوں کا 60
بحر ہند میں پہنچ جانا، جنوبی عرب کی خوش حالی کے خاتمے کی گھنٹی تھی۔ مالی حالت خراب ہوئی تو سیاسی زوال بھی پیچھے پیچھے آیا، جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے اور ایک ایک کر کے بترا، تدمر اور شمال مغربی عراق، رومی بھیڑیے کے پنجے میں دب گئے۔

۴۔ دوسری حمیری حکومت

سنہ ۳۰۰ء کے قریب جنوبی عرب کے بادشاہوں کا لقب "ملک سبا، ذوریدان، حضرموت و یمنات" ہوگیا تھا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ حضرموت کی آزادی رخصت ہو چکی تھی۔ پھر اس لقب میں یہ لفظ اضافہ کئے گئے: "والعرب فی الجبال و فی تہامہ"۔ تہامہ سے صنعا کے مغرب میں ساحل قلزم مراد ہے اور یمنات کے معنی زیادہ لمبے القاب میں یہ واضح ہوتے ہیں کہ قریب قریب تمام جنوبی ساحل کا علاقہ اس میں داخل تھا۔ چوتھی صدی عیسوی میں اہل حبشہ نے حملہ کیا اور تخمیناً سنہ ۳۴۰ سے سنہ ۳۷۸ء تک ملک پر قابض رہے لیکن اس کے بعد پھر حمیری بادشاہ آ گئے اور سنہ ۵۲۵ء تک حکومت کرتے رہے۔ حبشی

بادشاہوں نے اکسومی کتبات میں دعویٰ کیا ہے کہ وہ " اکسوم، حمیر، ریدان، حبشہ، سلح[۵۱] اور تہامہ " کے بادشاہ ہوگئے تھے۔ ان کا یہ حملہ بھی پہلا نہ تھا بلکہ چند صدی پہلے (یعنی قبل مسیح تیسری اور دوسری صدی میں) بھی وہ جنوبی عرب کے بعض اقطاع پر کچھ مدت کے لئے ضرور قابض ہوگئے تھے ؛

کتبات سے ہمیں تو حمیری بادشاہوں کے نام معلوم ہوئے۔ اسلامی ادبیات میں تبع کا لفظ سلامت رہا۔ یہ شاہی لقب تھا۔ لیکن بعد کے عربی افسانوں میں سب سے زیادہ شمر یرعش معروف ہوا جس کی نسبت کہا جاتا تھا کہ سمرقند تک پہنچا۔ اُسے فتح کیا اور اسی کے نام پر یہ شہر موسوم ہوا۔ ایک اور ابوکرب اسعد (یا ابی کریب اسعد) جو تخمیناً ۳۸۵ء تا ۴۲۰ء حکومت کرتا رہا، ایران کا فاتح بیان کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں آخر میں اس نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ عربی گیتوں میں جن بہادروں کے کارنامے گائے جاتے ہیں، انہی میں اس کا نام یاد رکھا گیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ حمیری خاندان کے اسی آخری دور میں یہودی اور نصرانی مذہب یمن میں داخل ہوئے ؛

اہل یمن کا مذہب

جنوبی عرب کا مذہب درحقیقت اجرام فلکی کے نظام پر مبنی تھا اور اس میں چندر دیوتا کی پرستش زیادہ عام تھی۔ ان کے سب دیوتاؤں کا سردار وہی مانا جاتا تھا۔ حمیری اسے سین کہتے تھے۔ مناتی، ودّ موسوم

---

۵۱ سلح سے حضرموت مراد ہے۔ دیکھو ٹائیل سن: ہانڈ بخ۔ ج ۱ ص ۱۰۸

کرتے تھے (یعنی محبت یا محبت کرنے والا، باپ) سبا کی اصطلاح اِل مقہ تھی (شاید تندرستی دینے والے دیوتا کے معنی میں) اور قطبانی اسے عَم (= چچا) پکارتے تھے۔ وہ نر مانا جاتا تھا اور شمس پر جو اس کی بیوی تھی، فوقیت رکھتا تھا۔ اِن کا بیٹا عشتر ہوا۔ (یہ زہرہ کا نام تھا جو بابل میں اِشتر، اہل فنیقیہ میں عشترت دیوی، کے مطابق ہے) چاند سورج کے جوڑے سے اور بھی آسمانی اجرام پیدا ہوئے جن میں خدائی صفات فرض کی جاتی تھیں لیکن اصل حکومت چاند، سورج اور عشتر کی مانتے تھے۔ شمالی عرب کا لات دیوتا جس کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے، ممکن ہے کہ سورج دیوی کا دوسرا نام ہو۔

بالکل آغاز ہی میں مونوفیزی، یعنی حلولی قسم کی مسیحیت شمال، خصوصاً ملک شام کی طرف سے رِس رِس کے عرب میں آنے لگی تھی۔ عجب نہیں شامی دعاۃ دشمنوں کے جبر و تشدد سے فرار ہو کر کبھی کبھی یمن پہنچے ہوں جن کا ہمیں علم نہیں ہوا۔ لیکن سب سے پہلی دینی سفارت جس کا ہم حال پڑھتے ہیں امپراطور قسطنطین نے ۳۵۶ء میں جنوبی عرب کو بھیجی تھی۔ اس کا سرگروہ اریا کا باشندہ تھیوفی لوس اِندوس تھا۔ سفارت کی تہ میں اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست اور ایران و روما کے (جنوبی عرب میں) حلقۂ اثر پھیلانے کی رقابت کارفرما تھی۔ بارے تھیوفی لوس نے ایک عدن میں اور دو حمیری علاقے میں گرجا بنوا دئے۔ ۵۰۰ء میں اہل نجران نے حلولی مذہب قبول کیا۔ کہتے ہیں یہ نیا دین کوئی شامی درویش مسمّی فیمیون لایا تھا جسے ابن ہشام و طبری کی افسانوی روایت کے بموجب ایک عرب قافلے کے لوگ لا اُٹھا لائے تھے۔ ریاست نجران کے

[illegible]

حاکم نے نجران کے عیسائیوں کو شامی زبان میں تسکین آمیز خط لکھا (سنہ ۶۵۱ء) ظہور اسلام کے بعد حضرت عمرؓ نے ان سب کو جو اسلام نہ لائے، حکماً عراق بھیج دیا۔[1] لیکن یمن میں بہت بعد یعنی سنہ ۸۴۰ء تک ہم ایک ماربطرس، اسقف صنعا کا نام سنتے ہیں۔

حمیری خاندان کی دوسری بادشاہی میں یہودیت بھی یمن میں خوب پھیلی۔ ممکن ہے یہ تی تس کی فتح فلسطین اور یروشلم کو تاراج کرنے (سنہ ۷۰ء) کے عواقب میں ہو کیوں کہ اس میں شبہ نہیں کہ شمالی عرب میں وہ دوسری تیسری صدی عیسوی ہی میں نفوذ کر گئی تھی۔ ناموں سے جو محفوظ رہے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب کے اکثر یہودی نسلاً ارامی اور عرب ہوں گے جنھوں نے یہ دین قبول کر لیا تھا، وہ اسرائیلی نسل سے نہ تھے۔ بہرحال چھٹی صدی کے آغاز میں یمن پر یہودیت کا اتنا غلبہ ہوا کہ آخری حمیری بادشاہ ذو نواس، (تبع اسعد کامل کی اولاد میں) یہودی ہو گیا تھا۔
62 کتاب ہذا کی تالیف کے وقت تک یمن میں ان کی آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

جنوبی عرب کے نئے یہود و نصاریٰ میں باہمی رقابت نے جنگ و جدال کی نوبت پہنچا دی۔ معلوم ہوتا ہے ذو نواس وطنی عیسائیوں کو بھی حبشی عیسائیوں کا ساتھی سمجھتا اور اپنی ساری قوم کی طرح ان سے نفرت کرتا تھا۔ نجران کے عیسائیوں کا اکتوبر سنہ ۵۲۵ء میں قتل عام اسی یہودی بادشاہ سے منسوب ہے۔ (سورہ بروج : ۴)[2] دوس ذو ثعلبان نج

---

[1] بلاذری، فتوح ص ۶۴ جتی " اور ی جتی " ص ۱۰۱ نیز دیکھو باب ۱۵ کتاب ہذا۔
[2] دیکھو ایکسل موبرگ کی " دی بک اوف دی ہم یرائٹس "

نکلا تھا۔ اس نے بای زنطی بادشاہ جسٹین اول سے مدد کی التجا کی جسٹین نے حبش کے نجاشی کو لکھا۔ (کتبوں میں اس کا نام کلب الااصبح آیا ہے) مسیحی قوت کا مقام فساد سے قریب ترین نمائندہ وہی تھا۔ کہتے ہیں اس نے ستر ہزار فوج ایک شخص اریاط کی سپہ سالاری میں بحر قلزم کے پار بھیجی۔ اس طرح یہ معرکہ آرائی بھی اس وقت کی بین الاقوامی شطرنج کی ایک بازی معلوم ہوتی ہے کہ گویا دولت بای زنطہ حبشہ کی وساطت سے عرب قبائل کو اپنے زیر اثر لانے اور ایران سے لڑانے کی تدبیر کر رہی ہے[1] حبشیوں کو ۵۲۳ء اور ۵۲۵ء میں فتح حاصل ہوئی۔ دوسرے موقع پر ان کا سردار ابرہہ تھا (یہ ابراہیم ہی کی دوسری صورت ہے) وہ پہلے اریاط کے ماتحت رہا پھر اس سے لڑکر پوری فوج کا سپہ سالار ہو گیا تھا۔ طبری کی روایت ہے کہ یمن کے بادشاہ ذونواس نے گھوڑے کے ایڑ لگائی اور سمندر میں ایسا کودا کہ پھر مرکب و راکب کی صورت نظر نہ آئی[2] آخری حمیری بادشاہ کا یہ حشر ہوا۔ اسی کے ساتھ یمن کی خود مختاری ختم ہو گئی۔ اس خاندان کے پر شکوہ دور کی یادگار اب فقط ایک گم نام سا قبیلہ حمیر عدن کے شرق میں باقی ہے۔

حبشیوں کی حکومت

حبشی مدد دینے آئے تھے مگر جیسا اکثر ہوا ہے فاتح بن کے جم گئے۔ وہ ۵۲۵ء سے ۵۷۵ء تک ان اقطاع پر قابض اور اپنی بستیاں

---

[1] پروکوپیوس: ہسٹری اوف دی وارز (مترجمہ ڈیونگ) جز پنجاہ۔ باب ۲۰۔

[2] جلد اول۔ ص ۹۲۷

بساتے رہے[۱] جہاں سے زمانۂ دراز پہلے اُن کے اجداد افریقہ پہنچے تھے۔ اَبرہہ، جنوبی عرب کا والی مان لیا گیا اور اپنے نئے صدر مقام صَنعا میں اُس نے وہ شان دار کلیسا تعمیر کیا جو زیر نظر عہد کے سب سے عظیم گرجوں میں شمار ہوتا تھا۔ عرب مصنف اسے ال قلیس (یا ال قُلّس۔ یونانی "اِک کلیسیا" بہ معنی گرجا) لکھتے ہیں۔ یہ قدیم مآرب کی
64 شکستہ عمارات کے ملبے سے تعمیر ہوا تھا۔ اب محلّ وقوع کے سوا اس کے آثار تک نہیں ملتے؛ شواہد کہتے ہیں کہ حبشی عیسائی ملک بھر میں اپنا دین پھیلانا اور جاہلی مکّے کا جواب تیار کرنا چاہتے تھے جو شمال کا سب سے بڑا تیرتھ تھا۔ شہر مکّہ اور وہاں کے راستوں میں جو بستیاں آتی تھیں اُن کو اس تیرتھ سے بڑا نفع ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے حبشی حاکموں کو جنوب میں ایسی زیارت گاہ قائم کرنے میں جہاں کثرت سے زائرین جانے لگے، خوب کام یابی ہوئی اور حجاز کی تیرتھ یاترا کو نقصان پہنچا۔ اس باہمی مذہبی رقابت کی شہادت ایک مقامی روایت میں موجود ہے کہ قبیلۂ فُقیَم کے دو عربوں نے جو کعبۂ مکّہ کے بُت پوجنے والوں میں تھے، عین کسی تہوار کے دن صَنعا کے گرجا کو ناپاک کر دیا جس کے بدلے میں اَبرہہ مکّے پر تادیبی مہم لے گیا۔ یہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی ولادت کے سال ۵۷۰ یا ۵۷۱ء کا واقعہ بتایا جاتا ہے اور اسے ہاتھیوں کا سال ("عام الفیل") کہنے لگے ہیں کیوں کہ اَبرہہ کی فوج میں ہاتھی بھی تھے جنھیں دیکھ کر حجازی عرب بہت مرعوب ہوئے کیوں کہ اس ملک میں پہلے کبھی ہاتھی نہیں دیکھے گئے تھے۔ حبشی فوج چیچک سے ہلاک ہوئی جسے

---

[۱] پروکوپیوس، جزو پنجاہ، باب ۲۰۔

قرآن مجید میں "کنکریاں" (سجیل) کہا گیا ہے[۱]۔

سدِ مآرب کا ٹوٹ جانا

مآرب کے بڑے بند کا ٹوٹنا بھی یقیناً اسی زمانے کا یادگار واقعہ ہے اسلامی ادبیات میں اس عظیم بند کے طوفانِ عظیم سے پھٹ جانے کو اس خوبی سے قلم بند کیا گیا ہے کہ فراموش نہیں ہو سکتا[۲]۔ الاصفہانی نے اپنے وقائع (تالیف ۹۶۱ء) کا آٹھواں جز ملوکِ حمیری سے مختص کیا اور بند ٹوٹنے کا زمانہ اسلام سے چار صدی پہلے بتایا ہے[۳]۔ لیکن یاقوت کا بیان صحت سے قریب تر ہے کہ وہ اسے حبشیوں کے دور میں رکھتا ہے[۴]۔ بند کے آثار آج تک نظر آتے ہیں۔ جنوبی عرب میں ابرہہ کا ایک کتبہ جس کی تاریخ ۵۴۲ء سے مطابقت رکھتی ہے، گلازر کے ہاتھ آیا اور اس نے شائع کر دیا۔ اس میں بند کے ایک رخنے کی کیفیت لکھی ہے[۵]۔ ابرہہ سے قبل ۴۵۰ء میں پانی نے بند کو توڑا اور ایک رخنہ ڈال دیا تھا۔ مگر پھر اس کی مرمت کر دی گئی۔ آخری حادثہ، ہالکہ جس کی قرآن شریف (سورہ سبا: ۱۵ و ۱۶) میں تلمیح آتی ہے، یقیناً ۵۴۲ء اور ۵۷۰ء کے درمیان ہوا۔ بند کے کسی پہلے رخنے سے بنی غسان اور بنو لخم کی ہجرت کا بھی تعلق ہے کہ یہاں سے اٹھ کر غسانی تو شام کے علاقہ حوران میں آباد ہوئے اور سلطنت ہوم

---

[۱] سورۃ الفیل۔ ۱۰۵: ۴۔ دیکھو طبری کی تفسیر القرآن (جلد سیزدہم) نیز سیرت ابن ہشام ص ۳۶

[۲] دیکھو سورہ سبا: ۱۵ و ۱۶ — [۳] ص ۱۳۶

[۴] ج ۴ ص ۳۸۳۔

[۵] ہر فلوک کے "بیٹے اور نگنے ....." میں ۱۸۹۶ء ص ۳۶۰ وغیرہ۔

کا قوت بازو بنے اور بنی لخم نے حیرہ کا علاقہ بسایا جہاں سے جنوبی عربی کے کئی کتابے حال میں کھود کر نکالے گئے ہیں ۔ بنی غسان نے اپنا نیا سن ہی بندِ مآرب کے ٹوٹنے کے سال سے شروع کیا تھا[1] شام میں آج بھی ایسے خاندان موجود ہیں جو یہاں اپنی آمد کا اسی واقعے تک سراغ لگاتے ہیں۔ غسان اور (شام وعراق کے) تنوخ قبائل کے علاوہ شمالی اور وسطی عرب بنی طے اور کندہ جیسے کئی بڑے اور طاقت ور قبیلے دعوے کرتے ہیں کہ جنوبی عرب سے آئے تھے ۔

بعد میں عربوں کی قوت متخیلہ نے اسی ہوش رُبا طوفان اور سدِ مآرب کے ٹوٹنے کو جنوبی عرب کی تجارت ، زراعت[2] خوش حالی اور قومی تمدن کی تباہی کا سبب قرار دیا ، حال آں کہ یہ ایک عرصے کے زوال و انحطاط کا نتیجہ تھے اور جیسا کہ ہم اوپر پڑھ چکے ہیں رومی جہازوں کا بحر قلزم میں پہنچنا ، نئے مذاہب کے تفرقہ انگیز اثرات اور آخر میں اجانب کی حکومت ، زوال کا سبب ہوئے تھے ۔ سدِ مآرب کا شق ہونا رفتہ رفتہ افسانوی رنگ اختیار کر گیا مگر تجزیہ کیا جائے تو شاید اسی کی تہ میں ان اقتصادی اور عمرانی اسباب کا پتہ چل جائے گا جو مدت دراز تک جنوبی عرب کی قوم کو ضعیف و پراگندہ کرتے رہے یہاں تک کہ وہ بالکل تباہ ہو گئی ۔ یہ افسانہ گویا ان کے زوال کی تمام طویل سرگزشت کو یکجا کرنے اور پُر اثر بنانے کی سعی ہو لطف یہ کہ وقائع نگاروں[3] نے

---

[1] دیکھو مسعودی کی کتاب التنبیہ — (لائیڈن ۱۸۹۴ء) ص ۲۰۲

[2] خشک سالی کے نظریے کی تاریخی زمانے کے علمی مشاہدات پوری طرح تائید نہیں کرتے ۔

[3] مسعودی: "مروج" ج ۳ ص ۳۸۳ ۔ یاقوت: "بلدان" ج ۴ ص ۳۸۳ ۔

اس مصیبت عظمیٰ کا سبب یہ روایت کیا ہے کہ ایک چوہے نے بند کا اتنا بڑا پتھر اپنی جگہ سے ہٹا دیا جسے پچاس آدمی مل کر نہ ہلا سکتے تھے اور اسی کے ہٹ جانے سے پورا بند ٹوٹتا چلا گیا۔ یہ گویا در پردہ اس بات کا اقرار ہے کہ بند کے ٹوٹنے کی اصلی وجہ کا ٹھیک پتہ نہ چل سکا۔ روایت کے بموجب مُوزَےقیا، (= عمرو ابن عامر ماء السماء) اُس وقت فرماں روا تھا جب کہ اس چوہے نے یہ عظیم اور انقلاب آفریں کام انجام دیا +

ایرانی دَور

الیمن کو حبشیوں کے پنجے سے چھڑانے کی قومی تحریک کا شور ما، روایتوں میں سیف ابن ذی یزن کو بتایا گیا ہے جو حِمیَری خاندان شاہی کا فرد تھا۔ اُس کی سیرت عرب کی قومی داستانوں میں ایک مقام رکھتی ہے۔ چودھویں صدی کے دوران میں اسے مصر میں جِلا دے کر از سر نو مرتب کیا گیا تھا اور آج بھی قاہرہ، بیروت، بغداد کے قہوہ خانوں میں قصہ خوان اسے 66 دہراتے سُنے جاتے ہیں۔ حسب روایت سیف نے قسطنطنیہ سے بھی حبشیوں کے خلاف مدد چاہی تھی مگر ظاہر ہے کہ کامیاب نہ ہوا۔ حبشہ کی حکومت عیسائی اور اسی لئے بازنطہ کی دوست دار تھی۔ تب حیرہ کے عرب رئیس نے سیف کو ایران کے فرماں روا کسریٰ نوشیرواں کے دربار میں بہ مقام مدائن پیش کیا۔ دُنیا کی قسمتیں اُن دنوں بہت کچھ مسیحی بازنطہ اور مجوسی ایران ہی کے قبضے میں تھیں حبشہ (= اکسوم) بائی زنطہ کا غیر سرکاری گماشتہ تھا۔ مسیحی عرب بازنطہ کی طرف تھے اور حفاظت و اعانت کے لئے ان کی نظر قسطنطنیہ پر رہتی تھی۔ یہودی اور جاہلی عرب، ایران کے حامی اور مدائن سے امداد کے امیدوار تھے۔ چنانچہ سیف کی التجا پر کسریٰ

نے ۵۷۵ء میں آٹھ سو سپاہی روانہ کئے۔ ان کا سردار وہ رز تھا۔ یمن میں حبشیوں کی حفاظتی فوج کو ایرانیوں نے شکست دے کر بھگا دیا اور طلوں افریقہ والوں سے ملک کو نجات دلادی۔ شروع میں مشترکہ قسم کی حکومت قائم کی گئی۔ سیف رسمی طور پر حاکم مقرر ہوا اور قصر غمدان میں سکونت اختیار کی جو حبشیوں کے زمانے میں بظاہر ویران ہوگیا تھا۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد یمن کو ایرانی ولایت (ست راپی) کی شکل دے دی گئی اور جنوبی عربوں کو معلوم ہوگیا کہ صرف آقا بدل گئے ورنہ وہ اب بھی محکوم ہیں۔

اس روایت میں واضح طور پر یہ حقیقت محفوظ ہو کر عرب کے دونوں جانب، زرتشتی ایران اور مسیحی حبشہ کی حکومتوں میں رقیبانہ کش مکش ہوئی کہ جنوبی عرب کی مردہ مملکت کے وارث ہو جائیں۔ مسیحی عربوں کا بائی زنطہ کی جانب میلان تھا جس نے حبشہ کو دخل اندازی کا موقع دیا۔ یہودی اور جاہلی (مشرک) عرب، ایران کی طرف جھکے جس کی وجہ سے ایرانیوں کا قابو چل گیا۔ شمالی صحرا نے اُدھر سے حملہ آوروں کا راستہ روک رکھا تھا لیکن جنوبی عرب نے ایک دروازہ تیار کر دیا جہاں سے بیرونی طاقتوں کو جزیرہ نما میں آنے کا راستہ مل گیا۔ ہجرت کے چھٹے سال، یعنی ۶۲۸ء میں ایران کے پانچویں والیٔ یمن، باذان نے اسلام قبول کیا۔ اس نئے مذہب کے ظہور سے سب کی توجہ کا مرکز شمالی عرب ہوگیا اور آئندہ عرب کی تاریخ بھی شمال ہی کے حوادث سے رہی۔ لوگوں کی نظریں یمن سے ہٹ کر حجاز پر لگ گئیں۔

باب ششم

شمال اور وسط عرب کی ریاستیں

۱۔ نبطی قوم

جنوبی عرب کے شاہی خاندانوں کے علاوہ، جزیرہ نما کے شمال اور وسط میں بھی عہد ماقبل اسلام میں کئی آزاد ریاستیں صورت پذیر ہوئیں شمالی ریاستوں کی قوت بھی جنوب کی طرح تجارت پر مبنی تھی اور وہ اپنی بنا یا نشوونما میں کسی طرح عسکری نہیں کہی جاسکتیں۔ ان میں سب سے پہلی نبطیوں کی مملکت تھی؛ ان پر ہم کسی اشوری حملے کا ذکر نہیں پڑھتے سبب یہ کہ وہ مغرب کی بڑی شاہ راہ پر نہ تھے۔ وہ چھٹی صدی قبل مسیح میں صحرائی قوم کے طور پر اس علاقے میں آئے جو اب شرق اردن کہلاتا ہے اور ادومی قوم کی اراضی اور آخر میں شہر بترا پر قبضہ کرلیا۔ نبطیوں کا قدیم نام ال انباط بعد یونانی رومی کتابوں میں "نبے تے ری" آیا ہے[1]

---

[1] عبرانی لفظ "نبے بایوث" اور اشوری "نبے تا ی" یا "نبے بے تو" کا اس نبطی سے بظاہر کچھ تعلق نہیں ہے۔

ادومی (حضرت یعقوب کے بڑے بھائی آدوم یا عیسو کی اولاد) بھی خطۂ "کوہ سیر" میں ہوریت (= حُرّی[1]) قوم کے جانشین ہوئے تھے۔ اب نبطیوں نے ان کی جگہ لی اور بترا کے نواحی اقطاع پر بڑھ کر قابض ہو گئے۔ بترا بمعنی چٹان، عبرانی سلع کا یونانی ترجمہ ہے۔ سلع کا نام اشعیا اور ملوک ثانی (توراۃ) میں مذکور ہے[2] اسے عربی میں ال رقیم کہتے ہیں[3] اور آج کل "وادیٔ موسیٰ" موسوم ہے۔ پرانا شہر جو تین ہزار فیٹ بلند خشک پہاڑی پر دریافت ہوا شہر خموشاں کا منظر پیش کرتا ہے۔ اسے پہاڑ تراش کر بنایا تھا اور پہاڑ کے بھربھرے پتھر کی مختلف تہیں روشنی میں خاصے قوس قزح جیسے کئی کئی رنگ دکھاتی ہیں۔ چوتھی صدی قبل مسیح سے چارسو سال، بلکہ زیادہ مدت تک یہ شہر سبا اور بحر متوسط کے کاروانی راستے پر کلیدی شہر کا مرتبہ رکھتا تھا۔

68 نبطیوں کا پہلا مفصل احوال ہمیں داؤ دورس سی کلوس (صقلی) کی کتاب (تخمیناً ۵۰ ق م کے بعد) میں ملتا ہے۔ ۳۱۲ ق م کے قریب تک وہ اتنے طاقت ور تھے کہ شام میں ان تی گونوس سکندر اعظم کا جانشین بادشاہ ہوا تو اُس کی فوج کے دو حملے روکے اور مظفر و منصور اپنی "پہاڑی" پر واپس آئے۔ پھر وہ مصر کے بطلی موسی بادشاہوں کے حلقۂ اثر میں رہے اور آگے چل کر سلطنت روما کے حلیف بن گئے۔ گالوس نے عرب پر ۲۴ ق م میں چڑھائی کی تو یہ برائے نام تعاون کرتے رہے لیکن رومیوں سے

[1] تکوین۔ ۱۴ : ۶، وغیرہ۔ [2] ۱۶ : ۱ وغیرہ نیز دیکھو وقائع ثانی ۲۵ : ۱۲ — ارمیا ۴۹ : ۱۶ وغیرہ۔

[3] دیکھو جوزفس: "این ٹی کوائی ٹیز" ج ۴ باب ۷۔

ان کا قریبی رابطہ حارثت (= حارث، ارتاس ثالث، تخمیناً ۸۷ء تا ۶۲ ق م) کے عہد حکومت میں قائم، اور اسی عہد میں اُن کا شاہی سکہ پہلی دفعہ ضرب ہوا۔ ۴۷ء ق م میں جولیس قیصر نے نبطی بادشاہ مالکو (= مالک، مال کوس اوّل) سے جنگ سکندریہ کے لیے سوار بھیجنے کی فرمائش کی۔ اس کا وارث عُبیدت (= عُبیدہ، اوبوڈس، تخمینًا ۲۸ء تا ۹ء ق م) گالوس کی عربی مہم کے وقت حکومت کرتا تھا۔ لیکن بتری مملکت کو انتہائی عروج حارثت۔ (= حاری ثتہ) رابع (تخمینًا ۹ء ق م تا ۴۰ء) کے عہد میں حاصل ہوا۔ ولادتِ مسیحؑ کے وقت یہ مملکت شمال میں دمشق تک وسیع ہوگئی تھی۔ اس شہر کو نشیبی شام سمیت حارثت ثالث ہی نے سل یوکی خاندان کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔ (تخ ۸۵ء ق م) اسی حارثت رابع کا ایک محتسب تھا جس نے پولوس (ولی) کو دمشق میں گرفتار کرنے کی کوشش کی[1] شمالی حجاز کا ال حجر (= مدائن صالح) پہلی صدی عیسوی میں یقیناً نبطی مملکت میں داخل ہوگا جس کی شہادت وہاں کے کتابے دیتے ہیں۔ حارثت اوّل (۱۶۹ء ق م) سے آخری خود مختار بادشاہ رتبیل (= کرتبیل) ثانی (۷۱ء تا ۱۰۶ء) تک جملہ نبطی ملوک کے نام ہمیں معلوم ہیں[2] ۱۰۵ء میں رومی قیصر تراجن نے ان کی خود مختاری کا خاتمہ کیا اور اگلے سال یہ مملکت باضابطہ رومی صوبہ بن گئی۔

دالیو دورس کے بعد نبطیوں کے متعلق ہماری معلومات کا بڑا ماخذ جوزِفس (= یوسیفوس) (تخ ۹۵ء) ہے گر وہ اُن سے وہیں تک واسطہ رکھتا ہے

---

[1] انجیل۔ کورنتھی۔ ۱۱: ۳۲۔

[2] دیکھو کوک کی فہرست "ٹیکسٹ بک آف نارتھ سیمیٹک انسکرپشنز" صفحہ ۲۱۶۔

نقشہ نمبر ۳


ملک عرب کی سطح
زروعہ
صحرا
ریگستان
بحر روم
خلیج فارس
خلیج عدن
افریقہ

جہاں تک کہ وہ یہودیوں سے معرکہ آرا ہوئے۔ اس کی دانست میں ملک
عرب سے نبطی مملکت مراد تھی جو مشرق میں فرات تک پھیلی ہوئی تھی مال کوس
(یہ عربی مالک) کو وہ شاہ عرب لکھتا ہے[۵۱] جس کی شاہ ہیرود اور اس کا
باپ حمایت کرتے رہے۔ وہ اور مال کوس ثانی جس نے ۶۷ء میں تی تس
کی یروشلم پر فوج کشی میں ایک ہزار سوار، پانچ ہزار پیادہ فوج سے مدد
کی[۵۲]، دونوں نبطی تھے۔ توراۃ کے صحیفہ مکابیں اول و ثانی میں نبطیوں کو
عرب شناخت کیا گیا ہے (۵: ۲۵۔ اور ۵: ۸) آج کل کے حویطات 25
بدو نبطیوں کی اولاد سمجھے جاتے ہیں۔

نبطیوں کی روزمرہ کی بولی عربی تھی لیکن عربی رسم الخط موجود نہ
ہونے کی وجہ سے وہ اپنے شمالی ہمسایوں کے ارامی حروف استعمال
کرتے تھے۔ دایودورس نے ان کے ایک خط کی نسبت لکھا ہے کہ "سریانی
حروف" میں ان تی گونس کے نام بھیجا گیا تھا[۵۳]۔ ان کی علمی زبان ارامی
تھی، اور کتبات میں عربی الفاظ (جیسے غیر) یا اعلام لکھنے میں جو غلطیاں
پائی گئی ہیں، انہی سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ لکھنے والوں کی اصلی زبان
عربی تھی۔ نبطیوں کا شکستہ خط ارامی سے ماخوذ تھا اور تیسری صدی
عیسوی میں یہی شمالی عربی کا رسم الخط بن گیا۔ شمالی عربی سے قرآن مجید
کی اور آج کل کی عربی زبان مراد ہیں۔ اسی خط نے بدلتے بدلتے گول نسخ
کی صورت اختیار کی جو کوفی سے بالکل الگ ہے۔ کوفی شہر کوفے میں تیار ہوا

---

[۵۱] "اینٹی کوئی ٹیز" ج ۱۴ باب ۱۴ — وغیرہ۔

[۵۲] "جواش وار" ج ۳ باب ۴۔

[۵۳] ۱۹۔ باب ۹۴۔

اور سیدھے خطوط یا زاویوں میں لکھا جاتا تھا۔ قدیم سکّے، کتبے، سرکاری دستاویزیں اور قرآن مجید لکھنے میں یہی کوفی خط استعمال کرتے تھے۔ عربی کا ایک نہایت قدیم کتبہ، مشرقی حوران میں ال نمارہ سے برآمد ہوا جس کا زمانہ ۳۲۸ء تک پہنچتا ہے۔ یہ حیرہ کے ایک لخمی بادشاہ امراؤالقیس کی قبر کی لوح پر لکھا گیا تھا۔ کتبات کے سوا نبطیوں کی اور کوئی تحریر ہم تک نہیں پہنچی۔

حروف تہجی کی سینائی اصلیّت

جزیرہ نمائے سینا نبطیوں کے وطن سے قریب، (موسوی) احکام عشرہ کی اشاعت کا مقام تھا۔ گذشتہ چند سال میں یہاں (سرابیط الخادم) سے حروف تہجی کے سب سے پرانے کتبے برآمد ہوئے اور قاہرہ کے عجائب خانے میں بھیجے گئے ہیں۔ انھیں پڑھنے کی بہت کوششیں کی جاچکی ہیں۔ یہ تحریر سینا کے کان کنوں نے کندہ کی تھی جو وہاں فیروزہ کی کان کھودتے تھے۔ اس طرح یہ کتبہ ۱۸۵۰ ق م کے قریب، یعنی احی رام کے جُبیلی کتابے سے چھ صدی پیشتر، تحریر ہوا۔ جُبیل (قدیم گبل، یونانی "بی بلوس") کا کتبہ مونٹیٹ نے دریافت کیا اور صرف ایک قدیم فنیقی کتبے سے جواب تک ملا، متاخر مانا گیا ہے۔

سینائی حروف ایجاد ہونے کے بعد شمالی شام میں پہنچے اور وہاں انھیں واقعی پیکانی یا میخی صورت میں تبدیل کیا گیا۔ را کی ال شمرہ کی لوحیں اس کا ثبوت ہیں۔ یہ پندرھویں صدی قبل مسیح کے اواخر میں تیار کی گئی تھیں[1]۔ یہ رسم الخط جو حال میں دریافت ہوا، صاف طور پر صوتی

[1] ملاحظہ ہو ونٹ: "اے اسٹڈی اوف دی لہ یانائٹ اینڈ تمودک انسکرپشنز" (لندن ۱۹۳۷ء) ص ۵۳

اور سامی ہے۔ اگرچہ گیلی تختیوں پر کیل سے لکھا گیا، لیکن حروف سُمیری
یا اکادی خط سے نقل نہیں کئے بلکہ سینائی حروف کو ہیکلانی شکل کی علامتوں 71
میں رواج دیا گیا ہے۔ جدید اہل تحقیق کی ایک زمانے تک یہ راے
رہی کہ فنیقیہ والے جنھوں نے سب سے پہلے حروف تہجی سے کام لیا،
ضرور مصر کے ہیروغلیفی خط کی بنا پر یہ نیا طریقہ نکال سکے ہوں گے لیکن
تحریر کے اِن دونوں طریقوں کے درمیان بڑا بُعد زمانی پایا جاتا تھا۔
اب ان کے بیچ کی کڑی سینائی خط نکل آیا ہے۔ مثال کے طور پر سینا کے
سامیوں نے بیل کے سر کی ہیروغلیفی علامت کو اپنی زبان کا نام "اَلِف"
تجویز کیا۔ اصل مصری میں کیا مطلب تھا۔ اس سے کچھ سروکار نہ رکھا۔
پھر صوتِ اوّل کے اصول پر اس کی آواز "اَ" مقرر کرلی۔ اسی طرح
خانہ کی مصری شکل کو وہ بَیت کہتے تھے، اسے پہلی آواز کے مطابق "ب"
بنالیا۔ دقِس علی ہٰذا۔ حروف تہجی کی یہ سینائی ایجاد، اس گتھی کو سلجھا دیتی
ہے کہ یہ تحریر کس طرح ایک طرف تو جنوبی عرب میں پہنچی اور وہاں مِنائیوں
نے اس کو بہ طور خود بہت پہلے (یعنی بارھویں صدی قبل مسیحی میں) ترقی
دی اور دوسری طرف یہ شمال میں فنیقیہ (شام) کے ساحل تک ان
عربوں کی وساطت سے آئی جو فیروزہ بیچنے یہاں آتے تھے۔ پھر ٹھیک
اسی طرح کچھ مدت بعد فنیقی تاجروں کے ذریعے یونان گئی جہاں سے چل کر
اسے تمام یورپ کے حروف کی ماں بننا مقدر تھا۔

حوران کے آتش فشانی علاقے، صفا سے جو کتبات نکلے وہ پہلی
صدی عیسوی، بلکہ اور بعد تک کے ہیں لیکن ان کی تحریر وہی جنوبی
عرب کے خط میں ہے جو حجاز کے شمال میں اَلعلا کی قدیم تر عربی یا ثمودی

عبارتوں میں استعمال ہوئی ہے، حال آں کہ ال عُلا کے کتبے ساتویں سے تیسری صدی قبل مسیح کے اور ثمودی، خصوصاً حِجر و تیما کے، کتبوں کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیحی سے چوتھی صدی عیسوی تک پھیلتا ہے۔ حروف کی شکلوں میں خفیف فرق ہے لیکن ان سب کتبات کی زبان شمالی عربی ہے جو ہماری معیاری زبان سے بہت معمولی اختلاف رکھتی ہے۔ ثمودی طغرے لحیانی تحریر سے بنائے گئے ہیں اور اسی کو دوسری طرح ترقی دے کر صَفا کے طغرے تیار کئے گئے ہیں۔ یہاں کے کتبے جنوبی
عربی (یا مناٸی) رسم الخط کے سب سے شمالی کتبے ہیں۔ مغرب میں 72
جنوبی عربی رسم الخط حبشی تحریر میں بھی سلامت ہے۔

صفائی، لحیانی اور ثمودی قوموں میں تاریخی تعلقات کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہیں چلتا۔ یہ تینوں شمالی عرب میں رہتی اور جیسا کہ اوپر بیان ہوا ایک ہی زبان اور تحریر استعمال کرتی تھیں۔ لحیانیوں کو رومی مورخ پلی نی "لِخے اِنی" لکھتا ہے[1] یہ غالباً ثمود کی شاخ اور قدیم قوم تھے۔ ان کا صدر مقام دے دان، یمن سے ساحل بحر متوسط کی تجارتی شاہ راہ پر پہلے مِناٸی نوآبادی تھا۔ بِترا کے سقوط (۱۰۶ء) کے بعد معلوم ہوتا ہے لحیانی، نبطیوں کے مشہور مرکز ال حِجر پر بھی قابض ہو گئے تھے۔ یہ پہلے ثمودی بستی تھا۔ (آج کل مدائن صالح کہلاتا ہے) مِناٸی اور نبطی تمدن کا بعد کی لحیانی تہذیب پر بہت اثر پڑا۔ ال عُلا کے

---

[1] ج ۶- باب ۳۲-

[2] دیکھو اودار وگلاند کی جرمن کتاب تاریخ وجغرافیہ عرب پر (مطبوعہ برلن ۱۸۹۰ء) ج ۲ ص ۹۵ نیز فرانسیسی: "مشن آرکیالوجیک ان ارے بیہ" (پیرس ۱۹۰۹ء) ص ۲۵۰

کھنڈروں میں ایسی قبریں پائی جاتی ہیں جن پر بہت اچھی ابھرواں سنگ تراشی کی ہو انہی آثار سے، قبل اسلام ایک ترقی یافتہ تمدن کا پتہ چلتا ہو جس کا ابھی تک بہت کم علم ہوا ہو ؛

بترا

بترا کی دولت و خوش حالی پہلی صدی عیسوی میں کمال کو پہنچی۔ رومی اسے پارتھیہ اور اپنی سلطنت کے درمیان برزخی ریاست سمجھتے اور سرپرستی کرتے تھے۔ شہر بترا مشرق مغرب جنوب، یعنی تین طرف سے ناقابل تسخیر تھا۔ اسے جیتی چٹانیں کاٹ کر بنایا تھا۔ ہر جانب سیدھی ناقابل گزر پہاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے درمیان ایک تنگ پیچ دار درے سے آنے کا راستہ تھا۔ وسط عرب سے اُردن تک یہی ایک مقام تھا جہاں پانی نہ صرف بہ افراط بلکہ نہایت صاف اور تازہ تھا۔ جنوبی عرب کے شمال کو جانے والے قافلے یہاں اونٹ اور شتربان بدلتے تھے۔ اس طرح نبطی، جنوبی عرب والوں کی پرنفع تجارت و آسودگی کا ضروری واسطہ بن گئے تھے۔ بترا کے شان دار آثار آج بھی سیاحوں کو کھینچتے اور شرق اُردن کی جدید ریاست کی آمدنی کا بڑا معقول ذریعہ ہیں۔ بترا میں اپنا ایک الگ کعبہ بھی تھا۔ یعنی سب سے بڑا بت ایک چوکور سیاہ پتھر کی شکل میں "ذوشریٰ" کے نام سے پوجا جاتا تھا۔ سب سے بڑی دیوی اللات کو ہیرودوتس نے (یونان کی) "افرودیت یورانیا" قرار دیا ہی[1] ذوشریٰ کو بعد میں انگور سے نسبت دینے لگے تھے۔ نبطیوں میں اس کی کاشت یونانی دور میں شروع ہوئی۔ پھر ذوشریٰ بھی انگوری

---

[1] سلہ ۲۵ باب ۸

73 شراب کا دیوتا بن گیا اور اس میں یونانی باکوس کی ادائیں پیدا کرلی گئیں۔"

عیسوی دو صدیوں میں ہندستان کے بحری راستے سے رومی زیادہ واقف ہوتے گئے۔ قافلوں کا راستہ بھی بدل کر اور شمال میں تدمُر (= پامیرا) کے علاقے سے گزرنے لگا، تیسرے، شمال سے جنوب کا راستہ بھی اور زیادہ مشرق کی طرف اُدھر ہٹ گیا جو بعد میں حاجیوں کی اور جدید حجاز ریلوے کی راہ بنی۔ پس بترا کے مقام کو جو فوائد حاصل تھے، وہ جاتے رہے اور اس نبطی قوم کی ریاست میں زوال آگیا۔ رومی قیصر ٹراجن کی ناعاقبت اندیشی اور حرص کی بہ دولت شہری تسخیر (سنہ ۱۰۶ء) کے ساتھ پوری ریاست ("اربے بیا پیٹ ریا") سلطنت روما میں صوبۂ عرب کے نام سے ضم کرلی گئی (سنہ ۱۰۶ء) اور آیندہ صدیوں تک بترا کی تاریخ صفحہ سادہ رہ گئی[1]۔

۲۔ تدمُر

پارتھیہ کے عراق عرب فتح کرنے سے مغربی ایشیا کی سیاسی بساط کا رنگ کچھ اور ہوگیا۔ تجارت کے راستے جیساکہ اوپر بیان ہوا، بدل گئے۔ ان اسباب نے پہلی صدی عیسوی کے بعد ایک نئے شہر کو نمودار کیا جو صحرائے شام کے وسط میں ایک سرسبز قطعے میں واقع تھا اور اسی زمانے سے دنیا بھر میں مشہور ہوا۔ یہ شہر پامیرا (عربی تدمُر) ہے کہ آج بھی اس کے آثار قدیمہ سے جاہ و جلال ٹپکتا ہے اگرچہ عہد قدیم کے کسی کھنڈر کی تحقیقات اس قدر کم نہ کی گئی ہوگی جتنی ان کھنڈروں کی ہے۔

[1] حال میں العقبہ سے پچیس میل مشرق میں نبطیوں کے ایک مقام "ارم" کو شناخت کیا گیا کہ وہ قرآن مجید کا اِرَم ہے۔ (سورۂ والفجر۔ ۶ و ۷)

وہ پارتھیہ و روما کی دو حریف سلطنتوں کے بیچ میں واقع تھا۔ ان دونوں کا توازن قائم رہنے میں اور اپنی غیر جانب داری سے فائدہ اٹھانے پر اُس کی سلامتی منحصر تھی[1] میٹھے اور پہاڑی پانی کی یہاں افراط تھی اور جغرافی اعتبار سے ایسے مقام پر واقع تھا کہ نہ صرف مشرق و مغرب بلکہ جنوبی عرب سے شمال کے تجارتی راستے یہاں آملتے تھے۔ کتبات میں "میر کارواں" اور "میر بازار" کا معزز شہریوں کے طور پر بار بار نام آتا ہے[2] دوسری اور تیسری صدی عیسوی کے دَوران میں یہ صحرائی صدر مقام مشرق قریب کے سب سے دولت مند شہروں میں شمار ہونے لگا۔ اس کا ابتدائی سامی نام "تدمور" تھا اور وہ ضرور نہایت قدیم بستی ہوگا کہ تگ لث پی لسر اول (تخ ۱۱۰۰ ق م) کے ایک کتبے میں "ادمو کے تدمَر" کے نام سے مذکور ہے[3] عرب قصہ خوانوں پر اس کے کھنڈروں کا ایسا رُعب تھا کہ وہ اسے حضرت سلیمانؑ کے لیے جنوں کا بنایا ہوا شہر بتاتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے مقامی روایتوں میں بھی کسی کو یاد نہ رہا کہ یہ شہر عربوں کے قبضے میں کس وقت آیا۔ ہماری سب سے پہلی مستند اطلاع ۴۲-۴۱ ق م کی ہے جب کہ مارک انٹونی نے اس
کے مال و زر پر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ خود یہاں والوں 75
کا لکھا ہوا کتبہ جو اب تک مل سکا ۹ ق م تک جاتا ہے۔ اس وقت بھی تدمُر پارتھیہ اور روما کے درمیان تجارت کا اہم مرکز بن چکا تھا۔

---

[1] پلینی - ج ۵ باب ۲۱۔ [2] کوک - ص ۲۴۲

[3] ملکن پل - ج ۱ ص ۲۵۔ عبرانی وقائع نویس (وقائع ثانی ۸ : ۴) اور ملوک اوّل کے یونانی مترجم نے اسے ادومیہ کے شہر تمر سے ملتبس کر دیا ہے جسے سلیمانؑ نے بنایا تھا۔

روما کے بادشاہی دور کی بالکل ابتدا میں یہ شہر ضرور رومیوں کے سیاسی حلقہ اثر میں آگیا ہوگا کہ ہم ۱۳۷ء میں اس کے محاصل درآمد کی نسبت فرامین جاری ہوتے دیکھتے ہیں۔ ہادریاں کے عہد (۱۱۷ء تا ۱۳۸ء) میں یہ اپنے توابع کے ساتھ روما کا باج گزار تھا۔ سوے رس (۱۹۳ء تا ۲۱۱ء) نے تدمر اور اس کی بستیوں کو سلطنت کے صوبائی شہر بنالیا۔ تیسری صدی کے شروع میں یہ سب ایک مقبوضہ علاقہ ہوگیا تاہم تدمر کی انتظامی آزادی برقرار رہی۔ وہ روما کی برائے نام سیادت کا اعتراف کرتا تھا۔ رومیوں کو اس کی جنگی اہمیت کا پورا احساس تھا۔ دمشق سے فرات کو رومی سڑک اسی علاقے سے گزرتی تھی۔ انہی ایام میں اہل تدمر نے اپنے ناموں کے ساتھ رومی نام بڑھانے شروع کیے تھے۔

اُدے نث اور زنوبیا

تدمر کی شان شوکت کا زمانہ ۱۳۰ء تا ۲۷۰ء تھا۔ اس کے کتبہ دار آثار اکثر اسی زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس کی بین الاقوامی تجارت چین تک پھیلی اور کاروانی شہر ہونے کے اعتبار سے وہ پترا کا صحیح معنی میں جانشین ہوگیا؛ مگر اہل تدمر جنگ جوئی میں اس وقت تک امتیاز نہ رکھتے تھے جب تک کہ ان کے سردار اُدے نث (عربی، اُذَینہ) نے شاپور اول کو ملک شام سے نہ مار بھگایا اور خاص اس کے پائے تخت مدائن کی شہر پناہ تک بھگاتا ہوا نہ لے گیا۔ حال آں کہ اس ایرانی بادشاہ نے ۲۶۰ء میں رومی قیصر (ویلرئین) کو گرفتار کیا اور شام کا ایک حصہ فتح کرلیا تھا۔ پارتھیوں کے جانشین ساسانی ہوئے تھے

(۲۶۲ء) لیکن رومیوں سے کش مکش جاری رہی۔ اُدینے نث رومیوں کا طرف دار تھا اسی لئے ۲۶۲ء میں اسے مشرق میں شہنشاہ روما کا نائب ("ووک اوری ان تیس") مقرر کیا گیا اور قیصر گالئی نوس نے "امپراطور" کے لقب سے نوازا اور مشرق کے رومی جیوش کا حاکم اُسے تسلیم کیا۔ اس کے معنی یہ تھے کہ رسمی طور پر مصر و ایشیائے کوچک کا اقتدار اعلیٰ اُسی کے ہاتھ میں آگیا۔ شام، شمالی عرب (اور ممکن ہی ارمنیہ) واقعی اسی کے زیر نگیں تھے۔ گویا تدمُر کی مغربی ایشیا پر حکم رانی ہو گئی تھی۔ چار سال بعد اُدینے نث اور اس کے فرزند اکبر کو حِمص میں دغا سے مارڈالا گیا (۲۶۶-۲۶۷ء) عجب نہیں کہ اس میں روما کا بھی اشارہ ہو کیوں کہ وہاں کی حکومت اُدینے نث سے بدگمان ہو گئی تھی۔

76 اُدینے نث کی حسین و جاہ طلب بیوی زَنوبیا تھی (ارامی میں بث زبّی"۔ عربی میں الزبا، نیز زینب) اور وہ شوہر کے شایانِ شان بیوی ثابت ہوئی۔ اس نے چھوٹے بیٹے وہب اللات (یعنی لات کا عطیہ) کی طرف سے حکومت کی باگ سنبھالی۔ "ملکۂ مشرق" کے لقب کا ادعا کیا اور کچھ مدت تک رومی سلطنت کو بھی خاطر میں نہ لائی بلکہ مردانہ مستعدی کے ساتھ اپنی مملکت کی حدود بڑھا کر مصر اور ایشیائے کوچک کا بڑا حصہ دبانا چاہا اور ۲۷۰ء میں روما کی متعینہ فوجوں کو انقرہ (انکارا) تک پیچھے ڈھکیل دیا۔ خاص بابی زنطہ کے مقابل کال سیدون تک میں اس کی حکومت جبراً قائم کرنے کی بھی کوشش کی گئی اور اسی سال اُس کی فاتح افواج نے سکندریہ پر قبضہ کر لیا جو سلطنت روما میں دوسرا سب سے بڑا شہر تھا۔ پھر زنوبیا کے صغیر سن بیٹے کے شاہ مصر ہونے کا

اعلان کیا گیا اور اسی کا سکہ ضرب ہوا جس پر سے قیصر روما اورے لیئن کا چہرہ اُڑا دیا گیا تھا۔ زنوبیا کی جنگی فتوحات بیشتر دو تدمری سپہ سالاروں کی رہین منت تھیں۔ ان کے نام زبّے اور زبدا تحریر ہیں۔ آخر اورے لیئن نے ہاتھ پاؤں ہلائے۔ انطاکیہ اور پھر حمص کی جنگ میں زبدا کو شکست دی اور ۲۷۲ء کے موسم بہار میں شہر تدمُر پر قبضہ کرلیا۔ مغرور ملکۂ عرب مایوس ہوکر سانڈنی پر بھاگی۔ صحرا کی راہ لی لیکن بالآخر گرفتار کرلی گئی اور سونے کی زنجیروں میں پابجولاں فاتح کی رتھ کے آگے آگے اُس کے جلوس فتح کی زینت بنی۔ روما کو واپسی میں اورے لیئن کو تدمُر میں بغاوت ہوجانے کی خبر ملی۔ وہ راستے سے بسُرعت پھر لوٹا اور اب کے فصیلیں توڑکر تدمر کی قومی حکومت کا بالکل خاتمہ کردیا۔ یہاں سورج (بل) دیوتا کا مندر بڑا شان دار تھا اُس کی ساری آرائش بھی رومی قیصر اپنے ساتھ لے گیا اور اس نمایاں فتح کی یادگار کے طور پر روما میں "مشرق کے سورج دیوتا" کا ایک نیا مندر بنا کے بیش قیمتی چیزیں اس میں لگادیں۔ تدمُر قریب قریب ایسا ہی ویران و خراب کردیا گیا تھا جس حالت میں آج نظر آتا ہی۔ اس طرح اُس کی چند روزہ شان شوکت خاک میں مل گئی۔

تدمُر کا تمدن یونان، شام وایران (پارتھیہ) کے عناصر کا قابلِ دید مرکب تھا۔ اسے بجائے خود اہمیت حاصل ہی، مزیدبرآں وہ شہادت پیش کرتا ہی کہ صحرائی عربوں کو مناسب مواقع میسر آئیں تو وہ تہذیب میں کیسی کچھ ترقی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اسی

کی ایک نظیر نبطی تمدن تھا جس کا ہم ماسبق اوراق میں مطالعہ کر آئے ہیں۔ یہ بات کہ اہل تدمر عربی نسل سے تھے، ان کے اعلام سے اور ارامی کتبات میں بار بار عربی الفاظ کی تکرار سے ثابت ہوتی ہے۔ ان کی بولی نبطیہ اور مصر کی اسامی زبان کے مماثل یعنی مغربی ارامی کی شاخ تھی۔ ان کا مذہب شمس پرستی کے عناصر رکھتا ہے جو شمالی عرب کے قدیم عقائد کی خصوصیت تھی۔ بل دیوتا اصلاً بابل سے آیا اور ان
78 کے اصنام کا سردار ہو گیا تھا۔ "بآل شمین" (= آسمانوں کا مالک) نذرنیاز کے کتبوں میں مذکور ہے اسی طرح کم سے کم بیس اور دیوی دیوتا کے نام تدمری علاقے میں ملے ہیں۔

تدمر کی ناپائے دار بادشاہی کے خاتمے کے ساتھ تری آمد و رفت نے بھی دوسرے راستے ڈھونڈ لئے۔ حوران[1] میں بصرا اور دوسرے غسانی شہر تدمر کی جاگیر کے وارث ہو گئے جس طرح خود یہ صحرائی شہر پہلے بترا کا میراث خوار بن گیا تھا۔

۳- غسانی ملوک

غسانی، جنوبی عرب کے ایک قبیلے کی اولاد میں ہونے کا دعویٰ کرتے تھے جس کا سابق سردار عمرو مزیقیا ابن عامر ماء السما تھا خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سد مارب کے ٹوٹنے کے وقت تیسری صدی عیسوی میں یمن چھوڑ کر حوران و بلقا کی طرف نکل آیا تھا۔ اس کا فرزند جفنہ

---

[1] اشوری، "حورانو" (دیکھو لکن بل ج ۱ ص ۲۶۲) قساۃ میں "بیثنی" اور یونانی تحریروں میں "اوران قیس"۔

ملوک غسان کا مورث اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔ ابوالفدا ان بادشاہوں کی تعداد ۳۱، حمزہ اصفہانی ۳۲، مگر مسعودی اور ابن قتیبہ صرف ۱۱ بتلاتے ہیں[1]۔ اعداد کے اس اختلاف سے ظاہر کہ یہ خاندان، عرب تاریخ نویسوں میں کس قدر غیر معروف رہا؛ لیکن شام میں عربوں کی پہلی بادشاہی قبیلۂ سلیح نے قائم کی تھی۔ اب اس یمنی قبیلے نے انھیں بے دخل کیا اور آرب ودمشق کی بڑی شاہراہ کے شمالی سرے پر دمشق کے شمال مشرق میں خود حاکم ہو گئے مرورِ زمانہ کے ساتھ غسانیوں نے دین مسیح، شام کا تمدن اور ارامی زبان اختیار کرلی تاہم اپنی عربی کو بھی ترک نہیں کیا۔ اور بعض دوسرے عرب قبائل کی طرح جو ہلال خصیب کے ملکوں میں ذولسانین ہو گئے تھے، وہ بھی دو زبانیں بولنے لگے پانچویں صدی کے اواخر میں وہ بای زنطہ کے حلقۂ اثر میں آ گئے اور بدوی یورشوں کو روکنے کے لئے ایک برزخی ریاست بنالئے گئے جس طرح آج کل برطانیہ کی اسی قسم کی خدمت شرق اردن انجام دے رہا ہے۔ غسانیوں نے مسیحیت کے وہ عقائد اختیار کئے تھے جو مقامی حلولی اعتقاد (فرقۂ مونوفیزی) سے مطابقت رکھتے تھے تاہم بای زنطہ سے رد در رد ہونے کے باعث انھیں اپنے سیاسی مفاد کا بھی لحاظ رہتا تھا۔ اوّل اوّل ان کا صدر مقام جلتی پھرتی لشکرگاہ رہا۔ بعد میں شاید جولان (= گوالے نی ٹیس) کے علاقے میں ال جابیہ مقرر ہوا اور کچھ عرصے جلیق میں[2] قائم رہا؛

[1] ابوالفدا: تاریخ - ج ۱ ص۱۰۲ - اصفہانی - ص۱۱۵ - مسعودی - مروج الذہب - ج ۳ - ص۲۱۷ ابن قتیبہ - ال معارف (گوٹن جن ۱۸۵۰ء) ص۳۱۴

[2] دیکھو کے تانی کی (اطالوی) تاریخ اسلام - ج ۳ ص۹۲۸۔

غسّانی حکومت نے اپنے حیرہ کے حریف لخمیوں کی طرح سب سے زیادہ شہرت چھٹی صدی عیسوی میں حاصل کی۔ چناں چہ غسّان کا حارث ابن جبلہ (ثانی۔ تخ ۵۲۹ء تا ۵۶۹ء) اور حیرہ کا مُنذِر ثالث ابن ماء السما اس صدی کی عربی تاریخ پر چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ (مُنذر کا زمانۂ وفات ۵۵۴ء کے قریب اور بای زنطی تاریخوں میں "ال امندروس" نام آتا ہے) حارث کو عرب تاریخ نگار "ال اعرج" یعنی لنگڑا موسوم کرتے ہیں۔ خاندانِ جفنہ کے بادشاہوں میں سب سے پہلا مستند اور ناموری میں سب سے بڑھ چڑھ کر اسی کا نام ہے۔ اس کے حالات کی یونانی ماخذوں سے تصحیح ہو سکتی ہے[1]۔ اس نے اپنے زبردست حریف ال منذر ثالث کو شکست دی جس کے صلے میں بای زنطی بادشاہ جستی نین نے ۵۲۹ء میں اسے شام کے تمام عرب قبائل کا سردار اور "پیٹ ری کیوس وفای لارک" (یعنی امیر الامرا امام قوم) بنادیا جو مرتبے میں بادشاہ کے بعد سب سے بلند منصب تھا۔ لیکن عربی میں اس خطاب کا صرف "ملِک" ترجمہ کیا گیا تھا[2]۔ حارث کے طویل عہد کا بڑا حصہ بای زنطہ کی خاطر جنگ کرنے میں بسر ہوا۔ ۵۴۴ء کے قریب ال منذر ثالث اس کے بیٹے کو پکڑ کر لے گیا اور عزّیٰ دیوتا پر بھینٹ چڑھادیا۔ (ال عزّیٰ قدیم یونانیوں کی افرودیتے دیوی کا مثنّیٰ ہے) دس سال بعد حارث نے اپنا انتقام لیا اور قنسرین کی نواح کی ایک

---

[1] پروکوپیوس۔ ج ۱۔ باب ۱۷۔ "کردوگرافیا" از ملالاس، مرتبہ ڈن ڈورف (بون ۱۸۳۱ء) ص ۴۳۵ و مابعد۔

[2] پروکوپیوس۔ ج ۲ باب ۲۸۔

لڑائی میں نخمی حریف کو تلوار کے گھاٹ اُتارا عجب نہیں کہ عربی روایتوں میں "یوم حلیمہ" سے یہی معرکہ مراد ہو۔ حلیمہ ال حارث کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک سو غسانی بہادروں کے عطر ملا تھا جو زرہ پر کفن پہنے، جان دینے کے ارادے سے جنگ میں شریک ہوئے تھے [۵۱]

[۵۶۳]ء میں ال حارث، جسٹی نین (اوّل) کے دربار میں قسطنطنیہ آیا [۵۲] اور اس بدو امیر و امام کا بادشاہی درباریوں پر بڑا رعب پڑا۔ اپنے قیام کے زمانے میں اس نے حلولی فرقے کے اسقف، جیکب برے ڈیئس کو شامی عربوں کا صدر اسقف مقرر کرالیا۔ یہ شہر اِڈیسا (عربی، رُہا) میں تھا اور عربوں میں یعقوب بردعی مشہور ہے۔ اپنے دین کی تبلیغ میں اُس نے وہ جوش خروش دکھایا کہ شام کا (حلولی) مذہب اسی کے نام پر "یعقوبی" (= جیکو بائٹ) کہلایا۔

حارث کا بیٹا ال مُنذِر

ال حارث ثانی کا جانشین اس کا فرزند ال مُنذِر ہوا۔ بازنطی تاریخوں میں اسے " ال امون دروس" لکھا ہے۔ باپ کی طرح وہ بھی یعقوبی فرقے کا بڑا حامی و سرپرست تھا [۵۳] حتیٰ کہ بازنطہ کی حکومت اسی بات پر بگڑ گئی اور غسانیوں نے بھی سلطنت سے علانیہ بغاوت بھی

---

[۵۱] ابن قتیبہ، صفحہ ۳۱۴ نیز دیکھو ابوالفدا۔ ج ۱ صفحہ ۸۶

[۵۲] "کرونوگرافیا" از تھیوفانوس۔ مرتبہ بوّر (لائپ زگ ۱۸۸۳ء) صفحہ ۲۴۰

[۵۳] جون افسوسی کی کتاب "ایک کلے زی ایس ٹیکل ہسٹری" ترجمہ اسمتھ (اوکس فورڈ، ۱۸۶۰ء) صفحہ ۲۸۴

کمر باندھی۔ لیکن یہ نزاع عارضی تھی۔ ۵۸۰ء میں ال مُنذِر اپنے دو بیٹوں کے ساتھ قسطنطنیہ آیا تو شہنشاہ تی بریوس ثانی نے بڑا اعزاز و اکرام کیا اور تاج نُما ٹوپی کی بجائے زیادہ بیش قیمت تاج اُسے پہنایا۔ اسی سال اپنے حریف لخمیوں کے صدر مقام حیرہ پر اُس نے یلغار کی اور اُسے آگ لگادی[1] لیکن حکومت بای زنظ کو اُس کے باپ کی نسبت دغا بازی کا جو شبہ پیدا ہوگیا تھا، وہ پھر بھی دور نہ ہوسکا۔ (دمشق و تدمُر کے درمیان) حَوران کے مقام پر وہ ایک گرجا کے افتتاح کی رسم ادا کرنے آیا تھا، جب کہ اُسے گرفتار کرکے قسطنطنیہ لے گئے اور کچھ مدت بعد صقلیہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ یہی حشر اس کے جانشین بیٹے نعمان کا ہوا جس نے بای زنظ کے علاقے کو تاخت تاراج کرنے کی جسارت کی تھی۔ وہ بھی قیدی بناکر قسطنطنیہ لایا گیا؛ ان دونوں کے بعد معلوم ہوتا ہے غسان کے علاقے میں بدنظمی پھیل گئی۔ صحرائے شام کے مختلف قبیلوں نے اپنا اپنا الگ سردار منتخب کرلیا۔ جفنہ خاندان پر آخری ضرب اُس وقت لگی جب کہ ساسانی خسرو پرویز نے دمشق اور یروشلم کو فتح کیا (۶۱۳–۶۱۴ء) یہ ٹھیک معلوم نہیں کہ ہرقل (ہراکلیس) نے ۶۲۹ء میں شام کو دوبارہ فتح کیا تو غسانی ملوکیت کو بھی واگزار کیا یا نہیں؟ عربی تاریخوں میں غسان کے آخری بادشاہ کا نام جَبلہ ابن ایہم بتایا گیا ہے۔ یرموک کی مشہور جنگ میں وہ بای زنظ کی طرف سے عربوں کے خلاف لڑا تھا، بعد میں مسلمان ہوگیا مگر اپنے پہلے حج میں طواف کرتے وقت

---

[1] ایضاً ص ۳۸۵ (متن اصلی، ص ۳۱۵ – مرتبہ ولیم کیورٹن ۱۸۵۳ء)

[2] ابن عبد ربہ – عقد – ج ۱ ص ۱۴۰

ایک بدو کا پاؤں اس کی عبا کے دامن پر پڑ گیا۔ حسبِ روایت، جبلہ نے بدو کے طمانچہ مارا اور (اس کی نالش پر) خلیفہ عمرؓ نے حکم دیا کہ جبلہ یا تو ویسا ہی طمانچہ کھائے یا تاوان ادا کرے۔ اس پر جبلہ مرتد ہو کر قسطنطنیہ بھاگ گیا[1]

بنی غسان، بای زنطہ والوں کے ہمسایے تھے اور انھیں تہذیب کا درجہ یقیناً اتنا بلند حاصل ہوا کہ ان کے لخمی حریف جو ایرانی سرحد پر تھے، وہاں تک کبھی نہیں پہنچ سکے۔ ان کے دورِ حکومت، نیز کچھ پہلے، رومیوں کے تسلط کے وقت شام کے پورے مشرقی حاشیے پر ایک خاص تمدن تیار ہوتا نظر آتا ہے جس میں عربی، شامی اور یونانی عناصر کی آمیزش تھی۔ گہرے رنگ کے سلیمانی پتھر (= بزالت) سے بڑی بڑی حویلیاں، محل، کمانیں، حوض، حمام، گرجا اور تماشا گاہیں جگہ جگہ بنی ہوئی تھیں جہاں آج کل خاک اڑ رہی ہے۔ حوران کی جنوبی اور
۲۱ مشرقی ڈھلانوں پر اس وقت معدودے چند گاؤں رہ گئے ہیں۔ حال آں کہ قریب قریب تین سو قصبات و قریٰ کے ابھی تک کھنڈر سابقہ آبادیوں کا نشان بتا سکتے ہیں۔

ایامِ جاہلیت کے کئی عرب شاعروں کے حق میں ملوکِ غسان فیاض مربی ثابت ہوئے۔ لبید جس کا قصیدہ سبعہ معلقات میں سب سے آخری ہے، جنگِ حلیمہ میں غسانیوں کی طرف سے لڑا۔ نابغہ ذبیانی کی لخمی بادشاہ سے ان بن ہوئی تو حارث کے بیٹوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور غسانی دربار میں پناہ دی۔ مدینے کے شاعر حضرت حسان

---

[1] ابن عبد ربہ۔ عقد۔ ج ۱ صفحہ ۱۴۰

ابن ثابت (ولادت تخ ۵۶۳ء) ملوک غسان سے رشتہ داری کا دعویٰ رکھتے تھے اور دربار رسالت میں ملک الشعرا بننے سے پہلے جوانی میں غسانی دربار میں آئے تھے جس کا اپنے دیوان میں بار بار ذکر کرتے ہیں۔ ایک مجہول روایت میں جو اُن سے منسوب کی گئی ہے[۱] جبلہ کے دربار کی شان اور عیش و عشرت کی بڑی تعریف و توصیف مذکور ہے کہ وہاں مکہ اور بابل و یونان کے مُطرب، مرد و عورت دونوں، گاتے بجاتے اور شراب انگوری کے دَور چلتے تھے۔[۲]

۴- لخمی خاندان

نامعلوم زمانے سے عرب صحرا نوردوں کے گروہ جزیرہ نما کے مشرق میں ساحل ساحل آہستہ آہستہ بڑھتے اور وادیٔ دجلہ و فرات تک پہنچ کر رس بس جاتے رہے۔ اسی قسم کے کئی قبائل تیسری صدی عیسوی کے اوائل میں فرات کے مغرب کے سرسبز خطّے میں سکونت گزیں ہوئے۔ یہ اپنے آپ کو تنوخ کہتے تھے اور کہا جاتا ہے کہ اصلاً یمنی تھے۔ ممکن ہے کہ ایران میں اشکانی خاندان کے خاتمے اور ساسانیوں کے برسر اقتدار آنے کے سلسلے میں جو فسادات ہوئے، (۲۲۶ء) اسی زمانے میں یہ اِن اقطاع میں آئے ہوں۔ ان کی بود و باش پہلے خیموں میں تھی پھر رفتہ رفتہ ان کی چھاونی "الحیرہ" بن گئی،

---

[۱] یہ جعلی روایت الاغانی میں آئی ہے (بولاق ۱۲۸۵ء) ج ۱۶ ص ۱۵

[۲] جنوبی لبنان کے عیسائی باشندوں میں بعض خاندان اپنا نسب غسانیوں تک پہنچاتے ہیں۔

جو شامی زبان کے "حِرتَ" بہ معنی پڑاؤ، سے مشتق ہے اور آل کوفہ سے کوئی تین میل جنوب میں تھی۔ قدیم شہر بابل بھی یہاں سے زیادہ دُور نہ تھا۔ یہی حیرہ ایرانی عرب کا صدر مقام قرار پا گیا؛ یہاں کی مقامی آبادی عیسائی اور مشرقی شام کے کلیسا کی پیرو تھی جو بعد میں نسطوری فرقہ کہلایا۔ عرب مصنف انھیں "عباد" (یعنی حضرت مسیحؑ کی پرستش کرنے والے) لکھتے ہیں[1]؛ تنوخ کے بعض خاندان بھی آگے چل کر عیسائی ہو گئے اور شمالی شام میں آ بسے۔ وہ تنوخی جو آخر میں جنوبی لبنان میں آئے اور دروزیوں کے خفیہ عقائد رکھتے تھے، اپنا نسب حیرہ کے لخمی بادشاہوں تک لے جاتے ہیں؛[2]

82 روایتوں میں عراق کی اس عرب آبادکاری کا پہلا سردار، مالک ابن فہم آل ازدی[3] موسوم ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کا بیٹا جذیمہ آل ابرش، اردشیر کا خراج گزار تھا لیکن لخمی ریاست کا اصلی بانی عمرو ابن عدی ابن نصر ابن ربیعہ ابن لخم، ہوا ہے۔ یہ جذیمہ کی بہن کا، جس نے اُس کے کسی ملازم سے عقد کیا، بیٹا تھا۔ عمرو نے حیرہ پر قبضہ پا کر اسے اپنا صدر مقام بنایا؛ تیسری صدی کے اواخر میں اس لخمی یا نصری خاندان کے بادشاہ ہو جانے کے بعد معتبر تاریخ کا دَور آتا ہے۔ ملوک لخمی کے کوئی بیس نام ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن سب سے پہلی واضح شخصیت امرؤ القیس اوّل (متوفی ۳۲۸ء) کی ہے۔ اس کی لوح مزار بھی بنیادی عربی کا سب سے

---

[1] دیکھو طبری، ج ۱ ص ۸۲۲۔

[2] حِتّی، "دی اوری جنز اوف دی دروز پیپل اینڈ ریلیجین" (نیویارک ۱۹۲۸ء) ص ۲۱

[3] ازد اور تنوخ عراق پہنچ کر باہم متحد ہوئے اور ایک ہی قبیلہ بن گئے تھے؛

قدیم کتابہ ہے جو اب تک دست یاب ہوا۔ اُس کی تحریر نبطی حروف کی ترمیم یافتہ صورت ہے اور اس میں بہت سی علامتیں پائی جاتی ہیں کہ کس طرح یہ (نبطی) خط رفتہ رفتہ شمالی عربی کا وہ رسم الخط بن رہا ہے جو آگے چل کر بن گیا۔ خصوصًا حروف کے جوڑ کے معاملے میں یہ عبوری تغیر نمایاں ہے[1]۔ امرؤالقیس ہی کی اولاد میں وہ نعمان اوّل الاعور (= یک چشم) تھا جسے شعر اور افسانے میں بڑی شہرت حاصل ہوئی (تخ ۴۰۰ء تا ۴۱۸ء) حیرہ کے قریب قصر خورنق کی تعمیر اسی کا کارنامہ بتائی جاتی ہے۔ خسرو ایران یزدگرد اول (۳۹۹ء تا ۴۲۰ء) نہایت خواہش مند تھا کہ اس کا بیٹا بہرام گور صحرا کی صحت بخش ہوا میں پرورش پائے۔ اسی شہزادے کے قیام کے لیے یہ قصر بنایا گیا جس کی نسبت دعویٰ تھا کہ فن کا اعجاز ہے۔ بعد کے مورخوں نے اس کی تعمیر ایک بائی زنطی معمار سے منسوب کر دی ہے جو اسی قسم کی اکثر افسانوی روایات کے مطابق، قصر بن چکنے کے بعد محض اس لئے مروا دیا گیا کہ اس جیسی عمارت دوسری نہ بن سکے۔ یہ توجیہ بھی ان کہانیوں کی ایک دل پسند آرائش ہوتی ہے۔ نعمان ساری عمر بُت پرست رہا بلکہ ایک زمانے میں اپنی عیسائی رعایا پر تعدی کرتا اور عربوں کو سینٹ سی میون کی زیارت سے روکتا تھا، اگرچہ آخر عمر میں مسیحیت سے رواداری پر مائل ہو گیا تھا۔ سی میون ولی خود عرب تھے۔ وہ ایک مینار کی چوٹی پر بیٹھے رہتے تھے اور لوگ جوق درجوق اس مرد مرتاض کی زیارت کرنے آتے تھے۔ ایک اور قصر السدیر کی تعمیر بھی نعمان سے منسوب کرتے ہیں۔

---

[1] دیکھو۔ "لے ارَبے اَن سی رئیا" ص ۳۲

یہ حیرہ اور شام کے درمیان صحرا کے وسط میں واقع تھا[۵۱] اشعار میں اسے خورنق کے ساتھ لایا گیا ہے۔

الحیرہ کا انتہائی عروج

جب نعمان کا بیٹا المنذر اول (تخ ۴۱۸ء تا ۴۶۲ء) اس کا جانشین ہوا تو حیرہ نے اس عہد کے واقعات میں نمایاں حصہ لینا شروع کیا۔ [۵۲] منذر کا یہ زور تھا کہ ایرانی موبدوں سے جبراً بہرام کی (جس کی تربیت اس کے باپ نے کی تھی) تاج پوشی کرائی حالانکہ تخت کا ایک اور طاقت ور مدعی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ۴۲۱ء میں وہ اپنے ایرانی فرماں روا کے پہلو بہ پہلو بازنطہ والوں سے لڑا۔ چھٹی صدی کے نصف اول میں حیرہ کی حکومت المنذر ثالث کے حصے میں آئی (تخ ۵۰۵ء تا ۵۵۴ء) جسے عرب "ابن ماء السما" (= آسمان کا پانی) سے معروف کرتے ہیں، یہ اس کی ماں ماریہ یا ماویہ کا لقب تھا۔ لخمی تاریخ میں وہ سب سے نامی گرامی بادشاہ گزرا ہے۔ وہ رومی شام کے پہلو کی پھانس بن گیا تھا اس کی ترک تازنے انطاکیہ تک سارا ملک تاراج کر ڈالا تھا یہاں تک کہ غسانی الحارث اس سیر کے لیے سوا سیر ثابت ہوا[۵۲]۔ اسی المنذر کی ایک عجیب حکایت اغانی میں منقول ہے کہ ایک دفعہ اس نے شراب خواری کے عالم میں دو عزیز دوستوں کو زندہ دفن کرا دیا[۵۳]۔

---

۵۱ یاقوت۔ ج ۲ ص ۳۷۵۔

۵۲ پروکوپیوس، ج ۱۔ باب ۱۷۔ ملالاس ص ۴۳۴ وغیرہ۔

۵۳ ج ۱۹ ص ۸۶۔ مقابلے کے لئے دیکھو ابن قتیبہ ص ۳۰۹۔ اصفہانی، تاریخ ص ۱۱۱۔

اس کا وارث بیٹا عمرو، "ابنِ ہند" معروف ہوا (۵۵۴ء تا ۵۶۹ء) کر جابرانہ حکومت کے ساتھ، شاعروں کی فیاضانہ سرپرستی کرتا تھا۔ "قصائد زریں" یعنی معلقات کے سات مشہور لکھنے والوں میں سے تین اس کے دربار میں کھنچ آئے تھے۔ یہ ان دنوں عرب کے بہترین زندہ شاعر مانے جاتے تھے۔ ان کے نام طرفہ ابن عبد۔ الحارث ابن حلزہ اور عمرو ابن کلثوم ہیں۔ دوسرے لخمی اور جفنی ملوک کی طرح عمرو (ابن ہند) ہم عصر شاعروں کو رائے عامہ کا رہنما اور نشر و اشاعت کا بہت اچھا ذریعہ سمجھتا تھا۔ یہ بادشاہ ان شاعروں کو دل کھول کر انعام اکرام دیتے اور جو ان کے دربار میں پہنچ جاتا اس کی بڑی سرپرستی کرتے تھے تاکہ بدوؤں میں ان کا اثر پھیلائیں۔ عمرو اگرچہ ابن کلثوم کا محسن و مربی تھا مگر ایک دفعہ اس کی ماں کی کوئی توہین (بادشاہ نے) کی تھی۔ لہٰذا اسی شاعر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ ابن کلثوم نے اپنا انتقام لے لیا۔ عمرو کی ماں ہند غسانی خاندان کی عیسائی شہزادی تھی۔ بعض لوگ اسے بنی کندہ سے بتاتے ہیں۔ بہر حال، پایۂ تخت حیرہ میں اسی نے مسیحی خانقاہ بنوائی جو دوسری صدی ہجری[1] تک سلامت رہی۔[2] یاقوت نے اس کے وقت کا کتبہ ہمارے لیے محفوظ رکھا ہے جس میں ہند اپنے تئیں "حضرت مسیح کی کنیز، غلام زادی، اور حضرت کے غلام (عمرو) کی ماں" لکھتی ہے۔[3] حیرہ کی آبادی میں عیسائی (مشرقی شام کے فرقے کے پیرو) موجود تھے وہاں کے اسقفوں کا بار بار تذکرہ آتا ہے اور ان میں ایک بہت پہلے یعنی ۴۱۰ء میں اس شہر کا عیسائی مقتدی تھا۔

[illegible]

۸۴ لخمی خاندان کا خاتمہ ال منذر رابع کے بیٹے نعمان ثالث (تخ ۵۸۰ء تا ۶۰۲ء) پر ہوا جس کی کنیت "ابو قابوس" تھی۔ نامور شاعر نابغہ ذبیانی کا مربی وہی تھا۔ مگر بعد میں ایک جھوٹے الزام کی بنا پر نابغہ کو حیرہ سے نکلنا پڑا۔ نعمان کی پرورش ایک مسیحی خاندان میں ہوئی تھی لہذا وہ عیسائی بنا لیا گیا اور لخمی خاندان کا پہلا اور آخری عیسائی بادشاہ تھا۔ اس سے پہلے کسی لخمی بادشاہ کے مسیحیت کو قبول نہ کرنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہ اہل بائی زنطہ کا مذہب تھا اور ملوک حیرہ کی سیاسی اغراض کا تقاضا تھا کہ ایران سے دوستانہ تعلقات میں فرق نہ نہ آئے۔ نعمان کو اصطباغ مشرقی شام کے (= نسطوری) فرقے میں دیا گیا جس پر ایران کو سب سے کم اعتراض ہو سکتا تھا۔

ایران کے پہلو میں حیرہ کی عرب تہذیب اتنی ترقی نہ کر سکی جتنی بای زنطی شام کے زیر اثر بترا، تدمر، اور سرزمین غسان میں عربوں نے حاصل کی تھی۔ حیرہ کے عرب کی روز مرہ بول چال عربی میں ہوتی تھی لیکن تحریر شامی یا سریانی تھی۔ جس طرح نبطی اور تدمری عربی بولتے مگر آرامی لکھتے تھے۔ فرات کی وادی زیریں میں کافر عربوں کو لکھنا پڑھنا اور دین سکھانے کی خدمت عیسائی انجام دیتے تھے۔ یہ نیک اثرات حیرہ سے عرب خاص میں نفوذ کرتے تھے۔ بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ نجران میں مسیحیت کو حیرہ کے شامی کلیسا ہی نے متعارف کیا۔ ابن رستہ کی روایتوں میں سے ایک یہ[1] ہے کہ قریش نے لکھنے کا فن اور اپنے جھوٹے مذہب کی تنظیم حیرہ والوں سے سیکھی تھی۔ اس سے واضح

[1] "الاعلاق النفیسہ" (لائیڈن ۱۸۹۲ء) ص ۱۹۲ وغیرہ۔ نیز دیکھو ابن قتیبہ، ص ۲۷۳

ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے تہذیبی اثرات بھی لخمیوں کی وساطت سے جزیرہ نمائے عرب میں داخل ہوئے۔

نعمان کے بعد ایاس ابن قبیصہ طائی ۶۰۲ء سے ۶۱۱ء تک حاکم رہا لیکن نظم و نسق کا اختیار ایک ایرانی قائم مقام کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ یہ ایران کے فرماں رواں کی چوک تھی کہ انھوں نے عربوں کی خراج گزاری کا طریقہ اُڑا کر انھیں ایرانی والیوں کے ماتحت کر دیا ۶۳۳ء تک یہی عمل رہا تا آں کہ خالدؓ ابن ولید لشکر اسلام لے کر آئے تو اہل حیرہ نے اُن کی اطاعت قبول کر لی[1]۔

۵۔ کِندہ

غسانیوں کا بائی زنطہ سے، اور لخمیوں کا ایران سے جیسا تعلق تھا، وسط عرب کے ملوکِ کِندہ، یمن کے خاندانِ تُبّع کے آخری بادشاہوں سے اسی قسم کا رابطہ رکھتے تھے۔ خاص عرب کے اندر صرف یہی حکم ران تھے جنھیں "مَلِک" کا خطاب حاصل ہوا ورنہ اہل عرب یہ لفظ عموماً اجنبی فرماں رواؤں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کِندہ کا طاقت ور قبیلہ جنوبی عرب سے آیا اور ظہور اسلام سے قبل حضر موت کے مغرب میں بس گیا تھا۔ لیکن جنوبی عرب کے قدیم کتبات میں ان کا ذکر نہیں بلکہ پہلی دفعہ تاریخ میں ان کا نام چوتھی صدی عیسوی میں آیا ہے۔ خاندان شاہی کا بانی حُجر، معروف بہ آکل المُرار عام روایت کے بموجب حسّان ابن تُبّع حمیری کا علاتی بھائی تھا۔ اور اسی کی طرف سے وسط عرب

[1] آہ اُس مقام پر جہاں الحیرہ بستا تھا، صرف چند مٹی کے ڈھیر رہ گئے ہیں۔

کے بعض مفتوح قبائل کا ۴۸۰ء میں حاکم مقرر ہوا تھا۔[1] اسی منصب پر حجر کا فرزند عمرو پھر اس کا بیٹا حارث حکومت کا وارث ہوا۔ حارث کندہ کا سب سے شجاع بادشاہ تھا۔ اسی نے ایرانی بادشاہ قباذ کے مرنے کے کچھ روز بعد، بڑھ کر حیرہ پر (۵۲۹ء کے قریب) قبضہ کر لیا لیکن لخمی منذر ثالث کے مقابل میں قائم نہ رکھ سکا بلکہ منذر کے ہاتھ سے شاہی خاندان کے تقریباً پچاس افراد کے ساتھ ۵۲۹ء میں مارا گیا۔ بنی کندہ کے اقتدار پر یہ ایسی ضرب لگی کہ پھر وہ پنپ نہ سکے۔ ممکن ہو کہ ال حارث شہر ال عنبر میں مقیم رہا ہو جو فرات کے کنارے بغداد سے کوئی چالیس میل شمال مغرب میں واقع تھا۔ ال حارث کے بعد اس کے بیٹوں میں نا اتفاقی ہوئی۔ ہر ایک الگ الگ قبیلے کا سردار بن گیا جس سے ان کا شیرازہ بکھرا اور یہ چند روزہ حکومت آخر ختم ہو گئی۔ کندہ کے بقیۃ السیف اپنی حضر موت کی آبادیوں کی طرف ہٹنے پر مجبور ہوئے اور حیرہ کا یہ رقیب کم ہو گیا ورنہ شمالی عرب کی سیادت کے تین مدعی بن گئے تھے اور لخمیوں کو غسانیوں کے علاوہ بنو کندہ سے بھی مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ مشہور شاعر امرؤ القیس کہ معلقات میں بھی بہترین قصائد میں سے ایک قصیدے کا مصنف ہے[2] کندہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ اس نے اپنے ورثے کا ایک حصہ واپس لینے کے واسطے کئی دفعہ ہاتھ پاؤں مارے مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کے اشعار میں لخمیوں کے خلاف نفرت کا زہر بھرا ہے۔ وہ مدد لینے کی کوشش میں ایک بار قسطنطنیہ تک گیا کہ شاید حیرہ کا دشمن جسٹینین اس کی

---

[1] اصفہانی۔ تاریخ ص۱۴۰۔ ابن قتیبہ، ص۳۰۸

[2] دیکھیے آیندہ باب میں معلقات کا ذیلی عنوان۔

دست گیری کرے۔ جب واپس ہوا تو روایت کہتی ہے کہ انقرہ کے مقام پر اسی بائی زنطی بادشاہ کے قاصد نے (۵۴۰ء کے قریب) اسے زہر دے کر ہلاک کر دیا[1]۔

۴۶ اسلامی عہد کے اوائل میں کئی کِندی افراد نے امتیاز حاصل کیا۔ ان میں سب سے بڑھ کر اشعث ابن قیس نے شام و عراق کی فتوحات میں نام پایا۔ یہ حضرموت کے رئیس تھے اور اپنی کارگزاری کے صلے میں ایک ایرانی صوبے کے والی مقرر ہوئے۔ خراسان کا نقاب پوش مدعی نبوت المقنع بھی کِندی تھا[2]۔ وہ خدا کا اوتار بنتا تھا اور برسوں تک عباسی خلیفہ المہدی کی فوجوں کو پریشان کرتا رہا۔ خود اشعث کی اولاد میں کئی اشخاص اموی خلافت میں ملک شام کے معزز عہدوں پر فائز رہے لیکن فلسفی یعقوب ابن اسحاق الکِندی کی نسبت کی وجہ یہ ہے کہ وہ بنی کِندہ کا مولی تھا[3]۔

کندہ کا عروج نہ صرف بجائے خود، بلکہ اس لئے بھی لائق لحاظ ہے کہ یہ اندرون عرب میں بہت سے قبائل کو ایک مشترک امیر کے زیرِ علم متحد کرنے کی پہلی کوشش تھی۔ اس اعتبار سے یہ تجربہ حجاز اور پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے لیے ایک نظیر پیش کرتا تھا۔

---

[1] الیعقوبی، تاریخ۔ (لائیڈن ۱۸۸۳ء۔ ہوتسمن)، ج ۱، ص ۲۴۸

[2] وہی جو ٹامس مور کی "لالہ رُخ" کا میر فسانہ ہے۔

[3] دیکھو باب ۲۷۔ ذیلی عنوان "فلسفہ"

باب ہفتم

87

ال حجاز، ظہور اِسلام سے قبل

اجمالی طور پر عرب کی تاریخ تین بڑے حصوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے:

۱۔ سبائی و حمیری دَور۔ جو چھٹی صدی عیسوی کے آغاز تک پہنچتا ہے۔

۲۔ عہدِ جاہلیت، کہ ایک اعتبار سے "خلق آدم سے" لے کر بعثت رسول اللہؐ تک وسیع ہے لیکن خصوصیت سے جیسا کہ ان اوراق میں استعمال کیا گیا، ظہور اسلام سے پہلے کی ایک صدی پر حاوی ہے۔

۳۔ عہد اسلامی جو آج تک چلا آتا ہے۔

ایّام جاہلیہ

جاہلیہ کی اصطلاح کے عام معنی جہالت یا بربریت کا زمانہ ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کا مفہوم وہ زمانہ ہے جس میں عرب کا کوئی با قاعدہ مذہب، کوئی صاحبِ وحی پیغمبر اور کتاب آسمانی نہ تھی۔ ورنہ جنوبی عرب کے لوگوں نے جیسی تعلیمی اور تہذیبی ترقی کر لی تھی، اس پر جہالت و وحشت کا مشکل سے اطلاق ہو سکتا ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ یہ لفظ آیا ہے۔

(آل عمران ۱۵۴، المائدہ ۵۰، الاحزاب ۳۳، الفتح ۲۶[1]) پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) غلبۂ توحید میں نہایت خواہش مند تھے کہ اپنی قوم کو قبلِ اسلام کے عقائد، خصوصاً بت پرستی سے بالکل پاک کر دیا جائے۔ پس آپؐ اعلان کرتے تھے کہ اسلام گزرے دَور (کے عقائد و اعمال) کو محو کرنے آیا ہے۔ بعد میں اس کے معنی یہ لیے گئے کہ قبل از اسلام خیالات و تصورات سب ناجائز تھے[2]۔

جنوبی عرب والوں کے مقابلے میں شمالی عرب کی (جس میں حجاز و نجد بھی شامل ہیں) آبادی کی بڑی اکثریت خانہ بدوش ہے۔ بدوؤں کی تاریخ زیادہ تر قزاقانہ جنگ و جدال پر مشتمل تھی جنھیں "ایام عرب" (عرب کی لڑائیاں) کہتے تھے۔ ان میں لوٹ مار، یورشیں زیادہ، لیکن کشت و خون کم ہوتا تھا۔ حجاز و نجد کی شہری آبادیوں نے عہدِ قدامت میں اپنی کسی تہذیب کی نشو و نما نہیں کی۔ اس بارے میں وہ اپنا ہمسایہ نبطی، تدمری، غسانی، لخمی رشتہ داروں سے بالکل مختلف تھے۔ پہلی
دو قومیں ایک حد تک ارامی رنگ میں اور غسانی و لخمی آباد کار بائی ۴۴
زنطہ و شام یا ایران و شام کی مخلوط تہذیب کے حلقے میں آ گئے تھے۔

اس طرح جاہلیہ کا مطالعہ ایک طرف تو اُن لڑائیوں تک محدود ہو جاتا ہے جو ہجرت سے ایک صدی قبل شمالی عرب کے قبائل میں ہوئیں اور دوسری طرف اس میں ہمیں صرف اُن تہذیبی خارجی اثرات کی

---

[1] اصل کتاب میں پہلی دو سورتوں میں آیتوں کا نشان غلطی سے ۱۴۸-۱۵۰ تحریر کیا گیا ہے۔ مترجم

[2] (فاضل مصنف کے اس جملے سے غلط فہمی کا احتمال ہے۔ اسلام نے بت پرستی اور اس کے شعائر کو مٹایا، صدق، توحید یا حسن اخلاق جو پہلے بھی موجود تھے۔ ان کی توثیق و تجدید کی۔ مترجم)

کیفیت بیان کرنی رہ جاتی ہے جو ظہور اسلام کے قریب حجاز کی شہری آبادی میں کار فرما تھے ؛ لیکن اس عہد پر مستند تاریخ کی روشنی بہت کم پڑ سکی ہے۔ شمالی عرب میں اُن دنوں کوئی باقاعدہ طرز تحریر نہ تھا، لہذا روایات، افسانے، ضرب الامثال، اور سب سے بڑھ کر اشعار ہی ہمارے محدود ماخذ ہو سکتے ہیں۔ یہ اشعار بھی دوسری تیسری ہجری سے قبل قلم بند نہیں ہوے تھے یعنی جن واقعات کی یادگار سمجھے جاتے ہیں، اُن سے دوسو تا چار سو برس بعد، تحریر کئے گئے۔ یہ سارا مصالحہ روایتی اور افسانوی ہے تاہم اس کی قدر وقیمت کچھ کم نہیں کیوں کہ جن باتوں پر کوئی قوم یقین رکھتی ہے، وہ بے اصل ہوں تو بھی اُس کی زندگی پر واقعی امور کی طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ شمالی عرب میں تحریر کا کوئی ضابطہ، قریب قریب بعثت نبوی تک تیار نہ ہو سکا تھا۔ اب تک صرف تین کتبے ماقبل اسلام زمانے کے نکلے ہیں: ایک زَبَد (حلب کے جنوب مشرق) میں، ۵۱۲ء کا۔ دوسرے ال لجا میں حرّان کا (۵۶۸ء)۔ تیسرا اسی صدی کا اُمّ الجمال میں ؛ بنیادی یا قدیم عربی میں امرء ال قیس کا نمارہ والا کتبہ (۳۲۸ء) ان تین سے الگ ہے ؛ عربوں کا لفظ وسیع معنی میں، جیساکہ پہلا بیان ہوا، جزیرہ نما کے جملہ باشندوں پر حاوی ہے لیکن محدود معنی میں اس سے فقط شمالی عرب کے لوگ مُراد ہوتے ہیں جنھوں نے اسلامی قوت کے فروغ تک بین الاقوامی معاملات میں کوئی حصہ نہیں لیا ؛ عربی زبان میں، یوں تو حجاز کی شمالی بولی کی طرح حمیری و سبائی بھی شامل ہیں لیکن چوں کہ حجازی آگے چل کر اسلام کی مقدس زبان بنی اور یمن کی جنوبی بولیوں کو اُس نے دبا لیا، لہذا اب اصلی عربی وہی

مانی جاتی ہے اور ہم جب عرب یا عربی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں
تو ہمارے ذہن میں خصوصیت سے شمالی عرب کی قوم اور قرآن مجید
ہی کی زبان ہوتی ہے۔

ایامَ العرب

"ایام عرب" وہ قبائلی آویزشیں تھیں جو عموماً مویشی، چراگاہ یا
چشموں پر جھگڑے سے پیدا ہوا کرتی تھیں۔ ان سے قزاقی اور غارت
گری کے بہت اچھے حیلے بہم پہنچتے تھے حریف قبائل کے بہادر تنہا
(جنگ یک یکی) لڑکر شجاعت کے کارنامے دکھاتے اور شاعروں کو
جو اپنے اپنے قبیلے کی زبان ہوتے تھے، ایک دوسرے کے خلاف
دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بدو لڑائی کے لئے ہر وقت
تیار رہتا مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ مارے جانے کا بھی آرزومند 89
ہے۔ اسی لئے وہ معرکے جن کے جوش خروش کے قصے پڑھ کر خیال ہوتا
ہے کہ بڑی کٹا چھنی ہوئی ہوگی در اصل ایسے خوں ریز نہ ہوتے تھے۔
پھر بھی زائد آبادی کو چھانٹنے کا ایک ذریعہ ضرور تھے اور ایسے علاقے
میں جہاں غذا کی کمی سے پہلے ہی نیم فاقہ کشی رہتی ہو۔ اور جنگ
خوئی ایک مزمن مرض کی طرح مزاج کی مستقل کیفیت بن گئی ہو، یہ
لڑائیاں خاصی تبرید کا کام دیتی تھیں۔ انہی کی وجہ سے بدو کی زندگی
میں انتقام، قوی ترین قومی و اعتقادی شعائر میں شمار ہوتا تھا۔ لڑائیوں
کی جو روایتیں ہم تک پہنچی ہیں ان میں واقعات کا صدور عموماً یکساں
پایا جاتا ہے۔ اول کسی سرحدی جھگڑے یا ذاتی اہانت کی بنا پر چند
آدمی گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ جھگڑا پورے قبیلے کا تنازعہ بن جاتا

ہے اور آخر کسی ثالث بالخیر کے بیچ میں پڑنے سے صلح کر لی جاتی ہے۔ جس قبیلے کے آدمی کم مارے گئے ہیں وہ حریف کو زائد مقتولوں کا خون بہا ادا کر دیتا ہے۔ البتہ بہادروں کے کارنامے عوام کے حافظوں میں پشت ہا پشت بلکہ صدیوں تک تازہ رہتے ہیں۔ مدینے کے دو ہم نسل قبیلوں اوس اور خزرج کی لڑائی "یوم بُعاث"[۱] ہجرت نبویؐ سے چند سال پہلے اسی طرح ہوئی تھی۔ "ال حجاز" کے معرکے آں حضرت کے قبیلے قریش، ان کے حلیف کنانہ اور دوسری طرف ہوازن کے درمیان واقع ہوئے۔ یہ حج کے مہینوں میں جب کہ جنگ کی ممانعت تھی، لڑے گئے اس لئے "ایام فجار" (یعنی خلاف قانون لڑائیاں) کہلائے۔ ان چار معرکوں میں سے ایک میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اپنی جوانی کے زمانے میں شریک ہوئے تھے۔[۲]

جنگ بَسُوس

ایک بہت قدیم اور مشہور بدووں کی جنگ "حرب ال بسوس" پانچویں صدی عیسوی کے اواخر میں بنو بکر و بنو تغلب میں ہوئی تھی۔[۳] یہ آپس میں رشتہ دار، شمالی مشرقی عرب کے رہنے والے اور دونوں عیسائی ہو چکے تھے۔ دونوں اپنے آپ کو وائل کی اولاد میں سمجھتے تھے۔ مگر لڑائی فقط ایک اونٹنی پہ چھڑی جو بکر کی ایک بڑھیا مسماۃ بسوس کی ملکیت تھی اور کسی تغلبی سردار کے ہاتھ سے زخمی ہوگئی تھی۔[۴] ایام عرب

---

[۱] اغانی ج ۲۔ صـ ۱۶۲۔

[۲] ابن ہشام صـ ۱۱۹۔ یاقوت بحوالہ ابن ہشام۔ ج ۳ صـ ۵۱۹۔

[۳] شہر دیار بکر ابھی تک اس قبیلے کے نام کا حامل ہے۔

[۴] اغانی، ج ۴ صـ ۱۴۰۔ ابو تمام۔ حماسہ صـ ۴۲۲۔ عقد، ج ۳ صـ ۹۵۔

کی افسانوی تاریخ کے مطابق یہ جنگ چالیس برس تک جاری رہی۔ فریقین ایک دوسرے پر چھاپے مارتے، لوٹ مار کرتے تھے اور شعرا دونوں طرف سے اشتعال دیتے اور جنگ کی آگ بھڑکاتے تھے۔ آخر ۵۲۵ء کے قریب حیرہ کا رئیس المنذر ثالث بیچ میں پڑا اور برادر ۹۰
کشی کا یہ سلسلہ ختم ہوا مگر اس وقت جب کہ دونوں فریق بالکل مضمحل ہو چکے تھے۔ تغلب کے کلیب ابن ربیعہ اور اس کے بہادر شاعر بھائی مہلہل (وفات تخ ۵۳۱ء) اور دوسری طرف بکر کے جساس ابن مرہ کے نام اب تک عربی بولنے والے ممالک میں بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ یہی مہلہل "سیرت بنی ہلال" کی عشقیہ داستان میں زیر موسوم ہوا ہے۔

"یوم داحس والغبرا" بھی کچھ کم مشہور معرکہ نہیں کہ جاہلی واقعات میں اس کی کیفیت سب سے بہتر معلوم ہے۔ یہ لڑائی وسطی عرب کے عبس اور ان کے عزیز قبیلہ ذبیان میں ہوئی۔ حسب روایت یہ دونوں غطفان کی اولاد میں تھے۔ وجہ مخاصمت یہ کہ عبس کے سردار کا گھوڑا "داحس" اور شیخ ذبیان کی گھوڑی "الغبرا" کی دوڑ میں ذبیانیوں نے چیند کی۔ یہ جنگ صلح نامہ لبوس کے تھوڑی ہی مدت بعد چھٹی صدی کے وسط میں چھڑی اور وقفوں کے ساتھ، کئی اعشار تک، اسلامی عہد میں بھی جاری رہی[1] اسی جنگ میں عنتر یا عنترہ ابن شداد العبسی نے (تخ ۵۲۵ء تا ۶۱۵ء) جو عرب کے عہد شجاعت کا بڑا سورما مانا گیا ہے، اپنی بہادری اور شاعری کے جوہر دکھائے۔

---

[1] اغانی - ج ۳، ص ۱۵۰ - ج ۹ ص ۱۵۰ -

شمالی عرب کے اثرات

شاید دنیا کی کوئی قوم حسن بیان اور تحریری یا زبانی کلام سے اتنی متاثر نہیں ہوتی جتنے عرب۔ مشکل سے کسی زبان کا اپنے بولنے والوں کے دل و دماغ پر اتنا اثر ہوتا ہوگا جتنا عربی کا۔ آج بھی بغداد و دمشق یا قاہرہ کے سامعین نظم سن کر حد درجے جوش میں آجاتے ہیں۔ اگرچہ وہ پوری طرح سمجھ میں نہ آئی ہو، اور یہی حال معیاری عربی میں خطبات سن کر ہوجاتا ہے۔ خواہ جزوی طور پر ہی معنی سمجھے ہوں۔ صرف الفاظ کی ترتیل، ترنم اور قافیہ بندی اُن پر وہ اثر کرتی ہے جسے وہ "سحر حلال" موسوم کرتے ہیں؛ وہ خاص سامی نسل کا نمونہ ہیں۔ انھوں نے کوئی بڑا فن پیدا نہیں کیا نہ اسے نشوونما دی۔ البتہ ان کی حسن پرست فطرت نے اظہار کا ایک راستہ ڈھونڈ نکالا، یعنی کلام۔ اگر یونانی کو اپنی بت تراشی اور تعمیر پر ناز تھا، تو عرب نے اپنے قصائد اور یہودی نے اپنی مناجات میں اظہارِ نفس کا نفیس تر پیرایہ ایجاد کرلیا۔ ایک عربی کہاوت ہے کہ آدمی کا حسن اُس کی فصاحت میں ہے! ایک اور بعد کا قول کہتا ہے کہ حکمت کا ظہور تین چیزوں سے ہوا: فرنگی کے دماغ سے۔ چینی کے ہاتھوں سے اور عرب کی زبان سے[1]؛ فصاحت ۹/ یعنی اپنے خیال کو نظم و نثر دونوں میں حسن و قوت سے ادا کرنا، تیراندازی اور شہسواری، یہی عہدِ جاہلیہ میں مردِ کامل کی تین لازمی صفات سمجھی جاتی تھیں۔ عربی زبان کی خصوصی ساخت کی بہ دولت اس میں عجیب و

[1] دیکھو الجاحظ، "مجموعۃ الرسائل" (قاہرہ ۱۳۲۴ء) ص۲۱۱؛ عقد۔ ج ۱ ص۱۲۵۔

غریب قل و دل، مقفیٰ مسجع طریق کلام پیدا ہوگیا۔ اسلام نے زبان کی اس صفت سے اور قوم کی اس نفسی خصوصیت سے پورا کام لیا چنانچہ مسلمان اپنے مذہب کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل کے طور پر قرآن مجید کے اعجازِ بیان اور طرز تحریر کو پیش کرتے ہیں۔ اسلام کی فتح یابی ایک خاص حد تک زبان، خصوصًا ایک کتاب کی فتح یابی تھی۔

زمانۂ شجاعت

عرب کے زمانۂ شجاعت میں عہد جاہلیّہ شامل اور ۵۲۵ء سے ۶۲۲ء تک پھیلتا ہے۔ اس زمانے کی چند ضرب الامثال، بعض فسانے اور خاص طور پر معقول تعداد میں اشعار محفوظ ہیں۔ اگرچہ ان سب کی تدوین و اشاعت اسلامی عہد میں ہوئی۔ کوئی علمی تحریر موجود نہ تھی سوا ے تھوڑے سے طبّی، موسیقی نسخوں یا جھاڑ پھونک کے منتروں کے۔ ضرب الامثال سے عوام کی ذہنیت اور تجربات کا خاصی طرح پتہ چلتا ہے۔ لقمان دانا (ال حکیم) سے بہت سی قدیم حکمت کی باتیں روایت کی گئی ہیں۔ وہ حبشی یا اسرائیلی شخص تھے۔ جاہلیت کے اور بھی کئی دانا مردوں، عورتوں کے نام بتائے جاتے ہیں۔ جیسے اکثم ابن صیفی۔ حاجب ابن زُرارہ۔ اور ہند بنت الخُس۔ ال مَیدانی (وفات ۱۱۲۴ء) کی کتاب "مجمع الامثال"[1] اور مُفضّل الضبّی[2] (متوفی ۷۸۶ء) کی "امثال العرب"

---

[1] دو جلدیں۔ (قاہرہ ۱۳۱۰ھ) نیز فریتاگ: "ارابوم پروربیا" (بون ۴۳-۱۸۳۸ء)

[2] " (قسطنطنیہ ۱۳۰۰ھ) نیز دیکھو المُفضّل ابن سلمہ کی "ال فاخر" (لائیڈن ۱۹۱۵ء)۔

میں ماقبل اسلام حکمت کے بہت سے نمونے مل سکتے ہیں۔ جاہلی ادب میں نثر کی اچھی نمائندگی نہ ہو سکتی تھی کیوں کہ کوئی طریق تحریر ہی اس وقت تک مکمل نہ ہوا تھا۔ تاہم چند عبارتیں جو اسلامی عہد میں لکھی گئیں زمانۂ ماسبق سے منسوب کی جاتی ہیں۔ یہ بیش تر حکایات و روایات ہیں۔ ان میں اکثر وہی لڑائیاں جن کا اوپر ذکر آیا، بین القبائل معرکے اور یا انساب سے بحث کی گئی ہے۔ عرب نسّاب، اپنے بھائی عرب مؤرخ کی طرح خلا چھوڑنے سے بہت گھبراتا تھا اور اُس کی متخیلہ بلا دقت جوڑ ملاتی اور خالی بیاض بھر دیتی تھی۔ اس طرح وہ اکثر صورتوں میں اپنی تحریر کا سلسلہ حضرت آدمؑ سے، اور اگر کمی پر قانع ہو تو بھی اسمٰعیلؑ
٩٢ اور ابراہیمؑ سے اپنے زمانے تک پورا پیش کر دیتا تھا۔ انساب کے متعلق ابن دُرید کی کتاب "الاشتقاق"[1] اور اصبہانی (متوفی ۹۶۷ء) کی قاموسی کتاب "الاغانی" نہایت قیمتی مصالحہ فراہم کرتی ہیں۔ قبل اسلام کاہنوں کی مقفیٰ نثر کے بھی نمونے سلامت رہ گئے ہیں۔

شاعری

صرف شعر گوئی کا میدان ایسا تھا جس میں جاہلی عرب بہت بڑھے چڑھے تھے۔ یہاں وہ اپنی بہترین جودت و قابلیت سے کام لے سکتے تھے۔ شاعری سے بدو کی شیفتگی، عرب شاعر کے لئے ایک ہی ذوقی اثاثہ تھا۔ دوسرے ادبیات کی طرح، عربی ادب بھی شاعری کی طغیانی سے معرضِ ظہور میں آیا لیکن معلوم ہوتا ہے یہ شاعری پورے شباب کو پہنچ کر سامنے آئی۔ دوسری اکثر زبانوں میں ہم یہ صورت نہیں پاتے۔

[1] (گوٹن جن ۱۸۵۴ء)

عربی نظمیں جو سلامت رہیں، بہ ظاہر سب سے قدیم وہ ہیں جنھیں البسوس کی جنگ کے سلسلے میں سال ہجری سے کوئی ایک سو تیس برس پہلے تصنیف کیا گیا تھا۔ لیکن ان قطعات میں رسم و روایت کی اس قدر پابندی کی گئی ہو کہ آن سے پہلے لازماً ایک طویل زمانہ تھا جس میں اظہار خیال کا فن اور زبان کی باطنی قوتیں پرورش پاتی رہیں چھٹی صدی عیسوی کے وسط کے شعرا سے بعد میں بھی کوئی فوقیت نہ لے جا سکا۔ قدیم مسلمان شاعر اور متاخر بلکہ زمانۂ حاضرہ تک کے سخن ور اس جاہلی کلام کو لاجواب اور مثالی سمجھتے ہیں۔ یہ نظمیں حفظ کر لی گئی تھیں اور زبانی منتقل ہوتی رہیں تا آں کہ دوسری اور تیسری صدی ہجری میں انھیں قلم بند کیا گیا۔ جدید تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہو کہ ان پر بار بار نظر ثانی ہوئی، ترمیم کے بعد کئی کئی نسخے تیار کئے گئے تاکہ انھیں اسلامی جذبات کے مطابق کر لیا جائے[1]۔

شعر موزوں کی نشو و نما کی پہلی منزل کاہنوں اور نجومیوں کے مقفیٰ اقوال کو خیال کیا جا سکتا ہو۔ قرآن مجید میں اس طرز کی مثالیں ملتی ہیں۔ دوسری منزل شاید شتر بانوں کے حُدی (گیت) تھے۔ عربوں کی ایک عام روایت شعر کو شتر بان کی اس کوشش کا نتیجہ بتانا چاہتی ہو کہ اونٹ کی ٹھمک ٹھمک چال کے مطابق گیت گایا جائے۔ عجب نہیں کہ اس میں تھوڑی بہت صداقت ہو۔ حادی (= حُدی خوان) کا لفظ سائق یعنی شتر بان کا ہم معنی ہو۔

---

[1] دیکھو طٰہٰ حسین: "ادب الجاہلی" (مصنف کی اس درجہ تعمیم، محل نظر ہو اور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے بعض اجتہادات بھی اہل علم نے قبول نہیں کئے۔ مترجم)

نثر مقفیٰ کے ارتقا سے رجز بنا۔ جس کے ہر مصرعے میں ۴ یا ۶ رکن ہوتے ہیں۔ یہ نظم کی سب سے ابتدائی اور سادہ شکل ہے اس کی عربی تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ شاعری میں پہلا بچہ ہے جس کی ماں گیت اور باپ سجع ہیں ان کے ازدواج سے وہ پیدا ہوا ؟

قدیم عربی قصیدہ

ادبیات کے اس عہدِ شجاعت میں، ادبی اظہار کا ذریعہ صرف شعر تھا، اس کی واحد اور نہایت مکمل صنف قصیدہ تھی۔ ان طویل نظموں کی پہلی تصنیف کا سہرا مہلہل کے سر باندھا جاتا ہے۔ وہ جنگ بسوس میں بنی تغلب کا سورما تھا۔ (تخمیناً ۵۳۱ء میں وفات پائی)۔ قرینہ بھی یہی کہتا ہے کہ قصیدے کی نشو ونما "ایامِ عرب" کے سلسلے میں، اور تغلب یا کندہ قبائل میں ہوئی۔ امرء القیس (وفات تخ ۵۴۰ء) اصلاً جنوبی عرب کا قحطانی، بنو کندہ کا فرد تھا۔ اتنے پرانے زمانے کا شاعر ہونے کے باوجود وہی عام طور سے شعرا کا سرتاج یا "امیر" تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تغلبی قبیلۂ ربیعہ کا شاعر عمرو ابن کلثوم (وفات تخ ۶۰۰ء) شمالی عرب کا تھا۔ ان دونوں کی مقامی بولیوں میں فرق تھا مگر ان کے قصیدے یکساں ادبی طرز رکھتے ہیں؛ عربی قصیدے کا آغاز ہومری نظم کی طرح یکایک ہوتا ہے لیکن وزن و بحر کی بارکیوں اور پیچیدگی میں وہ الیاد و اُدیسے سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ جس وقت وہ تاریخ کی روشنی میں آیا، اسی وقت سے ہم اُسے مقررہ قواعدِ رسمی کا پابند پاتے ہیں: وہی تشبیب، وہی طرزِ خطاب، وہی

صنائع بدائع اور وہی ایک سے موضوعات۔ اور یہ سب چیزیں بتاتی ہیں کہ وہ ایک زمانے سے تکمیل پاتی رہی ہیں۔ پرجوش جذبات سے لبریز اور بلیغ و پُراثر الفاظ کے باوصف عربی قصیدوں میں نئے خیالات اور فکر انگیز تمثیلات کی بہت کمی ہے اسی لئے وہ دنیا میں قبول عام نہیں حاصل کرسکے۔ ان میں اصل تصنیف کی بجائے اکثر صاحب تصنیف داد کا زیادہ مستحق ہوتا ہے۔ دوسری زبان میں ترجمہ کرنے سے ان کی خوبی جاتی رہتی ہے۔ نفسی یا شخصی عنصر کا غلبہ پایا جاتا ہے۔ موضوع، حقیقی لیکن میدان محدود اور نقطۂ نظر مقامی ہے۔ کوئی قومی رزمیہ یا اول درجے کی تمثیلی نظم (= ناٹک) عربوں نے کبھی تیار نہیں کی۔

معلّقات

قدیم قصائد میں سب سے اوّل مرتبہ "سبعہ معلقات" کو ملا۔ یہ ابھی تک عربی بولنے والے ملکوں میں شاعری کے شہ کار ہونے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ ان کی نسبت فسانہ کہتا ہے کہ ہر ایک بازار عکاظ میں سالانہ انعام کے قابل قرار پایا اور اسے سونے کے حروف میں لکھ کر خانہ کعبہ کی دیواروں پر لٹکایا گیا تھا[1]۔ ان کے وجود میں آنے کی یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ حجاز میں نخلہ اور طائف کے درمیان ہر سال ایک میلہ یا ایک قسم کا ادبی اجتماع ہوا کرتا تھا اور یہاں شجاعانِ روزگار جو شعر بھی کہتے، خود آکر اپنے کارنامے سناتے اور اوّلیت کا دل فریب انعام جیتنے میں باہم مقابلہ کرتے تھے۔ شاعر کے نام پانے کی جگہ صرف یہی تھی۔ یہ "سوقِ عکاظ" گویا جاہلی عرب میں

---

[1] سیوطی: "المزہر" (قاہرہ ۱۳۲۵ھ) ج ۲ ص ۲۴۰۔

فرانس کی اکادمیہ کی شان رکھتا تھا۔ کہتے ہیں یہ میلا حج کے مہینوں میں لگا کرتا تھا جب کہ جنگ و قتال ممنوع تھے۔ جاہلی عرب کی تقویم بھی بعد کی اسلامی تقویم کی طرح ہلالی تھی۔ سال کے تین مہینے یعنی ذوقعدہ، ذوحجہ اور محرم امن و صلح کے مہینے تھے۔ میلے میں دیسی اشیا کی نمائش و فروخت اور مبادلے کے بھی اچھے موقعے مل جاتے تھے۔ ہم آسانی سے تصور کر سکتے ہیں کہ ایسے صلح و مسالمت کے مجمعوں میں اہل صحرا کیسے خوشی خوشی آتے، دکانوں کی سیر کرتے اہلے گہلے پھرتے ہوں گے اور کھجور کی شراب پی پی کر مغنیہ عورتوں کے نغموں کا لطف اٹھاتے ہوں گے۔

اگرچہ مشہور ہے کہ پہلا قصیدہ جس نے عکاظ کے اہل الرائے سے خراج تحسین وصول کیا، امرء القیس (وفات تخ ۵۴۰ء) نے لکھا تھا لیکن معلقات کی تدوین کی امویوں کے آخر زمانے سے قبل کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں مشہور انشا پرداز حماد الراویہ نے فروغ پایا۔ اسی نے ان سات زریں قصائد کو ایک علاحدہ مجموعے میں مدون کیا۔ یقیناً اور بہت سے قصیدے ہوں گے جن میں سے یہ سات منتخب کئے گئے تھے۔ حماد کا مجموعہ اکثر یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا جا چکا ہے۔[1]

ماقبل اسلام زمانے کا شاعر

سبع معلقات کے پہلو بہ پہلو ہمیں قبل اسلام شاعری کا ایک مجموعہ ملتا ہے جسے المفضل الضبی (وفات تخ ۷۸۶ء) نے جمع کیا اور اسی کے

---

[1] دیکھو ولیم جونز: "ورکس" (لندن ۱۷۹۹ء) ج ۱۰ ص ۳۴۵۔ اور این ویل فرینٹ: "دی سیون گولڈن اوڈز اوف پیگن ارے بیا" (لندن ۱۹۰۳ء)

نام پر "ال مفضلیات" موسوم ہی۱؎ اس میں ثانوی درجے کے شاعروں کے ایک سو بیس قصیدے دئے گئے ہیں۔ کئی دیوان یعنی مختلف شعرا کے انتخابات اور دیوانِ حماسہ میں بہت سے قطعات اور اشعار منقول ہیں۔ اس کی ترتیب ابو تمام (وفات تخ ۸۴۵ء) نے کی تھی۔ علیٰ ہذا ال اصبہانی (وفات ۹۶۷ء) کی "کتاب ال اغانی" میں قبل اسلام شاعری کے اقتباسات محفوظ ہیں ۰ عربوں میں "شاعر" جیساکہ خود لفظ بتاتا ہی، ابتدا میں اُس شخص کو کہتے تھے جسے ایسی چیزوں کا علم ہو جو عام لوگوں سے چھپی ہوئی ہوں۔ اور یہ علم اُسے اپنے ہم زاد یا شیطان سے حاصل ہوتا تھا۔ شعر کہنے میں اسے مخفی قوتوں (جن وغیرہ) سے مدد ملتی تھی اور اُس کی بددعائیں دشمن پر تباہی لاسکتی تھیں۔ اسی لئے ہجا عربی شاعری کی بہت قدیم صنعت تھی ۰ پھر شاعر کا منصب ترقی کرتے کرتے کئی وظائف کا حامل ہوگیا۔ جنگ میں اُس کی زبان وہی کام کرتی تھی جو اس کی قوم کی دلاوری۔ زمانۂ امن میں وہ اپنے پرجوش کلام سے بڑا فساد مچا سکتا تھا۔ اس کی نظمیں سارے قبیلے کو اسی طرح مشتعل کرسکتی تھیں، جیسے آج کل سیاسی مظاہروں میں عوامی مقرر کی 95 آتش زبانی جوش پھیلا دیتی ہی۔ وہ اپنے زمانے کا صحافی اور اخبارات کا نمائندہ تھا۔ غسان اور حیرہ کے سرکاری وقائع سے ظاہر ہوتا ہی کہ فیاضانہ داد و دہش سے اُسے خوش رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس کے اشعار لوگوں کو حفظ ہو جاتے اور زبانوں پر چڑھ جاتے تھے۔ لہذا نشر و اشاعت کا نہایت قابل قدر ذریعہ تھے۔ وہ رائے عامہ کو بناتا

۱؎ شائع کردہ سی جے لائل، (آکسفورڈ کلارنڈن، ۱۹۱۸–۱۹۲۱ء)

بھی تھا، پھیلاتا بھی تھا۔ اس کی دہن دوزی اور ہجویات سے محفوظ رہنے کے لیے "قطعِ لِسان" (یعنی زبان کاٹ دینے) کا محاورہ بولا جاتا تھا۔[1] شاعر اپنی قوم کا صرف مرشد، رہنما، خطیب اور ترجمان ہی نہ تھا بلکہ مورخ اور علمی بھی قوم میں حکمت یا تجربی علم ہو، اس کا حامل ہوتا تھا اہلِ صحرا عقل کا موازنہ شاعری سے کرتے تھے۔ الاغانی میں ایک قصیدہ خواں کا قول آتا ہو کہ "میرے قبیلے کا مقابلہ کون کر سکتا ہو... اس کے شہسوار، اس کے شاعر، اس کے افراد کی تعداد میں؟"[2] انہی تین اجزا، یعنی جنگی قوت، عقل اور تعداد پر قبیلے کی فوقیت منحصر تھی۔ قوم کی تاریخ اور علوم میں مہارت کے لئے شاعر کو اپنے قبیلے کے انساب اور معلومات عامہ سے عمدہ واقفیت رکھنی ہوتی تھی۔ افرادِ قبیلہ کے کمالات اور گذشتہ کارنامے، حقوق، چراگاہیں اور حدود جاننے ضروری تھے۔ مزید برآں وہ اپنے حریف قبائل کی تاریخی ناکامیوں اور نفسی کمزوریوں کو نظر میں رکھتا تھا اور ان کے پترے کھولنا اور خاک اڑانا اُس کے فرائض میں داخل تھا۔

انہی سب وجوہ سے قدیم شاعری، اپنی ذاتی دل کشی، بیان کے حسن اور شان و شکوہ کے ساتھ بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہو کہ یہ اپنے زمانۂ تصنیف کے حالات کا مطالعہ کرنے میں معلومات کا ماخذ ہو۔ بلکہ سچ پوچھیے تو جیسی کچھ بری بھلی ہم عصر شہادت ہو تو یہی شاعری ہو اور اس سے قبلِ اسلام عہد کی معاشرت کے ہر پہلو پر روشنی پڑتی ہو۔ اسی سے یہ ضرب المثل بنی کہ "شاعری اہلِ عرب کا سرکاری دفتر ہو"۔

---

[1] ج ۴، ص ۸

[2] مزہر، ج ۲، ص ۲۳۵۔

بدو کی سیرت شاعری کے آئینے میں

جاہلی شاعری میں انسانیت کے کمال کا جو تصوّر پیش کیا گیا ہے وہ مروّت و عِرض کے الفاظ سے ادا کیا جاتا تھا۔ مروت کے معنی مردانگی (بعد میں نیکوی) اور عِرض سے عزت یا شرافت مراد ہی[1]۔ مروّت، بہادری، وفاداری اور سیرچشمی کے اوصاف سے مرکب تھی۔ بہادری کا پیمانہ غزوات کی تعداد ہوتی تھی اور سیرچشمی یا فیاضی کا اظہار یہ تھا کہ آدمی کسی مہمان کے آنے یا غریب و محتاج کی مدد کے لیے اپنا اونٹ قربان کرنے پر تیار ہو جائے۔ بدوی مہمان نوازی کا مجسّم نمونہ جس کا ٩٦ نام آج تک زندہ رہا، حاتم طائی (وفات تخ ۶۰۵ء) تھا۔ لڑکپن ہی میں جب وہ اپنے باپ کے اونٹ چرایا کرتا تھا، اس نے اجنبی مسافروں کو کھلانے کے لیے تین اونٹ ذبح کیے اور باقی انہی میں بانٹ دئے اسی پر باپ نے ناراض ہو کر اسے گھر سے نکال دیا[2]۔ بدوی شجاعت اور جواں مردی کی مثال میں عنترہ ابن شدّاد العبسی (تخ ۵۲۵ تا ۶۱۵ء) کا نام نسل بانسل تک زباں زد رہا، جو مرتےا عیسائی تھا۔ شہسوار، شاعر، جنگ جو، عاشق مزاج ــ غرض جملہ صفات سے جو اہل صحرا میں محبوب تھیں، موصوف تھا۔ اس کی بہادری کے واقعات اور اپنی معشوقہ عبلہ سے راز و نیاز کے قصّے عربی بولنے والی دنیا کی ادبی میراث بن گئے ہیں۔ عبلہ کا نام عنترہ کے قصیدۂ معلقہ نے لافانی کر دیا ہے۔

---

[1] مروّت و عِرض پر دیکھو بشر فارس کا مضمون "انسائکلوپیڈیا آف اسلام" کے ضمیمے میں۔

[2] ابن قتیبہ: "الشعر والشعراء" (لائیڈن ۱۹۰۲ء) ص ۱۲۳

لیکن عنترہ ایک سیاہ فام کنیز کا بیٹا، اور غلام پیدا ہوا تھا۔ ایک دشمن قبیلے کی جنگ میں اُس نے لڑنے سے یہ کہہ کر انکار کیا کہ غلام کو لڑنا نہیں آتا۔ اُس کا کام اونٹنی کا دودھ دوہنا ہے!" باپ نے نعرہ مارا "حملہ کر، تو آزاد ہے"[1]

بدوؤں کا جاہلی مذہب

شاعری سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد جاہلیہ کے بدو کا مذہب نہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ روحانی محرّکات سے وہ جوش میں نہ آتا تھا بلکہ بے پروائی کرتا تھا۔ قبیلے کی تقلیدِ جامد اور رسم کہن کے احترام کی بنا پر وہ تھوڑی بہت مذہب کی پابندی کر لیتا تھا ورنہ کسی دیوی دیوتا سے سچی عقیدت کی کوئی مثال ہمیں نہیں ملتی۔ امرء القیس کا ایک قصہ اس نظریے کی شہادت دیتا ہے۔ قیس باپ کے قتل کا انتقام لینے روانہ ہوا تو ذوالخلصہ کے مندر[2] میں ٹھیرا کہ ازلام (تیروں کے قرعے) سے فال نکلوائے[3]۔ تینوں دفعہ فال نکلی کہ (ارادہ) چھوڑ دے! تو اُس نے ٹوٹے ہوئے تیر دیوتا پر کھینچ مارے اور چلّایا کہ ملعون، اگر تیرا باپ مارا گیا ہوتا تو پھر تو مجھے انتقام لینے سے ہرگز منع نہ کرتا!"[4]

---

[1] ابن قتیبہ: ص۱۳۳۔ اغانی: ۷، ص۱۴۹

[2] یہ مندر مکہ سے سات دن کے راستہ پر جنوب میں واقع تھا۔ اس میں ایک سفید پتھر کی پوجا کی جاتی تھی۔ دیکھو الکلبی کی "الاصنام" (قاہرہ ۱۹۱۴ء) ص۳۴

[3] جاہلیت کے بتوں کی مزید کیفیت آئندہ اوراق میں آتی ہے۔ "ازلام" یعنی تیروں سے فال لینے کی قرآن مجید میں ممانعت کے لئے دیکھو سورہ المائدہ۔ ۳ و ۹۲

[4] اغانی۔ ۸۔ ص۷۰

شعری اشارات کے علاوہ، بدوی مذہب کے متعلق ہماری معلومات کے خاص ماخذ وہ جاہلی عقائد ہیں، جو عہد اسلامی میں بھی باقی رہے نیز وہ روایات و قصص جو بعد کی اسلامی کتابوں میں منقول ہیں اور الکلبی (وفات ۸۲۰-۸۱۹ء) کی کتاب "الاصنام" ورنہ جاہلیت کے عربوں نے کوئی دیو مالا تیار نہیں کی نہ بابل والوں کی طرح الٰہیات اور آفرینش کے عقائد مرتب کئے۔ بدو کا مذہب سامی نسل کی بالکل ابتدائی اور 7 بدوی شکل پیش کرتا ہے۔ جنوب میں جب مدنیت آئی اور مذہبی عقائد میں کواکب پرستی کے عناصر داخل ہوئے، پر تکلف مندر بنے، نذر نیاز اور قربانیوں کی پیچیدہ مراسم کا چلن ہوا تو یہ مذہب کی بعد کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ بترا اور تدمر کی مہذب قوموں کا شمس پرستی پر زور دینا ند احتی عہد کی یاد دلاتا ہے جب کہ سورج کی جاں بخش شعاعوں سے نباتات کے اگنے کا تعلق آدمی کی سمجھ میں آگیا تھا۔

بدو کے مذہب کی اساس دوسرے بدوی مذاہب کی طرح مظاہر پرستی پر قائم تھی۔ شاید ریگستان اور نخلستان کا حیرت انگیز فرق دیکھ کر اسے سب سے پہلے خاص خاص خدائی قوتوں کا تصور پیدا ہوا۔ سرسبز زمین کی قابلیت میں خدائے رحمت کار فرما نظر آیا جس کی خدمت عظمت کرنی مناسب تھی اور خشک ریگستان، موذی شیطان کی کارستانی معلوم ہوا، جس سے خوف کیا جائے لہ

خدا کا تصور تشکیل پانے کے بعد بھی، قدرتی اشیا جیسے درخت، چشمے، غار، پتھر وغیرہ لائق تقدس رہے کیونکہ عبد کے معبود تک

لہ عربی لفظ "تقوی" کا مادہ ہوشیار رہنے، خوف کرنے کے معنی رکھتا ہے۔

پہنچنے کا واسطہ بھی تھے۔ ریگستان میں چشمہ (یا کنواں) جس کا پانی جاں بخش اور طہارت وصحت کا موجب تھا، بالکل شروع میں پوجا کے لائق ٹھیر گیا تھا۔ عربی مصنفوں کے قول کے مطابق چاہ زمزم کی تقدیس قبلِ اسلام بہت زمانہ پہلے، اس وقت سے چلی آتی تھی جب کہ اس نے حضرت ہاجرہ اور اسمٰعیلؑ کو پانی دیا[1] یاقوت[2] اور اس کے بعد قزوینی[3] لکھتے ہیں کہ چاہ عروہ سے مسافر پانی لے جاتے اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کو خاص تحفے کے طور پر دیتے تھے؛ غاروں کا تقدس زیر زمیں دیوتاؤں اور قوتوں کی وجہ سے کیا جاتا تھا۔ مقام نخلہ میں غار غب غب کی شروع میں یہی نوعیت تھی جہاں ال عزیٰ کی پر بھینٹ چڑھاتے تھے[4] بعل دیوتا زیر زمیں پانی اور چشموں کا کارفرما مانا جاتا تھا اور ملک عرب میں ضرور اسی زمانے میں لایا گیا ہوگا جس زمانے میں کھجور لائی گئی۔ مسلمانوں کی مال گزاری کے ضوابط میں اس لفظ کا دلچسپ نشان یہ باقی رہ گیا تھا کہ بارانی اور بعل کی (یعنی جن کو آب پاشی کی ضرورت نہ ہو) اراضی کی قسمیں الگ الگ تھیں؛

سورج کا تعلق

بدو کے کوکبی عقائد کا مرکز چاند تھا جس کی چاندنی میں وہ اپنے گلے چراتا تھا۔ قمر پرستی، گلہ بانی کی معاشرت یاد دلاتی ہے بجائے کہ شمس پرستی میں بعد کی زراعتی منزل آنے کا مطلب نکلتا ہے۔ خود ہمالے

---

[1] ابن ہشام: سیرہ ص۷۱؛ [2] ج ۱- ص۴۳۳

[3] "عجائب المخلوقات" (گاٹن جن، ۱۸۹۴ء) ص۲۰۰

[4] کلبی، ص۱۸- یاقوت، ج ۳- ص۶۶۴-

زمانے میں قبیلۂ زوفلہ کے مسلمان بدو سمجھتے ہیں کہ چاند ان کی زندگی کا نظام بناتا ہے - آبی ابخرہ کو ٹھنڈا کرتا اور چراگاہ پر شبنم ٹپکاتا ہے ۹
جس کی بہ دولت نباتات اُگ سکتی ہے - بہ خلاف اِس کے سورج کی نسبت وہ باور کرتے ہیں کہ اُس کا بس چلے تو بدّووں اور سارے حیوانات و نباتات کو فنا کر ڈالے ؎

مذہبی عقائد کے جملہ ابواب میں ایک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ بلند تر منزل پر پہنچنے کے بعد بھی سابقہ عقائد کسی نہ کسی شکل میں چلتے رہتے ہیں اور ہر دو منزل کے عقائد میں مصالحت ہوجانے کا پتہ دیتے ہیں۔ مثلاً چندر دیوتا وَدّ (سورۂ نوح - ۲۳) مِنائی قوم کے دیوتاؤں میں سب کا صدر بنا رہا - ابن ہشام[۱] اور طبری[۲] لکھتے ہیں کہ نجران میں ایک کھجور بہت مقدس تھی "ذاتِ انواط"[۳] (جس پر چیزیں لٹکائی جائیں) کہ ہر سال اہل مکہ وہاں جایا کرتے تھے ، ممکن ہے کہ ال عُزّیٰ کے مندر ہی کا درخت ہو[۴] طائف میں ال لات ایک مربع پتھر کی صورت کا بنایا گیا تھا[۵] اور بترا میں ذوشریٰ دیوتا بھی ایک ناتراشیدہ چوکور چار فٹ اونچا دو فٹ چوڑا کالا پتھر تھا - ان میں سے اکثر بتوں کے واسطے "حِمیٰ" یعنی چراگاہ کی زمین مخصوص ہوتی تھی ؎

جن - اور (نعوذ باللہ) خدا کی بیٹیاں

بدّووں نے صحرا میں بہت سی موذی ارواح بسا رکھی تھیں انہیں

۱؎ سیرۃ - ص۵۵ - ۲؎ ۱ ق - ص۱۱۳۲ ۳؎ سیرۃ - ص۱۱۳۵
۴؎ دیکھو کلبی ، ص۱۸ ۵؎ ایضاً ص۱۶ -

جن یا شیطان (= دیو) کہتے تھے۔ یہ جن نوعیت میں دیوتاوں سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھے بجز اس کے کہ انسانوں سے ان کا سلوک دوسری طرح کا ہوتا تھا۔ دیوتا مجموعی طور پر مہربان اور جن دشمن ہوتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ صحرا اور وہاں کے درندوں سے خوف نے اس قسم کے عجیب عجیب تخیلات پیدا کیے تھے۔ دیوتاؤں کا مُلک وہ علاقے تھے جہاں انسان رہتا بستا ہے اور جن صحرا کے غیر آباد ناقابلِ گزر قطعات کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اسلام نے جاہلی دیوتاؤں کو اُن کے مرتبے سے گراکر اسی قسم کی مخلوق میں شامل کر دیا[۵۱] جس سے جنوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔

حجاز کے شہری باشندے کل آبادی میں تقریبًا سترہ فی صدی تھے۔ ان میں بت پرستی کی کوکبی منزل پہلے آگئی۔ ال عزّیٰ، ال لات اور ال مناۃ (نعوذ باللہ) خدا کی تین بیٹیاں (بنائی گئی) تھیں جن کے استھان اسی سرزمین میں تھے جو دینِ اسلام کا گہوارہ بنی۔۔۔۔۔[۵۲]

۹۶ ال لات کے (ال اِلٰہہ، بہ معنی دیوی سے) طائف کے قریب حِمیٰ اور حرم بھی مقرر تھے۔ اہلِ مکہ اور دوسرے لوگ یہاں زیارت اور قربانی کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان مقدس قطعات میں درخت کاٹنے،

---

[۵۱] قرآن مجید۔ سورۂ والصّٰفّٰت۔ ۱۵۸۔ الانعام: ۱۰۰۔

[۵۲] یہاں مصنف نے سورۂ والنجم کی آیات ۱۹ و ۲۰ کی نسبت وہ روایت لکھی ہے جس میں نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا سہواً چند بتوں کا نام لینا مروی ہے۔ روایت قابلِ استناد نہیں۔ دوسرے یورپ کے محققوں کی زبردستی دیکھیے کہ اپنی طرف سے سہو کو ارادہ تجویز کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی اقرار ہے کہ قرآن شریف میں توحید خالص پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ مصنف نے اسی سلسلے میں ناسخ و منسوخ کا بھی دو تین جملوں میں ذکر کیا ہے جس سے محض سوئے ظن ظاہر ہوتا ہے اور ناظرین غلط فہمی یا خلجان میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ (مترجم)۔

شکار کھیلنے اور کشت وخون کی ممانعت تھی۔ ان کے جانور اور پودے دیوی کے تقدس میں حصہ دار ہوتے تھے۔ بنی اسرائیل کے مامنوں کی بھی اصل اسی طرح کی تھی۔ لات کا تذکرہ ہر ددوتس نے نبطی دیوتاؤں میں "الیلات" کے نام سے کیا ہے[1]۔ ال عزیٰ (= صاحب قوت ستارۂ صبح، زہرا) کا دین کے سے مشرق میں بہ مقام نخلہ جاری تھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ قریش میں اس بت کی سب سے بڑھ کر تعظیم و تقدیس کی جاتی تھی[2]۔ اس کے استھان میں صرف تین درخت تھے۔ آدمی کی قربانی بھی اس کی پرستش میں داخل تھی۔ ایک جنوبی عرب نے اپنی بیمار بیٹی مسماۃ "امت عزیٰ" کی طرف سے یہیں سونے کا بت چڑھایا تھا[3]۔ ظہور اسلام کے وقت "عبدالعزیٰ" عام طور سے نام رکھا جاتا تھا۔ مناۃ (منیہ، بہ معنی انجام تقدیری سے) قسمت کی دیوی تھی[4] اور اس اعتبار سے مذہب کے قدیم تر دور کی یادگار ہی تھی۔ اور یثرب کے راستے میں بہ مقام قدید اس کا بڑا معبد تھا جس میں ایک کالا پتھر رہتا تھا۔ یہ دیوی قبائل اوس و خزرج میں بہت مقبول تھی جنھوں نے مکے سے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی تاریخی ہجرت کے بعد آپؐ کی رفاقت کی۔ ذوالشریٰ کے ساتھ اس کا نام جداگانہ دیوی کے طور پر ال حجر کے نبطی کتبات میں مذکور ہے[5]۔ آج کے دن تک عربی شعر نویس ساری مصیبتوں کا الزام "ال منایا" یا "ال دہر" یعنی زمانے کو دیتے ہیں۔

---

[1] جزو سوم۔ باب ۸ [2] ص ۱۹ (کلبی کی یہ روایت کہ جناب نبی کریمؐ بھی جاتی میں وہاں گئے تھے، نامعتبر ہے۔ مترجم) [3] نائل سن۔ ۱۶۔ ص ۳۴۶ [4] سیفی ۱ "اسرائیل" ۶۵: ۱۱ [5] کلبی، ص ۱۳ [6] کوک، ص ۲۱۷ وغیرہ وغیرہ۔

۱۰۰ سامیوں میں اوّل اول باپ سے بڑھ کر ماں کے خون کا رشتہ مانا جاتا تھا اور خاندان کی تنظیم ماں کی سیادت کے اصول پر تھی، لہذا جاہلی اور قدیم عربوں کی عبادت میں دیوی کو دیوتا پر فوقیت دی جاتی تھی۔

کعبۂ مکّہ (معظمہ)

ال کعبہ کا بڑا بت بظاہر ہُبَل تھا۔ (ارامی زبان سے بہ معنی بھاپ یا رُوح) اسے انسانی شکل میں تراشا تھا۔ اس کے پہلو میں تیر سیدھے رکھے رہتے تھے جن کا قرعہ ڈال کر کاہن فال نکالتے اور پیش گوئی کرتے تھے (کاہن بھی ارامی زبان کے مادے سے مشتق ہے) ابن ہشام کی روایت میں عمرو ابن لُحَیّ کو بتایا ہے کہ وہ مآب یا عراق عرب سے یہ بت لایا تھا[۵۱] اس سے جس حد تک ہُبَل کی ارامی اصلیت کی یاد تازہ ہوتی ہے، یہ روایت صحیح ہوگی[۵۲] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے مکہ فتح کیا تو ہبل پر بھی وہی گزری جو دوسرے بتوں پر گزری تھی یعنی اُسے توڑ پھوڑ دیا گیا۔

جاہلی کعبہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سیدھی سادی قدیم وضع کی کعب عمارت تھی۔ اوّل اوّل اس پر چھت نہ تھی۔ اندر ایک آسمانی (یعنی شہاب ثاقب کا) پتھر خارق کے طور پر پُوجا جاتا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت خانہ کعبہ کی عمارت ولید ابن مغیرہ نے ازسرِ نو بنائی تھی۔ اس میں لکڑی وغیرہ ایک شکستہ جہاز کی لگائی تھی۔ یہ یونانی جہاز حبشہ

۵۱۔ سیرہ۔ ص ۵۰۔

۵۲۔ عربی لفظ "صنم" غالباً ارامی کے "صیلم" کی بدلی ہوئی صورت ہے۔

جاتے ہوئے بحر قلزم کے ساحل پر ٹوٹ گیا تھا[۱] خانہ کعبہ کے گرد زمین مخصوص کردی تھی جس میں کشت و خون وغیرہ حرام تھا۔ ہر سال یہاں لوگ حج و زیارت کے لئے آتے اور خاص قربانیاں ادا کرتے تھے اسلامی روایتوں میں کعبے کی بنا حضرت آدم سے منسوب کی جاتی ہے کہ وہ آسمانی کعبے کے نقشے پر ڈالی گئی تھی۔ طوفانِ نوح ؑ کے بعد اسے حضرت ابراہیم ؑ اور اسمٰعیل ؑ نے ازسرنو تعمیر کیا[۲] انہی کی اولاد میں تولیت رہی یہاں تک کہ معزور بنی جرہم اور پھر بنو خزاعہ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے بُت پرستی کو رواج دیا۔ آخر میں دوبارہ حضرت اسمٰعیل ؑ کی نسل میں قریش کو یہ منصب مل گیا...[۳] مکہ میں اللہ (ال الٰہ = خدائے واحد) کی بھی عبادت ہوتی تھی مگر دوسرے دیوتا شریک کرلئے گئے تھے۔ یہ اسم (ذات) قدیم اور جنوبی عرب کے دو کتبوں میں آتا ہے: ایک رِنائی؛ جو العُلا میں نکلا۔ دوسرا سبائی۔ لیکن قدیم تر پانچویں صدی قبل مسیح ؑ کے لحیانی کتبوں میں "ہ ل ہ" کی صورت میں کثرت سے تحریر ہے[۴] اور لحیان ہی ملکِ عرب میں اللہ کی پرستش کا پہلا مرکز بنا جہاں یہ نام ۱۵۱
صریحاً شام سے پہنچا تھا۔ اسلام سے پانچ صدی پہلے صفا کے کتبوں

---

[۱] ازرقی: "اخبار مکہ" (لائپزگ ۱۸۵۸ء) ص ۱۰۱۔ تاریخ یعقوبی۔ ج ۲ ص ۱۶۱

[۲] سورۂ بقرہ: ۱۲۸۔ (مصنف نے یہاں اوپر کی قیاسی روایات کو قرآن مجید کے بیان سے اس طرح گڈ مڈ کیا ہے کہ غلط فہمی پیدا ہوسکتی ہے۔ قرآن مجید میں صرف حضرت ابراہیم ؑ و اسمٰعیل ؑ کے خانہ کعبہ بنانے کا ذکر ہے۔ آسمانی نقشے اور طوفان نوح وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ مترجم)

[۳] (مصنف نے یہاں بلا حوالہ یہ روایت لکھی ہے کہ جس وقت حضرت اسمٰعیل ؑ عمارت کعبہ بنا رہے تھے، حضرت جبرئیل سے انھیں حجر اسود اور مناسک حج کی تعلیم حاصل ہوئی۔ روایت کا جزو اول صریحاً وضعی ہے۔ مسئلہ قابل غور تھا کہ تاریخ کی کتاب میں درج کیا جائے۔ مترجم) [۴] ونیٹ ص ۳۰

میں اسے "ہلاہ" لکھا ہے اور اسی طرح امّ الجمال (شام) کے قبلِ اسلام عیسائی عربی کتبے میں، جسے چھٹی صدی عیسوی سے منسوب کرتے ہیں[۵۱]۔ خود جناب پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے والد کا نام عبداللہ تھا۔ قرآن شریف کی متعدد آیات (جیسے: لقمان: ۲۵ و ۳۲؛ الانعام: ۱۰۹ و ۱۳۷؛ یونس: ۲۲) سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسلام سے قبل اہلِ مکہ اللہ کو خالق اور ربِ اعلیٰ اور خاص مصیبت میں مدد مانگنے کے لائق سمجھ کر احترام کرتے تھے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ قریش کا قبائلی معبود تھا[۵۲]۔ ہرچند مکہ ناخوش گوار بنجر علاقے میں واقع تھا مگر کعبۃ اللہ کی وجہ سے تمام شمالی عرب میں حجاز نہایت اہم مذہبی مرکز بن گیا تھا۔

جاہلی دیوتاؤں میں نسر (= گدھ) اور عوف (= بڑا پرند) جانوروں کے نام توتمی (یعنی طائر و شجر پرستی) عہد کی یاد دلاتے ہیں۔ حیات بعدالموت کا، قدیم ادب میں کوئی واضح اور صاف عقیدہ نہیں ملا۔ چند
102 مبہم اشارات کو ہم مسیحی عقائد کی صدائے بازگشت کہہ سکتے ہیں۔ عرب میں تن پروری کا میلان اسے دنیا کے مسائل حاضرہ میں اتنا مصروف رکھتا تھا کہ آیندہ زندگی کی سوچنے کی مہلت ہی کم ملتی تھی۔ بقول ایک پرانے قوال کے ؎

---

[۵۱] ودود، ص۱۷۱؛ [۵۲] (مصنف کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ اللہ کو محض ایک قبیلے کا دیوتا ثابت کیا جائے۔ تاکہ دینِ اسلام میں اسے جو عظمت حاصل ہے وہ کس حد تک کم ہو جائے؛ حال آں کہ لغت اور تاریخ دونوں سے یہ کوشش باطل ٹھہرتی ہے۔ طرفہ تر یہ کہ مصنف جن آیتوں کا حوالہ دیتا ہے، انہی کے قریب (سورۂ انعام کے تیرھویں رکوع میں) یہ آیۂ کریمہ اللہ کی شان میں وارد ہے کہ "لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار"۔ یہ بھلا کسی پتھر یا بت سے کیا واسطہ رکھ سکتی ہے؟ آیات کی نشان دہی میں بھی مصنف سے تسامح ہوا تھا جس کی صحت کر دی گئی ہے۔ مترجم)

(ترجمہ) ہم چکر پہ چکر کھاتے زندگی کا دَور
پُورا کرتے ہیں یہاں تک کہ امیر و غریب
سب کو زمین کے نیچے آرام آجاتا ہے، پتھروں سے
ڈھکی ہوئی قبروں میں، جو ہمارا دائمی مسکن ہیں۔[1]

اشیا کے مبادلے کے لئے حجاز کی بستیوں میں بدوؤں کی آمدرفت رہتی تھی، خصوصًا امن اور حج کے مہینوں میں اور وہ شہری عقائد سیکھتے اور کعبے میں قربانی وغیرہ رسوم عبادت سے واقفیت حاصل کر لیتے تھے۔ جگہ جگہ پتھر (= انصاب) دھرے تھے جن سے بتوں اور قربان گاہوں کا کام لیتے اور وہاں اونٹ، بھیڑ بکری کی قربانیاں کرتے تھے۔ صحرائی عرب کی سب سے بڑی مذہبی عبادت ہی یہ تھی کہ دُور سے چل کر کسی شہری معبد کا حج کرنے آتا تھا۔ حج کے مقدس مہینے اسلامی سال میں ذوقعدہ، ذوالحجہ اور محرم (یعنی گیارہواں، بارہواں اور پہلا) قرار پائے اور ان میں وسط سال کا مہینہ رجب بھی ماہ حرام کے طور پر بڑھا لیا گیا۔ پہلے تین مذہبی مناسک سے مخصوص تھے اور چوتھا تجارت کے لیے تھا۔ ان دونوں کاموں کے لیے، حجاز سے بہتر ملک بھر میں کوئی علاقہ نہ ہوسکتا تھا کہ ایک تو تقریبًا وسط میں واقع ہو دوسرے شمال و جنوب کی شاہ راہیں یہیں سے گزرتی تھیں اور آمد و رفت آسان تھی۔ یہی اسباب تھے جن سے عکاظ کے میلے اور کعبۃ اللہ کے حج میں رونق پیدا ہوئی۔

---

[1] الاہتمام۔ ص۲۲۳ نیز دیکھو ترجمہ از لائل ص۳۳ (اصل قطعہ قاضی اختر میاں صاحب نے کمال عنایت سے میرے لیے تلاش کیا)۔ نطوف ما نطوف ثم یاوی ٭ ذوو الاموال منا والعدیم — الی حفر اسافلھن جوف ٭ واعلاھن صفاح مقیم۔ قطعہ بُرّہ بن مسہر طائی کی تصنیف ہے (مترجم)

ال حجاز کے تین شہر

نجد کے اونچے قطعات اور ساحل کے نشیبی میدانوں کے درمیان جنھیں تہامہ (یعنی نچلی زمین) کہتے ہیں، ال حجاز بہ طور "حجاز" (یعنی باڑ) واقع ہے۔ اس بنجر ملک میں تین ہی شہر تھے: طائف اور مکہ و مدینہ جنھیں دو بھائی سمجھنا چاہیے۔ ال طائف سایہ دار درختوں کے جھنڈ میں چھپا ہوا، سمندر سے کوئی چھ ہزار فیٹ بلند، "سرزمین شام کا ٹکڑا" کہلاتا ہے اور آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی عمائد مکہ کا گرمائی مقام تھا۔ برک ہارٹ نے ۱۸۱۴ء میں اس شہر کی سیاحت کی تو راستے کے مناظر ایسے خوب صورت اور نشاط انگیز پائے کہ لبنان سے روانہ ہونے کے بعد کہیں نہ دیکھے تھے[۱] وہاں کی پیداوار میں شہد، خربزہ،
کیلے، انجیر، انگور، زیتون، شفتالو اور ناسپاتی شامل تھے[۲] اس کے 103
گلاب مشہور تھے جن کا عطر اہل مکہ کی عطر سازی کا سرمایہ تھا۔[۳] ال اغانی نے یہ روایت ہم تک پہنچائی ہے کہ انگور کی بیلیں یہاں ایک یہودیہ نے پھیلائیں جو کسی مقامی شیخ کے لیے سب سے پہلے چند قلمیں تحفۃً لائی تھی[۴] یہاں کی انگوری شراب کی بڑی مانگ تھی حال آں کہ وہ بیرونی شراب سے جس کی عربی شاعروں نے وہ کچھ تعریف کی ہے، سستی ہوتی تھی۔ سارے جزیرہ نمائے عرب میں ال طائف اس جنت سے جس کی قرآن مجید (سورۂ محمدؐ: ۱۵) میں کیفیت بیان کی گئی ہے، بہت مشابہ تھا۔

۱؎ ٹراولز (لندن ۱۸۲۹ء)، ص ۱۲۲ ۲؎ ابن بطوطہ: (پیرس ۱۸۹۳ء)، ج ۱ ص ۳۰۴
۳؎ ۲۶ ص ۱۵۴ -

شہر مکہ کو بطلیموس نے "مکوربا" لکھا ہے۔ یہ سبائی "مکربؔ" سے مشتق ہے جس کے معنی معبد کے تھے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شہر کی بنا کسی مذہبی تعلق سے پڑی اور یقیناً وہ آں حضرتؐ کی ولادت سے بہت پہلے مذہبی مرکز بن گیا تھا[1] یہ جنوبی حجاز کے تہامہ میں ساحل قلزم سے کوئی اڑتالیس میل فاصلے پر ایک بنجر پہاڑی علاقے میں واقع تھا جسے قرآن مجید "وادی غیر ذی زرع" (یعنی نا قابلِ زراعت) بتاتا ہے۔

۱۵۷ مکے میں حرارت کا پارہ ناقابل برداشت درجے تک چڑھ سکتا ہے۔ طنجہ کا مشہور سیاح ابن بطوطہ خانۂ کعبہ کا برہنہ پا طواف کرنا چاہتا تھا لیکن فرش کے پتھروں سے ایسی آگ نکل رہی تھی، کہ نہ کر سکا۔

قدیم زمانے میں "مصالحے کی سڑک" شہر مکہ کے درمیان سے گزرتی تھی مگر اس سے بھی پہلے وہ مآرب اور غزہ کے وسط کی منزل تھا، اور تجارتی مزاج، ترقی پسند اہل مکہ نے اسے جلد دولت مند بنا دیا تھا۔ اسلامی عہد میں وہاں کا تجارتی قافلہ جس کے سلسلے میں جنگ بدر ہوئی (۶۲۴ء) بقول واقدیؔ ایک ہزار اونٹ لیے ہوئے غزہ سے واپس آرہا تھا اور ان پر پچاس ہزار دینار (= تقریباً بیس ہزار پونڈ) کا مال لدا ہوا تھا۔ قریش خانہ کعبہ کے متولی تھے اور بظاہر انہی کی سیادت میں وہ قومی معبد اور عکاظ کا میلا تجارتی اور ادبی مرجع عام

---

[1] جغرافیہ ۵، ۴ باب ۷۔ (حیرت ہے مصنف نے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں تعمیر کعبہ اور قدیم کتابت و صحائف میں شہر کے "بکہ" موسوم ہونے کا ذکر نہیں کیا۔ یہ قدیم تر نام قرآن مجید کی سورہ آل عمران (آیۃ ۹۶) تک میں بھی مذکور ہے۔ مترجم) ۱ صفحہ ۲۸۱

[2] المغازی اشاعت وان کریمر، کلکتہ (۱۸۵۵ء) صفحہ ۱۹۸

بنا جس نے شہر کی فوقیت کو سارے عرب میں مسلّم کردیا ؛

مکے سے کوئی تین سو میل شمال میں یثرب واقع ہے۔ (سبائی کتبات میں اسے "ی ث ر ب" اور بطلیموس کے جغرافیے میں "جت ربا" لکھا ہے[۵۱]) یہ قدرتی محل وقوع اور آب و ہوا کے اعتبار سے اپنے جنوبی بھائی سے کہیں بہتر ہے۔ یمن تا شام کی بڑی سڑک پر واقع ہونے کے علاوہ، یہ ہر لحاظ سے نخلستان تھا کہ یہاں کھجور کی بہترین کاشت ہو سکتی ہے۔ دو یہودی قبیلے بنو نضیر اور بنو قریظہ یہاں آباد تھے اور ان کی محنت سے یہ شہر زراعت کا ممتاز مرکز بن گیا تھا۔ ان کے نام اور زرعی معاشرت کی اصطلاحوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ عربی[۵۲] اور ارامی نسل کے تھے جنھوں نے دین موسوی اختیار کرلیا اگرچہ ممکن ہے کہ ان کی ابتدا بنی اسرائیل کے کسی گروہ سے ہوئی ہو جو یروشلم کی رومی فتح کے وقت (پہلی صدی عیسوی میں) وہاں سے بھاگ کر یہاں چلا آیا ہو۔ عجب نہیں کہ انہی ارامی بولنے والے یہودیوں نے یثرب کا نام "مدینتی" کردیا ہو کیوں کہ ال مدینۃ (الرسولؐ) کی توجیہ نسبتہً بعد کی ہے ؛ دوسرے (غیر یہودی) قبائل میں اوس اور خزرج دو ممتاز قبیلے تھے جو اصلاً یمن سے یہاں آئے تھے ؛

حجاز میں تہذیبی اثرات: (۱) سبائی

دنیا کے معاملات میں پیش پیش نہ سہی، تاہم ماقبل اسلام ال حجاز کو بالکل ہی متروک اور دور افتادہ ملک نہیں کہہ سکتے۔ مکے کے دنیا سے

---

[۵۱] ۶، ۲۵۔ باب ۷۔ اسی نام کی ایک صورت "ربت ربا" بھی تحریر ہے ؛

[۵۲] یعقوبی نے اصل عربی قبائل کے نام لکھے ہیں جن کی اولاد میں یہ لوگ بعد میں یہودی ہوگئے تھے۔ ج ۲ ص ۴۹

الگ تھلگ ہونے کا وقت اسلامی دور میں ۶۳۰ء ہی جب یہ شہر فتح ہوا اور سورۂ نہم (: التوبہ) کی ۲۸ ویں آیت نازل ہوئی[۱]۔ تاہم پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کے بعد بھی پہلی صدی میں آپ[۲] کی ولادت گاہ میں بہت سے 105
عیسائی اور یہودی طبیب، مطرب اور سوداگر آسودہ حالی سے رہتے سہتے تھے۔

جنوبی عرب کا قدیم تمدن اپنے شمالی جانشین پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑے بغیر ختم نہ ہو سکتا تھا۔ ابرہہ کا کتابہ (۵۴۲-۵۴۳ء) سد مآرب کے ٹوٹنے کے باب میں، اِن الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

> "صاحبِ جلال وجمال ورحمت رحمان (= رحمانا) اور اس کے مسیح اور روح القدس کے نام سے"[۲]

لفظ رحمانا خاص طور پر لائق لحاظ ہے کیوں کہ اس کا شمالی مترادف "الرحمن" آگے چل کر اللہ (تبارک وتعالیٰ) کی ممتاز صفت اور قرآن مجید اور اسلامی دینیات میں اُس (عزّ وجل) کا ایک نام بنا اور اُنیسویں سورۃ میں بار بار وارد ہوا ہے۔ اگرچہ یہاں مسیحی خدا کے لیے استعمال کیا گیا لیکن صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ جنوبی عرب کے قدیم ترکسی دیوتا کے نام سے لیا گیا تھا۔ اسی طرح قبل اسلام اور سبائی کتبات میں "الرحیم" بھی

---

[۱] فتح مکہ کا حال اگلے باب میں آتا ہے۔ آیۂ محولہ کے بارے میں دیکھو بیضاوی، ج۱ ص۳۸۳۔ طبری، "تفسیر" ج۱۰ ص۷۴ (مصنف کا اشارہ اس آیۂ کریمہ کی طرف ہے جس میں آیندہ (سال) سے مشرکین کو خانہ کعبہ میں آنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کی بدولت آج تک مکہ معظمہ بلکہ حرمین شریفین کی حدود میں غیر مسلم داخل نہیں ہو سکتے۔ بجز اس کے کہ چوری چھپے آ جائیں۔ آیت کا نشان ہونا چاہیے۔ مترجم)
[۲] دیکھو گلازر کی جرمن کتاب سامی کتبات پر۔ ج۲ ص۴۰۱ وغیرہ۔

ایک دیوتا (= رح م) کے لیے آیا ہے۱؎ جنوبی عرب کا ایک اور کتبہ بُت پرستی کے متعلق لفظ "شِرک" استعمال کرتا ہے۔ اس میں ایک بڑے خدا کے ساتھ دوسرے دیوتاؤں کی پُوجا کی جاتی تھی اور اسی شرک کے خلاف پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) نے بڑی شدت و جوش سے تعلیم و تلقین فرمائی ہے۔ کتبے میں عدم ایمان کے واسطے اصطلاحی لفظ "ک ف ر" بولا گیا ہے جیساکہ شمالی عرب میں آتا ہے۔

۲۔ حبشہ کے اثرات

ہم اوپر پڑھ چکے ہیں کہ بحرِ قلزم کے جنوب مغربی ساحل (= افریقہ) کی سامی آبادی مقابل کے عرب علاقے سے آہستہ آہستہ منتقل ہوکر یہاں (یعنی افریقہ میں)، آبسی تھی۔ یہ لوگ بعد میں اباسینی (حبشی) کہلائے۔ اُن دِنوں جب کہ سبائی وحمیری قیادت میں بین الاقوامی تجارت پر اِن قوموں کا بلاشرکت قبضہ تھا، افریقہ کے یہ سامی آبادکار بھی اُن کے معزز شریک تھے۔ تجارت کی بڑی شاہ راہ الحجاز سے گزرتی تھی۔ ولادت نبویؐ سے کوئی پچاس برس قبل اہل حبشہ نے یمن میں اپنی حکومت جمائی تھی اور ولادت مبارک کے سال ہم اُنھیں شہرِ مکہ کے پھاٹک پر دیکھتے ہیں کہ وہاں کی متاعِ گراں بہا یعنی
خانہ کعبہ کو منہدم کرنے آئے ہیں۔ خود مکے میں ایک حبشی محلہ تھا۔ ۱۰۷
یہ لوگ غالباً مسیحی تھے۔ حضرت بلالؓ جن کی گونجتی آواز نے اُنھیں مؤذنِ مسجدِ نبوی ہونے کا بے مثل افتخار دلوایا، اصلاً حبشی تھے۲؎

۱؎ وستوو، صفحہ ۱۲۵ وغیرہ ۲؎ حضرت بلالؓ کا مقبرہ دمشق میں ابھی تک موجود ہے۔

قرآن مجید (یونس: ۲۲، ۲۳ - النحل: ۱۴ - النور: ۳۹) میں سمندر اور اس کے طوفانوں کا جس حیرت انگیز صفائی اور منظر کشی کے ساتھ ذکر آیا ہے، وہ حجاز اور حبشہ میں سرگرم بحری مواصلات کی صدائے بازگشت ہے۔ نئی نئی اسلامی آبادی پر کفار قریش نے جور و تعدی کی تو سب ملکوں میں حبشہ ہی کو مسلمانوں نے جائے پناہ سمجھا اور اُدھر رُخ کیا تھا[۵۱]

۳ و ۴ - ایران اور علاقۂ غسان

ظہور اسلام سے ایک صدی پہلے زرتشتی ایران مسیحی حبشہ کے ساتھ یمن کی سیادت کے لیے کش مکش کر رہا تھا۔ ایران کا فنِ حرب جنوب کے علاوہ، ال حیرہ کے راستے سے عربوں کو پہنچا تھا۔ روایت میں آیا ہے کہ وہ سلمان رض پارسی تھے جنھوں نے آں حضرت صلعم کو شہر مدینہ کی حفاظت کے لیے خندق کھودنے کا طریقہ بتایا[۵۲] وہ عربی ریاست جس کا صدر مقام ال حیرہ تھا، دولتِ ایران سے وابستہ تھی۔ زیادہ تر اسی ذریعے سے ایران کے تہذیبی اثرات، اور آگے چل کر نسطوری تعلیمات قبلِ اسلام عرب میں نفوذ کرتی رہیں۔ اسلامی دور میں یہی نسطوری

---

۵۱ عربی میں برہان، حواری، جہنم، مائدہ، ملک، محراب، منبر، مصحف، شیطان، کی اہل حبشہ کی زبان ہے۔ (جہنم اور ملک قدیم تر عبرانی سے آئے ہیں) ان سے بھی حبشہ کے اسلامی حجاز پر اثرات کا پتہ چلتا ہے۔ سیوطی نے اپنی کتاب "ال اتقان" کے باب ۳۸ میں قرآن شریف میں ۱۱۸ الفاظ بیرونی ماخذوں سے بتائے ہیں۔ (مطبوعہ قاہرہ ۱۹۲۵ء) ج ۱ ص ۱۳۵

۵۲ اس جنگ کا مزید حال اگلے باب میں آئے گا۔ فارسی ماخذوں سے کئی لفظ عربی میں آئے ہیں جیسے (کرباس - تھان) فردوس، برزخ، زنجبیل وغیرہ (آخری تین قرآن شریف میں بھی استعمال ہوئے ہیں)۔

عیسائی یونانیت اور نوخیز مسلمانوں میں رابطے کا سب سے قوی واسطہ بنے۔ اسی طرح اسلام سے پہلے انھوں نے ایرانی، ارامی، یونانی افکار کو جاہلی عرب کے اندر تک منتقل کرنے کی خدمت انجام دی تھی۔ پھر جس طرح حیرہ کے نسطوری سرحدِ ایران کے عربوں پر تہذیبی اثر ڈالتے رہے، ٹھیک اسی طرح "مونوفیزی" عقائد (یعنی "وحدتِ مسیح") کے غسانی پیرو حجاز کے لوگوں میں اپنے مسیحی خیالات پھیلاتے رہے۔ اسلام سے چار صدی پیشتر سے یہ شامیت میں رنگے ہوئے عرب اپنے اہلِ وطن کا نہ صرف شام بلکہ بائی زنطہ سے رابطہ قائم کراتے تھے۔ قبل اسلام عربوں میں داؤد، سلیمان، عیسیٰ وغیرہ نام کچھ غیر معروف نہ تھے؛

157 لیکن ان شمال کے تاثرات کو غیر معمولی اہمیت نہ دینی چاہیئے۔ کیوں کہ مونوفیزی یا نسطوری کوئی فرقہ بھی اتنا جان دار نہ تھا کہ اپنے مذہبی عقائد کو متعدی بنا دیتا۔ پیر شیخو نے جو مواد جمع کیا ہے[۵۱] وہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں کہ مسیحیت نے شمالی عرب میں کہیں بھی گہری جڑ پکڑ لی تھی۔ البتہ اس سے یہ ضرور منکشف ہوتا ہے کہ بہت سے قبل از اسلام شعرا عیسائیوں کے بہتے ہوئے تصورات اور مسیحی مصطلحات سے بخوبی آگاہ تھے۔ ارامی الفاظ بھی خاصی بڑی تعداد میں قدیم عربی روزمرہ میں دخیل ہو گئے تھے[۵۲]؛

---

[۵۱] دیکھو اس کی تالیفات: "النصرانیہ وآدابہا" دو جزو۔ مطبوعہ بیروت اور "شعراء النصرانیہ" دو جلد (بیروت ۱۸۹۰ء)

[۵۲] کنیسہ، بیعہ، دمیہ، صورہ، قسیس وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ لاطینی "کیس ترم" سے شامی "قسطرا" اس سے ارامی "قصرا" بنا جو کر عربی قصر (بمعنی قلعہ یا محل) کا ماخذ ہے۔ عربی سے یہ لفظ پھر پلٹ کر یورپ میں آیا اور اطالوی "کےسیرو" اور ہسپانوی "ال کزر" کی شکل اختیار کی ہے

۵- یہودی اثرات

عرب میں جو توحیدی عقائد اثر انداز ہوئے، وہ فقط مسیحی قسم ہی کے نہ تھے۔ شمالی حجاز کے مختلف نخلستانوں اور المدینہ میں بارونق یہودی بستیاں تھیں[1]۔ الجمحی (وفات ۸۴۵ء) نے اپنے تذکرے میں ایک فصل مدینے اور مضافات کے صرف یہودی شاعروں پر تحریر کی ہے[2]۔ اغانی میں عرب کے متعدد یہودی شعرا کا کلام منقول ہے لیکن ان میں صرف ایک سموال (صموئیل یا سیم ئول[3]) جسے یہودی فرض کیا جاتا ہے، صاحب دیوان گزرا اور امرؤ القیس کا ہم عصر تھا۔ یہ تیما کے قریب الابلق کا رہنے والا تھا۔ اس کے کلام میں کوئی چیز ایسی نہیں جو دوسرے ہم عصر بت پرستوں کی شاعری سے فرق رکھتی ہو لہٰذا اس کی یہودیت بجا طور پر مشکوک سمجھی گئی ہے۔ البتہ یمن کے شاہ ذونواس کی عنایت سے کہا جاتا ہے کہ وہاں یہودیت نے سرکاری مذہب کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔

اوپر کے سارے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ بعثت نبویؐ سے ایک صدی قبل الحجاز مختلف ذہنی، مذہبی اور مادی اثرات سے گھرا ہوا تھا جن کی شعاعیں بائی زنطی، ایرانی، شامی، ارامی مرکزوں سے نکلتی، اور بیش تر غسانی، لخمی اور یمنی راستوں سے حجاز تک پہنچ رہی

---

[1] جبرئیل، سدرہ، جبّار، عبرانی الفاظ کی جو عربی میں داخل ہوئے، مثال ہیں۔

[2] "طبقات الشعرا" (لائےڈن ۱۹۱۶ء) ص۳۔

[3] "دیوان سموال" (مرتبہ شیخو، بیروت ۱۹۲۰ء)

تھیں۔ بایں ہمہ یہ ثابت کرنا محال ہو کہ اس کا تعلق کسی شمالی تمدن سے اتنا قوی تھا کہ (حجاز کی) مقامی تہذیب کا رُخ بالکل بدل دیتا۔ علی ہذا، اگرچہ مسیحیت نے نجران میں اور یہودیت نے یمن اور حجاز میں قدم ٹکائے تھے۔ تاہم ان میں سے کسی کا بھی بہ ظاہر پایہ دار نقش شمالی عرب کے قلوب پر نہیں پڑ سکا تھا۔ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہو کہ ملک میں جو مشرکانہ
۱۵۸ عقائد ایک مدت سے رائج تھے۔ وہ اب ایسے فرسودہ ہو چکے تھے کہ لوگوں کے مذہبی تقاضوں کی سیری نہ ہوتی تھی چناں چہ ایک غیر مطمئن گروہ بُت پرستی کا دائرہ چھوڑ کر مبہم سے توحیدی عقائد اختیار کرنے لگا اور "حنیف" کے نام سے موسوم ہو گیا تھا[1]۔ اُمیّہ ابن ابی صلت جو پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ننھیالی رشتے سے بھائی ہوتے تھے اور ورقہ ابن نوفل جو حضرت خدیجہؓ کے بنی عم میں تھے، اسی قسم کے حنیف تھے اگرچہ کئی روایتوں میں ورقہ کو عیسائی بتایا گیا ہو۔ سیاسی اعتبار سے، قدیم جنوبی عرب میں جو قومی تنظیم مرتب ہوئی، وہ بالکل درہم برہم ہو چکی تھی۔ سارا مُلک سیاسی انتشار کا اسی طرح شکار تھا، جس طرح مذہبی انتشار کا۔ ایک بڑے مذہبی اور قومی رہ نما کے ظہور کا نفسیاتی وقت آ پہنچا تھا۔ اس کے سب سامان تیار تھے۔

---

[1] دخیل الفاظ جو آرامی سے بہ ذریعہ نبطی پہنچے۔ ان کے متعلق دیکھو: فلسطین کی مشرقی انجمن کا جریدہ (۱۹۳۱ء) صہ جیفری کی "فورین ووکے بلری اوف دی قرآن" (بڑودہ، ۱۹۳۸ء) صہ ۱۱۲ مزید اثری اور لسانی تحقیقات سے غالباً نبطی تہذیب کے ان اثرات کی اور توثیق ہوگی جو نہ صرف اسلام بلکہ ابتدائی مسیحیت پر پڑے ہیں۔

جزو دوم

ظہور اسلام

(اور)

نظم خلافت (راشدہ)

باب ہشتم

پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم)

۵۷۱ء عیسوی یا اس کے قریب قریش مکہ میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ ماں نے اُسے جو نام دیا تھا، وہ شاید ٹھیک ٹھیک کبھی نہ معلوم ہو گا[1]۔ اہل قبیلہ اسے "الامین" پکارتے تھے جو اعزازی لقب معلوم ہوتا ہے[2]۔ قرآن مجید میں آپ کا نام کئی جگہ "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ایک مقام (سورۂ الصف آیہ ۶) پر "احمد[3]" آیا ہے۔ عام طور پر آپ پہلے نام سے (جس کے معنی ہیں نہایت ممدوح) مشہور ہیں اور یہ نام اتنے بچوں کا رکھا جاتا ہے کہ دنیا میں اور کوئی مردانہ نام اس کثرت سے

---

[1] ذکری نواب معشوق یار جنگ نے کمال عنایت سے مشکوٰۃ (ص ۵۱۵) سے یہ حدیث مجھے نقل کر کے دی جو بخاری اور مسلم کی متفق علیہ، لہذا نہایت مستند ہے: عن جابرؓ ابن مطعم فرمایا رسول اللہ صلعم نے "ان لی اسماء انا محمد وانا احمد ـــــ الحدیث" مسلم نے اسی کے ہم معنی ایک حدیث ابوموسیٰ اشعری رضؓ سے روایت کی ہے۔ مصنف کا مذکورہ بالا بیان عدم تحقیق اور پھر غلط قیاسی کی بدنما مثال ہے۔ کاش وہ ابن ہشام ہی کی روایت سے تمسک کرتا جس میں صراحت سے لکھا ہے کہ آپ کا نام والدہ نے "محمد" تجویز کیا اور عبدالمطلب نے اسی کا اعلان کیا تھا (مترجم)

[2] ابن ہشام ص ۱۲۵۔ یعقوبی، ج ۲ ص ۱۸۔ مسعودی، ج ۲ ص ۱۲۷

مستقل نہیں ہوا۔ آپؐ کے باپ عبد اللہ کا، آپؐ کی ولادت سے پہلے اور والدہ، آمنہ کا جب کوئی چھ برس کے تھے، انتقال ہوگیا۔ ابتدائی پرورش آپؐ کے دادا عبد المطلب کے نصیب میں آئی اور عبد المطلب کی وفات کے بعد یہ فرض آپؐ کے ایک چچا ابوطالب نے اپنے ذمے لیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہی چچا کے ساتھ آپؐ بارہ سال کی عمر میں ایک دفعہ شام گئے تھے جہاں ایک مسیحی راہب سے ملاقی ہوئے جس کا نام روایتوں میں بحیرٰی بتایا گیا ہے۔

عالمی پیغمبروں میں صرف آں حضرتؐ واحد پیغمبر ہیں جو تاریخ کی پوری روشنی میں پیدا ہوئے۔ پھر بھی آپؐ کی ابتدائی زندگی، معاشی
۱۱۷ کش مکش، تکمیلِ ذات کی کوشش، اور اس کارِ عظیم کی حقیقت کا جو آپؐ کو انجام دینا تھا، تدریجی، فکر انگیز ادراک۔ اس بارے میں بہت کم قابلِ اعتبار روایتیں ہمیں ملی ہیں۔ شمائل شریف کو سب سے پہلے ابن اسحاق نے مرتب کیا تھا جس نے ۱۵۰ ہجری (= ۷۶۷ء) کے قریب بغداد میں وفات پائی۔ اس کی سیرت نبویؐ کو ابن ہشام نے ازسرِ نو تحریر کیا اور یہی دوسرا نسخہ اب تک محفوظ ہے۔ ابن ہشام کا انتقال مصر میں ۲۱۸ھ (= ۸۳۳ء) کے قریب ہوا (سہیلی کی مطبوعہ شرح میں ۲۱۳ء لکھا ہے۔ مترجم)۔ سیرت شریف اور ابتدائی اسلام کے متعلق عربی ماخذوں کے سوا اور کوئی ذریعۂ معلومات ہمارے پاس نہیں۔ پہلا بازنطی وقائع نگار جس نے "فرماں روائے عرب (= سارا سنز" اور مدعیٔ نبوت) کی نسبت چند واقعات تحریر کئے تھیو فانس اوائل قرن نہم مسیحی کا آدمی تھا۔[۵]

۵؎ "کرونو گرافیا" ص ۳۳۳

البتہ سُریانی زبان میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کا نام (مبارک) پہلی دفعہ ایک ساتویں صدی عیسوی کی کتاب میں وارد ہے[۱]۔

پچیسویں سال میں آپؐ کی شادی ایک شریف مزاج بیوہ حضرت خدیجہؓ سے ہوئی جو پندرہ سال آپ سے بڑی تھیں۔ اسی کے بعد سے آپؐ کے حالات واضح تاریخ کے میدان میں آجاتے ہیں۔ حضرت خدیجہؓ قبیلہ قریش سے ایک دولت مند تاجر کی بیوہ تھیں اور اپنا کاروبار خود چلانے میں آں حضرتؐ کو مقرر کرلیا تھا۔ ان کے اوصاف ایسے ستودہ اور شخصیت ایسی موثر تھی کہ جب تک وہ زندہ رہیں، آنحضرتؐ نے کسی دوسری بیوی سے عقد نہیں کیا۔ شادی سے آپؐ کو معاشی اطمینان حاصل ہوا جس کا قرآن میں صاف صاف اشارہ موجود ہے (: سورۂ والضحیٰ) اور اپنے حسب مُراد مشاغل کے لیے فرصت ہاتھ آئی۔ اس کے بعد آپ کو اکثر دیکھا گیا کہ مکہ کے باہر ایک پہاڑ کے غار (" حرا ")[۲] میں عزلت نشیں ہوکر مراقبہ فرماتے تھے۔ اسی طلبِ حق کے زمانۂ بیم ورجا میں آپؐ نے غار حرا میں یہ آواز سُنی[۳]: اِقرا باسم ربک الذی خلق.... یہ پہلی وحی تھی۔ رسالت کا آغاز ہوگیا، اس (مبارک) دن کی رات بعد میں "لیلۃ القدر" موسوم ہوئی اور ماہ رمضان کے اواخر میں اس کا تعین کیا گیا[۴]۔ پھر چند روز کے وقفے (= فترہ) کے بعد جب دوبارہ وحی نازل ہوئی تو وفور جذبات سے آپؐ گھبرائے ہوئے گھر آئے اور حضرت خدیجہؓ 113

---

[۱] دیکھو منگانا کے شائع کردہ "سُریانی مآخذ": ۵ ص ۱۳۶ (ترجمہ ص ۱۷۵) (لائپزگ ۱۹۰۸ء)
[۲] دیکھو ابراہیم رفعت کی کتاب "مرآۃ الحرمین" ج ۱ ص ۶۰ (قاہرہ ۱۹۲۵ء)
[۳] "صحیح البخاری" (بولاق ۱۲۹۶ھ) ۱۵ ص ۳
[۴] (مصنف کے بیان سے غلط فہمی کا احتمال ہے۔ لیلۃ القدر کا نام (سورۃ القدر) اور ماہ نزول کا تعین سورۂ بقرہ میں موجود ہے۔ مترجم)

سے کہا کہ مجھے کچھ اُڑھا دو۔ اسی پر یہ وحی آئی : " یا ایّھا المدثر، قم فانذر"
یہ آوازیں مختلف تھیں اور کبھی کبھی " سلسلۃ الجرس " (= گھنٹیوں کی گونج) کی طرح سنائی دیتی تھیں[۱] مگر پھر، مدنی سورتوں میں، یکساں آواز مسموع اور جبرئیلؑ کی معلوم ہو جاتی تھی ؛ آپ کو جو پیام اور نبوّت ملی اس میں پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسے ہی سچے نبی تھے جیسے توراۃ کے اسرائیلی انبیائے سابقین۔ آپؐ کی ابتدائی تلقین کا خلاصہ یہ تھا : خدا، ایک، صاحبِ قدرت، خالق کائنات ہے۔ قیامت کا دن مقرر ہے۔ جو لوگ خدا کے حکم پر چلیں گے، وہ جنّت کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوں گے۔ جو نافرمانی کریں گے، اُن کے لیے دوزخ کا خوفناک عذاب ہے ؛

جب آں حضرتؐ کو معلوم ہوا کہ وہ خدا کے رسول، پیغام بر ہیں تو اس منصب جلیل کے تقدّس اور قوی جوش نے آپؐ کو اپنی عظیم خدمت انجام دینے پر مستعد کر دیا اور آپؐ نے اپنی قوم میں پیام الٰہی کی تعلیم و تلقین شروع کی۔ قوم نے مذاق اُڑایا۔ پھر آپؐ نے انھیں متنبہ کیا، انجام سے ڈرایا یعنی " نذیر " کا کام کیا۔ دوزخ کی عقوبتوں اور جنّت کی نعمتوں کے واضح، اثر انگیز الفاظ میں نقشے دکھائے اور (منکرین کو) دُنیا میں بھی قریبی خرابی سے خوف دلایا۔ یہ مکّی سورتیں اور ابتدائی آیاتِ وحی نہایت قلیل و دلّ، مختصر اور دل میں اُتر جانے والی ہیں ؛ خالق کی حمد و ثنا سنانے، اور قوم کے نذیر و بشیر، خدا کے نبی ہونے کے باوصف (مکّے میں) چند ہی افراد آپؐ پر ایمان لائے حضرت خدیجہؓ کو اپنے حنیف عزیز، ورقہ ابن نوفل، کی تلقین سے میلان

[۱] بخاری ۱:۵، ۲۔ وحی آنے کے متعلق دیکھو یسعیاہ ۶ : ۱۲

پیدا ہوگیا تھا[۱] اور انہی نے آپؐ کے پیام کو سب سے پہلے لبیک کہی۔ پھر آں حضرتؐ کے عم زاد بھائی علیؓ اور ایک رشتہ دار ابوبکرؓ اسلام لائے۔ لیکن قریش کی عالی خاندان اور بارسوخ اموی شاخ کا نمائندہ ابوسفیان کسی طرح نہ مانا۔ اوّل تو وہ اس دین ہی کو بے دینی سمجھتے تھے پھر یہ تعلیم قریش کے مفاد کے خلاف جاتی تھی جو کعبے کے متولی تھے اور کعبہ صدہا بتوں کا گھر اور سارے عرب کا تیرتھ تھا؛ پھر بھی زیادہ تر غلام اور ادنیٰ طبقے کے لوگوں سے مسلمانوں کی تعداد بڑھتے دیکھی تو قریش کو طعن و تعریض کے ہتیار جن سے اب تک بے محابا کام لے رہے تھے، کافی کارگر نہ معلوم ہوئے۔ ضرور ہوا کہ جور و تعدّی اختیار کی جائے۔ اسی بدسلوکی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے گیارہ مکی خاندان حبشہ ۱۱۴
چلے گئے اور ۶۱۵ء میں تراسی دیگر افراد نے وہیں ہجرت کی جن میں حضرت عثمانؓ ابن عفان سرگروہ تھے۔ مسیحی بادشاہ نجاشی کی مملکت میں مہاجرین کو پناہ ملی اور اہلِ مکہ کی درخواست کو کہ انھیں ان ظالموں کے حوالے کردیا جائے۔ نجاشی برابر مسترد کرتا رہا۔[۲] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) اتنے رفیقوں کی عارضی جدائی سے، اس یاس انگیز جور و تعدّی کے زمانے میں بھی ہمت نہ ہارے بلکہ بے خوف تبلیغ فرماتے اور لوگوں کو کثیر اور جھوٹے خداوں کی عبادت سے منع کرتے اور سچے خدائے واحد کی پرستش کی ترغیب دیتے رہے۔ وحی کا سلسلہ جاری تھا۔ وہؐ جو یہود و نصاریٰ کے صاحب کتاب ہونے پر

---

[۱] دیکھو ابن ہشام۔ صفحہ ۱۲۱ و ۱۴۳

[۲] ۔ صفحہ ۲۱۷۔ نیز ملاحظہ ہو ابن سعد۔ جلد ۱ صفحہ ۱۳۶

تعجب کرتے تھے، اب اپنی قوم کو اسی شرف سے مشرف کرنے پر تُل گئے تھے[۵۱]

تھوڑے ہی دن بعد عمرؓ ابن الخطاب خدا کے دین میں داخل ہوئے جن کے نصیب میں تھا کہ اسلامی مملکت بنانے میں سب سے بڑھ کر حصہ لیں گے۔ ہجرۃ نبویؐ سے تقریباً تین سال قبل وفادار خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا اور پھر کچھ مدت بعد ابوطالب نے وفات پائی۔ وہ اسلام تو نہیں لائے مگر اپنے متوسّل سگے بھتیجے کی مرتے دم تک دشمنوں کے مقابلے میں مدافعت کرتے رہے تھے۔ اسی ہجرۃ سے قبل زمانے میں وہ "اسرا" کا کرشمہ پیش آیا جب کہ کہا جاتا ہے کہ ایک رات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پلک جھپکتے میں کعبۃ اللہ سے بیت المقدس لے جائے گئے کہ آسمان ہفتم پر معراج کے لیے تشریف لے جائیں[۵۲] اسی یادگار سیر کے دنیاوی مقام ہونے کی بنا پر یہ شہر جو یہود و نصاریٰ میں پہلے سے مقدس تھا، اسلامی دنیا کا بھی مکہ اور مدینہ کے بعد تیسرا سب سے مقدس شہر بن گیا اور آج تک ہے۔ معراج کے خرقِ عادت واقعے کو بعد کی روایتوں سے اور زینت دی گئی اور وہ ابھی تک ایران و ترکی کے صوفی حلقوں میں نہایت مقبول موضوع ہے۔ ایک ہسپانوی فاضل

---

۵۱ (مصنف، وحی اور شاید مذہب سے منکر ہے، لہٰذا نزول قرآن کو اس طرح بیان کرتا ہے گویا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم خود اسے تصنیف کر رہے تھے مسلمانوں کے نزدیک دین سے محروم ہونے کے علاوہ یہ نری ضد ہے کہ ایک ایسے کلام کو جس کا اعجاز مخالفین بھی تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکے، انسانی کلام گمان کیا جائے۔ مترجم)

۵۲ قرآن۔ سورۂ اسریٰ۔ (لیکن قرآن میں آسمان ہفتم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مترجم)

اسے دانتی کی "ڈوائن کومیڈی" کا اصلی ماخذ قرار دیتا ہے[۵۱] مسلمانوں میں معراج کی یاد تازہ اور تحریک انگیز ہونے کا ایک ثبوت یہ ہے کہ فلسطین میں ان کا اگست ۱۹۲۹ء میں یہودیوں سے سخت جھگڑا ہوا کہ وہ جس مقام کو بُراق کے اُترنے کی جگہ سمجھتے ہیں، وہی یہودیوں کی "دیوار گریہ" ہے[۵۲]۔

116 ۶۲۰ء کے قریب یثرب کے چند باشندے سوقِ عکاظ میں آں حضرتؐ سے ملے۔ یہ زیادہ تر خزرج قبیلے کے لوگ تھے۔ آپؐ کی باتیں اُن کے دل کو لگیں۔ دو سال بعد کوئی پچھتّر افراد کے ایک وفد نے آپؐ کو دعوت دی کہ یثرب کو اپنا وطن بنالیں۔ اُنھیں اُمید تھی کہ آپؐ کا وہاں آنا اوس و خزرج کی باہمی مجادلہ کو صلح سے بدل دے گا۔ یثرب (المدینہ) میں یہودی بھی آنے والے مسیحا کے منتظر تھے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بُت پرست ہم وطنوں کو پیغمبر خدا جیسے کسی نبی کے استقبال پر تیار کرچکے تھے۔ آں حضرتؐ تبلیغ کے لیے طائف بھی گئے مگر ناکامی ہوئی اور اپنے وطنی شہر میں دیکھا کہ دِین کا راستہ مسدود ہوگیا۔ ہے تو دو سو کے قریب متبعین کو اجازت دی کہ قریش کی نگرانی سے بچ کے نکل جائیں اور خموشی سے مدینے پہنچ جائیں جو آں حضرت کی ننھیال تھا۔

---

۵۱ بحوالہ اسین کی کتاب (انگریزی ترجمہ: اسلام اینڈ دی ڈیوائن کومیڈی)

۵۲ بُراق، فارسی "بارا" بمعنی گھوڑا سے جس پر "اک" توصیفی لاحقہ ہے۔ زمانۂ حال کے اہلِ فلسطین مقامِ گریہ کو "البراق" کہتے ہیں۔ (عربی ترجمہ کتاب میں اسے برق سے بھی مشتق بتایا ہے۔ ص ۱۵۹ مصنف کا "دیوار گریہ" کو مستند اور البُراق کے نام کو جدید قرار دینا بھی غالباً یہود کی پاس داری ہے۔ لگے ہاتھ میں بُراق کی صورت کہ عورت کا چہرہ، مور کی دُم اور پر دار تھا، ایسی وضعی روایتوں سے لی گئی جن کی تاریخ میں گنجائش نہ تھی۔ یہ مسلمانوں پر بظاہر طعن کی غرض سے لکھا گیا ہے۔ مترجم)

پھر خود بھی اسی شہر کی راہ لی اور ۲۴ر ستمبر ۶۲۲ء کو وہاں ورود فرمایا۔ یہی نقل مکانی ہجرت کے نام سے مشہور ہوئی۔ (یورپ والوں نے) اسے گریز قرار دیا ہے۔ یہ کلی طور پر صحیح نہیں۔ اس ترک وطن پر دو سال تک غور و خوض کیا جاتا رہا تھا؛ سترہ سال بعد حضرت عمرؓ نے اسی قمری سال کو (جو ۱۶ر جولائی سے شروع ہوا تھا) جس میں ہجرت واقع ہوئی، اسلامی سن کا باضابطہ آغاز قرار دیا۔[لہ] ہجرت کو، جس سے مکی دور ختم اور مدنی زمانہ شروع ہوتا ہے، پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی زندگی میں ایک نقطۂ انقلاب سمجھنا چاہیئے۔ اپنی ولادت کے شہر سے آپؐ چلے تو وہاں کے ایک کس مپرس نبی تھے۔ نئے توطن گاہ میں داخل ہوئے تو ایک محترم سردار کا مرتبہ حاصل تھا۔ محض حکیمانہ افکار اب عقب میں چلے جاتے ہیں اور آپؐ کی عملی سیاست و ملک داری کی صفات ظہور میں آتی ہیں .... یہ مسلّم کا زمانہ تھا جب کہ عرب میں جنگ رُک جاتی تھی۔ مگر مدنی باشندے جو اب انصار کہلاتے تھے، مہاجرین کی ضروریات بہم پہنچانے کی فکر میں تھے۔ انھوں نے اپنے نئے حاکمؐ کی قیادت میں ایک تجارتی قافلے کا راستہ روکا جو گرمیوں میں شام سے مکے جا رہا تھا اور اس تجارتی قلب کی شہ رگ پر ضرب لگائی۔ قافلے کے سردار ابوسفیان کو اس منصوبے کی سن گن مل گئی اور اس نے مدد کے لئے مکے آدمی بھیجے۔ اس کمک اور تجارتی قافلے نے مل کر اہل مدینہ کا ماہ رمضان ۶۲۴ء میں بدر کے مقام پر مقابلہ کیا جو شہر سے بیس میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ

لہ طبری - ١٥ ص ١٢٥٦ و ١٢٨٠-٢٢ - مسعودی - ٥ و ١٩ ص ٥٣

والسلام) کی عمدہ قیادت کی بہ دولت تین سو مسلمانوں کو ایک ہزار سے زیادہ اہل مکہ پر کامل فتح نصیب ہوئی۔ جنگی اعتبار سے یہ معرکہ بجائے
17 خود کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو، آں حضرت کے ملکی اقتدار کا سنگ بنیاد تھا[1] اسلام نے اپنی سب سے پہلی اور فیصلہ کن جنگی فتح حاصل کی جسے نئے دین کی آسمانی تائید سے تعبیر کیا گیا[2] نظم وضبط کی پابندی اور موت سے بے خوفی کا جو جذبہ اس اولین جنگ میں ظاہر ہوا، ملت اسلام کی یہ خصوصیت آیندہ بڑی بڑی فتوحات میں بھی برابر قائم رہی۔ یہ سچ ہے کہ آیندہ سال (سنہ ۶۲۵ء) اہل مکہ نے ابوسفیان کی سپہ سالاری میں اُحد پر اپنی شکست کا بدلہ لے لیا اور پیغمبر (علیہ الصلوۃ والسلام) تک کو زخمی کیا لیکن یہ کامیابی دیرپا نہ تھی۔ ملت اسلامی پھر سنبھل گئی اور تھوڑے دن میں مدافعت کی بجائے پیش قدمی کرنے لگی۔ دین کی تبلیغ میں قوت و توثیق ہوگئی۔ اب تک اسلام ایک مملکت میں ایک دین تھا۔ بدر کے بعد سے وہ مدینہ (منورہ) میں پوری مملکت کے دین ہونے سے بھی بڑھ گیا: یعنی خود مملکت ہوگیا۔ اسی وقت سے اسلام نے وہ نوعیت اختیار کی جسے دُنیا (= غیر مسلم دُنیا۔ مترجم) آج تک ایک "جنگی طرز حکومت" سمجھتی رہی ہے ۔

---

[1] الواقدی (م ۱۳۰ھ سے ۲۰۷ھ) نے اپنی "مغازی" کا ایک تہائی سے زائد حصہ بدر کی جنگ اور اُس کے بہادر لڑنے والوں کے حالات کے لئے وقف کیا ہے۔ (مصنف نے ہجرت کے ساتھ ہی بدر کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ مگر اسلامی تاریخ اور عہد نبوی کے یہ واقعات اتنے مشہور اور واضح ہیں کہ ہم نے اس کے ترجمے پر اکتفا کی اور کسی تفصیلی تصحیح کی ضرورت نہ سمجھی۔ یہ بات بھی وہ غلط کہہ گیا ہے کہ قافلے اور کمک والوں سے لڑائی ہوئی۔ قافلہ بچ کر نکل گیا تھا۔ لڑائی صرف اس فوج سے ہوئی جو مکے سے امداد کے لئے آئی تھی۔ مترجم)

[2] سورۂ آل عمران: ۱۲۳ انفال: ۴۲ ۔

۶۲۷ء میں مخالف گروہوں ("احزاب") نے پھر اہل مدینہ سے تیغ آزمائی کی۔ ان میں اہل مکہ کے ساتھ صحرائی قبائل اور حبشی (تنخواہ دار) سپاہی شامل تھے۔ کفر و بت پرستی نے اللہ (کے دین) پر ایک دفعہ اور چڑھائی کی تھی۔ روایت ہے کہ آں حضرت ؐ نے حضرت سلمان ؓ فارسی کی صلاح سے مدینے کے گرد خندق کھدوائی[1]۔ بدوؤں کے مختلف گروہوں کو یہ بہت غیر سپاہیانہ بات معلوم ہوئی کہ انھوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دونوں طرف سے کوئی بیس بیس آدمی کام آئے[2]۔ پھر ایک مہینہ گزرنے پر محاصرین، اس خندق کی بدعت سے جز بز ہوکے واپس چلے گئے۔ اسی محاصرہ اُٹھنے کے بعد پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے یہودیوں سے "دشمنوں کی طرف داری کی" بنا پر مخالفت شروع کی جس کے نتیجے میں بنی قریظہ کے چھ سو جوان مارے اور باقی خارج البلد کیے گئے۔ اُن کے نخلستان جو لاوارث رہ گئے تھے، وہ مہاجرین کی ملکیت بنے[3]۔ بنو قریظہ مسلمانوں کے پہلے دشمن تھے (اگرچہ آخری نہ تھے) جنھیں موت یا اسلام لانے کی شرط پیش کی گئی۔ ایک سال پہلے مدینے کے ایک اور یہودی قبیلے بنی نضیر کو آں حضرت ؐ نے جلاوطن کیا تھا[4]۔ خیبر کے یہودی ۶۲۹ء (۷ھ) میں نکالے گئے۔ یہ مدینے کے شمال

---

[1] دیکھو جوزف ہاروویٹز: "نور اسلام" ج ۲ (۱۹۲۲ء) ص ۱۷۸۔ لفظ خندق کی اصل پہلوی "کندک" ہے جو آرامی کی وساطت سے عربی میں آیا۔

[2] قرآن مجید کی سورۂ احزاب میں اس جنگ کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔

[3] سورۂ احزاب: ۲۶ (مخالفت کا آغاز صریحاً عناد یہودیوں کی طرف سے ہوا تھا۔ یہود کے مقتولین کی تعداد معتبر تاریخوں میں چار سو اور غزوہ خندق میں کام آنے والوں کی کل نو تحریر ہے۔ مترجم)

[4] بلاذری۔ "فتوح" ص ۱۷۔ واقدی ص ۳۵۳۔

میں شاداب نخلستان تھا۔

اس مدنی دور میں اسلام پر عربیت اور قومیت کا رنگ چڑھایا ۱۱۴
گیا۔ پیغمبر آخرالزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہودیت اور مسیحیت سے قطع تعلق کیا۔ سبت کی بجائے جمعہ مقرر ہوا۔ ترم اور گھڑیال کی جگہ (مسجد کے مینار سے) اذان کا آئین جاری کیا گیا۔ ماہِ صیام رمضان قرار پایا۔ مقررہ نمازوں میں سمتِ قبلہ یروشلم سے بدل کر مکہ کردی گئی[1] خانہ کعبہ کے حج اور حجراسود کو بوسہ دینے کی (جو قبل از اسلام عہد کا ایک توہم تھا) اجازت دے دی گئی۔ ۶۲۸ء میں آں حضرت صلعم ۱۴ سو ایمان والوں کی فوج لے کر اپنے مولد مکہ پر گئے اور حریف سے صلح نامہ حدیبیہ لکھوایا جس میں اہل مکہ اور مسلمان مساوی مرتبے پر رکھے گئے تھے[2] اس معاہدے نے آں حضرت صلعم کی اپنی قوم قریش سے جنگ عملاً ختم کردی۔ من جملہ اور افراد کے اس قبیلے سے خالد ابنؓ ولید اور عمروؓ ابن العاص اسی زمانے کے قریب دینِ مبین کے دائرے میں ہاتھوں ہاتھ لئے گئے جن کے نصیب میں جنگ جو اسلام کے دو زبردست شمشیر زن ہونا لکھا تھا۔ دو سال بعد اواخر جنوری ۶۳۰ء (۸ھ) میں فتح مکہ کی تکمیل ہوگئی۔ اس کے صدر معبد (خانہ کعبہ) میں داخل ہوکر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سارے بتوں کو توڑ دیا۔ ان کی تعداد ۳۶۰ بتائی گئی ہے۔ توڑتے وقت آپ بآواز فرماتے جاتے تھے کہ "جاء الحق وزهق الباطل" یعنی حق آیا اور باطل نابود ہوا۔[3]

---

[1] اس سلسلے میں ملاحظہ ہو توریت کا صحیفہ ملوک اول - ۸ : ۲۹ - اور دانیال - ۶ : ۱۰-۔

[2] بلاذری ص۳۵ (ترجمہ حتی ص۶۰) [3] ایضاً ص۴۰۔

لیکن شہر کے باشندوں کے ساتھ خاص رحم وکرم کا برتاو کیا گیا[۱] قدیم تاریخوں میں ایسے فاتحانہ داخلے کی نظیر مشکل سے ملے گی۔

غالبًا یہی زمانہ تھا جب کہ حرم کعبہ کی حدود معیّن کی گئیں[۲] اور سورۂ توبہ کی آیۂ کریمہ انما المشرکون نجس ــ الآیہ۔ نازل ہوئی جس کے آگے چل کر یہ معنی لئے گئے کہ تمام غیر مسلموں کو ان میں آنے سے روک دیا۔ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آیت سے صرف بت پرستوں کو زمانہ حج میں خانۂ کعبہ کے قریب آنے کی ممانعت کی گئی تھی لیکن بعد کی تفسیر کے مطابق یہ حکم آج بھی نافذ ہے[۳]۔ مسیحی نژاد فرنگیوں کی تعداد جو حرمین کا مشاہدہ کر سکے اور زندہ نکل آئے، پندرہ سے زیادہ نہیں ہے۔ ان
۱۱۹ میں پہلا شخص شہر بلونا کا لدووی کو دی ورتھما تھا جو ۱۵۰۳ء میں آیا اور سب سے تازہ واردین میں، ایک انگریز رٹر اور دوسرا ہنگری (مجارستان) کا جولیئس جرمانوس ہے[۴] مگر سب سے دلچسپ سیّاح بے شبہ سر رچرڈ برٹن (۱۸۵۳ء) تھا[۵]۔

۹ھ میں آں حضرت صلعم نے غسّانیوں کی سرحد پر بمقام تبوک ایک فوج متعین کی اور بغیر کسی جنگ کے ایلہ (= العقبہ) کے

---

[۱] واقدی ص ۴۱۶۔

[۲] ابن سعد۔ ج ۲ ص ۹۹۔ نیز ملاحظہ ہو بیضاوی: "انوار" ج ۱ ص ۳۵۳

[۳] دیکھو محمد لبیب بتنونی کا رسالۂ حجازیہ (قاہرہ ۱۳۲۹ھ) ص ۴۷

[۴] یورپ میں عام طور پر یہ فسانہ مشہور تھا کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کا جسد مبارک کہ میں کسی جگہ معلق رکھا گیا ہے۔ ورتھما نے اس قصّے کو جھوٹا بتایا۔ دیکھو اس کے سیاحت نامے کا انگریزی ترجمہ از جونز (ہک لوٹ سوسائٹی ۱۸۶۳ء)

[۵] رٹر نے "دی ہولی سٹیز اوف ارےبیا" لکھی اور جرمانوس نے "اللہ اکبر" (مطبوعہ برلن ۱۹۳۸ء) برٹن کی ذاتی کیفیت حج تین جلدوں میں چھپی تھی (لندن ۱۸۵۵ء)

مسیحی سردار اور جنوب میں مقنا، اذروح، اور آل جربا کے نخلستانوں کے یہودی قبائل سے صلح کے عہد نامے کئے[1] مقامی یہود اور نصرانی، نذرانے کے عوض جسے آگے چل کر جزیہ کہا گیا، نئی اسلامی ملت کے زیر حمایت لے لئے گئے۔ یہی عمل ایک ایسی نظیر بنا جس سے آیندہ دور رس نتیجے پیدا ہوئے۔ ۹ھ کو "سنۃ الوفود" کہتے ہیں کہ اس میں دور و نزدیک سے بکثرت وفد آئے اور نبیؐ بادشاہ کی اطاعت قبول کی۔ اعتقاد سے نہیں تو سہولت ہی کی خاطر بہت سے قبائل آملے اور اسلام نے بھی ان سے اقرار باللسان اور زکوٰۃ لینے پر اکتفا کی۔ بدوؤں کی تعداد کثیر جو نئے دین میں داخل ہوئی ایسی تھی کہ یہ قول حضرت عمرؓ سے منسوب کیا جاتا ہے کہ بدو اسلام کا خام مادہ ہیں۔ وہ قبیلے اور اقطاع جہاں سے پہلے کوئی نمایندہ نہ آیا تھا، اب عمان، حضرموت اور یمن جیسے بعید علاقوں سے وفود بھیجنے لگے۔ قبیلۂ طے کے نائب حاضر ہوئے۔ اسی طرح کندہ اور ہمدان سے وفد آیا۔ معلوم ہوتا تھا سارا ملک عرب جس نے شخص واحد کے آگے کبھی گردن نہ جھکائی تھی آں حضرت صلعم کی سیادت ماننے اور آپ کے نئے منصوبے کا جزو بننے پر خود مائل ہے۔ جاہلیت ایک برگزیدہ دین اور برتر اخلاق کو جگہ دیتی چلی جاتی ہے۔

دسویں سال اسلامی میں آں حضرت صلعم حجاج کے قافلے کو لے کر بڑی شان شوکت سے اپنے نئے دینی صدر مقام مکہ تشریف لائے۔ یہ آپ کا آخری ورود تھا اسی لئے حجۃ الوداع کہلایا۔ مدینہ مراجعت فرمانے کے تین ماہ بعد آپؐ کی یک بیک طبیعت ناساز ہوئی۔ سخت

---

[1] بلاذری - ص ۵۹

دردِ سر کی شکایت تھی۔ ۸ ؍ جون ۶۳۲ء کو دنیا سے رحلت فرمائی۔

رسول اللہ صلعم کے مدنی دَور میں قرآن مجید کی وہ طویل اور مفصل سورتیں نازل ہوئیں جن میں نماز و زکوٰۃ اور روزے کے مذہبی قوانین کے علاوہ، شادی بیاہ، طلاق اور غلاموں، دشمنوں، جنگ کے قیدیوں کے متعلق سیاسی اور عمرانی احکام شامل ہیں۔ غلاموں، یتیموں، مظلوموں، مسکینوں کے بارے میں ہم اُس کے قوانین کو جو خود کبھی محتاج و یتیم ۱۲۵
تھا، خصوصیت کے ساتھ کریم النفسی اور دردمندی سے متصف پاتے ہیں۔[۱]

نبی کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) انتہائی اقتدار و دولت کے زمانے میں بھی ایک کچے گھر میں ویسی ہی سادہ زندگی بسر فرماتے رہے جیسی غربت و گمنامی کے زمانے میں تھی۔ آپ کے کچے گھر میں چند حجرے ایک صحن میں کھلتے تھے اور اسی سے اُن کا راستہ تھا، جیسے اس زمانے میں بھی عرب اور شام کے پُرانی وضع کے مکانوں میں ہوتا ہے۔ آپ کو بارہا اپنے کپڑوں میں پیوند لگاتے دیکھا گیا۔ اپنے لوگوں کے واسطے آپ کا دروازہ ہر وقت کُھلا تھا۔ تھوڑی سی متاع بھی جو آپ نے چھوڑی، سرکاری ملکیت سمجھی گئی۔ آپ نے ۱۲ کے قریب شادیاں کیں۔ بعض محبت کی بنا پر بعض ملکی مصالح سے۔ ان میں حضرت ابوبکرؓ کی چھوٹی بیٹی حضرت عائشہ (صدیقہ)ؓ آپ کو سب سے عزیز تھیں۔ حضرت

---

[۱] قرآن مجید میں جا بجا یہ احکام آئے ہیں۔ مثلاً دیکھو البقرہ - ۱۷۷، ۲۲۴ - النسا - توبہ - النور والضحیٰ - (آیات کے نشان مصنف نے مختلف دئے ہیں۔ مترجم) نیز مطالعہ کرو رابرٹ روبرٹس کی کتاب "دی سوشل لاز آف دی قرآن"۔ (لندن ۱۹۲۵ء)

خدیجہؓ سے آپؐ کے کئی بچے ہوئے مگر آپؐ کے بعد ان میں صرف حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں جو حضرت علیؓ کی نامی گرامی زوجہ تھیں۔ ایک مسیحی قبطیہ (ماریہ) سے آپؐ کے صاحب زادے ابراہیم پیدا ہوئے تھے جن کے شیر خوارگی میں مرجانے پر آپؐ کو نہایت غم ہوا۔ "پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی روزانہ زندگی کا ہر فعل، چھوٹا یا بڑا ایک دستور العمل کا مرتبہ رکھتا ہے جس کی لاکھوں اشخاص آج تک بالارادہ ہوبہو نقالی کرتے ہیں۔ کوئی دوسرا شخص جسے دنیا کے کسی حصے نے بھی انسان کامل سمجھا، اس کی اتنی جزئی نقل نہیں کی گئی"[1]

مدینہ منورہ کی مذہبی بستی ہی سے آیندہ کلاں تر اسلامی مملکت تیار ہوئی۔ مہاجر و انصار کی یہ جماعت مذہب کی بنیاد پر ایک خدا کی اُمت بنائی گئی تھی۔ ملک عرب کی تاریخ میں خون کے رشتے کی بجائے دین کی بنیاد پر قومی تنظیم کی یہ پہلی کوشش تھی۔ اقتدار اعلیٰ کا اصلی سرچشمہ اللہ (عزوجل) تھا۔ اس کا پیغمبرؐ جب تک زندہ رہا، خدا کا خلیفۂ برحق اور دُنیا میں حاکم اعلیٰ تھا۔ اسی لئے حضرت نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) روحانی وظائف کے علاوہ دنیاوی اختیارات اسی طرح استعمال فرماتے تھے جس طرح ملک کا کوئی حاکم کرتا ہے۔ نئی اُمت کے اندر سب لوگ برادری اور قبیلے اور زمانۂ ماضی کے جملہ تعلقات بھول کر، کم سے کم اصولاً بھائی بھائی بن گئے تھے۔ حجۃ الوداع کے برگزیدہ وعظ میں آں حضرت صلعم نے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

"لوگو، توجہ سے سنو اور میرے الفاظ کو خوب دل نشین کرلو۔

---

[1] د۔ ج۔ ہوگارتھ۔ "ادب یا" (اوکس فورڈ ۱۹۲۲ء) ص۵۲۔

جان لو کہ ہر مسلم دوسرے مسلم کا بھائی ہے اور اب تم سب
ایک ہی برادری ہو۔ پس تم میں سے کسی پر حلال نہیں ہے
کہ اپنے بھائی کا مال (یا آبرو یا جان۔ مترجم) لے لے۔
بجز اس کے کہ وہ مال (مالک نے) خوشی سے دیا ہو"۔[1]

اس طرح ایک ہی جنبش زبان سے عرب کا سب سے قوی یعنی
121 برادری اور قبیلے کا رشتہ اُڑا دیا اور اس کی بجائے دین کا نیا رشتہ استوار کر دیا گیا۔ یہ گویا ملک عرب میں "امن عامۂ اسلامیہ" ("پیکس اسلامیکا") کا قیام تھا۔ نئی ملت میں کسی پیر پروہت، مذہبی مرکزی امامت کی جگہ نہ رکھی تھی۔ مسجد مسلمانوں کی مشترک عبادت، فوجی اور سیاسی اجتماع کی جگہ تھی۔ نماز پڑھانے والا، امام ہی اہل ایمان کی فوج کا سپہ سالار ہوتا تھا اور جملہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ساری دنیا کے مقابلے میں ایک دوسرے کے محافظ و معاون رہیں۔ بت پرست عرب دائرہ اسلام سے خارج اور قریب قریب "ذات باہر" رہ گئے تھے۔ اسلام نے ماضی پر تنسیخ کا قلم پھیر دیا۔ شراب (خمر، آرامی زبان سے) اور قمار ایک آیت سے ممنوع کر دیے گئے، حال آں کہ عورتوں کے بعد عربوں کی سب سے دل پسند عیاشی کی چیزیں یہی تھیں۔[2] گانا بھی انھیں ایسا ہی پسند تھا، وہ مکروہ سمجھا جانے لگا۔ قدیم و جدید اصول کا یہ نمایاں

---

[1] دیکھو ابن ہشام ص ۹۶۹۔ واقدی ص ۴۳۳

[2] سورہ مائدہ: ۹۱ (مصنف نے آیۃ کا نشان ۹۲ لکھا ہے اور یہ غیر متعلق سا مبہم جملہ بڑھا دیا ہے کہ نبطیوں کے ہاں ایک دشمن عیش دیوتا تھا۔ شاید ناظرین کے دل میں یہ وہم ڈالنے کے لیے کہ اسلام نے یہاں بت پرستی کی تقلید کی ہوگی! مترجم)

فرق نہایت وضاحت سے ایک وضعی روایت میں[۱] جعفرؓ ابن ابی طالب کی زبان سے پیش کیا گیا ہے۔ وہ ابی سینیہ کے مسلم مہاجروں کے ترجمان تھے۔ انھوں نے نجاشی سے کہا:

"ہم جاہلیہ کے لوگ بت پرستی کرتے، مردہ جانور کھاتے تھے۔ بیوی بچوں کو چھوڑ دیتے، عہد و پیمان، حلف نامے توڑ دیتے تھے۔ فواحش میں مبتلا تھے۔ ہمارے قوی، غریبوں کو کھائے جاتے تھے۔ یہ حالت تھی جب کہ خدا نے ہم میں ہمیں میں سے ایک نبی بھیجا جس کے نسب سے ہم آگاہ اور صداقت، امانت، پاک بازی کو خوب جانتے ہیں۔ اسی نے ہم کو خدا کی عبادت کی دعوت دی کہ اسے خدائے واحد مانیں اور اسی ذات واحد کی پرستش کریں اور پتھروں اور بتوں کو جنھیں ہم اور ہمارے اجداد خدا کی بجائے پوجتے تھے، ترک کریں۔ پھر اس نے حکم دیا کہ باتوں میں صداقت کے پابند رہیں، حق داروں کے حق ادا کریں، اہل و عیال کا ساتھ دیں۔ خون گرانے اور بدی کرنے سے احتراز کریں۔ اس نے زناکاری، جھوٹی شہادت، یتیموں کا حق غصب کرنے اور پارسا عورتوں پر تہمت لگانے سے، ہمیں منع کیا۔ صرف

---

[۱] (یہ روایت ابن ہشام نے ص۲۱۹ پر جس کا مصنف بھی حاشیے میں حوالہ دیتا ہے) ابن اسحاق سے نقل کی ہے اور اس نے بہ طریق حدیث صرف دو واسطوں سے اُمّ المومنین اُم سلمہؓ سے روایت کیا ہے۔ لہٰذا مصنف کا محض اس بنا پر کہ قرآن میں ماہ صیام کا حکم ہجرت نبویؐ کے بعد نازل ہوا، اسے مطلقاً وضعی قرار دینا درست نہیں۔ ابن ہشام کے شارح سہیلی نے بھی اس کی صحت میں کوئی اشکال نہیں دیکھا۔ مترجم)

خدائے واحد کی بغیر کسی کو شریک کئے، پرستش فرض کی اور
نماز و زکوٰۃ ادا کرنے روزے رکھنے کا بھی حکم دیا ۔

مدینہ منورہ سے اسلامی حکومتِ الٰہیہ تمام عرب اور آگے چل کے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے وسیع اقطاع پر پھیل گئی۔ مدینے کی یہی اسلامی بستی آنے والی ملت اسلامیہ کی اساس اور مرقع تھی۔ پیغمبر خدا صلعم نے ایک نکمّے مسالے کو گوندھ کر قوم بنا دیا جس کے اجزا پہلے کبھی متحد نہ ہوئے تھے اور وہ بھی ایک ایسے ملک میں جو اب تک محض ایک جغرافی نام تھا۔ 122
آپ ؐ نے ایسا دین قائم کر دیا جس نے بڑے بڑے ملکوں سے یہودیت و نصرانیت کو نکال کر خود اُن کی جگہ لے لی اور آج بھی نوع انسان کا بہت بڑا حصہ اس کا پیرو ہے۔ پھر آپ ؐ نے ایک ایسی سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کی حدود میں بہت تھوڑے عرصے کے اندر اس زمانے کی متمدن دنیا کی نہایت بعید شاداب ترین ولایات شامل ہونے والی تھیں۔ آپ ؐ نے تعلیم نہیں پائی تھی[1] بر این ہم دنیا کو ایک ایسی کتاب دی جسے یک سُدس نسلِ آدم آج بھی تمام الٰہیات، اور علم و حکمت کا مجموعہ سمجھتی ہے۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

---

[1] قرآن مجید میں "اُمّی" کا لفظ آیا ہے۔ (آل عمران: ۲۰) سُنّی مسلمان اس کے معنی ناخواندہ کے لیتے ہیں۔ طبری نے اپنی تفسیر، ج ۳ ص ۱۴۳ میں شرح کی ہے کہ اُمّیوں سے عرب کے وہ مشرکین مراد ہیں جن کے پاس کوئی انبیائی کتاب نہ تھی۔ نقاد اہل علم جتاتے ہیں کہ سورۂ اعراف: ۱۵۶۔ آل عمران: ۷۵۔ جمعہ: ۲۔ میں یہ اصطلاح "اہل الکتاب" کے مقابلے میں آئی ہے لہٰذا اُمّی کے معنی وہ شخص ہیں جو سابقہ کتب آسمانی کو نہ پڑھ سکتا ہو نبی کریم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے عربی لکھ سکنے کی دلیل میں سورۂ فرقان کی آیۂ کریمہ ۵ نقل کی جاتی ہے۔

باب نہم (۹)

23 کتاب اللہ: قرآن مجید

اہل سنت کے نظرئیے کے مطابق پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ و السلام) کی رحلت کے دوسرے سال خلیفہ اوّل رض کو حضرت عمر رض نے یہ دیکھ کر کہ حفّاظِ قرآن ختم ہوتے جاتے ہیں، صلاح دی اور اسی پر انھوں نے حکم دیا کہ قرآن مجید کے اجزا جمع کردئے جائیں۔ یہ کام پیغمبر صلعم کے سابق کاتبِ وحی زید ابن ثابت (مدنی) کے تفویض کیا گیا۔ "کھجور کی چھال، سفید پتھر کی تختیوں اور لوگوں کے سینوں" سے[1] سورتیں یک جا کی گئیں اور متن قرآن تیار کیا۔ خلافتِ عثمان رض (۶۴۴ء تا ۶۵۶ء) میں مروجہ نسخوں میں قرات کا اختلاف ہوا جس کی اصل وجہ کوفی خط کی ناقص نوعیت تھی۔ لہذا حضرتِ عثمان رض نے انہی زید رض کو ۶۵۱ء میں نظرثانی کی جماعت کا صدر مقرر کیا۔ حضرت ابوبکر رض کا نسخہ اس وقت اُمّ المومنین حفصہ بنت عمر رض کی تحویل میں تھا۔ اُسے اساس قرار دیا گیا

---

[1] خطیب، مشکوٰۃ، ج ۱، ص ۳۴۳

پھر جو نسخہ مرتب ہوا وہ تو مدینہ منورہ میں رکھا گیا[۱] اور تین نقلیں دمشق، بصرہ اور کوفے کے فوجی مرکزوں میں بھجوا دی گئیں۔ اور جو دوسرے نسخے (یا اجزا) تھے، انھیں ضائع کرادیا گیا ؛ اس روایت کو کہ حضرت ابوبکرؓ نے باضابطہ متن قرآن مرتب کرایا، جدید اہل علم قبول کرنے میں متامل ہیں ان کا قول ہے کہ حضرت عثمانؓ کو عرب اور شام و عراق میں کئی شہری نسخے ملے جن میں اختلافِ قرات پایا جاتا تھا۔ آپ رضؓ نے مدینے کا متن مستند قرار دیا اور دوسرے نسخے تلف کرائے۔ متن قرآن کا آخری تعین ۹۳۳ء میں علامۂ وقت ابن مجاہد کی مدد سے دو وزیروں، ابن مقلہ اور ابن عیسیٰ نے کرایا۔ ابن مجاہد نے سات قراتیں جائز قرار دیں جو اعراب لگے نہ ہونے سے مروج ہو گئی تھیں[۲] ؛ خود مسلمانوں کی نظر میں قرآن مجید کلام اللہ ہے جو حضرت جبرئیل کی وساطت سے پیغمبر خدا (صلی اللہ علیہ وسلم) کو سکھایا جاتا رہا۔ اس کی
اصل ساتویں آسمان پر لوح محفوظ میں ہے۔ (سورۂ زخرف: ۳۔ سورۂ 124
واقعہ: ۷۷، ۷۸۔ سورہ بروج: ۲۱ و ۲۲)[۳] پس نہ صرف معنی، بلکہ اس کا ہر لفظ، حرف حرف، وحی کیا گیا ہے ؛

---

[۱] کہا جاتا ہے کہ یہ نسخہ ترک حکام نے قیصر ولیم ثانی کو تحفہ دے دیا تھا۔ ملاحظہ ہو صلح نامہ وارسای۔ حصہ ۸ فصل: فنون "۔ (یہ عجیب روایت صریحاً ایسی غلط ہے جسے کوئی صاحب ہوش مشکل سے باور کرے گا۔ مترجم)

[۲] آرتھر جیفرے وغیرہ۔ (مغربی اہل تحقیق کی کوشش یہ رہی کہ کس طرح قرآن کی صحت میں فیہ نکالیں۔ اس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے جیسا کہ خود اعتراف کرتے ہیں۔ حفظ و جمع قرآن کے لیے ہمارے پاس قدیم مستند ماخذ محفوظ ہیں۔ مترجم)

[۳] دیکھو بیضاوی، ج ۲ ص ۲۴۱ وغیرہ (یہاں بھی "ساتواں آسمان" مصنف نے کسی اور ماخذ یا اپنے خیال سے پیدا کیا ہے۔ قرآن میں مذکور نہیں۔ مترجم)۔

سورتوں کی ترتیب طوالت کے حساب سے کی گئی ہے۔ مکی سورتیں نوّے کے قریب اور کشمکش کے زمانے میں نازل ہوئیں۔ یہ اکثر مختصر، پُر اثر، تیز و تند طرز کی انبیائی خیالات سے لبریز ہیں۔ ان میں اللہ (عزّ و جل) کی وحدت و صفات، انسان کے اخلاقی فرائض اور یوم جزا، خاص موضوع ہیں جنھیں بار بار بیان کیا ہے۔ باقی چوبیس مدنی سورتیں کوئی ایک تہائی قرآن پر محیط ہیں۔ یہ فتح مندی کے دور میں نازل ہوئی تھیں اور زیادہ تر مطوّل، مفصّل، تشریعی احکام سے پُر ہیں۔ ان میں دینی عقائد اور عملی عبادات یعنی صوم و صلوٰۃ حج و زمانہ امن (شہورِ حُرم) کے ضابطے بتائے گئے ہیں۔ شراب خواری، لحم خنزیر، قمار بازی کی حرمت آئی ہے۔ مالی اور جنگی احکام، زکوٰۃ و جہاد کے متعلق، اور قتل و قصاص، سرقہ، سُود، زنا، نکاح و طلاق، وراثت، غلاموں کو آزاد کرنے کے قوانین درج ہیں۔ یہ تشریعی مواد بیشتر سورۂ بقر، نسا، اور مائدہ میں آیا ہے۔ سورۂ نسا کی تیسری آیت[۱] جو تعدد ازواج کے باب میں اکثر نقل کی جاتی ہے۔ سچ پوچھئے تو تعدد کے رواج کی بجائے اُس کی تحدید کرتی ہے۔ نقاد (اہل مغرب۔ مترجم) طلاق کے قوانین (مندرجہ سورۂ نسا: ۲۴۔ احزاب: ۴۹۔ بقرہ: ۲۲۹) پر سب سے زیادہ اعتراض کرتے اور غلاموں، یتیموں، مسافروں کی نسبت قرآنی احکام کو اسلامی قانون کا سب سے بڑھ کر رحیمانہ حصہ سمجھتے ہیں۔ غلاموں کو آزاد کرنے کی بار بار ترغیب دی ہے کہ یہ خدا کی نظر میں سب سے پسندیدہ فعل اور بہت سے گناہوں کا کفارہ ہے۔ مدنی سورتوں میں

---

[۱] نیز دیکھو سورۂ معارج: ۲۹-۳۰۔

انبیائی حرارت اور سابقہ فصاحت کی کہیں کہیں چنگاریاں نظر آتی ہیں۔
جیسے سورۂ نور میں۔ اور سورۂ بقرہ کی آیہ ۱۷۲ اور ۲۵۶ میں[1] تاریخی
واقعات قریب قریب سب وہی ہیں جو توراۃ میں بھی مذکور ہیں سوائے
عاد و ثمود، لقمان، اور اصحاب فیل کے خالص عربی قصوں کے۔ یا سکندر
اعظم (= ذوالقرنین)[2] اور "سات سونے والوں" کے، جن کا مختصر طور پر
ذکر آیا ہے۔ توراۃ کے افراد میں سے آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ[3]، اسماعیلؑ 125
لوطؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، طالوتؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، الیاسؑ، ایوبؑ،
یونسؑ قرآن میں نمایاں طور پر مذکور ہے۔ حضرت ابراہیمؑ سے ایک سورہ
(۱۴) موسوم اور پچیس مختلف سورتوں میں ان کا نام تقریباً ستر دفعہ آیا ہے۔
حضرت یوسفؑ سے بارہویں سورت اور یونسؑ سے دسویں موسوم ہے۔
آفرینش اور ہبوط آدمؑ کا قصہ پانچ جگہ، طوفان نوحؑ اور سدوما کا آٹھ
آٹھ دفعہ مذکور ہوا ہے۔ اس طرح قرآن مجید، توراۃ کے پنج سورہ موسوی

---

[1] ان آیات میں "نور" کا جس طرح ذکر آیا ہے اُن سے مجوسی اثرات مترشح ہوتے ہیں۔ (متن میں تعریف کرنے کے بعد نیچے یہ حاشیہ چڑھانا، مصنف کی پریشان خیالی معلوم ہوتا ہے۔ کریمہ: اللہ نور السموات ۔ الآیۃ میں آگ کو (معاذاللہ) خدا بتانے کی بجائے بالکل برعکس خدا کی "نور" سے مثال دی گئی ہے۔ آیات کے نشان دینے میں مصنف سے تسامح ہوا ہے۔ ہم نے قرآن مجید سے مقابلہ کرکے صحت کر دی ہے۔ سورہ بقرہ کی آیہ ۲۵۶، آیۃ الکرسی ہے۔ مترجم)

[2] سورۂ کہف: ۸۲ ومابعد۔ جن میں اُسے خدا کی طرف سے اپنے کام پر مامور کیا جانا معلوم ہوتا ہے
صحیفہ دانیال ۸: ۵ میں بھی صاف صاف سکندر یونانی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[3] مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کو حنیف اور مسلم کہا گیا ہے (آل عمران۔ آیۃ کا نشان مصنف نے ۶۰ لکھا ہے۔ اصل میں ۶۷ ہے: ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولکن کان حنیفا مسلما۔ مترجم) ان کو پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا خاص مورث، ملت اسلام کا روحانی باپ اور بانی کعبہ بتایا ہے۔ خدا کے "دوست" (= خلیل اللہ) کے نام سے توراۃ، انجیل اور قرآن تینوں میں ان کا ذکر آتا ہے (دیکھو اشعیاء ۔ وقائع ۔ وغیرہ اور قرآن مجید میں سورۂ نساء: ۱۲۵۔ واتخذ اللہ ابراھیم خلیلا)

("اسفار موسیٰ" یا پنتاتیوک) سے دوسرے صحائف کی نسبت، زیادہ مماثلت رکھتا ہے؛ یہ سب قصے، حکایت کے طور پر نہیں بلکہ ناصحانہ سبق دینے کے لیے اور یہ سکھانے کے لئے بیان کئے ہیں کہ قرون ماضیہ میں خدائے تعالیٰ نے نیکوں کو ہمیشہ انعام سے نوازا اور شریروں کو سزا دی حضرت یوسف کا قصہ بڑی خوبی اور حقیقت نگاری کے رنگ میں سنایا گیا ہے۔ اس میں اور توراۃ کے دوسرے قصص اور قرآن کے بیانات میں کچھ فرق ہیں۔ جیسے حضرت ابراہیم کا خدائے برحق کی آواز پر لبیک کہنا (سورہ انبیا: ۵۱ و مابعد) لیکن قرآنی بیان کی مدرش، (= تفسیر توراۃ "ال مشنہ") کا تل مود اور دوسری یہود کی غیر الہامی کتابوں میں نظیریں پائی جاتی ہیں[1]؛

انجیل کے افراد میں سے صرف زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور حضرت مریم کا خاص طور پر ذکر ہے۔ آخری دو نام عموماً ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ حسب قرآن، عیسیٰ کی ماں مریم عمران کی بیٹی اور ہارون کی بہن بھی ہوتی ہیں[2] ہامان، جو اہاسورس کا منظور نظر تھا، قرآن مجید میں اسی فرعون کا وزیر بتایا گیا ہے[3] یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ توراۃ کے افراد کے عربی نام براہ راست عبرانی سے آنے کی بجائے، معلوم ہوتا ہے زیادہ تر سُریانی کے ذریعے آئے ہیں (جیسے نوح) یا یونانی سے (جیسے الیاس اور یونس کہ یونانی میں ایلیاس اور جونہ لکھے جاتے ہیں)؛

ان قصص اور ذیل کی عبارات کا توراۃ سے مقابلہ کیا جائے تو

---

[1] دیکھو "دی لیگے سی آف اسرائیل" اوکس فورڈ ۱۹۲۸ء) ص ۱۲۹؛

[2] آل عمران۔ وسورۂ مریم؛ [3] استھنر۔ ۳: ۱؛ [4] سورۂ قصص و مومن؛

یہ معلوم نہیں ہوتا کہ لفظی طور پر قرآن، توراۃ کی پابندی کرتا ہے :-

قرآن مجید سورہ بقرہ - ۴۴ تا ۵۸ ..... توراہ: "اعمال الرسل" - ۷ : ۳۶ تا ۵۳

" ۲۷۳ .... انجیل متی - ۶ : ۳ و ۴

سورہ بنی اسرائیل - ۲۳ تا ۴۰ ..... توراۃ : اخراج، ۲۰ : ۲

" مومنون - ۳ .... انجیل متی - ۶ : ۷

وغیرہ وغیرہ -

صرف ایک جگہ جسے کہہ سکتے ہیں کہ شاید براہِ راست توراۃ کی مناجاتوں (مزامیر " ۳۷ : ۹) سے ماخوذ ہو، سورہ انبیا کی آیہ ۱۰۵[1] ہے[2]۔ دوسرے مقام جن میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے یہ ہیں :

سورہ انبیا - ۱۰۴ ——— اشعیا - ۳۴ : ۴

" والنجم - ۳۹ تا ۴۲ ——— حزقیل - ۱۸ : ۲۰

" " ۴۵ ——— صموئیل اول - ۲ : ۶

" " ۴۹ ——— " ۲ : ۷

ایسی آیات کریمہ جن میں "آنکھ کے بدلے آنکھ" "اونٹ اور سوئی" "مکان جس کی بنیاد ریت پر ہو"[2] اور "کل نفس ذائقۃ الموت" کے کلمات توراۃ و انجیل کی طرح وارد ہوئے ہیں، صریحًا قدیم سامی کہاوتیں

---

[1] (آیۂ مولہ یہ ہے: ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ——— الآیہ - پھر اگلی آیت میں مسلمانوں کو بشارت اور پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی رحمۃ للعالمین کے لقب سے انتہای ستائش فرمائی گئی ہے۔ توراۃ مقابلے کے لیے میرے سامنے نہیں مگر یہ عبارت اگر واقعی توراۃ میں ہوتی تو مجھے وہم ہے کہ لائق مصنف شاید اس کا حوالہ نہ دیتا ــ مترجم)

[2] (آیۂ مولہ میں "شفا جرف ھار" کے الفاظ ہیں۔ ریت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ مترجم)

ہیں جو عبرانی اور عربی میں مشترک تھیں۔ متی کی انجیل اور مکی سورتوں
میں خاص طور سے تشابہ نظر آتا ہے، حضرت مسیحؑ کے بچپن کے معجزے
جیسے گہوارے میں کلام کرنا (آل عمران : ۴۱) اور مٹی کے پرندوں
میں روح پھونکنا اسی قسم کے کاموں کی یاد دلاتا ہے جو بعد کی بنائی ہوئی
اناجیل جن میں "انجیل طفولیت" بھی شامل ہے، بیان کرتی ہیں۔ ایران
کی مذہبی کتابوں سے صرف ایک نمایاں مماثلت، دوزخ و جنت
کی کیفیت بیان کرنے میں پائی جاتی ہے (سورۃ الواقعہ) کہ پارسیوں
کی متاخر تحریروں میں بھی اسی قسم کے نقشے دکھائے گئے ہیں اگرچہ
ممکن ہے کہ یہ تصویر اصل میں عیسائیوں کے مرقع اور وہ نقش ونگار دیکھ کر
ذہن میں آئی ہو جن میں جنت کے باغ اور ان میں فرشتوں کی
صورتیں بنائی جاتی تھیں، جو حور و غلماں سمجھ لی گئیں۔[1]

اگرچہ قرآن مجید عہد آفریں کتابوں میں سب سے کم عمر ہے
لیکن دنیا میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ پڑھی
جانے والی کتاب ہے۔ کیوں کہ نمازوں میں پڑھنے کے علاوہ وہ
ایک دریسہ ہے جس کے ذریعے قریب قریب ہر مسلمان عربی زبان
کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ ترکی زبان میں سرکاری ترجمے کے سوا اور
کسی زبان میں قرآن کا باضابطہ ترجمہ موجود نہیں، البتہ غیر سرکاری
بین السطور کئی ترجمے مسلمانوں نے مختلف زبانوں میں کر لئے ہیں،
جن میں فارسی، اردو، بنگالی، مرہٹی، جاوی، چینی ترجمے شامل ہیں

---

[1] (مصنف کا یہ سارا بیان ظنیات کی وجہ سے بے لطف اور ژولیدہ ہو گیا ہے۔ مترجم)

مجموعی طور پر کوئی چالیس زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہی[۱] قرآن کے الفاظ (۷۷،۹۳۴) آیات کریمہ (۶۲۳۶) اور حروف تک (۳،۲۳۶۲۱)

127 بڑی محنت سے شمار کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کا یہ بے نہایت تقدس یہاں تک بڑھا کہ آخر میں اسے خدائے تعالےٰ کا "غیر مخلوق کلام" ٹھیرایا گیا جو نظریۂ "اقنوم" کی یاد دلاتا ہی[۲] "لا یمسّہ اِلّا المطھّرون"۔ آج کل بھی یہ دیکھنا عجیب بات نہیں کہ ایک مسلمان بازار میں چلتے چلتے کوئی کاغذ اٹھاتا اور سنبھال کر کسی اونچی جگہ رکھ دیتا ہی کہ مبادا اس پر خدا کا نام لکھا ہو۔ خود لفظ قرآن کے معنی پڑھنا، نطق یا درس، ہیں۔ بہ آواز پڑھنے کے لیے وہ ایک قوی اور جان دار صدا ہی جس کی قدر اس وقت معلوم ہو سکتی ہی جب کہ اصل عربی میں سنا جائے۔ اس کے الفاظ کا تناسب، ترنم، روانی اور جوش جیسے ترجمے میں بجنسہ قائم رکھنا ممکن نہیں، بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ عربی زبان کی انجیل سے قرآن کا حجم (دیکھو) چار پانچواں ہی۔ روحانی اور اخلاقی امور میں اسلام کی اساس اور قول فیصل وہی ہی اس لئے بڑا مذہبی اثر رکھتا ہی لیکن اس کی تاثیر کا

---

[۱] قرآن مجید کا غیر زبان میں پہلا ترجمہ کلونی (اطالیہ) کے پادری پیٹر (دی دے نرابل) نے قیاساً ۱۱۴۳ء میں اسلام کی تردید کی غرض سے لاطینی میں شروع کیا۔ تین عیسائی اور ایک عرب اس کے مددگار تھے۔ انگریزی میں پہلا ترجمہ فرانسیسی ترجمے سے کیا گیا تھا کہ "ترکوں کی خام خیالیاں" لوگوں کو معلوم ہو سکیں۔ یہ ترجمہ ۱۶۴۹ء (لندن) میں طبع ہوا۔ جارج سیل نے ۱۷۳۴ء میں ترجمہ کیا۔ روڈویل نے اپنے ترجمے (۱۸۶۱ء) میں قرآنی سورتوں کو زمانی ترتیب سے مرتب کیا۔ پامر (۱۸۸۰ء) نے مشرقی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ رچرڈ بیل نے آیات کو بھی از سر نو مرتب کرنے کی جسارت کی ہی (۱۹۳۷ء)۔ قرآن مجید کا عربی متن سب سے اول وینس میں ۱۴۸۵ء سے ۱۴۹۹ء کے درمیان پگانینی نے طبع کیا تھا۔ (کتاب کے عربی ترجمے میں مارماڈیوک پکتھال مرحوم کے انگریزی ترجمے کا ذکر کیا گیا ہی۔ مترجم) [۲] مقابلہ کرو یوحنا ۱:۱

یہ صرف ایک رُخ ہے۔ مسلمان شریعت اور علم دین و دنیا کو ایک ہی شے کے مختلف پہلو سمجھتے ہیں لہذا قرآن مجید کتابی تعلیم حاصل کرنے کی درسیہ اور علوم حکمت کا دستورالعمل بھی ہے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے دارالعلوم الازہر میں یہ کتاب پورے نصاب تعلیم کی بنیاد کے طور پر ہنوز اپنے مرتبے پر قائم چلی آتی ہے۔ جب ہم یہ حقیقت سمجھ لیں کہ محض اسی کتاب کی بہ دولت عربی بولنے والی مختلف قوموں کی مقامی بولیاں جداگانہ زبانیں نہیں بننے پائیں جس طرح کے ممالک یورپ میں رومانی السنہ ایک دوسرے سے الگ ہوگئیں۔ تب اس کی عظیم ادبی قوت کا اندازہ کرسکیں گے۔ ہرچند زمانۂ حاضرہ کا عراقی کسی مراکشی کی بول چال سمجھنے میں کچھ دشواری محسوس کرے گا لیکن اس کی تحریر سمجھنا کچھ مشکل نہ ہوگا کیوں کہ عراق و مراکش دونوں جگہ ــــ جس طرح مصر و شام اور ملک عرب میں ، معیاری تحریر کی زبان وہی ایک ہے جسے قرآن مجید نے اپنے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے زمانے میں عربی نثر کی کسی اعلیٰ درجے کی کتاب کا وجود نہ تھا لہذا قرآن مجید سب سے قدیم نثر کی کتاب اور آج تک تحریر کا نمونہ چلا آتا ہے۔ اس کی عبارت میں لحن اور خطابت ہے لیکن وہ شاعرانہ نہیں ہے۔ مقفّیٰ نثر کا جو معیار اُس نے قائم کر دیا ، آج بھی ہر عربی مصنف بالارادہ اُس کی تقلید میں عرق ریزی کرتا ہے۔

بابِ دہم

اسلام یعنی مرضیٔ الٰہی کی اطاعت کا مذہب

129 سامیوں نے جو تین توحیدی مذہب تیار کئے، ان میں قرآن کا "اسلام" بہترین مثال پیش کرتا ہے۔ انجیل کی مسیحیت کی نسبت وہ توراۃ کی تعلیم سے قریب تر ہے اگرچہ ان دونوں سے کافی مماثلت بھی رکھتا ہے چنانچہ ازمنہ وسطیٰ کے بہت سے فرنگیوں اور مشرقی عیسائیوں کے ذہن میں جداگانہ مذہب کی بجائے وہ مسیحیت ہی کا ایک فرقۂ مبتدع تھا....[۱] رفتہ رفتہ عقائد کا جداگانہ، آزاد نظام بنا۔ کعبۃ اللہ اور قریش اس تبدیلی میں دو فیصلہ کن عنصر تھے۔ مذہب کے بنیادی مسائل بیان کرنے میں علمائے اسلام، ایمان، عبادت اور احسان میں امتیاز کرتے ہیں اگرچہ یہ تینوں "دین" کی اصطلاح میں شامل ہیں۔ اِنَّ الدِّینَ عِندَ اللّٰہِ الاِسلَامُ"

[۱] (یہاں مصنف نے دانتی کی مشہور نظم (طربیہ خداوندی) سے نبی کریم علیہ التحیاۃ والتسلیم کی شان میں نہایت گستاخانہ کلمات نقل کئے ہیں جو لکھنے والے کے جہل وعناد سے بڑھ کر رذالت وبدزبانی کا ثبوت ہیں۔ مترجم)

ایمان میں خدا، ملائکہ، کتب سماوی، انبیا اور قیامت کا یقین کرنا لازم ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اہم عقیدہ کلمہ "لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ" ہے۔ وحدتِ الٰہی کا تصور ایمان کا سب سے بڑا رکن ہے۔ حقیقت میں مسلمانوں کی توجہ فی صدی دینیات خدا ہی سے بحث کرتی ہے۔ وہی خدائے برحق ہے۔ سورۂ اخلاص میں توحید کا اعتراف جامع ترین صورت میں آتا ہے۔ وہی عزّ وجل حقیقی وجود ہے۔ پروردگار ازلی ہے (بقرہ۔۲۷ و ۲۸۔ نحل ۳ تا ۱۷) علیم وقدیر، حیّ و قیوم ہے (بقرہ۔۱۰۰ و ۱۰۱ و ۲۵۶۔ آل عمران: ۱۔۲۵۔ انعام: ۵۹۔ رعد: ۹ تا ۱۷)۔ اس کے ننانوے اسمائے حسنا ہیں (اعراف: ۱۷۹) اور اتنی ہی صفات ہیں[۲]۔ انہی کی تعداد کے مطابق مسلمانوں کی

تسبیح میں ننانوے دانے ہوتے ہیں۔ صفات رحمت پر قوت وجبروت 9

کی صفات غالب ہیں (حشر: ۲۳ و ۲۴[۱])۔ اسلام خدا کی مرضی کے سامنے کامل اطاعت اور سپردگی کا مذہب ہے۔ جیسا کہ جابجا قرآن مجید میں تصریح کی گئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور اُن کے فرزندؑ کا انتہائی آزمائش کے وقت سر جھکا دینا اور جس وقت باپؑ نے بیٹے کی قربانی دینی چاہی اُس وقت دونوں کا لفظ "اسلما" سے اظہار اطاعت کرنا، صریحاً پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے لئے محرک ہوا کہ اپنے نئے مذہب کا نام (اسلام)

---

[۱] (مصنف نے یہاں مائدہ، انعام اور حجرات کی آیتوں کے حوالے دئے ہیں مگر ان کے نشانات میں التباس ہو گیا ہے۔ مترجم)

[۲] الغزالی: "المقصد الاسنا" (قاہرہ ۱۳۲۲ھ) ص۱۱۔ بغوی: مصابیح ۱:۱۵

ذکر یہ: هو اللّٰه الّذی لا اِلٰه اِلّا هو۔ الملك القدّوس — آلایہ کا حوالہ دیا گیا ہے۔ لیکن صفات کی تعداد قرآن میں متعین نہیں اور قوت وقدرت کو رحمت پر غالب بتانا بھی مصنف کی صریح غلطی ہے۔ خدا کی رحمت کل شے پر محیط ہے۔ قال اللّٰہ تعالیٰ "و رحمتی وسعت کلّ شیئ"۔ مترجم)

رکھیں[1]۔ اسی قطعی اور غیر مشروط توحید اور خدائے قدوس کی کامل قدرت و بادشاہی پر سادہ و پرجوش اعتقاد میں اسلام کی اصلی قوت مضمر ہے۔ اس کے پیرو ایسی قناعت و رضا کے اوصاف سے بہرہ مند ہیں جو اکثر مذہبوں کے ماننے والوں میں کہیں نہیں پائی جاتی۔ اسلامی ممالک میں خودکشی النادر کالمعدوم ہے۔

ایمان کا دوسرا کلمہ رسالتِ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے اعتراف میں ہے۔ وہ اللہ کے رسول، قوم کے نذیر و بشیر، طویل سلسلۂ انبیا میں آخری ہیں جن کی وہ "مُہر" (= خاتم) (سورہ احزاب: ۴۰) ہیں۔ لہذا سب سے بڑے رسول ہیں۔ قرآن کی دینی تعلیم میں آپ محض بشر ہیں۔ آپ کا معجزہ صرف قرآن کا اعجاز ہے[2] لیکن روایات اور عوامی عقائد و اقوال میں آپ کو ایسی صفات سے متصف کیا گیا ہے جن میں ربّانیت کی جھلک ہے۔ آں حضرت صلعم کا دین زیادہ تر عملی دین اور بانی کی معاملہ فہمی اور کاروائی کا آئینہ ہے۔ اس میں ناقابلِ حصول خیالی مقاصد نہیں۔ مسائل الٰہیات کی الجھنیں اور پیچیدگیاں بہت کم ہیں۔ یہ اسرار مذہبی رسوم اور کسی پادری پروہت کے اقتدار کا وجود نہیں جو پیشوایانِ مذہب کے مدارج اور تقدس اور پاپائی قسم کی وراثت کو لازمی بناتا ہو۔

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے (توبہ: ۶۔ نیز دیکھو انعام: ۱۱۴ و

---

[1] سی سی تورے: "دی جیواش فاونڈیشن اوف اسلام" (نیویارک ۱۹۳۳ء) صفحہ ۲ و مابعد (یعنی ایک قیاس ہے اسے اتنے وثوق سے بیان کرنا بے جا ہے۔ مترجم)

[2] یعنی اس کے بیان کی خوبی جو اس کا معجزہ (= غیر انسانی ہونے کی دلیل) ہے۔ سورۂ رعد: ۲۷ تا ۳۰۔ بنی اسرائیل: ۹۲ تا ۹۶۔ دیکھو ابن حزم۔ ج ۳۔ سیوطی: الاتقان۔ ج ۲۔

۱۱۵)[1] یہ آخری وحی ہو (بنی اسرائیل : ۱۰۰؛ القدر : ۱؛ دخان : ۲۔ قصص : ۲؛ احقاف : ۱۵؛ بروج : ۱۱)[2] وہ "غیر مخلوق" ہو۔ قرآن مجید کو نقل کرتے وقت ہمیشہ پہلے "قال اللہ تعالیٰ" کہہ دیا جاتا ہو۔ صوتی، خطی اور لسانی اعتبار سے وہ آسمانی نمونے (= لوحِ محفوظ) کا بجنسہ مثنیٰ اور اسی کی طرح ابدی ہو[3] تمام معجزوں میں وہ سب سے بڑا معجزہ ہو۔ انسان اور جنّ مل کر بھی کوشش کریں تو اس کی نظیر نہیں لا سکتے؛ (بنی اسرائیل : ۹۰)

ملائکہ میں اسلام نے پہلا مقام حاملِ وحی جبرئیل ؑ کو دیا ہو (بقرہ : ۹۱) وہی "روح القدس" (بقرہ : ۸۱۔ نحل : ۱۰۲) اور "روح الامین" ہیں (شعرا : ۱۹۳) خدائے تعالیٰ کے قاصد کی حیثیت سے وہ یونانیوں کے ہرمس (دیوتا) کے مماثل ہیں؛
30

گناہ، رسمی اور اخلاقی دونوں قسم کا ہو سکتا ہو۔ (مصنف کی مراد صغیرہ وکبیرہ گناہ معلوم ہوتی ہو۔ مترجم) سب سے بدتر، ناقابل معافی گناہ خدائے برحق کی خدائی میں کسی کو حصہ دار بنانا، یعنی شرک ہو (نساء: ۵۱ و ۱۱۶) خدا کے شریک قرار دینا پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی نظر میں سب سے زیادہ نفرت انگیز معلوم ہوتا ہو۔ مدنی سورتوں میں

---

[1] دغالباً مصنف کی مراد آیہ ۱۱۶ "وتمت کلمۃ ربک — الایہ" ہو۔ اوپر کی آیتوں میں کلام الٰہی کا ذکر نہیں آتا — مترجم)

[2] (پہلی اور آخری سورہ حوالہ میں آیتوں کا نشان درست نہیں۔ بنی اسرائیل میں اتنی آیتیں ہی نہیں ہیں۔ بروج میں ۲۰، ۲۱ ہونا چاہیے۔ مترجم)

[3] مصنف نے صوت وخط کی یکسانی کی جو تفصیل بیان کی ہو، قرآن مجید میں کہیں مذکور نہیں۔ یہ اس کی سخت غلط فہمی یا تخیل آرائی ہو۔ مترجم)

مشرکین کو بار بار یوم حساب سے ڈرایا گیا ہے۔ اہل کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ کو غالباً آپ مشرکین میں شامل نہیں خیال کرتے تھے اگرچہ سورہ بیّنہ : ۵ کے بعض مفسرین کی رائے مختلف ہے۔ قرآن مجید کے سب سے بڑا اثر حصے معاد سے متعلق ہیں۔ ایک پوری صورت القیامہ موسوم ہے۔ جگہ جگہ یوم حساب " یوم حشر، الیوم، الساعہ اور "نہ ٹلنے والی" (= الحاقہ) کا ذکر آئندہ زندگی کی حقیقت کی توثیق کرتا ہے۔
حیات بعد الموت میں جسمانی راحت و تکلیف کی جو کیفیت قرآن بیان کرتا ہے، اس سے حشر اجساد کے معنی نکلتے ہیں۔

اسلام کے پانچ رکن

مسلمانوں کی "عبادات" میں جن پر زور دیا جاتا ہے، وہ اسلام کے پانچ رکن کہلانے لگے ہیں:-

اوّل - ایمان کا اقرار یا کلمہ شہادت: لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہ سب سے پہلے لفظ ہیں جو مسلمان بچے کے پیدا ہوتے ہی کان میں پڑتے ہیں[۱] اور یہی آخری لفظ ہیں جو اس کی قبر پر کہے جاتے ہیں۔ اس ابتدا اور انتہا کے درمیان بھی اس کلمے سے زیادہ کوئی کلمہ نہیں دہرایا جاتا۔ یہی الفاظ دن میں کئی کئی دفعہ مسجد کے میناروں سے مؤذن پکارتا ہے۔ اسلام میں عام طور سے اقرار باللسان کافی سمجھا جاتا ہے۔ جو شخص کلمہ طیبہ کو قبول کرے اور زبان سے دہرا دے وہ رسماً مسلمان ہو جاتا ہے۔

---

[۱] (ولادت کے وقت بچے کے کان میں اذان و تکبیر پکاری جاتی ہے۔ مترجم)

۲۔ (صلوٰۃ) دن میں پانچ دفعہ قبلہ رُو (یعنی مکّے کی طرف مُنہ کر کے) مقررہ نماز پڑھنا مسلمان اہلِ ایمان کا فرض اور اسلام کا دوسرا رکن ہے۔ اوقاتِ صلوٰۃ میں اسلامی دُنیا پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو (عرض و طولِ بلد کے فرق کو چھوڑ کر) حلقہ در حلقہ نمازیوں کی جماعتیں دکھائی دیں گی جو مکّہ معظمہ کے خانہ کعبہ کے مرکز کے گرد کھڑی ہیں اور مغربی افریقہ سے لے کر چینِ (کینٹن) اور سائبیریا کے توبولسک شہر سے کیپ ٹاؤن تک وسیع تر حلقے بناتی چلی جاتی ہیں!

فریضۂ نماز کے لئے لفظ "صلوٰۃ" کے (جس میں واو لکھی جاتی ہے) اِملا سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ارامی اصل سے عربی میں لیا گیا ہے۔ مگر اسلام سے قبل نماز ہو بھی تو یقیناً غیر مرتب اور بے ضابطہ ہوگی۔ قرآن مجید کی ایک ابتدائی سورۃ (اعلیٰ: ۱۵) میں صلوٰۃ کی تعریف آئی اور کئی مکّی آیتوں میں اس کی شرائط بتائی گئیں (:۔سورۂ ہود: ۱۱۶۔ بنی اسرائیل: ۸۰ روم: ۱۷ و ۱۸) تاہم اس کے روزانہ پانچ اوقات اور شرعی طہارت و وضو کے احکام مدنی عہد سے پہلے تکمیل کو نہیں پہنچے تھے۔ سب سے آخر میں عصر کی نماز فرض ہوئی (بقرہ: ۲۳۹) بخاری کی روایت کے بہ موجب[۱] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے معراج کے وقت اللہ تعالےٰ نے پچاس کا مطالبہ کیا جسے آپ نے کم کراتے کراتے پانچ مقرر کرائیں سورۂ نسا کی آیہ کریمہ ۴۶ سے خیال ہوتا ہے کہ شراب کی تحدید اور پھر مطلق حُرمت کا سبب یہ ہوگا کہ نماز باجماعت میں کوئی خلل واقع

۱۔ صحیح بخاری۔ ج ۱ ص ۹۸۔ مقابلے میں دیکھو آفرینش ۱۸: ۲۳۔

نہ ہونے پائے[1]؂ فریضۂ نماز ایک قانونی حکم ہے جو سب پر یکساں حرکات و سکنات اور قیام و قعود کی ترتیب کے ساتھ واجب ہے۔ مصلّی کو طہارت کی حالت میں ہونا لازم ہے اور اس کی زبان کچھ ہی ہو، نماز میں عربی استعمال کرنا قطعی ضروری ہے۔ اپنی مقررہ صورت میں نماز مناجات اور دُعا[2]؂ سے بڑھ کر خدا کے نام کی یاد ہے (جمعہ : ۹ و ۱۰)۔ (نماز میں) مسلمان سورۂ فاتحہ کوئی بیس مرتبہ روزانہ پڑھتے ہیں۔ اس سادہ اور پرمعنی سورۃ کو دعائے مسیحؑ (لِواڈز۔ پریئر) سے مشابہت دیتے ہیں۔ مگر فاتحہ پڑھنا فرض ہونے کے باعث وہ سب سے زیادہ دُہرائی جانے والی عبارت بن گئی ہے۔ پچھلی رات کی نماز (تہجّد۔ دیکھو بنی اسرائیل : ۸۱ — قٓ : ۴۰) دُہری تعریف کے قابل ہوکر اپنی خوشی سے (نافلہ) پڑھی جاتی ہے۔

عام نماز صرف جمعے کو ظہر کے وقت مقرّر (جمعہ : ۹۔) اور سب بالغوں پر فرض ہے۔ بعض مسجدوں میں خاص عورتوں کے لئے ایک جگہ بنی ہوتی ہے۔ نماز جمعہ کا ایک جزو خُطبہ ہے۔ یہ امام پڑھتا ہے اور اس میں حاکمِ وقت کے نام دُعا کی جاتی ہے۔ اس جماعتی عبادت کا نقش اوّل
یہودیوں کی مجلسی نماز تھی لیکن بعد کی ارتقا میں مسیحیوں کی اتوار کی نماز 132
کا اس پر اثر پڑا۔ وقار و سادگی، تمکین و ترتیب کے اعتبار سے کوئی اجتماعی عبادت نمازِ جمعہ سے فائق نہیں۔ جب نماز میں سیدھی صفیں خود باندھ کر نمازی مسجد میں کھڑے ہوتے ہیں اور صحت و خشوع کے ساتھ امام کی

---

[1] (مصنف کا اشارہ آیۂ کریمہ : یا ایھا الذین اٰمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکارٰی حتّٰی تعلموا ما تقولون — کی طرف ہے۔ جس کا صحیح نشان ۴۳ ہے۔ اس میں نماز کے فساد و خلل کا کوئی ذکر نہیں آتا۔ مترجم)

[2] دعا اور صلوٰۃ میں فرق کرنا چاہیے۔ دُعا نفلی ہوتی ہے اس کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

پیروی کرتے ہیں تو وہ منظر ہمیشہ نہایت موثر ہوتا ہے۔ ضابطہ آموزی کے لحاظ سے یہ اجتماعی نماز خود پسند وخود رائے صحرائی عربوں کے حق میں یقیناً نہایت قیمتی تعلیم تھی۔ یہ اُن کو قومی مساوات واستحکام کا شعور بخشتی تھی۔ پیغمبر (علیہ الصلوۃ والسلام) کے مذہب نے مسلمانوں میں جو دینی اخوت خاندانی رشتے کی بجائے اصولاً قائم کی تھی، یہ نماز اُس رابطے کو عملی تقویت دیتی تھی۔ اسی لئے نماز کا میدان "اسلام کی جنگی مشق کا پہلا میدان" بن گیا تھا۔

۳۔ (زکواۃ)۔ ابتدا میں یہ اپنی خوشی اور ہم دردی کا فعل، قریب قریب تقویٰ کے مانند تھا لیکن پھر یہ شرعی خیرات (بقرہ: ۲۱۶ و ۲۶۳) املاک پر لازمی محصول بن گئی۔ املاک میں زرنقد، مویشی، غلہ، پھل، تجارت کا مال شامل تھے۔ قرآن مجید میں زکواۃ کئی جگہ صلواۃ کے ساتھ مذکور ہے (بقرہ۔ توبہ۔ وغیرہا)۔ پھر نئی اسلامی حکومت نے باقاعدہ عامل مقرر کئے کہ زکوٰۃ جمع کرتے تھے۔ مرکزی خزانے سے اس کے مساکین کی امداد، مساجد کی تعمیر اور سرکاری کاموں میں خرچ کرنے کا انتظام کیا جاتا تھا۔ (توبہ: ۶۰)۔ لفظ زکواۃ آرامی زبان سے آیا ہے اور صدقہ کی نسبت تخصیص کا پہلو رکھتا ہے۔ صدقے کے معنی عام خیرات دینے کے ہیں جس کا جی چاہے لوگوں کو دے۔ زکواۃ خالص ملی آئین ہے کہ مسلمانوں سے لی جاتی اور صرف مسلمانوں پر خرچ کی جاتی ہے۔ پلی نی لکھتا ہے کہ جنوبی عرب کے سوداگر اپنے خدا کے نام پر عشر ادا کرتے تھے تب ان کو اپنے مصالحے بیچنے کی اجازت ملتی تھی۔ زکواۃ کا اصول بھی اسی

لے دیکھو توراۃ ۹، ۹: ۹۔ متی ، ۲:۴:۲ ۔

سے ملتا جلتا ہے۔ اس کی شرح بدلتی رہی اور فقہ کے مختلف مقدمات سامنے رکھ کر طے کی گئی ہے۔ جو اوسطاً ڈھائی فی صدی ہے۔ فوجیوں کے وظیفے بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے لیکن جب خالص اسلامی حکومت میں انتشار آیا تو زکوٰۃ دوبارہ ہر مسلمان کے اپنے ضمیر پر منحصر رہ گئی۔ وہ دین کا تیسرا رکن ہے؛

۴۔ (صیام) اگرچہ مدنی سورتوں میں کفارے کے روزے کئی جگہ آئے ہیں، لیکن ماہ رمضان کے (فرض) روزوں کا ذکر صرف سورہ بقر میں ایک جگہ ہے۔ (۱۷۹ تا ۱۸۱) ممکن ہے یہ خاص مہینہ اسلام سے قبل مقدس سمجھا جاتا ہو۔ اسے ماہ صیام انتخاب کرنے کا سبب یہ تھا کہ قرآن مجید پہلے اسی مہینے میں نازل ہوا (بقرہ : ۱۸۱) اور بدر کی جنگ میں فتح حاصل ہوئی۔ روزے میں سحر سے غروب آفتاب تک
133 ہر قسم کا خورونوش ممنوع کیا گیا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں کہ اسلامی ملکوں میں وہاں کی حکومت یا باشندے کسی روزہ نہ رکھنے والے مسلمان سے جبر و تشدد کے ساتھ پیش آئے؛ جاہلی عرب میں روزہ رکھنے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ لیکن یہ دینی آئین یہود و نصاریٰ میں یقیناً بخوبی جاری تھا[1]۔ ابن ہشام کا بیان ہے کہ عہد جاہلیہ میں قریش سال میں ایک مہینہ کوہ حرا پر (تحنث =) ریاضت شاقہ میں گزارا کرتے تھے[2] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) رمضان کو ماہ صیام مقرر کرنے سے پہلے بہ ظاہر یوم عاشورہ (محرم کی دسویں) کا روزہ رکھا کرتے تھے۔ اسے آپ نے یہودیوں سے اخذ کیا تھا[3] مکی سورتوں میں

---

[1] دیکھو توراۃ، ۹:۹ — متی، ۴:۲۰۔ [2] سیرہ ص۱۵۱

[3] بخاری۔ ج ۲ ص۱۰۱۔

صَوم کا لفظ ایک جگہ آیا ہے (مریم ۱۹ : ۲۶) اور وہاں بھی "خاموشی" کے معنی میں معلوم ہوتا ہے۔

۵۔ (حج) حج بیت اللہ، اسلام کا پانچواں اور آخری رکن ہے۔ ہر مسلمان مرد و عورت جو استطاعت رکھتا ہو اسے اپنی زندگی میں ایک مرتبہ مقررہ زمانے میں مکہ معظمہ جانا فرض ہے۔ مکے کے چھوٹے حج کو عُمرہ کہتے ہیں۔ یہ ہر شخص بطور خود سال کے کسی زمانے میں ادا کر سکتا ہے۔ حج کے لیے حدود حرم میں داخل ہوتے وقت (بے سلے کپڑے میں) "احرام" باندھنا، خانہ کعبہ کے سات طواف اور صَفا مروہ کے درمیان سات مرتبہ سعی کرنی ہوتی ہے۔ صفا، خانہ کعبہ سے متصل ٹیکری ہے اور مروہ اس کے مقابل میں بلند زمین کا نام ہے۔[۱] اصل حج کا آغاز عرفہ[۲] جانے سے ہوتا ہے۔ اس کی تاریخیں ۷، اور ۸ ذی الحجہ اور مِنا اور مزدلفہ ٹھیرنے کے مقام ہیں جو عرفات کے قریب ہی واقع اور مذہبی تقدس رکھتے ہیں۔ "رمی جمار" یعنی کنکر پھینکنے کی رسم وادئ مِنا کی راہ میں جمرۃ العقبہ میں ادا کی جاتی ہے۔ پھر اونٹ یا بھیڑ بکری، کسی سینگ دار مویشی کی (الحج : ۲۲ تا ۳۷) مِنا میں قربانی کرتے ہیں۔ یہ دسویں (نویں۔ مترجم) تاریخ ہوتی ہے جسے تمام اسلامی دنیا میں عید الاضحیٰ (= قربانی کا تہوار) کے نام سے مناتے ہیں۔ اسی پر مناسک حج کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ پھر سر منڈوا کر

---

[۱] اپنی روایات کے مطابق مسلمان اس واقعے کی یاد تازہ کرنے کے لئے سعی کی رسم ادا کرتے ہیں کہ حضرت ہاجرہ اپنے پیاسے بچے کے لیے پانی کی تلاش میں سات مرتبہ ان ٹیکروں کے درمیان دوڑی تھیں۔

[۲] رفعت کے قول کے بموجب میدان کا عرفہ اور پہاڑ کا نام عرفات ہے۔ (مرآت : ۳۳) لیکن دونوں لفظ ایک دوسرے کے بدل کے طور پر بولے جانے لگے ہیں۔

136 احرام اتارتے اور "احلال" (یعنی دنیاوی حالت) میں آجاتے ہیں۔
کوئی حاجی جب تک مُحرِم یعنی اِحرام کی حالت میں ہو شرائط صوم کی طرح
بیوی کے پاس نہیں جا سکتا کسی جانور کا خون نہیں کر سکتا نہ شکار کھیل سکتا
یا درخت اُکھاڑ سکتا ہے۔ مقدس مقامات کی زیارت کو جانا قدیم سامی
رسم تھی۔ توراۃ کے زمانے تک اس کے آثار ملتے ہیں۔ (اخراج۔۲۳
: ۱۴ وغیرہ) ممکن ہے ابتدا میں یہ دینِ شمسی کا شعار ہو[1] جس کی رسمیں اعتدال
خریفی کے وقت منائی جاتی تھیں جب کہ سورج کی ناگوار تیزی کا دور ختم
اور کھیتیاں ہری کرنے والے کڑک چمک کے دیوتا قزح کی حکمرانی کا
زمانہ آتا اور پہلے کو خیر باد کہنے کے ساتھ دوسرے کا خیر مقدم کیا جاتا
تھا۔ اسلام سے قبل شمالی عرب کے سالانہ میلوں کے بعد کعبے اور عرفے
کی زیارت کو لوگ ذی الحجہ میں آیا کرتے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ
علیہ وسلم) نے ہجرت کے ساتویں سال حج کی پرانی رسوم کی جن کا کعبہ
اور عرفہ سے تعلق تھا، اصلاح کی اور انھیں اسلامی بنایا۔ ان میں قدیم
رسوم کا بڑا حصہ رہنے دیا گیا۔ مصری مصنف رفعت کا بیان ہے کہ
آج کل جب کوئی بدو طوافِ کعبہ کرتا ہے تو اپنی عامیانہ عربی میں یہ
الفاظ کہتا جاتا ہے: "اے خانۂ کعبہ کے مالک، میں تیرے در پر
حاضر ہو گیا۔ نہ کہنا کہ میں نہیں آیا۔ تو چاہے تو مجھے اور میرے باپ
کو بخش دے۔ نہ چاہے تو بھی مجھے ضرور بخش دے کیوں کہ دیکھ لے میں نے
تیرا حج ادا کر دیا!"[2]

---

[1] رابرٹسن اسمتھ: "لیکچرز ... سیماٹیکس" (لندن ۱۹۲۷ء) ص ۲۷۶ و
۲۵۴ ص ۳۵ ۔ (مصنف نے حاشیے میں اسی مصنف کی یہ عجیب روایت نقل کی ہے کہ اس
نے کسی بدو عورت کو طواف کرنے میں لیلہ خاتون سے دعا اور منت مانتے سنا (بقیہ ص ۲۱۰ پر دیکھیے)

حاجیوں کے مسلسل قافلے سینی گال، نائی جیریا، لائی بریا سے چل کے
وسط افریقہ کو طے کرتے اور مشرق کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔ جتنے
آگے چلتے ہیں ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ بعض پیدل اور
دوسرے لوگ اونٹ پر سوار ہوتے ہیں۔ اکثریت مردوں کی، لیکن کچھ
عورتیں اور بچے بھی قافلے میں ہوتے ہیں۔ وہ تجارت کرتے، خیرات
مانگتے چلے جاتے ہیں کہ جس طرح ہو مکہ مکرمہ اور مدینۂ منورہ کے برگزیدہ
شہروں تک پہنچ جائیں۔ بہت سے راستے میں فوت ہوتے اور شہادت
کا درجہ پاتے ہیں۔ جو سلامت رہے وہ بحر قلزم کی کسی بندرگاہ کا راستہ
لیتے اور وہاں سے بادبانی کشتیوں میں سمندر پار کرتے ہیں۔ لیکن چار
سب سے بڑے قافلے یمن، عراق، شام، و مصر سے آتے ہیں۔ اِن 135
چاروں ملکوں سے سالانہ محمل بھی آیا کرتا تھا۔ یہ قافلے کی شان بڑھاتا تھا
اس میں ایک پر تکلف کجاوہ اونٹ پر لاتے تھے۔ اونٹ پر کوئی سوار
نہیں ہوتا بلکہ اُسے لے کر چلتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی سے ایسے
محمل وہ اسلامی بادشاہ بھیجتے جنھیں اپنی خود مختاری نیز محافظ حرمین
شریفین ہونے کا دعویٰ کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عام روایت یہ ہے کہ آخری
ایوبی سلطان کی ایک بیوی شجر الدّر نے یہ رسم نکالی تھی لیکن قدیم تر
ماخذوں میں اس کا بانی بنی اُمیّہ کا مشہور والی حجاج (م ۹۵ھ / ۷۱۴ء) بتایا گیا ہے۔[1]
ان میں سے جو روایت بھی صحیح ہو، اتنا یقینی ہے کہ مملوک سلطان بی برس

(بقیہ حاشیہ [illegible]) اگر یہ صحیح ہو (جس میں مجھے شبہ ہے) تو بھی فاضل مصنف کے اس نظریے کی دلیل
نہیں ہو سکتی کہ اسلام نے بت پرستی کے شعائر کو مناسک حج میں بڑی حد تک جائز رہنے دیا تھا!
یہ وسوسہ پیدا کرنے کی کوشش خالص علمی نقطۂ نظر سے ہوتا ہے۔ مترجم)

[1] ابن قتیبہ۔ معارف ص ۲۷۲ یاقوت ۔ ۲ ۵ ص ۵۸۲ وغیرہ۔

نے اس تقریب پر ایسی دھوم دھام کے جلسے کئے کہ پھر یہ رسم مضبوط بنیاد پر قائم ہوگئی[1]۔ حالیہ سنین میں مصری محمل کی شان شوکت کا مقابلہ کرنے والا صرف شامی قافلہ رہ گیا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد سے حاجیوں کی اوسط تعداد ایک لاکھ بہتر ہزار ہے۔ حال آں کہ سنہ ۱۹۰۷ء میں اس سال کے حاجیوں کا شمار ترکی اعداد کی رُو سے دو لاکھ اسّی ہزار تھا۔ عموماً سب سے بڑی تعداد ملایا والوں کی، کوئی تیس ہزار سالانہ، حج کرنے آتی ہے۔ یہی حاجیوں کے قافلے نجر حجاز کی آمدنی کا اصلی ذریعہ ہے۔

قرن ہا قرن سے حج کا آئین، اسلامی دنیا کی وحدت کا سب سے قوی سبب اور مختلف مسلمانوں کا مشترک رشتہ چلا آتا ہے۔ یہ ہر مستطیع مسلمان کو طوعاً یا کرہاً زندگی میں ایک بار ضرور سیاح بنا دیتا ہے۔ دنیا کے بعید ترین گوشوں سے برادرانِ دینی کا اس طرح جمع ہونا میل جول کا ایسا ذریعہ ہے کہ اس کے تمدنی اثرات کو جتنا زیادہ سمجھا جائے، کم ہے۔ اسی نے حبشی، بربر، چینی، ایرانی، ترک، شامی، عرب — امیر، غریب ہر قسم کے مسلمانوں کو ایک دین کے میدان میں لانے اور مواخات بڑھانے کا موقع بہم پہنچایا۔ دُنیا کے جملہ مذاہب میں بظاہر اسلام نے نسل و رنگ، ملک و قوم کی دیواریں توڑنے میں سب مذہبوں سے زیادہ حد تک کامیابی حاصل کی۔ اس میں تفریق کی لکیر صرف مسلمانوں اور ماتحتی (غیر مسلم) آبادی کے درمیان کھینچی گئی ہے ورنہ ملت اسلامی کے اندر سب انسان یکساں ہیں۔ بے شبہ اس کامیابی میں حج کے اجتماعات کا بڑا حصہ ہے۔ مختلف تحریکات کے پھیلانے

[1] سیوطی: حسن، ج ۲ ص ۱۲۴۔ نیز دیکھو المقریزی: "المواعظ والاعتبار" (قاہرہ ۱۲۷۰ھ) ج ۲ ص ۳۰۷ وغیرہ۔

میں بھی یہ نہایت کارآمد ہیں کہ جن بعید ممالک کے مابین خبر رسانی اور نامہ وپیام کے جدید وسائل موجود نہیں اور اخبارات کی آواز میں زیادہ قوت نہیں آئی، اُن کے باشندوں میں حاجیوں کی وساطت سے کسی خیال کی خوب اشاعت کی جا سکتی ہے۔ شمالی افریقہ میں سنوسیت جیسی قوی تحریک کی تخلیق اور ابتدائی تبلیغ اسی مکہ معظمہ کے حج کے اجتماع کی رہین منت ہے۔

(جِہاد)۔ فریضۂ جہاد یا خدا کے لیے جنگ[1] (سورہ بقرہ: ۱۸۶) کرنے کو کم سے کم مسلمانوں کے ایک فرقے یعنی خوارج نے اسلام کے چھٹے رُکن کا درجہ دیا ہے۔ ایک دنیاوی قوت کی حیثیت سے اسلام کو جو بے مثال توسیع وترقی حاصل ہوئی، وہ جہاد ہی کی بدولت تھی۔ خلیفۂ اسلام کے خاص
138 فرائض میں داخل ہے کہ وہ دارالاسلام کی حدود کو بڑھاتا اور دارالحرب کی دیواروں کو پیچھے ہٹاتا رہے۔ دُنیا کو مقامِ امن ومسکنِ جنگ میں تقسیم کرنے کی نظیر جدید سویت روس کے اشتراکی نظریے میں نظر آتی ہے۔ لیکن زمانۂ حاضرہ میں مسئلہ جہاد کو اسلامی ممالک میں کچھ زیادہ تائید نہیں ملی جس کا بڑا سبب بعید ملکوں میں اسلام کا پھیلنا ہے جہاں کئی غیر حکومتوں کے ماتحت وہ پھول پھل رہا ہے اور یہ حکومتیں یا اتنی قوی ہیں یا ایسا شریفانہ برتاؤ کرتی ہیں کہ انھیں تہ و بالا کرنے کا کوئی محل نہیں۔ غیر مسلموں کے خلاف عالمگیر جہاد کی ایسی دعوت بالکل قریب زمانے میں خلیفہ سلطان محمد رشاد نے ۱۹۱۴ء کی سردیوں میں شائع کی تھی مگر بے اثر ثابت ہوئی۔

ایمان کا ایک اور اہم جزو جو تمام زمانوں میں مسلمانوں کے افکار وافعال پر گہرا اثر ڈالتا رہا، خیر وشر کا من جانب اللہ عقیدہ ہے (سورہ توبہ

---

[1] اصلاً دنیاوی جنگ کی اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

: ۱۵ - فاطر : ۲ - آل عمران : ۱۳۹)[1] اساسی عبادات کا اوپر ذکر آچکا ہے لیکن قرآن مجید کی تعلیم انہی پر ختم نہیں ہو جاتی - احسان یا نیکی کرنا بھی اسی درجے میں فرض ہے۔ اسلامی دنیا میں ذاتی اور اجتماعی اخلاق کی جملہ حدود، مذہبی نوعیت رکھتی ہیں - بنیادی طور پر حلال یا حرام وہ ہے جسے اللہ تعالٰے نے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) پر وحی کے ذریعے جائز یا ناجائز قرار دیا۔ مذہب کے تاریخی ارتقا میں اسلام پہلا دین تھا جس نے عرب میں ذاتی عقائد و اخلاق کی صحت کا مطالبہ کیا (نجم : ۳۹ تا ۴۲ - لقمان : ۳۲)[2] اخلاقی اعمال کی بنا اس نے خون کے قبائلی رشتے کی بجائے دینی اخوت پر قائم کی - انسانی نیکیوں میں وہ فیاضی اور خیرات، زکوٰۃ کی صورت میں بہت زور دیتا ہے۔ ایسی آیات کریمہ میں (جیسے سورۂ بقر کی ۱۷۲ - آل عمران کی ۱۰۱ و ۱۰۶ - سورۂ نسا کی ۴۰ - سورۂ اعراف کی ۳۱)[2] اس کے اخلاقی تصورات نہایت واضح طور پر بیان کئے گئے ہیں - ان کا مقابلہ توراۃ کی بہترین تعلیمات سے کیا جائے (جیسے عموس - ۵ : ۲۳ و ۲۴ - میکا - ۶ : ۶ تا ۸ - حوزی - ۶ : ۶) تو قرآنی تعلیم برتر پائی جائے گی ؎

---

[1] (سورۂ توبہ کی مولہ آیت : قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا — الایہ کے سوا دوسری آیتوں کے جو نشان دئے گئے ہیں، ان کا موضوع سے کچھ تعلق نہیں پایا جاتا - مترجم)

[2] (آیات مولہ بھی زیر بحث موضوع سے غیر متعلق ہیں - مزید ان کے نشانات دینے میں کوئی غلطی واقع ہوئی — مترجم)

باب یازدہم

فتوحات، ملک گیری و آبادکاری کا زمانہ

۶۳۲ء تا ۶۶۱ء

خلفائے راشدین:

۱۔ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ	۶۳۲ء تا ۶۳۴ء
۲۔ ” عُمر فاروق رضؓ	۶۳۴ء تا ۶۴۴ء
۳۔ ” عثمان غنی رضؓ	۶۴۴ء تا ۶۵۶ء
۴۔ ” علی مرتضیٰ رضؓ	۶۵۶ء تا ۶۶۱ء

جب تک پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) زندہ رہے، نبوت، تشریع، امامت، عدالت، فوجی قیادت اور دیوانی حکومت کے جملہ عہدے آپؐ کی ذات میں جمع تھے۔ لیکن اب آپؐ نے رحلت فرمائی۔ سوال یہ تھا کہ آپ کا جانشین یا خلیفہ کون ہو جو نبوت کے سوا دوسرے سب فرائض انجام دے۔ سب سے بڑے اور آخری رسولؐ ہونے کے اعتبار سے جن پر نزولِ وحی کا اختتام ہوا، اس منصب کا کوئی وارث نہ ہو سکتا تھا۔ آپؐ نے کوئی نرینہ اولاد نہیں چھوڑی۔ صرف ایک صاحب زادی،

حضرت فاطمہؓ زوجۂ علیؓ آپ کے بعد زندہ رہیں۔ لیکن عرب میں امارت یا شیخ کا عہدہ بالکل موروثی نہ تھا بلکہ زیادہ تر انتخابی، یعنی بزرگانِ قبیلہ میں سے کسی کو چن لینے کا طریقہ رائج تھا۔ پس اگر آپؐ کے فرزند زندہ ہوتے تو بھی یہ مسئلہ حل نہ ہوتا۔ نہ خود پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے صاف طور پر کسی کو جانشین نامزد فرمایا۔ نظر برایں ملت اسلامی کو سب سے پہلے اس عقدے سے سابقہ پیش آیا۔ آج تک یہ ایک ضروری سوال بنا ہوا ہے۔ مارچ ۱۹۲۴ء میں کمالی ترکوں نے عثمانی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ اُس وقت سلطان عبدالمجید ثانی اس منصب پر فائز تھے۔ پھر کئی بین الملی مجلسیں قاہرہ اور مکہ معظمہ میں منعقد ہوئیں کہ خلیفہ جائز کا انتخاب کریں مگر سب ناکام رہیں۔ شہرستانی کا قول ہے کہ کسی اسلامی مسئلے کی وجہ سے اتنی خوں ریزی نہیں ہوئی جتنی خلافت (= امامت) پر۔[1] آپؐ کی وفات پر کئی گروہ ہو گئے تھے، اور جب کوئی اہم مسئلہ عوام کے فیصلے پر چھوڑا جائے تو ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چناں چہ ایک طرف تو مہاجرین تھے جو پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ہم قبیلہ اور سب سے پہلے آپ کا دین قبول کرنے کا دعویٰ رکھتے تھے۔ دوسری طرف مدینے کے انصار جنھیں دعویٰ تھا کہ اگر ہم رسول اللہؐ اور نئے دین کی مدد نہ کرتے تو ان کا سلامت رہنا محال تھا۔[2] آخر میں یہ دونوں گروہ ایک ہی جماعت صحابہ بن گئے۔ پھر "اصحاب النص والتعیین" آئے جن کی حجت تھی کہ

---

[1] باب ۱۲۔

[2] (مصنف نے اور بھی سخت لفظ لکھے ہیں کہ انصار دعویٰ کرتے تھے کہ ہم مدد نہ کرتے تو دین اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم فنا ہو جاتے ـــ تاریخی اعتبار سے غلط ہونے کے علاوہ ایسا کوئی مسلمان ملکہ صاحب عقل نہیں رکھ سکتا تھا۔ مترجم)

خدا اور اس کا رسولؐ امت مسلمہ کو انتخاب کے اتفاقات اور وقتی جذبات پہ نہ چھوڑ سکتے تھے۔ ضرور ہے کہ امامت کے لئے کوئی واضح ہدایت کی گئی ہو۔ اور علیؓ جو حضرت رسول خداؐ کے عم زاد بھائی اور آنؐ کی ایک ہی زندہ رہنے والی صاحب زادی کے شوہر، اور سب سے پہلے دو تین ایمان والوں میں شامل ہیں، نام زد کئے گئے اور واحد وارثِ جائز وہی ہیں۔ یہ گروہ حکومت کو، اصول انتخاب کے مقابلے میں خدائی حق ٹھیراتا ہے۔ آخر میں قریش کے اُمرا یعنی بنو اُمیّہ کا گروہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا جو اسلام سے بیش تر دولت و اقتدار کے مالک تھے (لیکن اسلام لانے میں سب سے پیچھے رہے تھے) انھوں نے آگے چل کر اپنی جانشینی کا حق جتایا۔ فتح مکہ تک انھی کا سرگروہ ابوسفیان پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے مخالفین کا پیشوا تھا۔

پہلا گروہ (مہاجرین) کامیاب ہوا۔ معمر و متقی ابوبکرؓ کے ہاتھ پر جو آں حضرت صلعم کے خسر اور سب سے پہلے تین چار ایمان لانے والوں میں تھے، عائدِ حاضر نے بیعت کرلی۔ غالباً یہ آن کی اور عمرؓ ابن الخطاب اور ابوعبیدہؓ ابن الجراح کی پہلے سے کی ہوئی تجویز تھی۔ یہی اصحاب ثلاثہ ابتدائی ملتِ اسلام کی قسمتوں کے مالک بن گئے۔[1]

چار خلفائے راشدین میں ابوبکر صدیقؓ اوّل خلیفہ اور باقی تین عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ پیغمبر صلعم کی حیاتِ طیبہ

---

[1] (تاریخی واقعات یہ اس طرح کی قیاس آرائی دیانت کے خلاف ہے لیکن یورپ والے تاریخ لکھنے میں صداقت کی ضرورت پابندی نہیں کرتے۔ مصنف کے ظن فاسد سے قطع نظر یہ واقعہ تاریخ کے سو ... کوئی حکومت ثلاثہ قائم ہوئی جس کے ایک رکن حضرت ابوعبیدہؓ تھے۔ مترجم)

کے چراغ کی روشنی زائل نہیں ہوئی تھی اور خلفا کے افکار و اعمال پر اُس کا گہرا اثر تھا۔ چاروں خلیفہ آں حضرت ؐ کے خاص رفیق اور عزیز تھے۔ وہ آں حضرت صلعم کی تعلیم کے دوسرے مرکز، مدینے ہی میں رہے بجز خلیفۂ آخر حضرت علیؓ کے جنھوں نے عراق میں اپنا صدر مقام کوفہ انتخاب کیا۔

عرب کی بہ دستِ خود فتح

حضرت ابوبکرؓ کی مختصر خلافت کا زیادہ وقت ان لڑائیوں نے لیا جو "رِدّہ" (= ارتداد) سے منسوب ہیں۔ عرب تاریخ نویسوں کا بیان ہے کہ حجاز کے باہر تمام جزیرہ نمائے عرب کے لوگ جو اسلام لائے اور پیغمبر صلعم کی اطاعت قبول کر چکے تھے، آپ ؐ کے بعد نئی حکومت سے منحرف ہو گئے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ آمد و رفت کے وسائل اور باقاعدہ تبلیغی کوششیں مفقود تھیں لہذا اتنی قلیل مدت اور پیغمبر صلعم کی حیات مبارک میں ایک تہائی سے زیادہ عرب نہ اسلام لا سکتا تھا نہ آپ کی اطاعت کا اقرار کر سکتا تھا۔ خود حجاز آپ کی وفات سے دو ایک سال قبل تک پوری طرح مسلمان نہ ہوا تھا۔ وفود جن کی آمد کی خبر دی گئی ہے تمام اہل عرب کے نمائندہ نہ ہو سکتے تھے۔ اُن دنوں ایک قبیلے کے مسلمان ہو جانے کے معنی بھی یہ سمجھے جاتے تھے کہ صرف اُس کے شیوخ اسلام لے آئے ہیں۔ اسی قسم کے کئی قبیلے یمن، یمامہ، عمان میں حکومتِ مدینہ کو زکوٰۃ دینے میں تامّل کرتے تھے اور جب رسول کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) کا انتقال ہوا تو انھیں صاف انکار کرنے کا حیلہ مل گیا۔ حجازی صدر مقام کی روز افزوں سیادت بھی باطنی حسد کا سبب ہوئی۔ مرکز گریز قوتیں جو عربی زندگی

کی خصوصیات میں داخل تھیں، ایک مرتبہ پھر حرکت میں آگئیں۔ اتنے
مخالف عناصر جمع ہونے پر بھی حضرت ابوبکرؓ اس بات پر جمے رہے کہ یا
اہل ردہ غیر مشروط اطاعت قبول کریں ورنہ اُن سے فیصلہ کن جنگ
کی جائے۱؎ ان جنگوں کے بطلِ عظیم خالدؓ ابن ولید ثابت ہوئے۔ اُن کی
سپہ سالاری میں چھ مہینے کے اندر وسط عرب کے قبائل نے ہتیار ڈال
دئے۔ انھوں نے پہلے قبیلۂ طے کا سر نیچا کیا۔ پھر بنو اسد اور غطفان کا،
جن کا نبی طلحہ بنا تھا۔ مسلمان اسے ازرہ تمسخر طلیحہ کہتے تھے۔ آخر میں یمامہ
کے بنو حنیفہ کو ہزیمت ہوئی جو اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے
تھے۔ اس کا نام عربی وقائع نویس صیغۂ تصغیر میں مسیلمہ تحریر کرتے ہیں۔
اسی نے سب سے سخت مقابلہ کیا اور اپنے دینی و دنیاوی مفاد کو سجاح سے
شادی کر کے تقویت دی۔ یہ عورت بنی تمیم کی نبیہ اور کاہنہ تھی۔ ممکن ہو کہ
عیسائی ہو۔ کہا جاتا ہو کہ مسیلمہ کے ماتحت چالیس ہزار سپاہی تھے اور اسی
لشکر کثیر سے اُس نے مسلمانوں کی دو فوجوں کو سخت شکست دی جس کے
بعد خالدؓ تیسری فوج لے کر آئے۔ انھیں فتح ہوئی مگر اسی لڑائی میں اتنے
قرآن کے حافظ شہید ہوئے کہ کتاب اللہ کی حفظ و بقا خطرے میں پڑ گئی۔
بحرین، عمان، حضر موت، اور یمن میں دوسرے مسلم سپہ سالار بھیجے گئے 142
اور انھوں نے مختلف درجے کی فتوحات حاصل کیں۔ یمن میں بھی ایک نبی
"ذوالاسود" کے لوگ معتقد ہو گئے تھے۔ غرض معلوم ہوتا ہو کہ ان لڑائیوں
کا مطلب صرف اہل ردہ کو جبراً حیطۂ اسلام میں رکھنا نہ تھا۔ جیسا کہ عرب
مورخوں کا نظریہ ہو، بلکہ بہت سے لوگوں کو جو ابھی تک دین کے دائرے

۱؎ بلاذری ص۹۶

میں نہ آئے تھے مسلمان بنانا منظور تھا۔ خالدؓ کی تلوار نے آخر پورے عرب کو ابوبکر صدیقؓ کے ماتحت متحد کر دیا۔ دوسرے ملکوں کو فتح کرنے سے پہلے اہل عرب کا خود اپنے آپ کو فتح کرنا لازم تھا۔ پیغمبر صلعم کے بعد ان اندرونی محاربات نے کئی مہینے تک ملک عرب کو مسلح لشکر گاہ کی صورت میں بدل دیا تھا اور اب جنگی ولولے ظہور کے دوسرے راستے تلاش کر رہے تھے۔ باقاعدہ جنگ کرنے کی جو تدابیر ان معرکوں میں سیکھی گئی تھیں، وہ بھی دوسری جگہ آزمائش کا تقاضا کرتی تھیں۔ جملہ قبائل ایک نام نہاد نئی برادری میں شامل ہوئے تو نئے میدانوں میں ان کے جذبۂ جنگ جوئی کی تسکین کا سامان ہونا بھی ضروری تھا۔

تاریخ قدیم کے آخری ابواب میں دو جلی عنوان آتے ہیں: اول تیوتانی اقوام کی آمد یورپ میں جس نے کہن سال سلطنت روما کو پارہ پارہ کر دیا اور (دوم) عرب کی فتوحات، جنھوں نے دولت ایران کا خاتمہ کیا اور بائی زنطی سلطنت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ ان میں دوسرا واقعہ یعنی عرب کی فتوحات جس کا نقطۂ عروج ان کا قبضۂ اندلس تھا، یورپ کے ازمنہ وسطیٰ کا آغاز کرتا ہے[1]۔ اگر ساتویں صدی عیسوی کے پہلے ثلث میں کوئی یہ پیش گوئی زبان سے نکالنے کی جرأت کرتا کہ دس برس کے اندر ایک نادیدہ و ناشنیدہ قوت عرب کے گم نام جنگلی علاقوں میں ایسی پیدا ہو جائے گی کہ دنیا کی سب سے بڑی دو طاقتوں سے ٹکرائے گی۔ اور ان میں سے ایک (یعنی ساسانیوں) کی خود جگہ لے لیگی اور دوسری (بائی زنطہ) کے بہترین مقبوضات چھین لے گی، تو بلاشبہ لوگ اسے

[1] ہنری پارین، "محمد اور شارلماں" (فرانسیسی۔ طبع ہفتم۔ برسلز ۱۹۳۵ء)

دیوانہ بتاتے۔ لیکن واقعہ ٹھیک یہی پیش آیا۔ نبی کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) کے بعد عرب کی بنجر زمین یکایک جیسے کسی نے جادو کردیا ہو، سورما اگلنے لگی، جن کی، تعداد اور قابلیت دونوں اعتبار سے، کسی ملک میں نظیر ملنی دشوار ہے۔ خالدؓ ابن ولید اور عمرو ابن العاص کی معرکہ آرائیاں جو عراق و ایران، شام و مصر میں واقع ہوئیں، فن حرب کی تاریخ میں درخشندہ ترین لڑائیاں تھیں جن کو نپولین، ہنی بال یا سکندر اعظم کی جنگوں پر بھی فوقیت حاصل ہے۔

ایران و بائی زنطہ پشت ہا پشت سے باہم لڑکر مضمحل ہوگئے تھے۔ ان محاربات کی وجہ سے دونوں سلطنتیں اپنی رعایا سے بھاری محصول وصول کرتیں اور لوگوں کے جذبۂ وفاداری کی جڑیں کھوکھلی کرچکی تھیں۔ 3 شام و عراق میں، خصوصاً سرحدی اضلاع میں عرب قبائل متوطن ہوگئے تھے۔ دین مسیحی میں فرقہ بندی نے حلولی اور نسطوری عیسائیوں کو ایک دوسرے سے الگ کردیا تھا اور ایران و عراق میں ان کے گرجا اور جماعتیں جدا جدا قائم ہوگئی تھیں اور قدیم مذہب کا دونوں پر تشدد بر مزید تھا۔ غرض یہ سب اسباب تھے جن سے عرب لشکروں کے حیرت انگیز اقدام کا راستہ تیار ہوگیا۔ بائی زنطہ والوں نے سرحدی قلعوں پر مدت سے توجہ نہ کی تھی۔ ہرقلیس بادشاہ نے جنگ موتہ کے بعد جس میں آں حضرتؐ کے فرستادہ دستہ فوج کو شکست ہوئی (ستمبر ۶۲۹ء) بحر لوط اور غزہ و مدینہ کی شاہ راہ کے شامی عرب قبائل کے وظیفے بھی کہ پہلے باقاعدہ ملتے تھے، بند کرلئے تھے[1] اب جو عربوں نے پیش قدمی کی تو

---

[1] تمہید فاالنس۔ صفحہ ۲۲۵ در اصل میں عثمان کے بادشاہ نے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام کے
(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۸ پر)

شام و فلسطین کی سامی اور مصر کی حامی اقوام کو یہ حملہ آور اپنے قابل نفرت، ظالم اجنبی حاکموں سے رشتے میں قریب تر نظر آئے اور سچ یہ ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کو ہم اس نظر سے بھی دیکھ سکتے ہیں کہ یہ مشرق ادنیٰ کے سابقہ اقتدار کی بحالی تھی۔ گویا ایک ہزار سال تک مغرب کی بالادستی رہنے کے بعد اسلام کے قوی محرک سے کہنہ سال مشرق قریب پھر بیدار ہوا اور اس نے دوبارہ اپنا حق منوا لیا۔ مزید برآں نئے فاتحین جو محصول لیتے تھے وہ پرانے حاکموں سے بھی کم تر تھا۔ دوسرے یہ کہ مفتوحوں کو اپنے مذہبی مراسم ادا کرنے کی اب زیادہ آزادی ملی اور مداخلت میں کمی آگئی۔ رہے (مسلمان) اہل عرب، تو وہ ایک تازہ دم طاقت ور قوم کا نمونہ تھے جس کے دل میں نئے جوش کی آگ بھڑک رہی تھی اور فتح یابی کا ولولہ بھرا تھا۔ ان کے مذہب نے ان کے دل میں اُتار دیا تھا کہ موت قابل حقارت چیز ہے اور اس عقیدے نے اُن کو دلیر تر بنا دیا تھا۔ بہ ایں ہمہ ان کی فتوحات میں، جو خرق عادت نظر آتی ہیں، جنگ کے ایک خاص اسلوب سے کام لینے کا بھی دخل تھا۔ یعنی سوار و شتر سوار فوج کا استعمال جو مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ریگستانی میدانوں کے عین مناسب تھا اور جس پر رومی کبھی قادر نہ ہوتے تھے۔

(بقیہ حاشیہ ص۲۱۷) نامہ بر کو قتل کرا دیا تھا۔ آپ نے تین ہزار کا ایک دستہ تادیباً روانہ کیا مگر غسانی رومیوں کی امداد سے تقریباً ایک لاکھ فوج مقابلے میں لائے۔ مسلمانوں کے تین سپہ سالار معرکے میں شہید ہوئے۔ آخر حضرت خالدؓ نے دشمن کے بہت سے سپاہیوں کو مار کر، اپنی فوج اُن کے نرغے سے نکال لی۔ یہ سنہ ۸ھ کا واقعہ ہے۔ مترجم)

فتوحات کے معاشی اسباب

عربی ماخذ میں اسلامی تحریک کے اصلاً وخالصاً دینی ہونے پر زور دیا گیا ہے اور اُن معاشی اسباب کو اہمیت نہیں دی گئی جو اندر ہی اندر کام کر رہے تھے۔ ادھر بہت سے مسیحی مصنف عرب مسلمانوں کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے ہاتھ میں قرآن کا مفروضہ پیش کرتے ہیں جو بالکل غلط ثابت ہو چکا ہے۔ جزیرہ نمائے عرب کے باہر، خصوصاً اہل الکتاب (یعنی یہود و نصاریٰ) کے باب میں ایک اور بدل بھی تھا جسے فاتحین کے نقطۂ نظر سے زیادہ مفید سمجھنا چاہیئے۔ یعنی جزیہ۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے کہ اہل کتاب سے جو خدا اور قیامت پر ایمان نہ لائیں .... جنگ کرو، یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھوں سے جزیہ پیش کریں اور اُن کے سر جھکے ہوئے ہوں"[1] ضروریات وقت نے اس تیسرے اختیار کو آگے چل کر زرتشتی، ترک اور بربر اقوام کے لیے بھی توسیع دلوا دی تھی۔ اِن صورتوں میں ضرورت، اصول پر غالب آگئی تھی۔ یہ درست ہے کہ اسلام ایک نیا نعرۂ جنگ بن گیا اور اس نے قوم کی وحدت و امتیاز کا مفید ذریعہ بہم پہنچا دیا۔ غیر متجانس عوام کو پہلے کبھی متحد نہ ہوئے تھے، اسلام نے بے شبہ ان کی شیرازہ بندی اور گوندھ کر ایک کر دینے کی خدمت انجام دی اور قوت محرکہ کا جزو کبیر بھی وہی تھا۔ لیکن فتوحات اسلامی کی یہ توجیہ بجائے خود مشکل سے کافی ہو سکتی ہے۔ فتح مند فوجیں بیش تر بدوؤں پر مشتمل تھیں۔ انھیں مذہبی جنون کی بجائے معاشی ضرورت دھکیل رہی

---

[1] "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" (توبہ: ۲۹)

تھی کہ اپنے خشک ریگستانوں سے نکلیں اور شمال کے سرسبز علاقوں کا رخ کریں۔ ممکن ہو کچھ لوگوں کو آیندہ زندگی میں بہشت پانے کا شوق دامن گیر ہو، لیکن زیادہ تعداد ایسی تھی جنھیں ہلالِ خصیب کے عیش و آرام حاصل کرنے کی خواہش کچھ کم قوی نہ تھی؛ یہ معاشی پہلو جسے کیتانی، بیکر وغیرہ جدید اہل تحقیق نے دلائل کے ساتھ پیش کیا ہو، عرب تاریخ نویسوں نے بھی بالکل نظر انداز نہیں کیا تھا۔ فتوحاتِ اسلامی کا سب سے معتدل مورخ بلاذری ہو۔ وہ بتاتا ہو کہ حضرت ابوبکرؓ نے شام کی جنگ کے لئے سپاہی طلب کئے تو اہل طائف و مکّہ کو لکھا اور حجاز و نجد و یمن کے جملہ باشندوں کو جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت دی۔ اور مسلمانوں کو اسی کے ساتھ رومیوں کے مال غنیمت کی بھی ترغیب دلائی[1]۔ ایرانی سپہ سالار رستم کا جس نے اپنے ملک کے عرب حملہ آوروں کا مقابلہ کیا، یہ قول منقول ہو کہ عرب قاصد سے اس نے کہا "مجھے معلوم ہوا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس پر تمھیں صرف عسرت و افلاس نے مجبور کیا ہو"[2]۔ حماسۂ ابو تمام کے ایک شعر میں یہ حقیقت بڑی جامعیت سے بیان ہوئی ہو:

فما جنّة الفردوس هاجرتَ تبتغي

ولكن دعاك الخبزُ احسبُ والتمرُ

"تو نے جنت کی خاطر صحرائی زندگی کو نہیں چھوڑا۔
میں تو سمجھتا ہوں روٹی اور کھجور کی طمع اس کا سبب ہوئی"[3]

---

[1] فتوح، ص۱۰۷ [2] بلاذری ص۲۵۶

[3] (اصل شعر کی قاضی اختر میاں صاحب جوناگڑھی نے مہربانی سے حماسہ کے باب السیر والنعاس سے تلاش کر کے مجھے بہم پہنچایا۔ اس میں صحرائی زندگی چھوڑنے کا ذکر نہیں ہو۔ مگر اوپر انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ کر دیا گیا ہو۔ مترجم)

صحرا کے بنجر علاقے سے ہلال خصیب کے سرسبز ممالک میں نقل مکانی کا سلسلہ صدیوں سے جاری تھا۔ اسلام کے اقدام و توسیع کو تاریخ کے چوکھٹے میں ٹھیک ٹھیک جماکر دیکھئے تو یہ اسی سلسلے کی تکمیل منزل اور سامیوں کی آخری بڑی ہجرت تھی ۔ 145

جملہ (عرب) وقائع نویس فتوحات کو بعد کے عواقب کی روشنی میں جانچتے اور اسی لئے ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں کہ خلفائے راشدین خصوصًا حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ نے ان محاربات کا بڑی دور اندیشی اور احتیاط سے انتظام کیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں بہت کم بڑے واقعات ایسے ہوئے ہیں، جن کے نتائج کا آغاز کرنے والوں کو پہلے سے ٹھیک ٹھیک اندازہ ہوگیا ہو۔ ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب قبائل کو آپس کی خوں ریزی سے روکنے کے بعد ضرور تھا کہ ان کے جنگی حوصلے نکالنے کا اور کوئی سامان کیا جائے لہذا یہ حملے شروع کرائے گئے جن کا مقصد مستقل قبضے کی بجائے زیادہ تر مال غنیمت حاصل کرنا تھا۔ انھیں بالکل ہی کسی سوچی سمجھی تجویز کا نتیجہ کہنا دور از کار ہے۔ لیکن ابتدائی حملوں کے لئے جو تنظیم ہوئی وہ پھر بانے والوں کے قابو میں نہیں رہی۔ فتح پر فتح پانے سے تحریک کو اور قوت پہنچتی چلی گئی تب باقاعدہ محاربات کا آغاز اور لازمًا عرب سلطنت کا قیام ہوا۔ ایسی سلطنت کے بنانے میں ارادے کو اتنا دخل نہ تھا جتنا پیش آمدہ حالات اس کی تشکیل کا سبب ہوئے ۔ مکتبی یا مذہبی نظریہ، اسلام کی فتوحات کو نصرتِ الٰہی سے تعبیر کرتا ہے جس طرح یہود کی تاریخ کی تاویل توراۃ میں کی گئی ہے یا نصاریٰ کی تاریخ کے اسباب ازمنۂ وسطیٰ میں (یورپ کے) اہل فکر نے قرار دئے تھے ۔ اسلام کو تین معنی میں استعمال کرسکتے ہیں:

اوّل محض دین کے معنی ہیں، پھر وہ حکومت بنا اور آخر میں ایک تہذیب ہوگیا۔ وہ یہودیت اور پرانے بُدھ مت کی مثل نہ تھا بلکہ ایسا ہی جنگی اور تبلیغی مذہب ثابت ہوا، جیسے نصرانیت۔ نتیجے میں اس نے ایک حکومت تعمیر کی شمال کے خطوں کو جس نے فتح کیا وہ اسلامی دین نہ تھا بلکہ اسلامی حکومت تھی۔ جب اہل عرب بے خبر دنیا پر ٹوٹ کر گرے تو اس وقت وہ ایک وطنی حکومتِ مذہبی کے افراد تھے۔ پہلے جس چیز نے فتح پائی وہ اسلامیت نہ تھی، عربیت تھی۔ شام، عراق، ایران کی اکثریت نے کہیں دوسری تیسری صدی ہجری میں جاکر اسلام قبول کیا۔ ان کی جنگی فتح اور تبدیل مذہب کے درمیان طویل وقفہ عارض ہوا۔ پھر لوگ مسلمان ہوئے بھی تو زیادہ تر ذاتی اغراض کی بنا پر کہ جزیہ دینے سے بچیں اور حکمراں قوم کی برادری میں ہو جائیں[1] رہا اُس کا نشو نما پاکر ایک تہذیب بن جانا، یہ جنگی فتوحات کے بعد آہستہ آہستہ عمل میں آیا۔ سابقہ سامی و ارامی، ایرانی و یونانی تمدنوں کا جو قوام بنا اور ورثہ ہاتھ آیا، اسی پر زمین پر اسلامی تہذیب تیار ہوئی۔ ظہور اسلام سے مشرق قریب نے اپنے تمام سابقہ مقبوضات ہی واپس نہیں لے لئے بلکہ تہذیب کی دنیا میں سابقہ ذہنی تفوق بھی دوبارہ حاصل کر لیا۔

---

[1] (اس سارے بیان میں لائق مصنف نے اپنے ذاتی قیاسات و آرا تحریر کی ہیں۔ یہ بعض جگہ بہت ضعیف اور متضاد پائی جاتی ہیں۔ قبول اسلام کا بڑا سبب خود مذہب کی خوبی اور برتری تھی، مصنف نے اسے بہت کم اہمیت دی ہے۔ اسی طرح یہ کہنا سراسر تاریخ کے خلاف ہوگا کہ شروع میں فاتحین پر عربیت غالب تھی۔ مترجم)

باب دوازدہم ۱۲

47

فتحِ ملکِ شام

ہرقلیس کا اُن دنوں بڑا شہرہ تھا کہ سلطنت شرقیہ (رومہ) کے ٹکڑے دوبارہ جوڑے، مسیحیت کو نجات دلائی اور اصلی صلیب مقدس پھر ایرانیوں سے چھین لایا[۱]۔ قریب قریب اسی زمانے میں جب کہ وہ یہ صلیب یروشلم میں دوبارہ نصب کرا رہا تھا، اُردن کے پار کی فوجوں نے خبر بھیجی کہ ایک عرب دستے نے حملہ کیا جسے آسانی سے پسپا کر دیا گیا۔ یہ لڑائی موتہ میں ہوئی جو صوبہ آل بلقا کی سرحد پر بحر لوط کے نچلے سرے سے مشرق جانب واقع تھا۔ عربی فوج کے سردار زیدؓ ابن حارثہ، پیغمبر صلعم کے متبنّٰی بیٹے تھے۔ ان کے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار تھی[۲]۔ زیدؓ حملے میں شہید ہوئے اور خالد ابن ولید جو انہی دنوں ایمان لائے تھے، ہزیمت خوردہ باقی فوج کو بچا کر لے جانے میں کامیاب ہو گئے[۳]۔ حملے کا ظاہری مقصد یہ تھا کہ

۱؎ یہ ستمبر ۶۲۹ء کی ۱۴ تاریخ تھی۔ لبنان میں اب تک چراغاں سے اس کی یادگار مناتے ہیں۔

۲؎ طبری۔ ۱۔۵ صفحہ ۱۶۱۱۔ مقابلے میں دیکھو تھیوفانس صفحہ ۳۳۶۔

۳؎ (یہ معمولی آویزش تھی جس میں مسلمان شہید ہونے والوں کی تعداد صرف ۱۲ بتائی گئی ہے۔ مصنف کے بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ مترجم)

پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے قاصد کی شہادت کا، جو بُصرا کے غسانی امیر کے پاس بھیجا گیا تھا، انتقام لیا جائے لیکن اصلی غایت یہ تھی کہ موتہ اور مضافات میں اعلیٰ درجے کی مشرفیہ تلواریں[1] بنتی تھیں، انھیں حاصل کیا جائے کہ آیندہ مکے کی مجوزہ مہم میں کام دے۔ ان تلواروں کی ان دنوں بڑی مانگ تھی۔ رومیوں نے اس واقعے کو طبعاً ایسا ہی چھاپا خیال کیا جیسے کہ سرحدی بستیوں پر اکثر پڑتے رہتے تھے اور مستقل باشندے مدت سے اُن کے عادی ہو گئے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی اُس طویل جدوجہد کا پہلا تیر تھا جو بالآخر مغرور قیصر کے دارالسلطنت کے سقوط (۱۴۵۳ء) پر ہی ختم ہونے والی تھی جب کہ اسلام کے تازہ ترین سپاہی میدان میں آئے اور دنیائے مسیحیت کے سب سے شان دار کلیسا ایا صوفیا کے در و دیوار پر حضرت مسیحؑ کی بجائے پیغمبر عرب (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام نامی تحریر ہوا۔

آں حضرت صلعم کی زندگی میں شام کے خلاف مسلمانوں کا صرف یہی موتہ کا معرکہ وقوع میں آیا۔ اگلے سال (۹ھ = ۶۳۰ء) کے غزوۂ تبوک میں آپؐ خود فوج لائے۔ یہود و نصاریٰ کے چند نخلستان حاصل کیے مگر کسی خوں ریزی کی نوبت نہیں آئی[2]۔ ردہ کی لڑائیاں ۶۳۳ء کے
۱۶۴ جاڑوں میں ختم ہونے کے بعد کوئی تین تین ہزار سپاہیوں کے تین دستے مدینے سے جانب شمال بھیجے گئے کہ جنوب اور جنوب مشرق شام پر فوج کشی کریں۔ ان کی قیادت عمرو ابن العاص، یزید ابن ابی سفیان اور

---

[1] "مشارف الشام" سے۔ یہ وہ بلند مقامات تھے جہاں سے شام نیچے نظر آتا ہے۔ دیکھو ڈی گوجی میموائر۔

[2] واقدی ص ۲۲ — بلاذری ص ۵۹۔

شرحبیل ابن حسنہ کے ہاتھ میں تھی[1] یزید کے ہمراہ اس کے بھائی معاویہ فوج کے علم بردار تھے جنھوں نے آیندہ اموی سلطنت کے بانی کی حیثیت سے ناموری پائی۔ یہ دو دستے تبوک و معان کے سیدھے راستے پر چلے تھے اور عمرو براہ ایلہ ساحل ساحل بڑھے۔ تینوں فوجوں کے مل کر لڑنے کی صورت میں سپہ سالاری عمرو ابن العاص ہی کے تفویض کی گئی تھی۔ آگے چل کر ہر دستے کو مزید کمک بھیجی گئی کہ ہر ایک کی تعداد ۷½ ہزار سپاہی ہو گئی۔ انھی کمکی فوجوں میں سے غالباً ایک کے سردار حضرت ابوعبیدہؓ ابن الجراح تھے جو کچھ مدت بعد جملہ افواج کے صدر سپہ سالار مقرر ہوئے ان کی کمکی فوج مدینے سے دمشق کی قدیم کاروانی شاہ راہ پر چلی تھی جو اب حاجیوں کا بہت مشہور راستہ ہے۔

پہلا مقابلہ وادی عربہ میں ہوا۔ یہ بحر لوط کے جنوب میں وسیع نشیب ہے۔ قیصریہ کے حاکم اور فلسطین کے نواب (= پیٹ ری شیئن) سرجیوس کو یزید نے شکست دی اور جب وہ غزہ کی طرف پسپا ہوا تو راستے میں داثن پر آگھیرا اور کئی ہزار بائی زنطی سپاہی تقریباً سب کے سب مارے گئے (۴ر فروری ۶۳۴ء)۔ لیکن دوسرے مقامات پر بائی زنطیوں کو قدرتی فوائد حاصل تھے اور مسلمان حملہ آور پریشان ہو رہے تھے۔ ہرقلیس کا قدیم وطن رُہا (= اڈیسہ) تھا۔ اس کی جنگ آرائی ایرانیوں سے شام و مصر کو صاف کرا چکی تھی۔ وہ خود بہ عجلت حمص پہنچ گیا کہ تازہ لشکر آراستہ کرے اور اپنے بھائی تھیوڈورس کے ماتحت جنوب میں بھیجے۔

---

[1] ملاحظہ ہو۔ الی بصری کی "فتوح الشام" (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۴ء) ص ۴۰

اس عرصے میں "خدا کی تلوار" یعنی (سیف اللہ) خالدؓ ابن ولید کو جو ایرانی سرحد پر بنو شیبان کے ہمراہ مصروفِ جنگ تھے، حضرت ابوبکرؓ کا حکم پہنچا کہ فوراً شامی محاذ پر جائیں اور اپنے ساتھی سپہ سالاروں کو مدد دیں۔ (بنو شیبان ایرانی عراق کی سرحد پر بکر ابن وائل کے قبیلے کی ایک شاخ تھے) حضرت خالد کے سپاہی تعداد میں پان سو کے قریب گر ردّہ کی لڑائیوں کے آزمودہ کار تھے اور ہر چند عراق پر ان کا یہ چھوٹا سا حملہ ممکن ہو کہ خلیفۂ اسلام کی بغیر اطلاع عمل میں آیا ہو، درحقیقت مسلمانوں کی تیغ آزمائی کا اہم آغاز تھا۔ لیکن مدینہ اور حجاز کے نقطۂ نظر سے ہمسایہ شام کی فکر مقدم تھی۔ بارے اس عرصے میں کہ حضرت ابوبکرؓ کے احکام جاری ہوں، الحیرہ نے خالدؓ اور ان کے حلیف بنی شیبان کے آگے ہتیار ڈال دئے۔ اس قبیلے کا سردار مُثنّیٰ ابن حارثہ تھا۔ حیرہ سے ساٹھ ہزار ۱۴۹
درہم تاوان لیا گیا۔ اصل جزیرہ نمائے عرب کے باہر یہ ریاست جس پر ایک عیسائی عرب ملک حکومت کرتا تھا، سب سے پہلا اسلامی مقبوضہ اور دولت ایران کے درخت کا ٹوٹا ہوا پہلا سیب تھا جو مسلمانوں کے دامن میں گرا۔ کوفہ کے شمال مغرب میں صحرا کا مورچہ بند مقام عین التمر بھی شام کی طرف اپنی مشہور یلغار کرنے سے پہلے حضرت خالدؓ نے فتح کر لیا۔[1]

شام کی پرخطر یلغار

حضرت خالدؓ کا صحرا میں یہ کوچ کئی تاریخی اور جغرافی سوال پیدا کرتا ہے کیوں کہ مختلف مصنفوں نے مختلف راستے اور تاریخیں

[1] واقدی، ص۲۱۔ ابن عساکر "تاریخ کبیر" (دمشق ۱۳۳۲ھ) ۱، ۵۔ ص۲۳

لکھی ہیں[1]۔ ان سب ماخذوں کو احتیاط سے جانچا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ غالباً وہ حیرہ سے چلے (مارچ ۶۳۴ء) اور جانب مغرب صحرا کو طے کرکے دومۃ الجندل[2] کے نخلستان میں پہنچے جسے آج کل الجوف کہتے ہیں یہ شام و عراق کے سب سے سہل راستے پر وسط میں واقع ہے۔ یہاں سے وادیٔ سرحان کے راستے شام کے پہلے دروازے یعنی بُصریٰ تک جاسکتے تھے لیکن راستے میں کئی جنگی قلعے تھے لہٰذا اُنھوں نے وادی کے مشرقی کنارے سے شمال مغرب میں قُراقِر[3] کی راہ اختیار کی اور وہاں سے شام کے دوسرے دروازے سُوا[4] کا رُخ کیا جو تقریباً بے آب ریگستان میں پانچ دن کا سفر تھا۔ قبیلۂ طے کا ایک شخص رافع ابن عُمیرہ نامی تھا۔ سپاہیوں کے لئے پانی کے مشکیزے بھر لئے تھے لیکن گھوڑوں کے واسطے بڈھے اونٹوں کے پیٹ جنھیں آگے ذبح کرکے کھایا گیا، پانی کا خزانہ بنے[5] سپاہی کل پانسو تا آٹھ سو اور سب اونٹوں پر سوار تھے۔ تھوڑے سے گھوڑے جن سے جنگ میں کام لینا تھا، کوتل ساتھ لائے گئے۔ دھوپ کی تیزی سے ریت میں وہ چمک تھی کہ ایک جگہ رافع کی آنکھیں چُندھیا گئیں اور وہ پانی کا متوقع نشان نہ دیکھ سکا۔ ساتھیوں سے کہا تم دیکھو یہاں کوئی کانٹوں کی جھاڑی ہے۔ اسی کے قریب کھودا تو گیلی ریت نکلی اور پانی

---

[1] دیکھو بلاذری، یعقوبی (ج ۲ ص ۱۵۰) طبری (ج ۱ ص ۲۱۲۲) ابن عساکر، ابن اثیر وغیرہ۔ مختلف عبارتوں کے تنقیدی مطالعے کے لئے ملاحظہ ہو موزل: "اریبیا ڈیزرٹا" ص ۵۵۳۔

[2] اس کا قیدار کی کتاب آفرینش میں ذکر آتا ہے ۲۵ : ۱۴ — اور اشعیا ۲۱ : ۱۱۔

[3] آج کل "قلبان قراقرہ" کہتے ہیں۔

[4] دمشق کے شمال مشرق میں موجودہ سبع بیار کے قریب تھا۔

[5] اشوری پہلے بھی اپنے کتبوں میں لکھا ہے کہ دشمن عرب "جو سواری کے اونٹوں کے پیٹ چاک کرتے ہیں" [illegible] ج ۵ [illegible] موزل [illegible]۔

رستے لگا کہ پیاسی فوج کی جان میں جان آگئی ۔

ایک ناگہانی کرشمے کی طرح حضرت خالدؓ دمشق کی نواح اور بائی
زنطی افواج کے عین عقب میں نمودار ہوئے۔ پورا سفر اٹھارہ دن میں
150 طے کرلیا اور آتے ہی ہر طرف چھاپے مارنے شروع کئے۔ انہی میں ایک
مرتبہ غسانیوں سے عین ان کے ایسٹر (= عید الفصح) کے اتوار کو مرج
راحت[1] میں مقابلہ ہوا۔ غسانیوں نے شکست کھائی۔ حضرت خالدؓ بصریٰ
(= اسکی شام یا پرانے دمشق) کی طرف فاتحانہ بڑھے، بظاہر دوسری
عرب فوجوں سے یہیں اتصال قائم کرنے میں کامیاب ہوئے اور ۳۰؍
جولائی ۶۳۴ء کے دن اجنادین[2] کے خوں ریز معرکے میں فتح پائی جس نے
عملاً سارے فلسطین کا راستہ کھول دیا۔ متحدہ فوجوں کی اعلیٰ قیادت اب
حضرت خالدؓ کے ہاتھ میں آئی اور باضابطہ جنگ آرائی کا آغاز ہوا۔
بصریٰ غسانیوں کا ایک صدر مقام تھا یہ کسی بڑی مزاحمت کے بغیر قبضے
میں آگیا۔ فحل (یا فحل، یونانی: پلا) کہ اردن کے مشرق میں اس کی
شاہ راہ پر زد رکھتا تھا، جنوری ۶۳۵ء میں فتح ہوا۔ دوسری طرف
شام کے دارالحکومت دمشق کے راستے میں مرج الصُفّار[3] پر دشمن بری
طرح شکست کھا کے بھاگا۔ اور یہ راستہ صاف ہوتے ہی دو ہفتے میں خود
حضرت خالدؓ اس شہر کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے جسے روایتوں
میں دنیا کا سب سے پرانا شہر بتایا گیا ہے۔ پولوس ولی کی شب فرار،

---

[1] یہ دمشق سے پندرہ میل دور عذرا کے قریب غسانیوں کا پڑاو تھا۔

[2] اسے جنابتین بھی کہتے ہیں۔ غزہ اور یروشلم کے راستے پر رملہ کے قریب واقع ہے۔

[3] دمشق سے ۲۰ میل جنوب میں ایک میدان کا نام ہے۔

تاریخ میں فراموش نہ ہوگی جب کہ وہ ٹوکرے میں بیٹھ کر اسی شہر کی فصیل سے اُتارے گئے تھے۔ یہی دمشق چند سال بعد اسلامی سلطنت کا دار الخلافہ بننے والا تھا۔ مسلمانوں نے ۶ مہینے تک اس کا محاصرہ کیا، پھر شہری اور کلیسائی حکام کی غداری سے یہ ستمبر ۶۳۵ء میں تسخیر ہوگیا۔ غداری کرنے والوں میں سینٹ جون کے دادا بھی شامل تھے اور یہ وہ سینٹ جون ہے جس کا حال بنی اُمیہ کے عہد میں ہم آگے بھی پڑھیں گے۔ قلعے کی رومی فوج شہر کو چھوڑ گئی۔ شہری آبادی نے اطاعت قبول کر لی۔ یہاں جو شرائط طے ہوئی تھیں وہی شام و فلسطین کے باقی ماندہ شہروں کے لیے نمونہ بنیں۔ یہ حسب ذیل ہیں:-

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ خالد ابن ولید شہر میں داخل ہو تو وہاں کے باشندوں کے حق میں یہ وعدہ کرتا ہے: اُن کی جان، مال، گرجا محفوظ رہیں گے۔ شہر کی فصیلیں نہیں گرائی جائیں گی۔ نہ کوئی مسلمان اُن کے گھروں میں مقیم ہوگا۔ یہ خدا کا میثاق، اور اُس کے پیغمبرؐ، خلفاء، اور مسلمانوں کی حفاظت کا وعدہ ہم انھیں دیتے ہیں۔ جب تک وہ جزیہ ادا کریں گے انھیں بھلائی کے سوا کوئی نقصان نہ پہنچے گا"[1]

جزیہ ایک دینار اور ایک جریب (گیہوں کا پیمانہ) فی کس پر مشتمل تھا جس میں حضرت عمرؓ کے عہد میں اضافہ کیا گیا۔ حمص، حماہ اور دوسرے شہر اس طرح فتح ہوئے جیسے ہوا سے تنکے گر جاتے ہیں۔ فاتحؓ قدم بڑھائے چلا آتا تھا۔ اس کے سامنے کوئی حائل نہ رہی تھی۔ "شیزر کے

[1] بلاذری ص ۱۲۵

باشندے، آمد کی خبر سن کر گویّوں اور طنبور بجانے والوں کے ساتھ پیشوائی کو آئے اور اس کے روبرو سر اطاعت خم کر دیا۔"[1]

یرموک کا فیصلہ کُن معرکہ

اس اثنا میں ہرقل نے ایک اور پچاس ہزار سپاہیوں کا لشکر دوبارہ اپنے بھائی تھیوڈورس کی قیادت میں مرتّب کیا اور جم کر مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ حضرت خالدؓ نے حمص بلکہ دمشق اور دوسرے جنگی موقع کے شہروں سے بھی اپنی فوجیں ہٹاکر وادیٔ یرموک[2] میں جمع کیں۔ یہ چھوٹی سی ندی کا نام ہے جو (بُصریٰ) کے مشرق کی طرف سے نہر اُردن میں آگرتی ہے۔ اسلامی فوج کی تعداد کوئی پچیس ہزار ہوگی[3] بہت دن تک مختلف دستے اِدھر اُدھر باہم ٹکراتے رہے حتیٰ کہ ۲۰/اگست ۶۳۶ء کے تپتے دن میں پوری فوج کا زبردست معرکہ پڑا۔ یہ دُنیا کا ایک گرم ترین مقام ہے اور اُس روز آندھی اور غبار سے مطلع دُھندھلا ہوگیا تھا۔ بے شبہ اسی کو عرب سپہ سالار نے لڑائی کے لئے معیّن کیا۔ جس وقت صحرائے عرب کے فرزند پوری قوت سے دشمن پر گرے تو

---

[1] بلاذری ص۱۳۱

[2] صحیفۂ یوشع بنی، ۱۰: ۳ میں ایک جُرمتّ کا نام آتا ہے اور وہ بھی آج کل اجنادین کے قریب خربت یرموک کہلاتا ہے۔ مگر یہ یرموک بالکل دوسرا اور اس جگہ واقع ہے جہاں اس نام کی ندی رودِ رُقّاد سے مل کر تھوڑی دُور تک بڑھتی اور دریا یا نہر اُردن میں جاگرتی ہے۔

[3] عربی تاریخوں میں رومی فوج کی تعداد ایک لاکھ سے دو لاکھ چالیس ہزار تک اور مسلمان چالیس ہزار بتائے گئے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں نہ یونانی تحریریں قابل اعتماد ہیں۔ اس کی بحث کے لیے دیکھو ای کل لِ سی ریاں: "کرانیک"۔ ج ۴ ص۲۱۴ (پیرس ۱۹۱۰ء)

اس تیز و تند حملے کے آگے رومی سپاہ کی جد و جہد جسے پیر پادریوں کی دعاؤں اور مناجاتوں کی برکت حاصل تھی اور وہ اپنی صلیبیں[1] اٹھائے ہوئے فوج کے ساتھ تھے، کچھ کام نہ آسکی۔ جو رومی سپاہی اور ان کے ارمنی وعرب ہمنوا میدان میں مارے جانے سے بچے، انھیں کھدیڑ کھدیڑ کر یرموک ندی اور وادی رُقاد کے پشتے میں ڈھکیل دیا گیا۔ تھوڑے بہت جو ندی اُتر کے کسی طرح دوسرے کنارے تک سلامت پہنچ گئے انھیں اُدھر تلوار کے گھاٹ اتارا گیا۔ خود تھیوڈورس کام آیا۔ قیصر کا لشکر محض بے حواس بھاگتی ہوئی بھیڑ رہ گیا۔ اسی جنگ نے شام کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور یہ شاداب صوبہ دولتِ بائی زنطہ کے ہاتھ سے ہمیشہ کے لیے نکل گیا۔ ہرقل کے وداعی الفاظ یہ نقل کئے گئے ہیں: "او ملک شام، رخصت۔ اور دشمن کے لیے تو کیا ہی نفیس ملک ہے"[1]

فتح کے بعد امن و انتظام کی قابلیت دکھانے کا وقت آیا۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر خالدؓ سے کچھ کدسی رکھتے تھے[2] ان کی جگہ حضرت ابو عبیدہؓ شام کے امیر اور خلیفہ کے نائب مقرر کئے گئے۔ مدینے کی حکومت الٰہیہ کے ممتاز اکابر اور محترم ترین صحابہؓ میں ان کا شمار تھا اور حملہ آور لشکروں میں سے ایک لشکر کے سپہ سالار ہو کر شام آئے تھے۔ اب خالدؓ کو لے کر وہ شمال کی طرف چلے تو اس ملک کی قدرتی

---

[1] طبری، ص ۱۹۱۔ ابن عساکر۔ ج ۱ ص ۱۶۳ [2] بلاذری ص ۱۳۷

[2] (مصنف نے حضرت ابو عبیدہؓ کو پچھلے باب میں مدینے کی مفروضہ مطلق العنان حکومت ثلاثہ کا رکن قرار دیا تھا۔ یہاں شام کی امارت بھی شاید اسے پسند نہیں۔ حضرت خالدؓ سے فاروق اعظمؓ کی کسی ذاتی وجہ خصومت کی خفیف ترین شہادت بھی تاریخوں میں موجود نہیں پھر ایسے نفوس زکیہ سے بدگمانی کرنا کس طرح جائز ہوگا۔ مترجم)

سرحد، یعنی کوہ طارس تک کوئی اہم مزاحمت پیش نہ آئی اور جو شہر پہلے فتح کرکے چھوڑ دئے تھے ، ان کے دوبارہ لینے میں کوئی دشواری نہ ہوئی ذیل کا بیان حمص والوں سے منسوب اور حقیقت میں نئے فاتحین کی نسبت شامی جذبات کا نمونہ ہے :

"ہم تمہاری حکومت اور تمہارے انصاف کو اُس ظلم و تعدی پر ہزار درجے ترجیح دیتے ہیں جس کے تحت میں اب تک زندگی گزار رہے تھے"[۵۱]

انطاکیہ، حلب اور دوسرے شمالی شہر جلد ہی فہرست مفتوحات میں شامل ہو گئے۔ صرف قنسرین (= کال کیس) سے معاملہ کرنے میں مشکل پیش آئی۔ جنوب میں یوروشلم اور قیصریہ پر یونانیت کا رنگ چڑھا تھا۔ پہلے نے ۶۳۸ء تک اپنے پھاٹک مضبوطی سے بند رکھے قیصریہ کو سمندر سے مدد ملتی تھی جسے روکنے کا عربوں کے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا لیکن آخر پے درپے چھاپے اور محاصرے کا انجام یہ ہوا کہ وہ معاویہ رض کے حملے کی تاب نہ لایا اور شہر پناہ کے اندر ایک یہودی کی غداری کی مدد سے تسخیر کر لیا گیا۔ پورا ملک شام، شمال سے جنوب تک (۶۳۳ تا ۶۴۰ء) سات سال کے اندر مسلمانوں کے زیر نگیں آگیا[۵۲]

اس "آسان فتح" کے چند خصوصی اسباب تھے۔ سکندر اعظم کی فتح کے وقت (۳۳۲ ق م) سے یونانی تہذیب کا جو روغن ملک پر چڑھایا گیا وہ فقط اوپر کی سطح پر، اور شہری آبادی تک محدود تھا۔ دیہات والے اپنے اور اپنے حاکموں کے درمیان نسلی اور ذوقی فرق برابر محسوس کرتے

---

[۵۱] بلاذری صـ ۱۳۷۔
[۵۲] بلاذری صـ ۱۱۶ وغیرہ۔

رہے۔ مذہبی فرقہ بندیوں نے شام کی سامی رعایا اور یونانی حکمرانوں میں اور نفرت بڑھادی تھی۔ شام کے حلولی (" مونوفی زی") فرقے کے عیسائی اس عقیدے پر جمے ہوئے تھے کہ حضرت عیسیٰؑ ایک ہی فطرت رکھتے تھے اور کال سی ڈن کے اجلاس ۴۵۱ء میں مسیحی علما نے فیصلہ کیا تھا کہ ان کی ربانی اور بشری، دو فطرتیں جداگانہ تھیں۔ اسی عقیدے کو بازنطہ کے یونانی کلیسا نے قبول کر لیا تھا۔ پھر قسطنطنیہ کے بطریق سرجیوس[1] نے یہ عقیدہ نکالا کہ ایک یا دو فطرتوں کے سوال کو نظر انداز کر کے حضرت مسیحؑ کے وحدت ارادہ ("تھالیما") پر زور دیا۔ قیصر ہرقل نے اسی کی بنیاد پر ۶۳۸ء میں بین بین صورت تجویز کی اور جو لوگ اس نئے عقیدے کو مانتے تھے وہ متوحدین (= "مونوثلیت") مشہور ہوئے۔ لیکن جیسا کہ مذہبی مباحث میں ہوتا ہے، یہ اصلاحی شکل نہ راسخ العقیدہ فرقے کو پسند آئی نہ مخالفت کرنے والے رضامند ہوئے لہٰذا ایک تیسرا گروہ اور نیا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ بہرحال، شامی عیسائی بیشتر حلولی عقیدے پر قائم رہے۔ ان کے جداگانہ فرقہ بنانے اور اس پر جمے رہنے کی تہ میں اپنی الگ قومیت کا احساس بھی ضرور کارفرما تھا اگرچہ اس کا اظہار دبے لفظوں ہی میں ہوتا تھا۔

عربوں کا نظم و نسق

یروشلم کی تسخیر سے چند روز ہی پہلے خلیفۂ ثانی حضرت عمرؓ مسلمانوں کی چھاؤنی جابیہ میں تشریف لائے۔ یہ پڑاؤ یرموک کے میدان جنگ

---

[1] یہ یعقوبی خاندان کا شامی تھا۔

سے کچھ اوپر واقع تھا اور دمشق کا مغربی دروازہ آج تک اسی نام کا حامل ہے۔ حضرت عمرؓ کے آنے کا مقصد یہ تھا کہ فتح کی توثیق، مفتوحوں کے درجے کا تعین اور صدر سپہ سالار ابو عبیدہؓ سے مشورت کے بعد مفتوحہ علاقوں کا جدید انتظام اور ضروری قاعدے ضابطے نافذ کئے جائیں۔ یروشلم فتح ہوا تو حضرت عمرؓ اس شہر میں بھی آئے۔ وہاں کے بطریق سوفرونیوس نے انھیں مقدس مقامات کی سیر کرائی۔ یہ پادری کلیسا کا "انگبین زبان وکیل" کہلاتا تھا، سن رسیدہ خلیفۂ عرب کے موٹے جھوٹے کپڑے اور دیہاتی طور طریق دیکھ کر ایسا جز بز ہوا کہ کہتے ہیں اپنے ایک خادم کی طرف مڑ کر یونانی زبان میں بولا کہ دانیال نبی نے بیت المقدس میں جس تباہی کی زشت نشانی کھڑے ہونے کا ذکر کیا ہے، بے شک وہ یہی ہے[1]

زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا کہ عمواس کے طاعون میں ابو عبیدہؓ کا انتقال ہوا۔ کہتے ہیں اُن کے بیس ہزار سپاہی اسی وبا کا شکار ہوئے اور جب ان کا جانشین یزید بھی مرگیا تو زمام اختیار موقع شناس معاویہ کے ہاتھ میں آئی۔ اب شام کو چار جنگی اضلاع (= جُنود) میں تقسیم کیا گیا۔ فتح کے وقت رومی صوبے بھی اسی کی مثل تھے۔ یہ دمشق، حمص، اُردن اور فلسطین تھے۔ اُردن میں صحرائے شام تک جلیل کا علاقہ شامل تھا اور مرج ابن عامر کے وسیع میدان کے جنوب سے فلسطین کی حد

---

[1] تھیو فانس، ص ۳۳۹۔ نیز دیکھو "ہیٹ رولوجیاگری کا" ج ۳ - ۶۳۔ (پیرس ۱۸۶۴ء) (تھیوفانس نویں صدی عیسوی کا یونانی یا بائی زنطی وقائع نویس ہے۔ اس کی کتاب جس صورت میں یورپ میں اب موجود ہے، اس میں اسلام اور مسلمانوں کی نسبت سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ مترجم)

شروع ہوتی تھی۔ شمالی صوبہ قنسرین کا الحاق کچھ مدت بعد یزید (ابن معاویہؓ) کے عہد میں ہوا ؛

جب دنیا کی سب سے طاقت ور سلطنت کے ہاتھ سے اتنا بڑا جنگی اہمیت کا صوبہ دیکھتے دیکھتے اس نے چھین لیا، تو سب کی نظروں میں اسلامی حکومت کی قدر و منزلت بڑھ گئی اور زیادہ اہم فائدہ یہ ہوا کہ خود مسلمانوں کو اپنے مستقبل پر اعتماد ہو گیا۔ شام ہی سے عربی جیوش تند کی طرح ملک مصر میں در آئے اور پھر تمام شمالی افریقہ کے ملکوں میں فاتحانہ بڑھتے چلے گئے۔ دوسری طرف شام کے مرکز سے ارمنیہ، شمالی عراق، جرجستان (= جورجیہ) اور آذربی جان پر پیش قدمی ممکن ہو گئی اسی طرح ایشیائے کوچک پر چھاپے مارنے اور حملے کرنے کا موقع نکل آیا، جن کا سلسلہ آئندہ ایک زمانے تک جاری رہا۔ شامی فوجوں ہی کی مدد سے اور پیغمبر (علیہ الصّلوٰۃ والسلام) کے بعد ایک صدی کے اندر، یورپ اقصیٰ کا ملک اندلس دولت اسلامی کے روز افزوں حلقے میں داخل کر لیا گیا ؛

باب سیزدہم ۱۳

فتوحات عراق و ایران

155

۶۳۴ء میں جب حضرت خالدؓ نے حیرہ سے جانب مغرب اپنی یادگار یلغار کی تو عراق کے محاذ کو اپنے بدو حلیف اور بنو شیبان کے شیخ المثنیٰ ابن حارثہ کے تفویض کر دیا تھا۔ اُدھر سے ایرانی بھی جوابی حملے کی تیاریاں کر رہے تھے اور پُل کی جنگ میںؑ جو ۲۶ نومبر ۶۳۴ء کو حیرہ کے قریب ہوئی اُنھوں نے عرب دستوں کا قریب قریب خاتمہ کر ڈالا تھا۔ مگر المثنیٰ ذرا نہ ڈرا اور دوسرے سال اکتوبر یا نومبر میں ایرانی سپہ سالار مہران پر فتح حاصل کی۔ یہ لڑائی فرات کے کنارے البُوَیب میں ہوئی تھی۔ لیکن المثنیٰ محض ایک بدو سردار تھا۔ مکے، مدینے سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی حیات مبارک میں وہ اسلام سے بے خبر رہا اور بعد میں ایمان لایا تھا نظر بریں خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ نے اس طرف حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص کو تازہ دم فوج کا سپہ سالار بناکر بھیجا۔ یہ اُن صحابہ میں تھے جنھیں جنگ بدر

ؑ فرات کے پار۔ دیکھو بلاذری ص ۲۵۱۔ طبری ۱/۵ ص ۲۱۷۴۔

کے بعد آں حضرت صلعم نے جنت کی خوش خبری سنائی تھی۔ اس عرصے میں یرموک کی فتح عظیم نے شام کی قسمت پر مہر بھی لگادی تھی حضرت سعدؓ نے اپنے چھ ہزار سپاہیوں سے پہلی مرتبہ دولت ایران کے ناظم اعلیٰ رستم سے قادسیہ میں تیغ آزمائی کی جو حیرہ سے کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ یہ مئی ۶۳۷ء کی آخری یا جون کی پہلی تاریخ تھی۔ سخت گرمی پڑ رہی تھی اور آندھی کے غبار نے یہاں بھی کچھ جنگ یرموک ہی کی طرح دن کو مکدر کر دیا تھا۔ اس معرکے میں وہی جنگی تدابیر کی گئیں اور ویسا ہی نتیجہ برآمد ہوا۔ رستم مارا گیا۔ ساسانیوں کا لشکر کثیر بدحواس ہوکر منتشر ہوگیا۔ دجلے کے مغرب میں عراق کے تمام سرسبز نشیبی قطعات حملہ آوروں کے قدموں تلے آ گئے[1] شامی کسانوں نے جس تپاک سے مسلمانوں کا خیر مقدم کیا تھا، یہاں کے ارامیوں نے کچھ کم گرم جوشی نہیں دکھائی اور اس کے اسباب وہی تھے کہ سامی نژاد عراقی ایرانی آقاؤں کو غیر سمجھتے تھے اور نئے آنے والوں سے قریبی نسلی رشتہ 126 محسوس کرتے تھے۔ عیسائی ہونے کی بنا پر بھی ایران کے زرتشتی ان سے کوئی ہمدردانہ برتاؤ نہ کرتے تھے۔ عراق عرب کی سرحد پر اسلام سے صدیوں قبل سے چھوٹے چھوٹے عرب ملوک و شیوخ کی عمل داریاں رہی تھیں۔ بلکہ قدیم بابلی عہد میں ہی یہاں کے باشندوں سے اہل عرب کے گہرے تعلقات قائم ہوئے۔ اُن کے تمدن سے عربوں نے

---

[1] لفظ عراق غالباً پہلوی زبان سے عربی میں آیا۔ اس کے معنی نشیبی زمین کے ہیں اور عربی "سواد" سے مماثلت رکھتا ہے جو صحرائے عرب کے مقابلے میں ہریالی مٹی کے لئے بولتے تھے۔ دیکھیے یاقوت ج ۳ ص ۶۲۸ [illegible] : ہسٹری آف دی عربز [illegible]

واقفیت حاصل کی ۔ بدوخون کی بھی عراقیوں میں آمیزش ہوتی رہی اور یہ سب اسباب گویا دوآبۂ عراق پر عرب کی سیادت کا پیش خیمہ تھے۔ جس طرح فتح یرموک کے بعد شام میں ہوا تھا، ادھر بھی نومفتوح علاقے میں قبائل عرب کے صدہا خاندان معاشی فوائد کی بنا پر کھنچ کھنچ کر آنے لگے ؛

حضرت سعدؓ کا دوسرا مطمح نظر ایرانی پائے تخت تسی فون[1] تھا۔ اپنی فطری ہمت و مستعدی کے ساتھ وہ تیزی سے بڑھے اور ایک مناسب معبر سے دجلہ عبور کر لیا۔ حال آں کہ برسات کے سیلابوں سے اس میں بہت پانی بھرا تھا۔ اس دشوار کام میں فوج کا ایک شخص بھی ضائع نہ ہوا۔ جسے مسلمان مؤرخ خدائی معجزہ بتا کے بڑی تعریف کرتے ہیں۔ جون ۶۳۷ء میں عرب فاتح سپہ سالار ایران کے دار السلطنت میں مظفر و منصور داخل ہوئے ۔ شہنشاہ اور مقامی فوج اسے چھوڑ کر چل دی تھی ۔ یہاں جو خزائن واموال ہاتھ آئے اس کی کیفیت بیان کرنے میں عرب وقائع نویس ایک سے ایک بڑھ کر مبالغہ کرتے ہیں ان کا تخمینہ نو ارب درہم کی مالیت ہے[2] ؛

مغربی ایشیا کے سب سے بڑے بادشاہی شہر پر قبضہ ہونے سے بنجر عرب کے بچوں کو اس عہد کی اعلیٰ زندگی کے سامان عیش و تکلفات سے براہ راست سابقہ پڑا ۔ ایوان کسریٰ قصر بادشاہی کے وسیع درباری

---

[1] عربی = المدائن = جس کے لفظی معنی کئی شہر کے ہوتے ہیں۔ یہ دجلے کے دونوں جانب کے شہروں سلوکیہ اور تسی فون کے لیے بولتے تھے ۔ موجودہ بغداد سے کوئی بیس میل جنوب مشرق میں واقع تھا ؛

[2] طبری ۱۵۔ صفحہ ۲۴۳۶ ؛ نیز ملاحظہ ہو ابن اثیر ۲ صفحہ ۴۰۰ ؛ کیتانی ۔ ج ۳ صفحہ ۷۴۴ ۔

ایوان نفیس دالان، بیش بہا فرش فروش اور زینت کے ساز و سامان جن کی یاد عربی اشعار میں محفوظ ہے، اب حضرت سعدؓ کے ہاتھ میں تھے۔
عربی تاریخوں میں اِدھر اُدھر جو قصے بکھرے پڑے ہیں، وہ نہ صرف مزہ دار بلکہ سبق آموز بھی ہیں۔ اور اُن سے دونوں قوموں کے تہذیبی مذاق کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً، کافور کو عربوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ قدرتی طور پر نمک سمجھے اور کھانا پکانے میں استعمال کر لیا[1] الصفرا یعنی سونا عرب میں نامعلوم سی چیز تھی۔ اسے بہت سے سپاہی البیضا (= چاندی) سے بدلنے پر تیار ہو گئے[2] حیرہ کے ایک جنگ جُو کو لوگوں نے ملامت کی کہ مال غنیمت میں اس کے حصے میں ایک امیرزادی آئی تھی، اُسے صرف ایک ہزار درہم میں بیچ ڈالا تو اس نے جواب دیا کہ مجھے خیال تک 57
نہ تھا کہ دس سو سے اوپر بھی کوئی عدد ہوتا ہے[3]

قادسیہ اور مدائن کی لڑائیوں کے بعد بصرہ مسلمانوں کی نئی چھاؤنی بنا اور سلطنت ایران کی باضابطہ فتح کا کام شروع ہوا۔ حضرت عمرؓ کا قطعی حکم تھا کہ قسطنطین کی بجائے کوفہ جہاں فوج کا پڑاؤ تھا، صدر مقام قرار دیا جائے۔ یہ پُرانے عرب شہر الحیرہ کے قریب تھا یہیں حضرت سعدؓ نے عراق کی سب سے پہلی مساجد میں ایک مسجد تعمیر کی؛ اُدھر ساسانی بادشاہ یزدگرد ثالث اپنے درباری خدم و حشم کے ساتھ جانب شمال فرار ہو رہا تھا۔ ایرانی سطح مرتفع کے کنارے، بہ مقام جلولا ایک

---

[1] ابن الطقطقا: "الفخری" (پیرس ۱۸۹۵ء)، ص ۱۲۱۔

[2] "فخری" ص ۱۱۱۔ نیز دیکھو دینوری: "الاخبار الطوال" (لائیڈن ۱۸۸۸ء۔ ص ۱۳۲)

[3] بلاذری، ص ۲۶۳۔

اور مقابلہ (اواخر ۶۳۷ء) ایرانیوں کی ناکامی پر ختم ہوا۔ اسی کے ساتھ سارا عراق فاتحین کے قدموں میں سرنگوں نظر آیا۔ ۶۴۱ء میں موصل پر پیش قدمی کی گئی۔ یہ قدیم نینوہ کے مقام کے قریب تھا مسلمانوں کی یہاں آمد اور فتح نے اس مہم کا مقصد پورا کر دیا جسے عیاض ابن غنم شمالی شام سے لے کر آئے تھے۔ اسی سال ایک اور بڑا معرکہ نہاوند (قدیم اک بٹانا یا ہمدان کے قریب) میں لڑا گیا۔ عرب سپاہ کی قیادت حضرت سعد کا بھتیجا کر رہا تھا۔ یزدگرد کی باقی ماندہ فوج مقابلے میں تھی اور اُسے سخت ہلاکت خیز شکست نصیب ہوئی۔ بصرے اور کوفے سے عرب لشکروں نے بڑھ کر پورے خوزستان پر قبضہ کر لیا (جسے عہد قدیم میں ایلم اور پھر سوسیانا کہتے تھے۔ آج کل "عربستان" کہلاتا ہے) دوسری طرف بحرین سے جو کوفے اور بصرے کے علاوہ مسلمانوں کی تیسری چھاؤنی بن گیا تھا، خلیج فارس کے مشرقی جانب صوبہ پارس پر حملہ کیا گیا[1]۔ اب غیر سامی قومیں سامنے تھیں اور اُن کی مزاحمت بڑھ رہی تھی جس کا قلع قمع بصرے کے والی عبداللہ ابن عامر نے کیا کہ ۶۴۹ — ۵۰ء[2] میں اس ولایت کا صدر مقام اصطخر چھین لیا۔ ولایتِ پارس (یا فارس خاص) کے بعد سب سے بڑی اور بعید ولایت خراسان کی باری آئی اور پھر دریائے سیحوں تک مسلمانوں کو روکنے والا کوئی نہ رہا۔ اس کے نیچے ۶۴۳ء کے چند ہی روز بعد موجودہ بلوچستان کا ساحلی علاقہ مکران زیرنگیں آیا جس نے مسلمان عربوں کو ہندوستان کی سرحدوں تک پہنچا دیا۔

---

[1] بلاذری صفحہ ۳۸۶۔ [2] دیکھو طبری۔ ج ۱ صفحہ ۲۸۳۰ - کیتانی - ج ۴ صفحہ ۱۵۱ وغیرہ وغیرہ۔

بائی زنطی آرمینہ پر پہلی پیش قدمی عیاض نے کی تھی۔ پھر کوئی چار برس گزرے تھے کہ حبیب ابن مسلمہ کی سرداری میں ایک مہم شام سے بھیجی گئی۔ لیکن اس صوبے کی فتح ۶۵۲ء کے قریب تکمیل کو پہنچ سکی[1]۔

ان سب فتوحات اور جدیدہ مقبوضات کا صدر مقام کوفہ بن گیا حضرت عمرؓ تاکید فرماتے تھے کہ حجازی سادگی اور قدیم وضع کی پابندی کی جائے مگر حضرت سعدؓ نے پروا نہ کی اور یہاں تِسی فون کے شاہی محل کے نمونے پر شان دار حویلی بنوائی۔ پرانے پائے تخت کے دروازے اکھڑوا کے نئے صدر مقام میں لگائے گئے۔ یہ گویا انقلاب حکومت کا نشان تھا ایشیا میں. عربوں نے اکثر اس رسم کی پیروی کی۔ اوّل اوّل کوفے میں اہل لشکر کے لئے نرسلوں کے گھر بنوائے گئے تھے۔ پھر ان کی جگہ کچی اینٹیں لگائی گئیں۔ چند ہی سال میں یہ فوجی پڑاؤ ایک بڑا شہر بن گیا۔ وہ اور بصرہ، عراق کے مسلمانوں کے مشہور سیاسی اور تعلیمی مرکز رہے تاآں کہ عباسی خلیفہ المنصور نے اپنا شہرہ آفاق شہر بغداد آباد کیا۔

۶۵۱ء یا ۶۵۲ء میں برگشتہ قسمت یزدگرد کہ اپنا تاج اور شاہی جواہرات لئے بھاگتا پھرتا تھا، مرو کے قریب ایک پنہارے کی جھونپڑی میں اپنے ہی کسی آدمی کی حرص کا شکار ہوا[2]۔ یزدگرد کی ذلت آمیز و عبرت انگیز موت نے اس عظیم سلطنت کا خاتمہ کر دیا جو صرف ایک وقفے کے ساتھ، تقریباً بارہ سو سال مسلسل قائم رہی تھی۔ اب کے ایسی برباد ہوئی کہ پھر آٹھ سو سال سے زیادہ عرصے تک پوری طرح بحال نہ ہو سکی۔ اس

---

[1] ملاحظہ ہو بلاذری ص۱۹۳۔ کیتانی۔ ج ۴ ص ۵۰ وغیرہ۔

[2] ملاحظہ ہو: مای کل بی سی رمان۔ ج ۴ ، ۴۱۸

ابتدائی اور ناتمام فتح میں کوئی دس برس لگے۔ یہاں شام کی نسبت سخت تر مزاحمت سے سابقہ پڑا۔ تخمیناً ۳۵، ۴۰ ہزار عرب جن میں عورتیں بچے غلام بھی شامل ہیں، ایرانی محاربات میں ضرور حصہ لیتے رہے۔ ایران والے سامی نسل کے نہ تھے، آریائی تھے۔ صدیوں سے اپنی قومی زندگی سے بہرہ مند رہے اور وہ منظم جنگی قوت فراہم کر کے چار سو برس تک رومیوں سے ٹکر بہ ٹکر لڑتی رہی۔ عربی حکومت کی آئندہ تین صدی میں ایران کی سرکاری اور تہذیبی زبان عربی ہوگئی بلکہ کسی حد تک عام بول چال میں بھی استعمال کی جانے لگی تھی۔ لیکن مفتوح قوم کی قدیم روح پھر بیدار ہونے والی اور فراموش کردہ بولی کو تازہ کرنے والی تھی۔ قرامطہ کی تحریک میں ایرانیوں کا بڑا حصہ تھا اور اس تحریک نے کئی سال تک خلافت کی بنیادیں تک ہلادی تھیں۔ اسی طرح شیعہ عقائد کو تیار کرنے اور فاطمی حکومت بنانے میں ایرانی پیش پیش تھے۔ یہ خانوادۂ شاہی دو صدی سے زیادہ مصر پر حکومت کرتا رہا۔ ایرانی فنون، ادبیات، فلسفہ، اور طب دنیائے عرب کی مشترکہ میراث بن گئے اور فاتحین کو مفتوح کرلیا۔ شروع کی تین صدی میں ملت اسلامی کے آسمان پر بعض سب سے درخشاں ستارے نومسلم ایرانی تھے۔

جس زمانے میں یہ عربی جیوش حضرت سعدؓ کی سپہ سالاری میں مشرقی ممالک میں نبرد آزمائی کر رہے تھے، ایک اور عرب لشکر اُن سے بھی زیادہ نامور سپہ سالار، عمرو ابن العاص کے ماتحت مغرب میں مصروف جنگ تھا۔ یہ لشکر وادئ نیل کے ساکنوں اور شمالی افریقہ کو

بربروں کو ہلال کی شاخوں کی آغوش میں لا رہا تھا۔ اسلامیان عرب کی یہ بے مثال کشورستانی[1] ظاہر میں مذہبی، لیکن بیش تر ملکی اور معاشی نوعیت رکھتی تھی اور بڑھتے بڑھتے اتنی بڑی سلطنت بن گئی تھی جس کے مقبوضات سکندر اعظم کی سلطنت کی طرح بہت دُور دُور تک پھیلے ہوے تھے۔ خلیفہ اسلام مدینہ منوّرہ میں بیٹھ کر کوشش کر رہے تھے کہ اس سیلاب کی رفتار کو ضابطے کا پابند رکھا جاے جس میں روز افزوں تعداد و قوّت کی ندیاں برابر ملتی چلی جاتی تھیں کہ اُمنڈتی ہوئی رَو کو قابو میں رکھنا محال ہوگیا تھا۔[2]

---

[1] یورپ والوں نے اسلام کے خرقِ عادت فروغ کی تازہ وجہ یہ تجویز کی ہو کہ معاشی مزدوروں نے عربوں میں کشور کشائی اور سرفروشی کا یہ جوش بھر دیا تھا ـــــ مگر معاشی مزدوریں اسلام سے پہلے بھی کچھ کم نہ تھیں دوسرے شمالی افریقہ کے ریگستانی اور خراسان و سیستان کے پہاڑی علاقوں میں کوئی ایسی معاشی کشش نہ تھی کہ محض دولت کی ہوس مسلمانوں کو اُدھر لے جاتی۔ درحقیقت سب سے قوی محرک قرآن مجید کی انقلاب انگیز تعلیم اور اسلام کے معلّم صلی اللہ علیہ وسلّم کی عظیم ترین شخصیت کی صحبت کی تاثیر تھی جس کا اعتراف غیر مسلم نہیں کرنا چاہتے لہٰذا نئے قیاس دوڑاتے اور تحقیق کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں۔ (مترجم)

باب ۱۴ چہارم

مصر، طرابلس اور برقہ پر قبضہ

مصر جنگی محل وقوع رکھتا تھا۔ شام و حجاز سے اس کی نزدیکی خطرناک تھی۔ پھر غلے کی پیداوار میں زمین ایسی زرخیز تھی کہ قسطنطنیہ کا انبار خانہ یہی ملک بن گیا تھا۔ اس کے صدر مقام سکندریہ میں بائی زنطی بیڑے کا مستقر تھا اور شمالی افریقہ کے پورے گلیارے کا دروازہ مصر تھا۔ یہی سب اسباب تھے کہ عربی فتوحات کے بالکل ابتدائی زمانے سے فاتحین کی حریص نگاہیں وادیٔ نیل پر پڑنے لگی تھیں؛ اس کی فتح بھی حملوں کی بجائے شروع سے باقاعدہ جنگ کے ذریعے عمل میں لائی گئی۔ عمرو ابن العاص عہد جاہلیہ میں کئی دفعہ مصر کا سفر کر چکے تھے انھیں وہاں کے کاروانی راستوں اور شہروں سے خوب واقفیت تھی[1] اور اپنے نامی گرامی ہم چشم سے مسابقت کے لئے نئے میدان کی تلاش میں تھے۔ حضرت عمرؓ یروشلم آئے تو انھیں موقع مل گیا کہ سرزمین فراعنہ پر فوج کشی کی اجازت حاصل کریں۔ حضرت عمرؓ نے

---

[1] ابن عبد الحکم: "فتوح مصر" (نیوہیون ۱۹۲۲ء) ص ۵۳۔

نیم دلی سے اجازت تو دی مگر جب مدینے واپس آئے، حضرت عثمانؓ وغیرہ صحابہ سے مشورہ کیا اور انھوں نے مجوزہ مہم کے خطرات و صعوبات بتائے تو حضرت عمرؓ نے ایک قاصد روانہ کیا کہ لشکر کی پیش قدمی روک دی جائے۔ کہتے ہیں خلیفہ کا پیام ٹھیک اس وقت پہنچ گیا تھا جب کہ عمرو فلسطین کی سرحد پار کرنے والے تھے۔ وہ تاڑ گئے کہ مخالف احکام آئے ہوں گے اور حضرت عمرؓ کا یہ فرمانا بھی یاد تھا کہ ـ "اگر میرا خط تجھے روکنے کے لئے، اس سے قبل کہ تو مصر کے کسی حصے میں داخل ہو، مل جائے، تو واپس لوٹ آنا۔ لیکن اگر (امتناعی) خط کے وصول سے پہلے ہی تو حدود مصر میں داخل ہو چکا ہو تو اقدام جاری رکھنا اور خدائے تعالےٰ سے امداد کی دعا کرنا۔"

عمرو نے منزل العریش تک پہنچنے سے پہلے خط نہ کھولا (دسمبر ۶۳۹ء)۔ وہ قبیلۂ قریش کے بڑے موقع شناس شخص تھے۔ پنتالیس سال کی عمر تھی۔ جنگ جو، پرجوش، فصیح البیان تھے۔ اُردن کے مغرب میں فلسطین کی فتح کا سہرا ان کے سر رہا۔ آگے چل کر اپنے یار غار
معاویہؓ کے حصول خلافت میں انھوں نے جو حصہ لیا، اس کی بدولت 161
"عرب کے چار ذہات اسلامی" یعنی بہترین رجال سیاسی میں شمار ہوئے۔[1] مصر کے حملے میں اپنے چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ انھوں نے وہی قدیم راستہ اختیار کیا جسے کبھی ابراہیم علیہ السلام، ایرانی بادشاہ کیکاؤس (=کیم بائی سیس)، سکندر اعظم، انٹیوکسس (یونانی)، "خاندان مقدس" اور زمانۂ قریب میں نپولین اور جمال پاشا نے طے

---

[1] ابن حجر: "الاصابہ فی تمیز الصحابہ" ج ۵ (قاہرہ ۱۹۰۷ء)

کیا تھا۔ اصل میں قدیم تاریخ کی یہ بین الاقوامی شاہ راہ تھی جو دنیا کے سب سے اہم تمدنی مرکزوں کو باہم ملاتی تھی[۵] عرب لشکر نے جنوری ۶۴۰ء میں، سب سے پہلے جس قلعہ بند مقام پر ضرب لگائی وہ ال فرما (= پل سیئوم)، مشرقی مصر کی کنجی تھا۔ یہ ایک مہینے کی مزاحمت کے بعد مسخر ہوگیا۔ اس کے بروج و فصیل کی غالباً ایرانیوں کے گذشتہ حملے اور قبضے (۶۱۶ء) کے وقت سے مرمت نہیں ہوئی تھی۔ فاتحین عرب نے انھیں مسمار کرا دیا۔ یہی کیفیت قاہرہ کے شمال مشرق میں، شہر بل بیس کی ہوئی۔ انہی کی دیکھا دیکھی دوسرے کئی شہروں نے ہتیار ڈال دئے تا آں کہ دریائے نیل کے جزیرۂ روضہ کا مستحکم قلعہ بابل یون[۶] آگے بڑھنے میں مزاحم ہوا۔ ملک مصر کو قیصر ہرقل نے ۶۳۱ء میں دوبارہ فتح کیا تھا۔ اسی وقت سے کائی روس، جسے عربی میں مقوقس کے نام سے یاد کرتے ہیں، سکندریہ کا بطریق، دیوانی نظم و نسق کا ذمہ دار، اور قیصر کی نیابت کا فرض بھی انجام دیتا تھا۔ وہ اپنے سپہ سالار اوگس تایس تھیوڈورس اور فوج کو لے کر دوڑا ہوا بابل یون آیا۔ عمرو نے شہر کے باہر ڈیرے ڈال دئے اور کمک پہنچنے کا انتظار کرتے رہے۔ چناں چہ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مشہور صحابی رسولؐ حضرت زبیر ابنؓ العوام مدد لے کر پہنچ گئے اور حملہ آوروں کی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہوگئی جنھیں کم و بیش بیس ہزار رومی سپاہیوں سے لڑنا تھا۔ اس میں دشمن کی پانچ ہزار فوج

---

[۵] دیکھو اوس ٹیڈ: "ہسٹری اوف پلیس ٹائن" صفحہ ۹۴۔

[۶] بٹلر: "دی عرب کون کوئسٹ اوف ای جپٹ" (اوکسفورڈ ۱۹۰۲ء) صفحہ ۲۴۵۔

شامل نہیں جو قلعے کی حفاظت کے لئے پہلے سے متعین تھی۔ محاصرے ہی کے دوران میں عمرو نے جولائی سنہ ۶۴۰ء میں عین شمس[1] پر حملہ کیا۔ بائی زنطی سپاہ سخت شکست کھاکر منتشر ہوگئی۔ سپہ سالار تھیوڈورس سکندریہ کو بھاگا۔ کائی روس شہر بابل یون میں قلعہ بند ہوگیا۔ عربوں کے پاس قلعہ شکن آلات وادوات نہ تھے مگر محاصرے میں بڑی شدت سے کام لیا۔ دغاباز کائی روس نے خفیہ رشوت دے کر حملہ آوروں کو ٹالنا چاہا تھا لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ مسلمانوں کی طرف سے حسب معمول تین صورتیں پیش کی گئیں: اسلام۔ خراج یا تلوار۔ ذیل کے الفاظ جو مقوقس کے قاصدوں سے منسوب کئے گئے ہیں، گویا خلاصہ ہیں کہ عرب حملہ آوروں 63
نے دشمن کے دل پر کیا اثر ڈالا تھا: (قاصدوں نے مقوقس سے آکر کہا کہ) "ہم نے ایک قوم دیکھی جس کا ایک ایک فرد زندگی سے زیادہ موت کو عزیز رکھتا ہے۔ امتیاز واقتدار پر خاکساری کو ترجیح دیتا ہے۔ ان میں سے کسی کو دنیا کی کسی چیز کی طرف رغبت نہیں۔ وہ نہیں بیٹھتے مگر خالی زمین پر۔ وہ کھانا نہیں کھاتے مگر دو زانو ہوکر۔ ان کا امیر انہی (کے عام لوگوں) جیسا ہے۔ ان کے امیروں اور غریبوں میں، غلام اور خواجہ میں امتیاز نہیں ہوسکتا اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو سب کے سب حاضر ہوجاتے ہیں۔ ہاتھ پاؤں دھوتے اور خشوع وخضوع سے عبادت کرتے ہیں۔"[2] مقوقس نے گفتگو کے لئے وکلا بلوائے

---

[1] لفظی معنی سورج کا چشمہ۔ قدیم یونانی نام "ہلیو پولس" تھا۔ توراۃ اور عبرانی کتابات میں "اون" مرقوم ہے۔

[2] ابن عبد الحکم۔ ص ۶۵۔

تھے اور یہ دیکھ کر کہ اُن کے سرگردہ ایک حبشی، عبادہؓ ابن صامت ہیں، سناٹے میں آگیا۔ وہی تین صورتیں پیش کی گئیں۔ مقوقس نے خراج دینا قبول کرلیا اور بہ عجلت سکندریہ روانہ ہوا کہ قیصر کو شرائطِ صلح کی اطلاع دے۔ ہرقل کو یہ شرطیں کب پسند آسکتی تھیں اس نے اپنے بطریق نائب پر غداری کا الزام لگایا اور جلا وطنی کی سزا صادر کی۔[۱]

اِدھر بابلیون کا محاصرہ برابر جاری تھا۔ سات مہینے پورے ہونے پر حضرت زبیرؓ اور ان کے ساتھی خندق کا ایک حصّہ پاٹنے میں کام یاب ہوگئے اور اسی طرف سے کمندیں ڈال کر فصیل پر چڑھے۔ پہرہ داروں اور قلعے کی فوج کو مغلوب کرلیا۔ قلعے کے ایوان ۶ر اپریل ۶۴۱ء کے دن اسلام کے نعرۂ جنگ "اللہ اکبر" کی فاتحانہ صداؤں سے گونج اٹھے۔ نیل کے مثلثی دہانے کی مشرقی سرحد ہاتھ آگئی تو عمرو کی آہنی گرفت نے نقطۂ راس کو دبانا شروع کیا۔ شہر نقیوس (جسے آج کل شب شیر کہتے ہیں) ۱۳ر مئی کو فتح ہوا اور قتلِ عام کا منظر بنا۔ تاہم سکندریہ کو جو قسطنطنیہ کے بعد دُنیا کا سب سے خوب صورت اور سب سے مستحکم شہر تھا، ابھی لینا باقی تھا۔ عرب سے تازہ کمک آگئی اور مجاہدین کی تعداد بڑھ کر بیس ہزار کے قریب ہوگئی تو ایک صبح عمرو ابن العاص مصر کے دار الحکومت اور عظیم بندرگاہ کے سامنے کھڑے تھے اور اس کی حفاظت کرنے والی قطار در قطار فصیلوں اور برجوں کو تک رہے تھے جن کی تسخیر آدمی کی طاقت سے باہر نظر آتی تھی۔ ایک جانب سیراپیوم[۲] کی سربہ فلک

---

[۱] بلاذری ص۲۱۳۔ ابن عبد الحکم، ص۱۶

[۲] عربوں نے اسے ڈیوسلے شین کے مینار کی وجہ سے "عمود السواری" کا نام دیا تھا۔ یہ مینار ابھی تک قدیم قصر کی جگہ کا پتہ دیتا ہے۔ دیکھو مقریزی: "مواعظ" ج ۳ ص۱۲۸۔

عمارت کھڑی تھی جہاں ایک زمانے میں سراپیس کا مندر اور سکندریہ کا مشہور کتب خانہ تھا۔ دوسری طرف مرقس ولی کا خوش نما کلیسا بنا تھا۔ اصل میں یہ "قیصریہ" نام کا مندر تھا جسے جولیس سیزر کے اعزاز میں کلیوپترا نے بنوانا شروع کیا اور قیصر اغسطس کے عہد میں اس کی تکمیل ہوئی۔ مغرب کی طرف ذرا آگے کی طرف وہ نفیس مینار کھڑے تھے جو "کلیوپترا کی سوئیاں" کہلاتے ہیں حال آں کہ حقیقت میں انھیں فرعون تت موسس ثالث نے (تخ ۱۴۵۰ ق م) بنوایا تھا۔ یہ وہی مینار ہیں جن میں سے ایک اب لندن میں دریائے ٹیمز کے گھاٹ کی اور دوسرا نیویارک میں "وسطی چمن" کی زینت ہے؛ ان میناروں کے عقب میں روشنی کا بلند برج فاروس، دن کو سورج کی روشنی سے اور شب میں اپنی آگ سے، دور دور سے چمکتا نظر آتا تھا۔ سات عجائبات عالم میں اس کا شمار کیا گیا اور فی الواقع کچھ غلط نہیں کیا گیا ہے؛[۱] بے شبہ صحرائی عربوں کی اسے دیکھ کر وہی کیفیت ہوئی ہوگی جو نووارد پر جدید نیویارک کی فلک بوس عمارات کے فضائی خط دیکھ کر ہو جاتی ہے؛

سکندریہ میں قلعہ کی فوج ہی پچاس ہزار سے کم نہ تھی۔ پھر پشت پر بائی زنطی بحریہ کی پوری طاقت موجود تھی۔ کیوں کہ یہی بندرگاہ بیڑے کا صدر مستقر تھا۔ حملہ آور تعداد و اسلحہ میں بہت کم تھے۔ ان کے پاس ایک بھی جہاز نہ تھا۔ قلعہ شکن آلات نہ تھے اور قریب میں کوئی مرکز نہ تھا۔ جہاں سے کمک پہنچتی رہے۔ جون نقیوسی نے، جو ہم عصر مصنف ہے عرب حملہ آوروں کی بیچارگی کی کیفیت لکھی ہے کہ جب وہ بلند فصیلوں پہ

---

[۱] دیکھو مقریزی - ج ۳ ص۱۱۳ - سیوطی، "حسن" ج ۱ ص۲۳ -

بڑھے اور وہاں سے منجنیقوں نے ان پر پتھر برسائے تو کس بُری طرح مارے گئے اور پسپائی پر مجبور ہوئے[1] آخر عمرو، ایک جمعیت یہاں چھوڑ کر لڑتے بھڑتے بابل یون چلے آئے اور وہاں سے جنوبی مصر پر کئی تاختیں کیں۔ فروری ۶۴۱ء میں ہرقل نے وفات پائی۔ اس کا ناتجربہ کار لڑکا کونس ٹینس ثانی (یہ قسطنطین، ۶۴۱ - ۶۶۸ ء) جانشین ہوا۔ کائی روس (مقوقس) پھر قیصری عنایت سے سرفراز ہوکر سکندریہ آیا کہ عربوں سے صلح کی شرطیں طے کرے۔ چناں چہ ۸ / نومبر ۶۴۱ء کو بابل یون میں عمرو ابن العاص اور مقوقس نے صلح نامے پر دستخط کر دئے اگرچہ اسے عہدنامہ سکندریہ کہ سکتے ہیں۔ مقوقس کو اُمید تھی کہ قیصر سے آزاد اور عربوں کا نائب بن کر مصر پر حکومت کرے گا لہذا ہر بالغ پر بحساب دو دینار فی کس مقررہ جزیہ اور جنس کی صورت میں مال گزاری ادا کرنا قبول کیا اور عہد کر لیا کہ کسی بائی زنطی فوج کو آنے یا ملک پر قبضہ کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ قیصری سپاہ نے ستمبر ۶۴۲ء میں شہر خالی کر دیا۔ نوجوان اور کم زور قیصر قسطنطین نے صلح کی توثیق کر دی جس کے معنی یہ تھے کہ سلطنت کی ایک عمدہ ترین ولائت عربوں کے قبضے میں چلی گئی۔ فتح کا مژدہ حضرت عمرؓ کو ان الفاظ میں مدینے بھیجا گیا: "میں نے جو شہر فتح کیا اس کی تفصیلی کیفیت بیان نہیں کرتا۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ اس میں ۴ ہزار حویلیاں ۴ ہزار حمام، ۴۰ ہزار جزیہ گزار یہودی
165 اور چارسو بادشاہی تفریح گاہیں موجود ہیں[2]" عرب سپہ سالار کے

---

[1] زوٹن برگ۔ متن وقائع جون نیقوسی مع ترجمہ فرانسیسی (پیرس ۱۸۸۳) صفحہ ۲۵۰۔

[2] ابن عبدالحکم۔ ص ۸۲۔ نیز دیکھو، زوٹن برگ ص ۲۶۳۔

قاصد کی جو یہ فتح نامہ لایا تھا، حضرت خلیفہ رضؓ نے روٹی اور کھجور سے ضیافت کی اور مسجد نبویؐ میں وقار و سادگی سے شکرانے کی نماز باجماعت ادا فرمائی ؛

فتح مصر کا سب سے قدیم بیان جواب تک سلامت رہا، ابن عبدالحکم (متوفی ۲۵۷ھ = ۸۷۱ء) نے لکھا تھا۔ وہ بتاتا ہے کہ مصر کے قبطیوں کو اُن کے سکندریہ کے اسقف نے شروع ہی سے ہدایت کردی تھی کہ مجاہدین عرب کا کوئی مقابلہ نہ کریں[۱] یہ کچھ قابل حیرت نہیں۔ کیوں کہ یہ حلولی فرقے سے تعلق رکھتے تھے اور ان پر ملکی (یا شاہی) کلیسا کی طرف سے جبر و تشدد ہوتا رہتا تھا۔ قیصر ہرقل سالہا سال تک اپنے نائب مقوقس کے ذریعے کوشش کرتا رہا کہ مصری عیسائیوں میں اپنا نیا "مونوثلیت" کا عقیدہ جبرًا رائج کرے اور ان کے قدیم طریقِ عبادت کو ممنوع قرار دے۔ چنانچہ قبطی فرقے کے پادریوں پر مقوقس نے وہ وہ ظلم کئے کہ مصری عیسائیوں کی بعد کی روایتوں میں اُسے دجّال بتایا گیا ہی ؛

حضرت عمرؓ کے عام اصول کے مطابق وہی مقام جہاں فاتح مصر نے بابل یون کے باہر اپنا پڑاؤ ڈالا تھا، فسطاط کے نام سے نیا دارالحکومت بن گیا۔ جس طرح شام میں جابیہ اور عراق میں بصرہ اور کوفہ کے پڑاؤ، شہر بن گئے تھے۔ وہیں سپہ سالار اسلام عمرو ابن العاص نے سیدھی سادی مسجد تعمیر کی جو فراعنہ کی سرزمین میں پہلی مسجد تھی اور اپنے (بانی کے) نام سے آج تک سلامت ہی اگرچہ بعد کی ترمیم

---

[۱] ابن الحکم ص۵۸ ؛

و توسیع سے اُس کی صورت بدل گئی ہے۔ فسطاط (مصر العتیق یا قدیم قاہرہ) فاطمیوں کے نیا قاہرہ بنانے (یعنی ۹۶۹ء) تک برابر دار الحکومت رہا۔ عرب کے مقدس شہروں تک سیدھا آبی راستہ نکالنے کی غرض سے عمرو نے عہد فراعنہ کی قدیم نہر صاف کرائی جو "خلیج امیر المومنین" کے نام سے ہِل یوپولس سے گزرتی اور نیل کو قلزم[1] کے مقام پر بحر قلزم سے ملا دیتی تھی[2] نیل سے وہ بابل یون کے شمال میں ملی تھی۔ رومی قیصر ٹراجن نے بھی (کوئی ۶ صدی قبل) اسے صاف کرایا تھا۔ مگر بعد میں کسی نے خبر نہ لی اور وہ اٹ گئی تھی۔ اس پر چند مہینے جبری محنت لی گئی اور ۶۴۴ء میں حضرت عمرؓ کی شہادت سے کچھ قبل مصری پیداوار کے لدے ہوئے بیس جہاز عرب کی بندرگاہوں پر اپنا مال اتار رہے تھے[3] بعد میں یہ نہر فاطمی خلیفہ الحاکم (وفات ۱۰۲۱ء) کے نام پر حاکمی کہلانے لگی تھی۔ پھر اس کے نام بدلتے رہے مگر انیسویں صدی عیسوی کے آخر تک اس کے بعض حصے سلامت رہے ۔

۱۶۶ باقی نظم و نسق، جس میں نظام مال گزاری شامل ہے، فاتحین عرب نے حسب معمول اختیار کر لیا مگر اس میں ضروری ترمیم بھی کر دی جو مرکزیت کا پہلو لئے ہوئی تھی۔ حال میں جو مصری نوشتے (پاپیری = اوراق بردی) دریافت ہوئے، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیل کی زرخیز وادی سے نفع اندوزی اور دودھاری گائے کی طرح دودھ نچوڑنے کی حکمت عملی کہ زمانہ دراز سے چلی آرہی تھی، اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

---

[1] پہلے اس مقام کو کلی زما کہتے تھے۔ اب سویز کہلاتا ہے۔
[2] دیکھو مسعودی۔ ج ۵ صفحہ ۹۹۔
[3] یعقوبی۔ ج ۲ صفحہ ۱۷۷۔

حضرت عمرؓ کو خیال ہوا کہ عمرو ابن العاص کافی خراج وصول نہیں کرتے۔ لہذا اپنی شہادت سے قبل بالائی مصر کی حکومت عبداللہ ابن سعد ابن سرح کے تفویض کی۔ پھر نئے خلیفہ حضرت عثمانؓ نے عمرو ابن العاص کو واپس بلا لیا اور پوری ولایت مصر پر اپنے علاتی بھائی عبداللہ کو مامور کیا۔ (تخ ۶۴۴ء)۔ اسی سال ۶۴۵ کے اواخر میں سکندریہ والوں نے نئے انتظام سے ناراض ہوکر قیصر قسطنطین سے مدد کی التجا کی اور اس نے ایک ارمن مانوءل کو تین سو جنگی جہاز دے کر بھیجا کہ شہر واپس لے لیا جائے[1] قلعے کی عرب فوج کے ایک ہزار سپاہی تلوار کے گھاٹ اتار دئے گئے۔ سکندریہ پھر بائی زنطی ہاتھوں میں آگیا اور عربی مصر پر حملوں کا مرکز بنایا گیا۔ ادھر سے فوراً عمرو ابن العاص بحال کئے گئے۔ انھوں نے نقیوس کے قریب مقابلہ کیا جس میں بائی زنطی سپاہی کثرت سے مارے گئے اور ۶۴۶ء کے اوائل میں سکندریہ دوبارہ تسخیر کرلیا۔ شہر کی زبردست فصیلیں گرادی گئیں اور مصر کا یہ قدیم پائے تخت اس دن سے آج تک مسلمانوں کے قبضے میں ہے۔

سکندریہ کا کتب خانہ

یہ قصہ کہ خلیفۂ اسلام کے حکم سے عمرو نے چھ مہینے تک شہر کے تمام سکندریہ کے کتب خانے کی کتابوں سے گرم کرائے، ان کہانیوں میں سے ایک ہے جو بہ طور افسانہ بامزہ مگر بہ حیثیت تاریخ، فاسد ہوتی ہیں۔ سکندریہ کا بڑا بطلیموسی کتب خانہ، بہت پہلے ۴۸ قبل مسیح میں جولیس سیزر

---

[1] بلاذری۔ ص ۲۲۱۔

نے جلوادیا تھا۔ ایک اور جو "کتب خانے کی بیٹی" موسوم تھا، قیصر تھیودوسیئس کے فرمان سے ۳۸۹ء میں فنا کیا گیا۔ غرض عربوں کی فتح مصر کے زمانے میں کوئی خاص کتب خانہ سکندریہ میں نہ تھا اور نہ کسی ہم عصر مصنف نے یہ الزام حضرت عمرؓ یا عمرو ابن العاص پر عاید کیا پہلا شخص جس نے یہ کہانی بیان کی عبداللطیف بغدادی معلوم ہوتا ہے اور وہ بہت بعد کا آدمی ہے کہ ۶۲۹ھ ہجری م ۱۲۳۱ء میں فوت ہوا۔ ہمیں معلوم نہیں اُس نے کیوں ایسا کیا۔ لیکن اسی کی روایت کو بعد کے مصنف دہراتے اور اُس پر حاشیے چڑھاتے رہے[1]

67/ سکندریہ کی مکرر فتح کے بعد حضرت عثمانؓ چاہتے تھے کہ عمرو فوج کے سپہ سالار اور عبداللہ حاکم خزانہ رہیں۔ عمرو ابن العاص نے یہ تجویز سن کر وہ جواب دیا جو تاریخ میں مشہور ہو گیا ہے: "میری حیثیت پھر اس شخص کی سی ہوگی جو گائے کے دونوں سینگ پکڑے رہے اور دودھ دوسرا آدمی دوہے!"[2] تب عبداللہ ہی خلیفہ کے نائب اور والی ملک بنا دئے گئے۔ وہ مالیات کے جیسے ماہر تھے، اتنے اچھے سپاہی نہ سمجھے جاتے تھے۔ لیکن عنانِ حکومت ہاتھ میں آئی تو مغرب و جنوب کی طرف، زیادہ تر مالِ غنیمت کے واسطے کئی مہمیں لے گئے اور دونوں سمتوں میں حدودِ حکومت کی توسیع کی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پہلا اسلامی بیڑا بنانے میں حصہ دار تھے۔ یہ فخر حضرت معاویہ والیٔ شام کو حاصل ہے لیکن عبداللہ

---

[1] قفطی، "تاریخ الحکماء" (لائپزگ ۱۹۰۳ء) ص ۳۵۵؛ "تاریخ مختصر الدول" ال عبری (بیروت ۱۸۹۰ء) ص ۱۸۰۔ مقریزی، ج ۳ ص ۱۲۹۔ نیز دیکھو بٹلر۔ اور گبن (تاریخ زوال روم۔ ج ۵ ص ۴۵۲)

[2] ابن عبدالحکم۔ ص ۱۷۸۔ نیز ملاحظہ ہو، بلاذری، ص ۲۲۳۔

بھی اس فخر میں اُن کے شریک ہیں۔ مصری بیڑے کی بڑی لنگرگاہ قدرتی طور پر سکندریہ میں بنی۔ بحری پیش قدمیوں کا خواہ شام سے معاویہ نے کی ہوں، خواہ مصر کی طرف سے عبداللہ نے، ہدف بائی زنطہ ڈالے تھے۔ ۶۴۹ء میں والئی شام نے بائی زنطی بیڑے کا ایک اور مرکز چھین لیا، یعنی جزیرہ قبرس کہ ساحل شام سے خطرناک طور پر قریب تھا۔ اس طرح ملت اسلامی کو پہلی بحری فتح حاصل ہوئی اور اسلامی سلطنت میں سب سے پہلا جزیرہ شامل کر لیا گیا۔ دوسرے سال شام کے قریب ہی جزیرہ ارواد فتح ہوا۔ ۶۵۲ء میں عبداللہ نے اپنے سے بڑے یونانی بیڑے کو سکندریہ کے سامنے زک دی۔ دو سال نہ گزرے تھے کہ معاویہ کے ایک بحری سردار نے رودس پر چھاپہ مارا[1]۔ ۶۵۵ء میں[2] مصر و شام کے عربی بیڑوں نے مل کر لی سیہ کے ساحل کے سامنے فنکس کے قریب بائی زنطی بیڑے کو بالکل تباہ کر دیا جس میں کوئی پانسو جنگی جہاز تھے۔ اور خود قیصر قسطنطین ثانی انھیں لڑا رہا تھا۔ وہ بمشکل جان بچا کے بھاگا۔ یہ معرکہ عربی میں "ذوالصواری[3]" (یعنی مستولوں کی جنگ) مشہور ہے اور اسی نے بائی زنطہ کی بحری سیادت پہ خط تنسیخ کھینچ دیا۔ مگر مسلمان اندرونی اختلال کی وجہ سے فتح کا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے اور قسطنطنیہ پر جو اصل منزل مقصود تھا، پیش قدمی نہ کر سکے۔ البتہ ۶۶۸ء یا ۶۶۹ میں دو سو جہازوں کا ایک بیڑا اسکندریہ سے صقلیہ تک بڑھ آیا۔ پہلے بھی کم سے کم ایک دفعہ معاویہ کا ایک سپہ سالار ۶۵۲ء

---

[1] بلاذری نے ایک اور حملہ کا ۵۳ھ (م ۶۷۲ء) میں ذکر کیا ہے۔ ص ۲۳۶۔

[2] دیکھو بیکر کا مضمون عبداللہ بن سعد پر۔ انسائی کلو پیڈیا اوف اسلام میں۔

[3] ابن عبدالحکم۔ ص ۱۸۹۔

میں اسے تاخت تاراج کر گیا تھا۔[۵۱] اب کے آسے مصر کے عربوں نے لوٹا۔ غرض معاویہؓ اور عبداللہؓ کی صورت میں ملت اسلامی نے اپنے سب سے پہلے دو امیر البحر تیار کئے۔[۵۲]

168 واضح رہے کہ ان بحری مہمات میں خلافت مدینہ کی امداد شامل نہ تھی بلکہ یہ ایک حد تک خلافت کے منشا کے خلاف تھیں جیسا کہ ابتدائی مآخذ کی پر معنی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے عمروؓ کو مصر میں لکھ بھیجا تھا کہ میرے اور تیرے درمیان پانی حائل نہ ہونا چاہیئے۔ اپنا پڑاؤ ایسی جگہ نہ بنانا کہ میں اپنے اونٹ پر چڑھ کر اس تک نہ پہنچ سکوں!"[۵۳] حضرت عثمانؓ نے معاویہؓ کو ان کے بار بار جتانے پر کہ قبرس بہت قریب ہے، بحری مہم لے جانے کی اجازت تو دی مگر یہ شرط لگا دی کہ تمہیں اپنی بیوی کو ساتھ لے کر جانا ہوگا!"[۵۴]

سقوط مصر نے اس کے مغرب کے باقی زنطی صوبوں کو دفاع سے محروم کر دیا۔ ادھر سکندریہ پر قبضہ قائم ہو جانے سے ضروری ہوا کہ مسلمان فاتح ان صوبوں کو بھی فتح کریں۔ سکندریہ کی پہلی تسخیر کے بعد ہی اپنے عقب کی حفاظت کے لیے عمرو ابن العاص اسی سرعت و مستعدی سے جو ان کی خصوصیت تھی، پنتا پولس پر سوار فوج لے کر جا چڑھے اور برقہ کو بغیر کسی مزاحمت کے فتح کر لیا۔ طرابلس کی بربر اقوام نے جن میں لواتہ

---

۵۱ بلاذری۔ ص۲۳۵۔

۵۲ مگر افسوس ہے کہ ان بحری مہمات کے تفصیلی حالات عربی تاریخوں میں بہت کم درج ہیں۔

۵۳ یعقوبی۔ ج ۲ ص۱۸۱۔ طبری کا بیان ہے (ص۲۱۱) کہ حضرت عمرؓ نے سعدؓ ابن ابی وقاص کو بھی لکھا تھا کہ تمہارے اور خلیفہ اور مسلمانوں کے درمیان سمندر حائل نہ ہونا چاہیئے۔

۵۴ بلاذری۔ ص۱۵۲۔

شامل تھے[1] اُن کی اطاعت قبول کی۔ طرابلس ہی سے گزر کر اُن کے جانشین عبداللہ نے ولایت افریقہ کا ایک حصہ فتح کیا اور وہاں کے دارالحکومت قرطاجنہ (= کارتھیج) سے خراج وصول کیا[2]۔ یہ جنگلی بربر اہل کتاب کی تعریف میں نہ آتے تھے مگر حضرت عثمانؓ نے انھیں بھی ذمیوں کے حقوق عنایت کر دئے۔ جنوب میں نوبیہ پر پیش قدمی کی گئی، جہاں کی چراگاہیں ملک عرب سے مماثل اور صحرائی طریق زندگی کے لئے مصر سے زیادہ موزوں تھیں۔ اسلام کے ظہور سے صدیوں قبل اہل عرب ان ملکوں میں آتے اور تھوڑے کر کے بستے رہے تھے۔ اہل نوبیہ سے عبداللہ نے ۶۵۲ء میں معاہدہ صلح کر لیا[3] اور انھیں قریب قریب آزاد رہنے دیا۔ چنانچہ کئی صدی تک یہ مسیحی مملکت جس کا پائے تخت ڈنگولہ تھا اور اس میں طرابلس اور حبشہ کے باشندے ملے جلے رہتے تھے، مسلمانوں کی مدد کو جنوب کی طرف بڑھنے سے روکتی رہی۔

---

[1] یعقوبی، ج ۲ ص۱۶۹۔

[2] ابن عبدالحکم۔ ص۱۸۳۔

[3] بلاذری۔ ص۲۳۸۔

باب پانزدہم ۱۵

نئے مقبوضات کا نظم و نسق

۱۶۹

ملت اسلامی کے سامنے اب یہ عقدہ تھا کہ ان وسیع علاقوں پر جو حال میں حاصل ہوئے، کس طرح حکومت کی جائے؟ اور عرب کی بدوی معاشرت کے سیدھے سادے قانون کہ ضبط تحریر میں نہ آئے تھے، انھیں اتنی کثیر و مخلوط قسم کی آبادی پر چسپاں کرنے کے لائق کیوں کر بنایا جائے جب کہ یہ آبادی اس قدر مختلف حالات میں بسر کرتی تھی کہ ابتدائی قانون ساز کو ان کا خیال بھی نہ آیا تھا؟ حضرت عمرؓ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان دشوار مسائل کو حل کرنے کی تدبیر کی۔ ملی روایات کی رُو سے وہ کامیاب ہوئے اور اسی لئے اسلام کی دوسری حکومتِ الٰہیہ کے بانی مانے جاتے ہیں۔ وہ حکومت جو مسلمانوں کے خیال میں بہترین تھی اگرچہ زیادہ مدت تک قائم رہنا اس کے نصیب میں نہ تھا۔

حضرت عمرؓ کا آئین

حضرت عمرؓ کے آئین حکومت کا آغاز اس نظریئے سے ہوا کہ جزیرہ نمائے عرب میں اسلام کے سوا کسی دوسرے مذہب کو جگہ نہیں

دی جاسکتی ۔ اس غرض کے لئے انھوں نے سابقہ معاہدات کی بھی پروا نہ کی[۱۰] اور ۱۴ھ و ۱۵ھ (= ۶۳۶ و ۶۳۵ء) میں من جملہ دوسروں کے خیبر کے یہود اور نجران کے نصاریٰ کو نکال دیا۔ یہودی تو اریحا وغیرہ میں جاکر آباد ہوئے اور نصاریٰ شام و عراق میں بھاگ آئے[۱۱]۔ حضرت عمرؓ کی حکمت عملی کا دوسرا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تمام اہل عرب کی پوری طرح ایک عسکری قسم کی مذہبی حکومت میں شیرازہ بندی کردی جائے اور یہ افراد جو اب سب مسلمان تھے، دوسروں سے الگ اور غیر مخلوط رہیں۔ گویا ایک جنگی طبقۂ اشراف بن جائے اور باقی تمام غیر عرب لوگوں کو شہری حقوق سے محروم رکھا جائے۔ اسی مقصد کے پیش نظر عرب مسلمانوں کو اجازت نہ تھی کہ بیرونِ ملک میں زمیں داری یا مزروعہ ملکیت حاصل کریں۔ جزیرہ نمائے عرب میں وہاں کے باشندوں سے زمین کی پیداوار پر ایک عشر مال گزاری لی جاتی تھی۔ غرض یہی وجہ ہے کہ عرب فاتحین اول اول فوجی چھاؤنیوں میں رہا کرتے تھے۔ جیسے ال جابیہ، حمص، عمواس، (اردن میں) طبریہ اور (فلسطین کے ضلعے میں) پہلے لد پھر رملہ میں مصر میں وہ فسطاط اور اسکندریہ کے پڑاؤ میں مقیم رہے اور عراق میں کوفہ اور بصرہ کو نئے شہر بناکر اپنا مرکز قرار دیا[۱۲]۔ مفتوحہ علاقوں میں وہاں کے باشندے

---

[۱۰] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو شرطیں منظور کی تھیں، ان کے لئے دیکھو واقدی کی کتاب "مغازی" ص ۳۹۱ اور ابو یوسف کی "کتاب الخراج" (قاہرہ ۱۳۴۲ھ) ص ۸۰ یہ معاہدات دوامی نہ تھے بلکہ تراضی طرفین پر مبنی تھے۔ جو لوگ اٹھائے گئے انھیں معاوضہ اور بسنے کے لئے دوسری جگہ دی گئی۔ تھوڑی ہی مدت بعد یمن کے یہودی عبداللہ ابن سبا نے مسلمانوں میں جو فتنہ برپا کیا، وہی حضرت عمرؓ کی اصابت رائے اور دور بینی کا گواہ ہے (مترجم) [۱۱] بلاذری ص ۶۶ [۱۲] پہلی صدی ہجری میں اس طرح کی کئی چھاؤنیاں بن گئی تھیں خوزستان کا عسکر مکرم، فارس میں شیراز اور شمالی افریقہ میں برقہ اور قیروان ...

اور ان کی مزروعہ اراضی انھیں کے پاس رہنے دی گئی۔ ان کا درجہ ادنیٰ تھا اور مسلمانوں کی ضرورت کے وقت (بہ طور تمات المسلمین) کام میں لائے جانے کے واسطے رکھے گئے تھے[۱] اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ایک غیر عرب، مسلم عرب سے فروتر مرتبہ پاتا تھا۔

محکوم لوگ بہ طور ذمّی کے، مسلمانوں کی حفاظت سے بہرہ مند تھے۔ اُن سے جنگی خدمت نہ لی جاتی تھی کیوں کر اُن کا اختلافِ مذہب اسلامی لشکر میں خدمت انجام دینے سے مانع تھا۔ لیکن انھیں بھاری خراج ادا کرنا پڑا ہوگا۔ ان پر شریعت اسلامی کا نفاذ نہ ہوتا تھا لہذا ہر فرقے کے مذہبی پیشوا کو اپنے دینی قوانین کے مطابق مقدمات کا فیصلہ کرنے کی اجازت تھی اور یہ جزوی خود مختاری جسے آگے چل کر سلاطین ترکی نے بھی تسلیم کیا، آج کے دن تک شام و فلسطین وغیرہ میں قائم رہنے دی گئی ہے[۲] جس وقت ذمّی رعایا کا کوئی آدمی ایمان لاتا تو اسی بدوی نظام کے مطابق، جسے روایت حضرت عمرؓ سے منسوب کرتی ہے، وہ جملہ محاصل سے مستثنیٰ ہو جاتا۔ انہی میں وہ محصول شامل ہے جو بعد میں جزیہ

---

[۱] یحییٰ ابن آدم، "کتاب الخراج"، (لائیڈن ۱۸۹۶ء) ص ۲۷۔

(اوپر کے بیان میں تاریخی اور مسلّمہ واقعات سے تجاوز کیا گیا ہے۔ عرب سپاہیوں کو بے شبہ زراعت کرنے سے روکا گیا تھا لیکن کسی غیر عرب کو اسلام لانے کے بعد بھی غیر یا فروتر سمجھنا، ساری اسلامی تعلیم اور تاریخ کے اس قدر صریحاً خلاف ہے کہ کوئی باخبر آدمی اُسے باور نہیں کر سکتا اس کی تردید کی ضرورت نہیں۔ مترجم)

[۲] ذمّی یا اہل الذمہ (یعنی جن کا ذمّہ لیا گیا ہو) کی اصطلاح کا اول اہل کتاب، یہود، نصاریٰ اور صابئین پر اطلاق ہوتا تھا لیکن پھر تدریجاً آتش پرست وغیرہ بھی اس میں شامل کر لیے گئے۔ (صابیٔ اور سبائی بالکل مختلف ہیں۔ ان کا فرق ملحوظ رہنا چاہیے)

کہلایا۔ جو اراضی تمام مسلمانوں کی ملکیت، یعنی فے یا وقف ہوتیں، ان کا لگان مسلمان (مزارع) بھی ادا کرتے رہے۔ البتہ وہ اضلاع جہاں کے لوگوں نے اس شرط پر خود اطاعت قبول کی تھی کہ ان کی اراضی انہی کے پاس رہنے دی جائیں گی، وہاں کی زمین فے میں داخل نہیں کی گئی۔ یہ علاقے "دارالصلح" کہلاتے تھے۔ نومسلموں کو جزیہ معاف ہو جاتا تھا۔ لیکن (مساکین کا محصول یعنی) زکوٰۃ ادا کرنی پڑتی تھی۔ البتہ وہ ہر قسم کے وظائف و فوائد میں جو مسلمانوں کو ملتے تھے، حصہ دار ہو جاتے تھے۔

بعد کے قوانین جو کئی سال کے تجربے کا نتیجہ ہوں گے، مذکورہ بالا روایت میں حضرت عمرؓ ہی سے منسوب کر دئے گئے ہیں حال آں کہ ابتدائی خلفا اور مسلمان والیوں نے محصول لگانے اور مالیات کا انتظام کرنے میں اوّل اوّل جو حصہ لیا، وہ کچھ زیادہ نہیں ہو سکتا۔ شام و مصر میں صوبائی حکومت کا بائی زنطی ڈھانچہ، اللہ کے نام سے، 71 بحال رہنے دیا گیا۔ اور دولت ایران کے سابقہ اقطاع میں بھی مقامی نظم و نسق کے کل پرزوں میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی گئی۔ دونوں سلطنتوں کے علاقوں میں، ابتدا سے محاصل مختلف تھے اور یہ اختلاف زمین کی نوعیت اور سابقہ حکومت کے ضابطوں کا لحاظ رکھنے کی وجہ سے تھا۔ اس کا انحصار حضرت عمرؓ کے بنائے ہوئے قوانین پر نہ تھا اور نہ اس بات پر کہ وہ علاقہ صلحاً ہاتھ آیا یا عنوۃً (یعنی جبریہ)۔ فرقِ محاصل کی یہ وجہ محض بعد کی گھڑی ہوئی قانونی تاویل تھی، حقیقت سے اس کا زیادہ تعلق نہیں۔ اسی طرح جزیہ کو شخصی اور خراج کو اراضی محصول میں جدا

جُدا قرار دینے کی بھی خلیفۂ ثانی رض کے زمانے (۶۳۴ء – ۶۴۴ء) تک نوبت نہیں آئی تھی۔ (خراج غالباً یونانی "کوریجیا" سے ہے) بلکہ یہ دونوں لفظ محصول کے عام معنی میں متبادل طریق پر بولے جاتے تھے۔ قرآن مجید میں صرف ایک جگہ (سورۂ توبہ : ۲۹) جزیہ کا لفظ آتا ہے اور وہاں بھی وہ کسی قانونی معنی میں نہیں ہے۔ خراج کا لفظ بھی قرآن میں ایک ہی جگہ (سورۂ مومنون : ۷۲) وارد ہوا اور معاوضے کا مفہوم رکھتا ہے نہ کہ زمین کی مال گزاری کا۔ غرض صاف معلوم ہوتا ہے کہ محکوم اقوام سے شروع میں جو شرطیں ہوئی تھیں وہ اس وقت تک کہ تاریخ لکھنے والوں نے یہ واقعات قلم بند کئے، قریب قریب فراموش ہو چکی تھیں لہٰذا انھوں نے بعد کے حالات اور ترقیات کے مطابق خود ان کی تعبیر کر لی ۔ جزیہ اور خراج کی نوعیت میں جو فرق کیا گیا، یہ بنی امیہ کے بھی آخری خلفا کے زمانے سے قبل نہیں ہوا تھا۔ خراج یا مزروعہ اراضی کا مالیہ پیداوار سے جنس کی صورت میں بہ اقساط ادا ہوتا تھا۔ جنس میں شراب، سوٗر، مردہ جانور قطعاً ممنوع تھے۔ جزیہ علامت کم تری کے طور پر زرِ نقد کی شکل میں دیا جاتا تھا۔ یہ عموماً آسودہ حالوں سے چار دینار، متوسط طبقے والوں سے دو اور غریبوں سے ایک دینار مقرر تھا[1] اسلامی لشکر کے مصارف کے لئے رعایا سے اور بھی رسوم وصول کئے جاتے تھے۔ یہ سب محاصل صرف تن درست مردوں پر واجب ہوتے تھے۔ عورتیں، بچے، بوڑھے، پیر پرو ہبت، فقرا، فاتر العقل اور دائم المرض اشخاص مستثنیٰ تھے

---

[1] "دینار" یونانی لاطینی "دیناریوس" سے بنا ہے۔ عہدِ خلافت میں یہ سونے کا سکہ قریب دس شلنگ انگریزی کے معادل تھا۔ حضرت عمر رض کے زمانے میں اس کے دس درہم بنتے تھے۔ بعد میں بارہ ہو گئے

بجز اس کے کہ ان کی اپنی کوئی آمدنی ہو۔

تیسرا اصول، جو کہا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے مشیر صحابہؓ کی رائے کے مطابق وضع کیا،[1] یہ تھا کہ صرف مال منقولہ اور قیدی، 172
غنیمت شمار ہوں گے[2] اور حسب سابق مجاہدین میں تقسیم کئے جائیں گے۔ مگر زمین غنائم میں شامل نہ ہوگی۔ یہ زمین اور اسی طرح رعایا سے جو محاصل لئے جاتے تھے، وہ سب فَے میں داخل اور پوری ملت اسلامی کا مال تھے[3]۔ فَے کی زمین میں زراعت کرنے والے اسلام لے آنے پر بھی مقررہ مال گزاری ادا کرنے کے پابند تھے۔ یہ سب محاصل بیت المال میں جمع کئے جاتے اور جنگی مصارف نیز سرکاری عمّال کے مواجب ادا کرنے کے بعد جو کچھ بچتا تھا، وہ مسلمانوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اس تقسیم کے لئے مردم شماری کرنا ضروری ہوا اور سرکاری مالئے کی تقسیم کے واسطے دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی مردم شماری معرض تحریر میں آئی ہے۔ سر فہرست اُمّ المومنین عائشہ صدیقہؓ کا نام اور بارہ ہزار درہم سالانہ وظیفہ تھا[4]۔ اہل البیت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد مہاجرین وانصار کے نام تھے اور ہر ایک کو اسلام لانے میں تقدم کے لحاظ سے وظیفے کی

---

[1] ابن سعد۔ ج ۳۔ ص ۲۱۲۔

[2] غنیمہ اور فَے کی بحث میں دیکھو ماوردی، "الاحکام السلطانیہ" ص ۲۱۶ اور ابو یوسف، ص ۲۱۔

[3] سورۂ انفال: ۴۱، کے مطابق مال غنیمت کا صرف خُمس خدا اور رسول یعنی حکومت کا حصہ تھا۔ باقی بچا مال مجاہدین کا، جو اسے حاصل کرتے تھے۔

[4] عربی درہم (فارسی: درم، یونانی: دراخمہ) عربوں کے نظام زر میں چاندی کا سکہ تھا۔ اس کی قیمت جنگ عظیم سے پہلے کے فرانسیسی فرانک کے برابر یعنی دس پنس کے قریب مقرر تھی لیکن چاندی کے نرخ میں کمی بیشی سے (لازماً گھٹتی بڑھتی رہی۔

رقم مقرر تھی۔ اس زمرے میں فی کس اوسط ۴ تا ۵ ہزار درہم سالانہ آتی تھی[۱]۔ آخر میں اہل قبائل کے نام قرآن دانی اور جنگی خدمات کے لحاظ سے ترتیب دیئے گئے تھے۔ ہر مجاہد کے لیے کم سے کم ۵ سو ۶ سو درہم سالانہ وظیفہ تھا۔ عورتیں بچے اور موالی تک شریک فہرست تھے اور ان کے وظائف دوسو تا چھ سو درہم سالانہ قرار پائے تھے[۲]۔ یہ دیوان، یعنی داخل و خارج کا سرکاری دفتر جس کی تشکیل کا سہرا بھی خلیفۂ ثانی رضی اللہ عنہ کے سر باندھا جاتا ہے، ضرور ایران کے نظام حکومت سے لیا گیا ہوگا جیسا کہ ابن طق طقانے جتایا[۳] اور خود لفظ (فارسی 'دیوان') سے پتہ چلتا ہے ؂ (فرانسیسی میں لفظ "دوان" بہ معنی محصول خانہ، عربی سے آیا ہے۔)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ بالا عسکری آئین سے عربیت کو غلبہ حاصل ہوا اور غیر عرب مسلمانوں کو بھی غیر مسلموں سے برتری کا درجہ مل گیا۔ لیکن یہ نظام کچھ ایسا مصنوعی تھا کہ زیادہ دن نہ چل سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جانشین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد ہی میں عرب کے باشندوں کو نئے مقبوضات میں زمینداری لینے کی اجازت ہوگئی۔ پھر کچھ زمانہ گزرنے پر موالی کی روز افزوں تعداد ایسی چھاگئی کہ شرفائے عرب کے خاندان ہی نظر سے اوجھل ہوگئے ؂

اسلامی فوج

پوری امت (کے کارکن افراد) اسلامی فوج تھی۔ اس کا امیر یا اعلیٰ

[۱] ابن سعد۔ ج ۳ ص ۲۰۳۔ ماوردی ص ۳۴۷۔ ابو یوسف ص ۲۵، بلاذری۔ ص ۴۵۰ ؂
[۲] موالی (واحد، مولا) یعنی غیر عرب نو مسلم، جو کسی عرب قبیلے میں شامل ہو جاتے تھے۔ ان کا رتبہ واضح نہ تھا۔ وہ مسلمان عربوں سے کم تر سمجھے جاتے تھے ؂
[۳] فخری ص ۱۱۶ نیز دیکھو ماوردی ص ۳۴۳ ؂

سپہ سالار، مدینے میں خود خلیفہ تھا کہ اپنے نائب یا فوج کے سالاروں کو اختیار تفویض کردیتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جو سپہ سالار ملک فتح کرتا وہی نماز کی امامت اور قضائت کی خدمت انجام دیتا تھا پھر، بلاذری کی روایت کے مطابق[1] حضرت عمرؓ نے دمشق و اُردن کے لئے، اور دوسرا حمص و قنسرین کے لئے قاضی مقرر کیا۔ اگر یہ درست ہو تو قاضیوں (یعنی حکام عدالت) کا عہدہ انہی نے قائم کیا۔[2] فوج کے ایک جیش کی تقسیم قلب، دو بازو، اور طلیعہ (ہراول) و ساقہ میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے وقت ہی میں معلوم تھی اور بائی زنطی و ساسانی اثرات کی غمازی کرتی ہو۔ اس فوج کے مجموعے کو اصطلاحاً "خمیس" (= پنج گانہ) کہتے تھے۔ بازووں پر سوار فوج ہوتی تھی۔ پورے جیش میں قبائلی گروہ بندی کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ہر قبیلے کا اپنا علم ہوتا، یعنی برچھے سے بندھا ہوا پھریرا جسے دلیر ترین شخص کو دیا جاتا تھا۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا علم "عقاب" تھا۔ پیادہ فوج تیر کمان، فلاخن، اور کبھی کبھی ڈھال تلوار سے کام لیتی تھی۔ تلوار میان میں ڈال کر سیدھے کندھے پر لٹکائی جاتی تھی۔ حربہ (= سانگ یا چھوٹی برچھی جسے پھینک کر مارتے تھے) کچھ مدت بعد حبشہ سے لاکر عرب فوج میں متعارف کی گئی۔ سوار فوج کا خاص ہتیار رمح (= نیزہ) تھا۔ اس کا بھل عربی ادب میں "خطی" مشہور ہو۔ جس کی وجہ تسمیہ یہ، کہ ساحل بحرین کو الخط کہتے تھے جہاں سب سے اوّل بانس کی کاشت ہوئی اور پھر ہندستان سے بھی درآمد ہونے لگی تھی۔ نیزہ اور تیر کمان ہی عربوں کے قومی ہتیار تھے۔

---

[1] ص ۱۴۱ [2] ابن سعد۔ ج ۳ ص ۲۰۲

سب سے عمدہ تلواریں بھی ہندوستان کی ساختہ ہوتیں اور اسی لئے "ہندی"
موسوم تھیں، حفاظت کا سامان زرہ اور ڈھال تھی۔ عربی اسلحہ بازنطیوں کی نسبت وزن میں ہلکے ہوتے تھے[1]۔ جنگی ترتیب قدیم وضع پر، البتہ صفوں یا قطاروں میں کرتے تھے۔ لڑائی کا آغاز ممتاز بہادروں کے انفرادی مقابلے سے ہوتا۔ یہ صفوں سے بڑھ کر میدان میں آتے اور دشمن کو لڑنے کے لیے للکارتے تھے۔ عرب جنگ جو اپنے ایرانی یا بازنطی حریف سے بہتر معاوضہ پاتا تھا اور غنیمت میں بھی اس کا حصہ یقینی تھا۔ سپہ گری اشرہی کی نظر میں سب سے پسندیدہ اور افضل پیشہ نہ تھا، سب سے زیادہ نفع کا پیشہ بھی تھا۔ مسلمان عربوں کی اصل
طاقت، اسلحہ کی برتری یا تنظیم کی خوبی میں نہ تھی بلکہ اعلیٰ حوصلہ مندی 174
میں مرکوز تھی اور کچھ شک نہیں کہ اُسے پیدا کرنے میں مذہب کا حصہ تھا۔ دوسرے صحرائی معاشرت کی وجہ سے برداشت کی قوت میں اور زیادہ تر اونٹ کی سواری کی بدولت سُرعتِ سیر میں ان کی برتری مضمر تھی[2]۔

نام نہاد عربی تمدّن

"ہلال خصیب" اور مصر و ایران کی فتوحات سے عربوں کا فقط قریبی ممالک پر ہی قبضہ نہیں ہوا بلکہ دنیا بھر کی سب سے قدیم تہذیب کے گہوارے اُن کے ہاتھ میں آ گئے۔ ان تہذیبوں کی تاریخ یونانی رومی ایرانی، فرعونی، اور اشور بابلی قرون ماضیہ تک چلی جاتی تھی۔ صحرائے

---

[1] عربی اسلحہ کے لئے دیکھو ابن قتیبہ کی عیون، ج ۱ ص ۱۲۸۔

[2] بازنطی فوج سے تقابل کے لئے دیکھو چارلس اومان کی "اے ہسٹری... مڈل ایجز" (لندن ۱۹۲۴) جلد ا ص ۲۰۸

عرب کے بچے اب ان کہن سال و عتیق تہذیبوں کے وارث ہوئے۔ فنون لطیفہ، تعمیر، فلسفہ، طب، علوم تجربی، ادبیات یا فنِ ملک داری میں انھیں سب کچھ سیکھنا تھا، خود کچھ نہ جانتے تھے۔ مگر سیکھنے کا شوق بے پایاں تھا۔ یہ عرب مسلمان وہ مخفی قوائے دماغی لائے جو پہلے کبھی کام میں نہ آئے تھے۔ ہر چیز کے جاننے کے اشتیاق نے علم کی وہ تشنگی دی تھی، جو کسی طرح سیر نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ محکوم قوموں کی امداد و شراکت سے انہی قوموں کی ذہنی اور جمالیاتی میراث کو انھوں نے لیا، تراش خراش کر کے پھر زندہ کرنا شروع کیا۔ مدائن، نہر الصیبین دمشق، بیت المقدس اور سکندریہ میں انھوں نے معمار و مہندس، صناع و جوہری کے کارنامے دیکھے، عش عش کی اور پھر خود ویسے ہی کام کرنے لگے۔ قدیم تہذیبوں کے ان سب مراکز میں وہ آئے، دیکھا اور مفتوح ہو گئے۔ ان کی بھی ایک مثال تاریخ میں ہے کہ فاتح کو مفتوح نے مغلوب کر لیا۔ پس وہ چیز جسے ہم "عرب تمدن" کے نام سے یاد کرتے ہیں، اپنی ایجاد، اصولی ساخت یا اہم نسلی خصوصیات، کسی اعتبار سے بھی عربی نہ تھا۔ اس میں عربوں کا خالص حصہ لسانیات اور کسی حد تک الٰہیات میں تھا۔ ورنہ عربی خلافت کے تمام زمانے میں علم و تہذیب کے نمایاں مشعل بردار شامی، مصری، ایرانی وغیرہ نظر آتے ہیں۔ جو یا مسلمان ہو گئے تھے یا یہودی اور نصرانی رہے اور عربوں کی حکومت میں اسی طرح کی خدمات انجام دیں جیسے فاتح رومیوں کے زیر نگیں آکر یونانیوں نے کی تھیں۔ عرب کے اسلامی تمدن کی تہ وہ آرامی اور ایرانی تمدن تھا جس پر یونانیت کا رنگ چڑھا ہوا تھا اور جس نے خلافت کے

زیر سایہ فروغ پایا اور زبان عربی کو اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔ دوسرے معنی میں اسے ابتدائی سامی تمدن کا منطقی سلسلہ کہنا چاہیئے جس کا آغاز بہت پہلے "ہلال خصیب" میں ہوا اور اہل اشوریہ، بابل، وفنیقیہ، ارامی اور یہودیوں نے اسے ترقی دی تھی۔ اب عربی تمدن میں مغربی ایشیا کے جملہ سواحل کے تمدنوں کا اتحاد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا ؛

خلفائے راشدین کی سیرت اور کام

دُنیا کو فتح کرنے کی پہلی تحریک حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے مسلمانوں کو دی اور عمر فاروق رضؓ کے عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچی۔ حضرت علی رضؓ کے زمانے میں وہ تھوڑے دن کے لیے رُک گئی کیوں کہ ان کی خلافت اندرونی فسادات میں اتنی گھری رہی کہ مزید توسیع کا موقع نہ مل سکا۔ بہرحال پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کے بعد کی پہلی ہی نسل کے خاتمے تک اسلامی سلطنت دریائے سیحون سے شمالی افریقہ کے سرتیس (خورد) تک پھیل گئی۔ عربی خلافتِ اسلام کا آغاز صِفر سے ہوا تھا اور اب وہ دُنیا کی سب سے قوی حکومت بن چکی تھی ؛ حضرت ابوبکر رضؓ (۶۳۲ء تا ۶۳۴ء) جنھوں نے عرب کو فتح کیا اور امن سے بہرہ مند کیا، درویشانہ سادگی سے رہتے سہتے تھے۔ ان کا غریبانہ گھر سُنح میں تھا۔ وہیں ان کی بیوی حبیبہ رضؓ رہتی تھیں اور اپنے مختصر عہد کے ابتدائی ۶ مہینے تک وہ وہاں سے روزانہ اپنے دارالخلافت مدینہ آتے اور پھر واپس چلے جاتے تھے۔ انھیں کوئی معاوضہ نہ ملتا تھا کیونکہ حکومت کی آمدنی ہی کچھ نہ تھی[1]۔ مسجد نبویؐ کے صحن میں وہ جملہ امور ملک داری انجام

[1] ابن سعد ج ۳ ص ۱۳۰۔ ابن اثیر : اسد الغابہ ..... ۳۰ ، ۲۱۹

دیتے تھے ۔ ذاتی اوصاف اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر غیر متزلزل ایمان نے انھیں نو مولود اسلام کی تاریخ میں سب سے دل کش کردار بنایا اور "الصدیق" کا لقب دلوایا ہے[۱] نبی کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) عمر میں ان سے تین سال بڑے اور ان کے داماد بھی تھے ۔ عام روایات میں انھیں جتنی استقامت اور مضبوطی کا مالک بتایا جاتا ہے، حقیقت میں وہ یہ صفات کہیں زیادہ رکھتے تھے ۔ جسمانی طور پر وہ چھریرے بدن، تنک چہرے اور کھلتے ہوئے رنگ کے آدمی بیان کئے جاتے ہیں۔ ڈاڑھی میں خضاب کرتے اور ذرا جھونک لے کے چلتے تھے[۲]۔

اُن کے جانشین حضرت عمرؓ (۶۳۴ء تا ۶۴۴ء) مستعدی اور خداداد اوصاف سے متصف تھے ۔ زہد اور سادگی شعار تھا ۔ بلند قامت، مضبوط جُثے کے آدمی تھے ۔ سر کے بال اُڑے ہوئے تھے[۳]۔ خلیفہ ہونے کے بعد، کم سے کم کچھ مدت تجارت سے بسر اوقات کرتے رہے اور تمام عمر ایک بدوی شیخ کی طرح زندگی گزاری جس میں ظاہری نمائش و آرائش کا بالکل دخل نہ تھا ۔ حقیقت میں مسلمان مصنفوں میں وہ اپنے عدل و تقویٰ اور درویشانہ سادگی کے باعث سب سے محبوب و محترم ہیں اور جملہ صفات حسنہ کا جو ایک خلیفہ میں ہونی چاہئیں مجسمہ مانے جاتے ہیں ۔ اسلامی تاریخ کی رو سے قرن اول میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے بعد حضرت عمرؓ کا نام سب سے بڑھ کر عظمت کا حامل ہے۔

---

[۱] الصدیق کا ترجمہ عام طور پر راست باز کیا جاتا ہے لیکن دیکھو ابن سعد ج ۳ ص ۱۲۱ جہاں اس کے معنی صاحب ایمان بتائے گئے ہیں ۔

[۲] یعقوبی ۔ ج ۲ ص ۱۵۱ ۔ ۳ھ ۶ ص ۱۸۵ ۔

ان کی سیرت پر حرف زنی کی کہیں گنجائش نہیں مل سکتی اور بعد کے جملہ متدین حکم رانوں کے لئے وہ بہترین نمونہ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے 176/ پاس صرف ایک کرتا اور ایک چادرا رہتا تھا اور ان میں بھی جا بجا پیوند لگے ہوئے تھے[1] کھجور کے پتوں کا بچھونا تھا۔ دین مبین کے قیام، اعلائے کلمۃ اللہ، عربوں اور مسلمانوں کی سلامتی اور حفظ حقوق کے سوا اور کسی شے کی فکر نہ تھی۔ اصول کی پابندی میں ان کے تشدد کی روایات سے عربی کتابیں بھری پڑی ہیں۔ کہتے ہیں انھوں نے بدچلنی اور شراب خواری کی سزا میں خود اپنے بیٹے کے اتنے کوڑے لگوائے کہ وہ ہلاک ہوگیا[2]۔ ایک مرتبہ طیش وغضب کی حالت میں کسی داد خواہ بدوی کے چند درّے مار دئے تھے، پھر تھوڑی ہی دیر میں پشیمان ہوئے اور بدو سے درخواست کی کہ وہ بھی ان کی کمر پر اتنے ہی درّے لگائے۔ اس نے انکار کیا۔ تب حضرت عمرؓ اپنے آپ سے یہ کہتے ہوئے گھر چلے کہ:

> "او خطاب کے بیٹے، تو ادنیٰ تھا، خدا نے تجھے اعلیٰ کیا۔ گمراہ تھا، خدا نے تجھے ہدایت کی۔ ضعیف تھا، خدا نے تجھے قوی کیا۔ پھر اسی نے تجھے مالک رقاب، لوگوں پر حکم راں بنایا۔ اور جب ان میں سے ایک شخص تجھ سے مدد لینے آیا، تو تو نے اسے مارا۔ جب تو خدا کے

---

[1] ابن سعد - ج ۳ ص ۲۳۶ -

[2] دیار بکری: "تاریخ الخمیس" (قاہرہ ۱۳۰۲ھ) ج ۲ ص ۲۹۱؛ نویری "نہایۃ الارب" ج ۴ - (قاہرہ ۱۹۲۵ء) ص ۸۹؛

حضور میں جائے گا تو اُسے کیا جواب دے گا؟ [۱]

وہ جس نے اسلامی سن کا ہجرت سے آغاز کیا، دنیا ے معلوم کے وسیع اقطاعِ مفتوحہ کی سرداری کی، حکومت کا دفتر قائم اور نئی سلطنت میں نظم ونسق مرتب کیا، زندگی کے عین عروج کے وقت ایک عیسائی ایرانی غلام[۲] کے زہر میں بجھے خنجر کی ضرب سے الم ناک طریق پر شہید ہوا (۳ر نومبر ۶۴۴ء) یہ ناگہانی ضرب اس وقت لگائی گئی جب کہ وہ نماز جماعت کی امامت کر رہے تھے؛

تیسرے خلیفہ عثمان رضؓ نے کلام اللہ کو مسلمہ صورت میں مرتب کیا۔ ایران، آذربیجان اور ارمنیہ کے اقطاع کی فتح اُن کے عہد میں تکمیل کو پہنچی۔ وہ بھی متقی، نیک دل، سن رسیدہ بزرگ تھے مگر ایسے کم زور کہ اپنے حریص کنبے والوں کے تقاضے ٹالنے کی قوت نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے علّاتی بھائی عبداللہ کو والیٔ مصر مقرر کیا۔ یہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے کاتب وحی رہے اور ان کے الفاظ غلط لکھ دینے کا اُن پر الزام تھا[۳] فتح مکہ کے وقت جن دس افراد کے داخلے کی ممانعت کی گئی، یہ بھی انھی میں تھے۔ اسی طرح اپنے رضاعی بھائی ولید ابن عقبہ کو حاکم کوفہ بنایا جس نے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے چہرۂ مبارک پر تھوکا اور آپ نے اس کی مذمت فرمائی تھی[۴] اپنے چچیرے بھائی مروان

---

[۱] ابن اثیر۔ ج ۳ صلا۔ [۲] طبری۔ ج ۱ صفحہ ۲۷۲۲ و یعقوبی۔ ج ۲ صفحہ ۱۸۱؛

[۳] قرآن؛ انعام، ۹۳۔ بیضاوی، ج ۱ صفحہ ۳ (مصنف کا اشارہ غالباً آیۂ کریمہ ہٰذا "ومن اظلم ممن افترٰی علی اللّٰہ ... الآیہ" کی طرف ہے لیکن یہ علم نہیں آن کے خلاف ہے جو نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے کتاب کے مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں پایا جاتا۔ مترجم)؛

[۴] (مصنف نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا۔ روایت ناقابلِ اعتبار ہے۔ مترجم)؛

ابن الحکم کو جو آیندہ اموی خلافت پر بھی فائز ہوگیا۔ دیوان تفویض کیا۔ بہت سے بڑے بڑے عہدوں پر خلیفہ کے رشتہ دار قابض ہوگئے [۱]۔ کنبہ پروری کے الزامات کا عام چرچا ہوا۔ نظم ونسق کے غیر مقبول ہوجانے سے ناراضی کے جذبات پیدا ہوئے۔ انھیں خلافت کے تین قریشی امید واروں، یعنی حضرت علی رضؓ، طلحہ رضؓ اور زبیر رضؓ نے اور بھڑکایا [۲]۔ پیروان علی رضؓ نے کوفے میں سرکشی کا آغاز کیا مصر میں اسے زیادہ قوت حاصل ہوئی اور وہیں سے اپریل ۶۵۶ء میں پانسو شورہ پشت مدینے بھیجے گئے۔ ان بلوائیوں نے ہشتاد سالہ بزرگ خلیفہ کو اُن کے مکان میں محصور کرلیا اور اس وقت جب کہ وہ قرآن کا وہی نسخہ جسے خود مرتب کرایا تھا [۳] تلاوت کر رہے تھے، مکان پر یورش کی۔ محمد جو خلیفۂ اوّل اور حضرت عثمان رضؓ کے دوست ابوبکر رضؓ کا بیٹا تھا، گھر توڑ کر گھسا اور حملہ کرنے میں پہل کی [۴]۔ حضرت عثمانؓ پہلے خلیفہ تھے جن کا خون خود مسلمانوں کے ہاتھ سے بہایا گیا۔

---

[۱] (مصنف نے بلا حوالہ یہ بھی لکھ دیا ہو کہ خلیفہ (حضرت عثمان رضؓ) اپنے والیوں کے تحفے تحائف قبول کرتے تھے انہی میں والئی بصرہ کی بھیجی ہوئی ایک خوب صورت کنیز بھی تھی۔ یہ روایتیں بوجوہ ظاہر ناقابل اعتبار ہیں۔ مترجم)

[۲] (اس الزام کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور ان نیک خصال حضرات سے بدگمانی کرنا مذموم ہے۔ مترجم)

[۳] ابن بطوطہ (متوفی ۱۳۷۷ء) ج ۲ ص ۱۔ دعویٰ کرتا ہو کہ جب وہ بصرے گیا تو وہاں کی مسجد میں حضرت عثمان کا وہ نسخہ قرآن دیکھا جس کی سورہ بقرہ آیہ ۱۳۱ پر اُن کے خون کا دھبہ موجود تھا اور ابن سعد کی روایت ہو (ج ۳ ص ۵۲) کہ مجروح خلیفہ کا خون اسی آیہ کریمہ (اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین) تک بہ آیا تھا؛ نیز دیکھو: "زوِدْلاَ بِشیا" ج ۱ ص ۱۴۳۔

[۴] ابن سعد۔ ج ۳۔ ص ۵۸۔

(۱۷جون ۶۵۶ء۔) اسی پر اسلام کی "حکومت بزرگاں" کا وہ دور ختم ہوگیا جس میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی بدولت اہل مدینہ کا تقدس اور عظمت ووقار دلوں میں چھایا رہا تھا اور خلفا کی زندگی میں آپؐ کی تعلیم برابر ایک زندہ قوت فاعلہ بنی رہی تھی، شہادت عثمانؓ کے بعد حکومت کی خالی مسند کے لیے پہلے حضرت علیؓ اور اُن کے قریب المرتبہ حریفوں، طلحہ اور زبیر میں، پھر علیؓ اور ایک نئے مدعی، امیر معاویہ میں وہ نزاع ہوی کہ بالآخر مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہ گئیں۔ معاویہ بنی اُمیہ کی طرف سے انتقام لینے آٹھے تھے کیوں کہ مقتول خلیفہ اسی خاندان کے نمائندہ تھے ۔

بابِ شانزدہم

حضرت علی اور معاویہ کی کشمکش خلافت کے لئے

انتخابی خلافت

178

حضرت ابوبکرؓ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سابق ترین طرفداروں اور پختہ ترین دوستوں میں، ہم زاد کی مثل تھے۔ رسول اللہ صلعم کی آخری علالت میں انہی نے نماز کی امامت کی۔ پایۂ تخت مدینہ میں جو اکابر موجود تھے، ان کی رائے سے ایک قسم کا انتخاب عمل میں آیا اور اس میں وہی آں حضرت صلعم کے جانشین بنائے گئے۔ (۸ رجون ۶۳۲ء) منصب نبوّت کے سوا جس کا رحلت رسول اللہ صلعم کے ساتھ خاتمہ ہوگیا، آپ کے باقی فرائض و امتیازات حضرت ابوبکرؓ کے تفویض ہوئے "خلیفہ رسول اللہؐ" کا خطاب جو آن کے نام کے ساتھ بولا جاتا ہے شاید خود انھوں نے استعمال نہیں کیا۔ قرآن مجید میں صرف دو جگہ "خلیفہ" کا لفظ آیا ہے (بقرہ: ۳۰۔ ص: ۲۶) مگر کسی اصطلاحی معنی میں نہیں ہے نہ ایسا کوئی اشارہ پایا جاتا ہے کہ اسے نبی کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) کے

جانشین کے لیے اطلاق کرنا منظور تھا[1]۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنا جانشین حضرت عمرؓ کو نامزد کیا۔ واقعات کی رو سے وہی اس منصب کے وارث تھے اور کہتے ہیں کہ شروع میں اُنھوں نے خلیفہ خلیفۂ رسول اللہ صلعم کے الفاظ میں یہ اصطلاح استعمال کی تھی جسے آگے چل کر طوالت کی وجہ سے مختصر کر لیا گیا[2]۔ خلیفۂ ثانی کو یہ امتیاز بھی دیا جاتا ہے کہ تمام اسلامی افواج کے حاکم اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اوّل انہی کو "امیر المومنین" کے خاص لقب سے ملقب کیا گیا تھا۔ قرون وسطیٰ کے مسیحی مصنفوں نے اسی کو "میرا مولین" بنالیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وفات سے قبل حضرت عمرؓ نے ان چھ اشخاص کی ایک جماعت خلیفہ کے انتخاب کے واسطے نامزد کی تھی :— علیؓ ابن ابی طالب۔ عثمانؓ ابن عفان۔ زبیر ابن العوام طلحہؓ ابن عبداللہ۔ سعدؓ ابن الوقاص اور عبدالرحمٰنؓ ابن عوف[3]۔ یہ بھی شرط کردی کہ میرا بیٹا منتخب نہیں کیا جائے گا۔ اس جماعت کا نام "الشوریٰ"
تھا۔ اس میں سب سے ممتاز و مسن صحابۂ رسول اللہ صلعم جو اس وقت موجود 179
تھے، شامل کئے تھے اور یہ بات پتہ دیتی ہے کہ موروثی بادشاہی کے خیال پر قبائلی شیخ کا قدیم عربی تصور غالب رہا تھا۔ تیسرے خلیفہ، حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ پر ترجیح کا موثر سبب بھی یہی ہوا کہ وہ عمر میں حضرت علیؓ سے بڑے تھے (۶۴۴ء–۶۵۶ء) وہ اپنے دونوں پیش رووں کے خلاف جو تمام

---

۱ (خلیفہ کا لفظ حاکم کے لئے، جیسا کہ مصنف نے لکھا، قرآن میں وارد ہے۔ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشینوں کے واسطے اس لفظ کی ایک سند سورۂ نور کی آیۂ استخلاف: وعد اللہ الذین آمنوا منکم — الآیہ مانی گئی ہے۔ مترجم)۔

۲ ابن سعد۔ ج ۳ ص ۲۰۲۔

۳ ایضاً۔ ص ۲۴۵۔

مہاجرین کے قائم مقام تھے، شرفائے بنی اُمیّہ کے نمائندہ تھے۔ مگر ان خلفا میں سے کسی نے موروثی حکومت کی بنا نہیں ڈالی ؛

حضرت عثمان رضہ کی شہادت پر، حضرت علی رضہ کی خلافت کا مسجدِ نبوی میں ۲۴ جون ۶۵۶ء کو اعلان کیا گیا۔ قریب قریب ساری اسلامی دنیا نے ان کی خلافت تسلیم کی۔ یہ چوتھے خلیفہ، رسول اللہ صلعم کے عم زاد بھائی، آنحضرت ؐ کی عزیز بیٹی فاطمہ رضہ کے شوہر، دختری اولاد میں صرف دو زندہ رہنے والے لڑکوں کے (یعنی حسن رضہ و حسین رضہ کے) باپ اور ایمان والوں میں دوسرے یا تیسرے شخص تھے۔ وہ خوش مزاج متقی اور شجاع تھے۔ اہل النص والتعیین[1] کا گروہ پوری قوت سے دعویٰ کرتا تھا کہ اللہ اور اس کے رسول ؐ نے شروع سے اور صاف صاف علی رضہ کو وارث جائز تجویز کیا تھا مگر پہلے تین خلفا نے چالاکی سے انھیں اپنے حق سے محروم کر دیا ؛

خلافت علی رضہ

حضرت علی رضہ کے سامنے پہلا سوال یہ تھا کہ اپنے دو حریفوں، طلحہ رضہ اور زبیر رضہ[2] سے کیوں کر نمٹا جائے۔ یہ مکی گروہ کے نمائندہ تھے اور حجاز و عراق میں ان کے متبعین نے علی رضہ کی خلافت ماننے سے انکار کر دیا۔ رسول اللہ صلعم کی سب سے عزیز بیوی عائشہ صدیقہ رضہ جو اب اُمّ المومنین تھیں

---

[1] شہرستانی۔ مثلاً (مصنف کے بیان سے غلط فہمی کا احتمال ہے۔ مذکورۂ بالا گروہ عرصے کے بعد بنا اور اس کے دعوے میں قوت و شدت بہت مدت کے بعد بنی عباس وغیرہ کی تبلیغ کے باعث پیدا ہوئی تھی۔ مترجم)

[2] حضرت زبیر رضہ کی والدہ رسول اللہ صلعم کی پھپھی تھیں ؛

حضرت عثمان کے خلاف شورش کی طرف سے اغماض کرتی رہیں مگر بصرے میں حضرت علیؓ کے مخالفین میں شریک ہوگئیں۔ ان کی شادی اس قدر کم سنی میں ہوئی تھی[1] کہ اپنے باپ کے گھر سے وہ کھلونے ساتھ لائی تھیں۔ حضرت علیؓ سے انھیں بڑی نفرت تھی جیسی کسی خود دار خاتون کو اپنی تذلیل کی بنا پر ہوجاتی ہو کیوں کہ ایک مرتبہ وہ قافلے میں پیچھے رہ گئی تھیں تو حضرت علیؓ نے اُن کی پارسائی پر شک کیا تھا۔ یہاں تک کہ خدائے عزّوجل نے اُن کے حق میں وحی نازل فرمائی (سورۂ نور: ۱۱ تا ۱۹)۔ غرض بصرے کے باہر حضرت علیؓ نے اس جماعت کا بہ تاریخ ۹ دسمبر ۶۵۶ء مقابلہ کیا اور شکست دی۔ حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں اور باغی جنگ آزما اسی کے گرد جمع ہوکر لڑے تھے لہٰذا یہ جنگ "یوم جمل" موسوم ہے۔ اسی معرکے میں علیؓ کے دونوں حریف کام آئے۔ اُنھوں نے کشادہ دلی سے مرنے والوں کا غم کیا اور اعزاز کے ساتھ انھیں دفن کرایا[2]۔ حضرت عائشہؓ اسیر کرلی گئی تھیں مگر اُن سے بڑی عزّت حرمت کا برتاؤ کیا گیا اور ملک کی "خاتونِ اولیٰ" ہونے کے اعتبار سے وہ جیسی توقیر کی مستحق تھیں، وہی مرعی رکھی گئی اور واپس مدینہ منوّرہ بھجوا دی گئیں۔ اس طرح یہ معرکہ ختم ہوا۔ یہی پہلا موقع تھا اگرچہ ظاہر ہو کہ آخری کسی طرح نہ تھا کہ مسلمان، مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ وہ خاندانی محاربات جو بار بار اسلامی دنیا میں زلزلہ ڈالتے اور بعض اوقات اس کی جڑیں تک ہلاتے رہے، یہ ان کی محض ابتدا تھی۔

---

[1] ابن ہشام کے قول کے بموجب شادی کے وقت ان کی عمر نو یا دس سال کی تھی۔ صفحہ ۱۰۰۱

[2] حضرت زبیرؓ کی قبر کے گرد ایک گاؤں آباد ہوگیا ہے۔

سے ان کی حکومت بظاہر محفوظ ہوگئی تو حضرت علی رضؓ نے نئے دار الخلافہ کوفے میں اپنے دور کا آغاز یوں کیا کہ اکثر وُلاۃ کو جو ان کے پیش روؤں نے مقرر کئے تھے، معزول کر دیا اور باقی ماندہ سے وفاداری کے حلف اٹھوائے۔ ان میں سے ایک یعنی معاویہ ابن ابی سفیان کی قوت کا، کہ شام کے والی اور حضرت عثمان رضؓ کے عزیز قریب تھے، انھوں نے اندازہ نہ کیا تھا۔ اب یہی معاویہ شہید خلیفہ کا انتقام لینے میدان میں نکل آئے۔ انھوں نے دمشق کی مسجد میں حضرت عثمان رضؓ کی خون آلود قمیص اور ان کی بیوی نائلہ کی انگلیاں، جو شوہر کو بچانے میں خونیوں نے کاٹی تھیں[1]، لوگوں کو دکھائیں۔ انٹونی کی سی فصاحت اور تدبیروں سے مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کیا۔ حضرت علی رضؓ کی اطاعت قبول کرنے سے باز رہے اور انھیں اس پیچ میں لانے کی کوشش کی کہ یا تو رسول اللہ صلعم کے خلیفۂ جائز کے قاتلوں کو پیش کریں یا اُن کے جرم میں اپنی شرکت تسلیم کریں جس کے معنی یہ تھے کہ وہ خلافت کے قابل نہ رہے۔ لیکن دراصل بنائے نزاع شخصی اور خاندانی بھی نہ تھی بلکہ ان سے زیادہ گہری ہوگئی تھی۔ اصلی سوال یہ تھا کہ کوفہ اور ال عراق آیندہ اسلامی امورِ جہاں داری کو طے کریں گے یا دمشق اور شام کی سیادت مانی جائے گی؟ مدینہ طیبہ کو حضرت علی رضؓ نے خلیفہ ہونے کے تھوڑی مدت بعد ہی، ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا (۶۵۶ء) اور وہ اب خارج از بحث ہو چکا تھا۔ دور دراز ملکوں کی فتوحات نے مرکز ثقل کو شمال کی طرف منتقل کر دیا تھا۔

---

[1] فخری۔ ص ۱۲۵ و ۱۲۶۔

آخر فرات کے مغربی کنارے پر، رقہ کے جنوب، صفین کے میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل ہوئیں۔ بروے تاریخ حضرت علیؓ کے لشکر میں پچاس ہزار عراقی تھے۔ امیر معاویہ کی فوج شامیوں پر مشتمل تھی۔ فریقین میں سے کوئی بھی دوٹوک جنگ کرنے کا زیادہ خواہش مند نہ تھا۔ بے دلی سے ہفتوں تک معمولی جھڑپیں ہوتی رہیں۔ آخری جنگ ۲۶ جولائی ۶۵۷ء کے دن واقع ہوئی۔ مالک اشتر کی قیادت میں لشکر علیؓ کو فتح ہونے والی تھی جب کہ امیر معاویہ کے شاطر سپہ سالار عمرو ابن العاص نے ایک چال کھیلی۔ یکایک نیزوں پر بندھے ہوئے قرآن مجید کے نسخے ہوا میں بلند ہوئے۔ یہ گویا علامت تھی کہ فیصلہ ہتیاروں کی بجائے کتاب اللہ سے کرنا مقصود ہے۔ جنگ رک گئی۔ اپنے متبعین کے اصرار سے سادہ دل علیؓ نے امیر معاویہ کی تجویز کہ معاملہ تحکیم سے طے کیا جائے اور مسلمانوں کا خون نہ بہنے دیا جائے، قبول کرلی۔ یہ تحکیم یا ثالثی یقیناً "کلام اللہ کے مطابق"[۱] ہونے والی تھی۔ ان الفاظ کا جو کچھ بھی مطلب لیا جائے، حضرت علیؓ نے اپنی دلی اور صحیح رائے کے خلاف اپنا نائب ابوموسیٰ اشعریؓ کو مقرر کیا۔ ان کے تقویٰ میں شبہ نہیں لیکن حضرت علیؓ کی حمایت میں چنداں سرگرم نہ تھے۔ ان کے مقابلے میں معاویہ نے عمرو ابن عاص کو پیش کیا جو عربوں میں ذہین ترین مرد سیاسی کا لقب رکھتے ہیں[۲]۔ دونوں حکموں کے ہاتھ میں تحریری دستاویز لکھ کر فیصلے کا پورا اختیار دیا گیا تھا اور چار چار سو

۱؎ تحکیم کی دستاویز کے لئے دیکھو دینوری، ص ۲۰۶

۲؎ مسعودی ج ۴ ص ۳۹۱۔ یہ ذکر پہلے آیا اور اگلے باب میں بھی ہماری نظر سے گزرے گا۔

گواہوں کی معیت میں ان کا عام اجلاس جنوری ۶۵۹ء میں بمقام اذرح منعقد ہوا۔ یہ جگہ معان اور بترا کے عین وسط میں دمشق تا مدینہ کی شاہ راہ پر واقع تھی۔ صحت کے ساتھ یہ پتہ چلانا کہ اس یادگار جلسہ مشاورت میں کیا کیا ہوا، دشوار ہے۔ کئی ماخذوں میں مختلف بیانات ملتے ہیں[1] عام روایت یہ ہے کہ دونوں حکم متفق ہو گئے کہ دونوں بڑے مدعی معزول کر دئے جائیں اور ایک "لامعلوم" شخص کے انتخاب کا میدان تیار کیا جائے مگر جس وقت کہ بزرگ تر حکم، یعنی ابوموسیٰؓ نے کھڑے ہو کر اپنے خلیفہ کی حکومت کو ختم و منسوخ کرنے کا اعلان کیا، تو عمرو نے اپنے ہم صفیر سے وعدہ خلافی کی اور معاویہ کی خلافت کی توثیق کر دی۔ لیکن پہلے ول ہاوزن اور پھر پارے لامانس[2] کے تنقیدی مطالعے کے نتائج سے ایسا پایا جاتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت عراقی گروہ کا نظریہ پیش کرتی ہے۔ ہمارے زمانے تک جو ماخذ سلامت رہے وہ زیادہ تر اسی گروہ کے لکھے ہوئے ہیں جو بنی امیہ کے جانی دشمن بنی عباس کے دور میں پھولا پھلا تھا۔ مجلس تحکیم میں غالباً واقعہ یہ ہوا کہ دونوں حکموں نے اپنے اپنے بڑے دعوے داروں کو معزول کر دیا۔ جس کے معنی یہ تھے کہ علیؓ ہار گئے۔ معاویہ کے پاس کوئی خلافت نہ تھی کہ اس سے معزول کئے جاتے۔ وہ محض ایک صوبے کے والی تھے۔ مگر خود تحکیم کے قبول کر لئے جانے سے ان کا مرتبہ علیؓ کے برابر بلند ہو گیا۔ اور حضرت

---

[1] دیکھو طبری - ج ۱ ص ۳۳۴۱ مسعودی - ج ۴ ص ۳۹۶ یعقوبی ج ۲ ص ۲۲۰ - فخری ص ۱۲۴

[2] دیکھو اس کی فرانسیسی کتاب خلافت معاویہ پر۔ (بیروت ۱۹۰۸ء) باب ہفتم۔ نیز ول ہاوزن کی کتاب کا انگریزی ترجمہ: "دی عرب کنگ ڈم اینڈ اٹس فال" (کلکتہ ۱۹۲۷ء) باب دوم۔

علیؓ کی حیثیت گر گئی کہ وہ خالی مدعی رہ گئے۔ حکموں کے فیصلے نے علیؓ کو
اُن کے واقعی منصب سے محروم کر دیا اور معاویہ کو محض ایک فرضی 182
دعوے سے، جس کے اعلان کی بھی اُنھوں نے ہنوز جرأت نہ کی تھی، قائم کر دیا۔
تحکیم کا سانگ ختم ہونے کے بھی دو سال بعد کہیں ۶۶۰ء میں جا کے
معاویہ نے بیت المقدس میں اپنی خلافت کی منادی کرائی ہے۔

اصول تحکیم قبول کرنے سے حضرت علیؓ کو کئی کئی نقصان اُٹھانے
پڑے: خود اُن کے متبعین میں ایک گروہ کثیر کی طرف داری مخالفت سے
بدل گئی۔ یہ خوارج[1] (یعنی ساتھ چھوڑ دینے والے) کہلاتے تھے اور
ملت اسلامی میں پہلا جداگانہ فرقہ بن کے حضرت علیؓ کے سخت دشمن
ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے "لاحکم الا اللہ" کا نعرہ[2] اختیار کیا اور چار ہزار[3]
کی تعداد میں عبداللہ ابن وہب الراسبی کے ماتحت سرکشی کی۔ نہر نہروان
کے کنارے پر حضرت علیؓ نے اُن کے پڑاؤ پر حملہ اور قریب قریب
سب کو فنا کر دیا (۶۵۹ء) لیکن پھر بھی وہ دوسرے ناموں سے خروج کرتے
اور عباسیوں کے زمانے تک خلافت کا ناک میں دم کرتے رہے۔ ۲۴
جنوری ۶۶۱ء کی صبح حضرت علیؓ کوفے کی مسجد کو جا رہے تھے کہ ایک
زہر میں بجھی تلوار سے آپ کی پیشانی پر زخم لگایا گیا۔ تلوار دماغ تک
گھس گئی۔ یہ وار ایک خارجی عبدالرحمٰن ابن ملجم نے کیا۔ اپنی کسی دوست

---

[1] انھیں حرورا (یا بقول یاقوت "حروراء" مقام کے نام پر) "حروریہ" بھی کہتے ہیں۔
[2] فخری، ص ۱۳۰۔ نیز دیکھو قرآن مجید: سورۂ یوسف، ۶۷ (: ان الحکم الا للہ۔ سے بظاہر
مراد ہے۔ مگر مصنف نے آیۂ کریمہ کا نشان ۴۰ لکھا ہے۔ مترجم)
[3] شہرستانی یہ تعداد ۱۲ ہزار بتاتا ہے۔

عورت کے عزیزوں کا جو نہروان میں قتل کئے گئے تھے بدلہ لینا وجہ تحریک ہوا تھا۔ روایت کہتی ہے کہ تین آدمیوں نے کعبۃ اللہ میں حلف اٹھایا تھا کہ امت اسلامی کو ایک ہی دن تین فتنہ پرور افراد یعنی حضرت علی رضؓ، امیر معاویہ، اور عمرو ابن العاصؓ سے نجات دلائیں گے۔ ابن ملجم بھی ان میں شامل تھا۔ لیکن یہ روایت کچھ ایسی فسانہ نما ہے کہ اسے سچ ماننا مشکل ہے۔ حضرت علی رضؓ کوفے کے قریب آبادی سے الگ مقام میں دفن ہوئے یہ اب نجف میں مشہد علی رضؓ کہلاتا اور دنیائے اسلام کی ایک بڑی مرکزی زیارت گاہ بن گیا ہے۔ اپنے شیعہ طرف داروں میں خلیفہ رابع بہت جلد سب سے ممتاز اور ایسے ہی "اللہ کے ولی" بن گئے جس طرح کہ اللہ کے رسول، پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تھے۔ ان کا زندگی میں اتنا اثر نہ تھا جتنا مرنے کے بعد وہ صاحب اثر ثابت ہوئے۔ زندگی بھر میں جتنا انہوں نے کھویا تھا، شہید تسلیم ہونے کے بعد سب دوبارہ پالیا۔ اگرچہ وہ اوصاف جن سے ایک قائد اور سیاست داں بنتا ہے، یعنی دور بینی، باخبری، عزم، موقع شناسی، ان کی حضرت علی رضؓ میں کمی تھی تاہم ایک بہترین عربی فرد کی صفات رکھتے تھے۔ رزم کے مرد میدان، بزم مشاورۃ میں عقل مند مشیر، تقریر میں فصیح اللسان، دوستی

---

۵۱ دیکھو دینوری ص ۲۲۷

۵۲ شیعہ روایتوں میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت علی رضؓ نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ اُن کی نعش اونٹ پر رکھ کر اسے بے نکیل چھوڑ دیا جائے اور جہاں وہ بیٹھے، وہیں اُن کی قبر بنائی جائے۔ اسی کے مطابق عمل کیا گیا۔ بنی اُمیہ کے زمانے اور بعد تک یہ جگہ مخفی رکھی گئی یہاں تک کہ ہارون الرشید کا اتفاقیہ یہاں (۷۹۱ء) میں گزر ہوا۔ مقبرے کے سب سے پہلے مفصل حال کے لئے دیکھو ابن حوقل کی "مسالک والممالک" (لائیڈن ۱۸۷۳ء) ص ۱۶۳۔

میں وفادار، دشمنی میں فراخ دل، غرض مُسلم شرافت وفتوّت (= مردانگی) کا وہ بے مثل نمونہ اور اسی کے ساتھ عربی روایات کے سلیمان ہیں جن کے نام کے ساتھ بے شمار اشعار، امثال، مواعظ و محاضرات منسوب کر دئے گئے ہیں۔ ان کا رنگ سانولا۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں چندیا کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ لمبی اور گھنی سفید ڈاڑھی تھی۔ میانہ قامت اور فربہ اندام تھے[1]۔ ان کی تلوار ذوالفقار (= کمر کے فقرے کاٹنے والی) وہ تھی جس سے جنگ بدر کے روز رسول اللہ صلعم نے کام لیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی اکثر عربی تلواروں پر یہ بیت کندہ ملی ہے:

"لا سیف الا ذوالفقار ولا فتیٰ الا علی"

کہ ان سے یہ نام لافانی ہوگیا۔ فتیٰ کے معنی جوان جنگ آزما کے ہیں۔ قریب زمانے کی فتیان تحریک نے اپنا پہلا فتیٰ اور نمونہ علیؓ کو مانا تھا اگرچہ اس کی کئی رسوم اور علم، قرون وسطیٰ کے فرنگی عہد شجاعت کی جھلک دکھاتے اور جدید کشافہ (= اسکاوٹ) تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں۔ غرض حضرت علیؓ کو ساری اسلامی دنیا نے شجاع اور دانا، اور فتیان اور بہت سے صوفیہ کے گروہ نے، لائق مثال، عالی خیال، اور خود شیعانِ علی نے معصوم اور مبرّیٰ عن الخطا سمجھا ہے بلکہ اُن کے غُلاۃ (یعنی انتہاپسندوں) نے خدا کا اوتار مانا ہے۔ ان کی دنیاوی زندگی قریب قریب بالکل ناکامیاب رہی لیکن بعد از وفات اُن کے اثرات پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے سوا اور سب سے بڑھے رہے۔ نجف میں آج تک اُن کے مشہد پر زائروں کا ہجوم، پھر قریب ہی کربلا میں ان کے

---

[1] مسعودی "تنبیہ" صفحہ ۲۹۷۔

فرزند حضرت حسینؓ کے روضے پر، جو شیعوں کے ولیٔ کامل اور سید الشہدا ہیں، کثیر اژدہام۔ اور تمام شیعہ دنیا میں ہر سال محرم کی دسویں کو مصائبِ حسینؓ کی تمثیل نمائی گواہی دیتے ہیں کہ ممکن ہو کسی مسیحا کی موت زندگی سے زیادہ اس کے لئے مفید ہو!

خلافت کے دَور

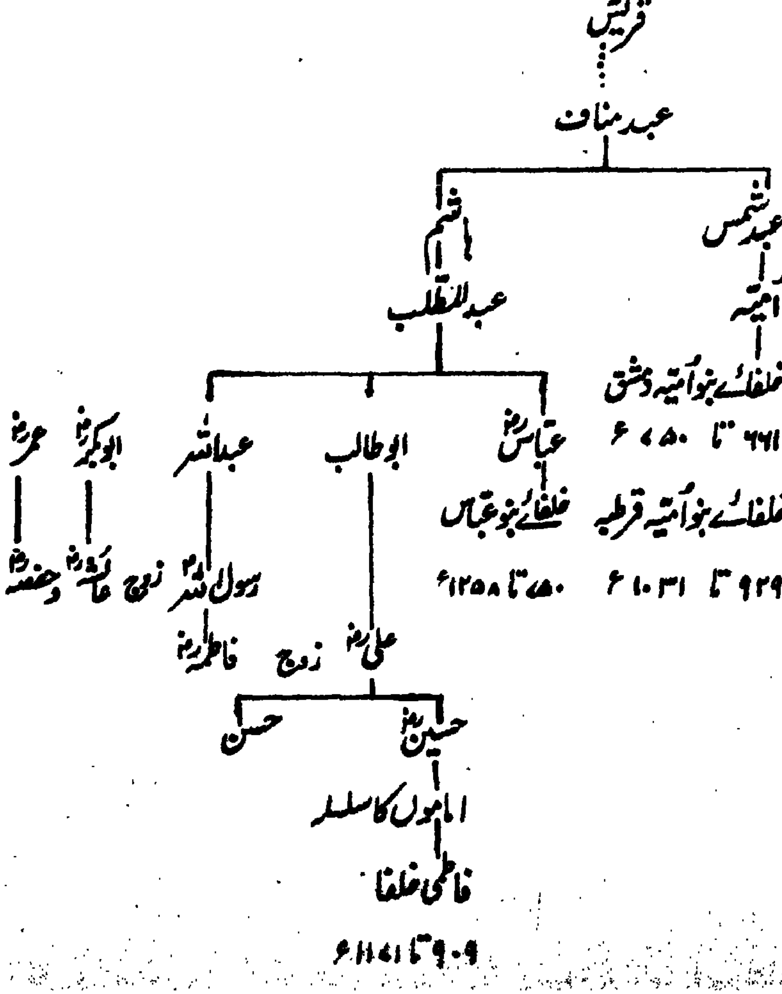
[1] حضرت علیؓ کی شہادت (۶۶۱ء) نے خلافت کے اس دَور کو جسے جمہوری کہہ سکتے ہیں اور جو حضرت ابوبکرؓ سے (۶۳۲ء میں) شروع ہوا تھا، ختم کر دیا[2] اس دور کے چاروں خلفا کو عرب مؤرخ "راشدین" (یعنی پابند دین) کی صفت سے یاد کرتے ہیں۔[3] خلافت کے دوسرے دور کے بانی امیر معاویہ اموی نے، جو دنیا دار شخص تھے[4]، اپنے فرزند یزید کو جانشین نامزد کیا اور موروثی بادشاہی کی بنا رکھی۔ وراثت کا اصول جو خلافت میں اس موقع پر داخل کیا گیا، آیندہ پوری طرح کسی نے ترک 184/ نہ کیا۔ اسلامی تاریخ میں اموی خلافت پہلی ملوکیت تھی اگرچہ بیعت کی رسم کے ذریعے جس میں اکابر قوم حقیقتاً یا مجازاً خلیفہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اظہار اطاعت کرتے تھے، انتخاب کا ڈھونگ قائم رکھا گیا۔ دمشق کی اموی خلافت (۶۶۱ تا ۷۵۰ء) کی جانشین عباسیوں کی خلافتِ بغداد (۷۵۰ تا ۱۲۵۸ء) ہوئی۔ فاطمی خلافت (۹۰۹ تا ۱۱۷۱ء) کا بڑا مرکز قاہرہ اور شیعہ فرقے کی سب سے اہم خلافت یہی تھی۔

[1] ابن خلدون، مقدمہ (قاہرہ ۱۲۸۴ھ) صـ۱۲۷ نیز دی سلین کا فرانسیسی ترجمہ مع حواشی۔ (پیرس ۱۸۶۳ء)

بنی اُمیّہ کی ایک اور خلافت قرطبہ (اندلس) میں ۹۲۹ سے ۱۰۳۱ء تک چلی۔ اسلام کی آخری بڑی خلافت غیر عرب، عثمانی ترکوں کی قسطنطنیہ میں قائم ہوئی (سنہ ۱۵۱۷ تا ۱۹۲۴ء) مگر ۱۹۲۲ء کے نومبر میں انقرہ کی مجلس ملی نے ترکی کے جمہوریہ ہونے کا اعلان کیا۔ سلطان خلیفہ محمد سادس کو معزول کر کے ان کے عم زاد بھائی عبدالمجید کو صرف خلیفہ بنایا۔ سلطانی سے محروم کر دیا۔ اور مارچ ۱۹۲۴ء میں خود خلافت ہی کو اُڑا دیا[۵]۔

---

۵ عرب خلافتوں کا نسبی تعلق ذیل کے شجرے سے معلوم ہوگا :



Political Nature

خلافت کی سیاسی نوعیت[۱]

185

یہاں ہمیں اس عام مغالطے میں پڑنے سے بچنا چاہیئے کہ خلافت کوئی مذہبی عہدہ تھی۔ اس باب میں روما کی مذہبی سلطنت کے حاکم اور خلیفہ اسلام میں مقابلہ کرنا یا عیسائیوں نے جو آج کل دینی اور دنیاوی حدودِ اختیارات الگ الگ بنائے ہیں، ان کو مثال میں لانا غلط فہمی کا موجب ہوگا۔ امیرالمومنین کے لقب سے خلیفہ کا عسکری عہدہ نمایاں ہوتا ہے۔ بہ حیثیت امام وہ بے شک نماز جماعت پڑھاتا اور جمعے کا خطبہ سناتا تھا۔ لیکن یہ وہ کام ہے جو ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان انجام دے سکتا ہے۔ رسول اللہ صلعم کی جانشینی یا خلافت کے معنی ملک کی حکومت پر ان کی جگہ فائز ہونا تھا۔ خدا کے رسول اور صاحبِ وحی وکتاب ہونے کے لحاظ سے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا کوئی جانشین نہ ہوسکتا تھا۔ خلیفہ کا مذہب سے تعلق محض اس کی حفاظت کا ذمہ دار ہونا تھا۔ وہ دین کا اسی طرح حامی تھا جس طرح یورپ میں کوئی بھی مسیحی بادشاہ حامیٔ دین فرض کیا جاتا تھا۔ وہ الحاد ولا مذہبی کا سدباب کرتا، کفار سے لڑائیاں لڑتا۔ دارالاسلام کی حدود وسیع کرتا تھا اور ان سب امور میں اپنی دنیاوی اسلحہ کی قوت سے کام لیتا تھا۔[۱] کچھ مدت گزرنے پر مکہ، مدینہ اور دوسرے مرکزوں میں ایسے اصولی فقیہوں کو فروغ ہوا جنھیں دمشق، بغداد و قاہرہ کی اسلامی تخت گاہوں میں واقعات کی رفتار سے آگہی نہیں رہی تھی اور انھوں نے خلیفہ کے اوصاف و امتیازات اور کارہائے

۱؎ اس سلسلے میں دیکھو آرنلڈ کی کتاب "دی کے لی فیٹ" (آکسفورڈ ۱۹۲۴ء) ص ۹ تا ۱۴۔

منصب کا بہت باریکی سے تعین کیا۔ الماوردی[۵۱] (متوفی ۱۰۵۸ء) اپنے شمالی نظامِ مملکت کے رسالے میں، النسفی (متوفی ۱۱۴۲ء) اپنی تحریر میں، ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء) اپنے شہرۂ آفاق تنقیدی مقدمے میں[۵۲] اور بعد کے مصنف جو سنت والجماعت (یعنی راسخ العقیدہ) فریق کے نمائندہ ہیں خلیفہ کے لئے یہ شرطیں مرتب کرتے ہیں: قبیلہ قریش کا فرد ہو۔ مرد اور بالغ ہو۔ جسم و دماغ صحیح رکھتا ہو نیز ہمت و قوت اور دفاعِ سلطنت کے واسطے جو اوصاف ضروری ہیں، بیعت کے ذریعے قوم کی اُس نے اطاعت کا اقرار حاصل کر لیا ہو۔ اس کے برعکس فرقہ شیعہ، خلافت کی چنداں پروا نہیں کرتا، امامت پر زیادہ زور دیتا اور اس منصب کو خاندان علیؓ تک محدود رکھتا ہے۔ اُس کے نزدیک رسول اللہ صلعم نے حضرت علیؓ کو بروئے نص، یعنی حکم الٰہی سے اپنا جانشین نامزد کیا تھا اور پھر اس بزرگ منصب کے ضروری اوصاف علیؓ کی اولاد میں مشیت الٰہی سے منتقل ہوتے[۵۳]۔ سُنیوں کی دانست میں خلیفہ کے فرائض میں، منجملہ دوسرے امور کے، دین اور اسلامی سلطنت کی حفاظت و بقا (خصوصاً "حرمین شریفین" یعنی مکہ معظمہ 186
اور مدینۂ طیبہ کی حفاظت)، ضرورت کے وقت اسلامی جہاد کا اعلان کرنا سرکاری عہدہ داروں کا تقرر، وصول مال گزاری اور بیت المال کا انتظام خطا کاروں کی تعزیر اور احقاقِ حق، شامل تھے تب خود اس کے حقوق یہ تھے کہ سکّے اور جمعے کے خطبے میں اس کا نام لیا جائے۔ اہم سرکاری تقریبات میں وہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کی چادر مبارک (بُردہ)

---

۵۱ ص۴۔　　۵۲ مقدمہ، ص۱۶۱

۵۳ ماوردی۔ ص۳۔ نسفی، "عمدۃ عقیدۃ اہل السنۃ" (لندن ۱۸۴۳ء) ص۲۸

زیب دوش کرے اور اس قسم کے تبرکات جیسے عصا، مُہر، نعلین، دندان و موے مبارک جو آں حضرت صلعم کے بتائے جاتے ہیں، اس کی تحویل میں رہیں[1]؛

یورپ میں یہ خیال کہ اسلامی خلیفہ پاپائے روما کی طرح تمام دنیا کے مسلمانوں پر روحانی اقتدار رکھتا ہے، اٹھارویں صدی عیسوی کے بھی کہیں آخری نصف میں شائع ہوا تھا۔ سب سے اوّل یہ مغالطہ پھیلانے والوں میں قسطنطنیہ کے ارمن مصنف ڈوہوسن کی کتاب "تابل یو ژن رال ..... اوتومان" (مطبوعہ پیرس، ۱۷۸۸ء) تھی[2] یہ موقع شناس عبدالحمید ثانی نے دول یورپ کی نظروں میں اپنا وقار بڑھانے کی غرض سے جو اس وقت ایشیا اور افریقہ کے اکثر مسلمانوں کی حاکم بن گئی تھیں، اسے خوب اُچھالا؛ گزشتہ صدی کے اواخر میں اتحاد بین الاسلام ("جامعہ اسلامیہ") کی ایک تحریک پیدا ہوئی تھی اس کے مقاصد اچھی طرح معین نہ تھے لیکن مسیحی طاقتوں کی مُتفقہ طور پر مزاحمت کرنے میں خاص طور سے کوشاں رہی۔ اس نے سلطنت ترکی کو مرکز اتصال بنا کر خلافت کی عالم گیر مذہبی نوعیت پر خواہی نخواہی بہت زور دیا؛

---

[1] یہ تبرکات (= ذخائر نبویہ) مصر کی فتح سے واپسی کے وقت سلطان سلیم اپنے ساتھ قسطنطنیہ لایا تھا۔ اور بہ حیثیت مسلمانوں کے آخری خلفا ہونے کے عثمانی سلاطین اُن کے محافظ و متولی رہے۔ انھیں اسی وقت سے قصر سلطانی کے حصار کے اندر ایک خاص حویلی میں محفوظ کر دیا گیا اور خلافت کے برگزیدہ منصب کا سب سے بیش بہا نشان امتیاز سمجھ کر ان کی بڑی حرمت کی جاتی رہی ہے؛

[2] جلد اوّل ص ۲۱۳ و مابعد۔

جزوسوم

اموی اور عبّاسی سلطنتیں

باب ہفت دہم[17]

اُموی خلافت - بنائے خاندانِ شاہی از امیر معاویہ

سنہ ۴۰ھ (م ۶۶۱ء) میں بہ مقام اِیلیا (بیت المقدس) امیر معاویہ کی خلافت کا اعلان کیا گیا[1]۔ ان کی تخت نشینی سے صوبائی دار الحکومت، دمشق ایک اسلامی سلطنت کا پائے تخت بن گیا اگرچہ یہ سلطنت ذرا محدود ہو گئی تھی۔ مصر کو تو تحکیم کے بعد ہی معاویہ کے دست راست عمرو ابن العاص نے حامیان علیؓ سے چھین لیا تھا لیکن اہل عراق نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد ان کے بڑے فرزند، امام حسنؓ کو (جو حضرت فاطمہؓ کے بطن سے تھے) وارث جائز تسلیم کیا۔ اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ دونوں شہروں میں، سفیانیوں کی وکالت سے لوگوں میں امیر معاویہ کی وفاداری کا کچھ بہت جوش نہ پیدا ہو سکا کیوں کہ یہ وہ خاندان تھا جو مکہ فتح ہونے تک دولت ایمان سے بہرہ مند نہ ہو سکا تھا اور اس لئے ان کا اسلام سچے عقیدے کی بجائے مصلحت پر مبنی سمجھا جاتا تھا۔

---

[1] طبری - ج ۲ ص ۴ - نیز دیکھو مسعودی، ج ۴ ص ۱۴

ادھر حضرت حسنؓ مسندِ فرماں روائی کی بجائے حرم سرا میں زیادہ خوش رہتے ۱۹۵
تھے اور اُن کی دل چسپیاں امورِ جہاں داری سے زیادہ دوسرے میدانوں
میں تھیں۔ چناں چہ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انھوں نے اپنے قابل تر
حریف کے حق میں دست برداری لکھ دی[۱] اور عیش و راحت کی زندگی
بسر کرنے مدینے چلے آئے۔ اس کی ترغیب امیر معاویہ کی طرف سے
یوں ہوئی کہ "امام حسنؓ نے جتنی رقم اور شاہانہ وظیفے کا مطالبہ کیا وہ
امیرِ شام نے منظور کر لیا۔ اسی میں کوفے کے بیت المال کے نقد پچاس
لاکھ درہم[۲] اور اپنی زندگی تک ایران کے ایک ضلعے کا مالیہ بھی شامل ہے
حضرت امام نے طلب کیا تھا"۔ اگرچہ ان کا انتقال شاید اہلِ حرم کی
کسی سازش [illegible] زہر خورانی کے باعث[۳] پینتالیس سال کی عمر میں ہو گیا (تخ
۶۶۹ء) تاہم [illegible] میں وہ کم سے کم سو نکاح کر چکے
اور طلاقیں دے چکے تھے جس کی وجہ سے انھیں "مطلاق" (یعنی بہت
طلاق دینے والے) کا لقب حاصل ہوا[۴]۔ شیعہ ان کو زہر دلوانے کا الزام
امیر معاویہ کے سر لگاتے اور حضرت حسنؓ کو بھی شہید، بلکہ فی الواقع "سید
الشہدا" قرار دیتے ہیں۔ اُن کے چھوٹے بھائی امام حسینؓ امیر معاویہ
کے دورِ حکومت میں مدینے میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے لیکن
سنہ ۶۸۰ء میں انھوں نے معاویہ کے بیٹے اور جانشین یزید کو ماننے
سے انکار کیا۔ عراقیوں نے امام حسنؓ اور حضرت علیؓ کے بعد امام حسینؓ
کے خلیفہ جائز ہونے کا اعلان کیا اور انہی کی فوری اور پیہم التجا کے

---

[۱] ابن حجر۔ ج ۲ ص ۱۳۔ دینوری، ص ۲۳۱۔ [۲] طبری۔ ج ۲ ص ۳۔
[۳] یعقوبی۔ ج ۲ ص ۲۶۶۔ [۴] ابن عساکر۔ ج ۴۔ ص ۲۱۶۔

جواب میں وہ عزیزوں کا مختصر سا لشکر لے کر کوفہ روانہ ہوئے۔ اسی میں ان کی حرم اور جاں نثار رفیق شامل تھے۔ بنی اُمیّہ کی طرف سے اُن دِنوں عبیداللہ، عراق کا والی تھا۔ اس کے باپ زیاد کو امیر معاویہ نے ازرہ مصلحت اپنا (علاتی) بھائی مان لیا تھا۔ عبیداللہ نے حجاز سے عراق آنے والے سب راستوں پر فوجی پہرے بٹھا دئے۔ امام حسین رضؓ کے مٹھی بھر لشکر میں کُل کوئی دو سو متنفس ہوں گے۔ اسے کوفے سے تقریبًا پچیس میل شمال مغرب کی جانب کربلا میں مشہور و ممتاز سپہ سالار حضرت سعدؓ ابن ابی وقاص (فاتح ایران) کے فرزند عمر نے دس محرم سنہ ۶۱ھ (مطابق ۱۰ر اکتوبر سنہ ۶۸۰ء) کے دن اپنی چار ہزار سپاہ سے گھیر لیا اور اُنھوں نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا تو قتل کر دیا۔ پیغمبرِ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کا نواسہ بہت سے زخم کھا کے گرا اور اس کا سر یزید کو دمشق بھیجا گیا۔ یہ سر امام حسینؓ کی بہن اور بیٹے کو جو اسی کے ساتھ دمشق آئے تھے[۱] واپس کیا اور جسم کے ساتھ کربلا میں دفن کیا گیا۔ شہادتِ حسینؓ کی یادگار میں شیعہ مسلمانوں نے محرم کے دس دنوں میں ماتم کرنے کی رسم قائم کی اور ایک مذہبی تمثیل تیار کر لی ہے جس میں ان کی بہادرانہ 191
جنگ اور مصائب کو بڑے زور شور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ سالانہ تمثیل دو حصوں میں دکھائی جاتی ہے۔ ایک تو وہ کہ جنگ کی یادگار میں عاشوری کہلاتا ہے اور (بغداد کے قریب) کاظمین میں مناتے ہیں۔ دوسرے حصے کو دسویں محرم کے بعد چالیس دن تک کربلا میں دکھاتے ہیں اور یہ حصہ "سر کی واپسی" کہلاتا ہے۔

---

[۱] ابن حجر۔ ج ۲ ص ۱۴۔

حضرت حسین رضؓ کا خون ان کے والد رضؓ کی شہادت سے بھی بڑھ کر شیعہ مذہب کی بنا ثابت ہوا۔ گویا دسویں محرم کو شیعیت عالم وجود میں آئی۔ اسی وقت سے لے کر آج تک حضرت علی رضؓ کی اولاد میں امامت کا عقیدہ شیعہ فرقے میں ایسا بن گیا جیسے ملت اسلامی میں رسول اللہ (صلعم) کی رسالت کا عقیدہ ہے۔ یوم کربلا سے شیعوں کو ایک نعرۂ جنگ مل گیا: "قتل حسین رضؓ کا انتقام" اور یہ بھی آگے چل کر خاندان بنی امیہ کی بیخ کنی کا ایک سبب ثابت ہوا۔ دوسری طرف، سنی حجت کرتے تھے کہ عملاً یزید فرماں روائے وقت تھا۔ اس کی حکومت پر حرف زنی ایک طرح کی بغاوت تھی جس کی سزا موت ہے۔ وہ اصرار کرتے رہے کہ شیعوں کو اصل واقعات اسی نظر سے دیکھنے چاہئیں۔ لیکن تاریخ میں عموماً یہ بات زیادہ اہم ہوتی ہے کہ ایک قوم کسی واقعے کو جو محرک ہوا، کس نظر سے دیکھتی ہے۔ نہ یہ کہ کس نظر سے اسے دیکھنا چاہیئے۔ غرض ملت اسلامی میں ایک تفرقہ پڑ گیا اور یہ رخنہ ابھی تک نہیں بھرا ہے۔

ہرچند امویوں کی خلافت کو ایک مدت تک اولاد علی رضؓ کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تاہم یہ لڑائی درحقیقت سہ گوشہ تھی اور تیسرے فریق کا ہنوز خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ جب تک صاحب قوت معاویہ زندہ رہے حضرت زبیر رضؓ کے بیٹے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضؓ کے بھانجے عبداللہ مدینے میں خاموش رہے۔ حضرت زبیر رضؓ نے حضرت علی رضؓ سے جھگڑا کیا اور ناکام رہے تھے[1] اب جو یزید وارث تخت ہوا اور اس کی بیہودگی اور عیاشی مشہور

---

[1] (حضرت زبیر رضؓ نے کبھی خلافت کا دعویٰ نہیں کیا۔ مصنف محض ایک ظنی بنیاد رکھتا اس پر عمارت چنتا چلا جاتا ہے۔ مترجم)

تھی۔ تو عبداللہ ابن زبیرؓ نے علانیہ اس کی مخالفت کی اور حضرت حسینؓ
کی بھی ہمت بڑھائی کہ وہ خطرناک اقدام کریں جس میں اُن کی جان گئی۔
عبداللہ اکیلے دعوے دار رہ گئے۔ سارے حجاز نے اُن کی حکومت کا
اعلان کر دیا۔ یزید بھی غافل نہ تھا۔ فوراً مدینے کے اہل شورش کے خلاف
تادیبی مہم روانہ کی جس میں بہت سے عیسائی شامی بھی تھے۔ یک چشم
مسلم ابن عقبہ سردار تھا جس کے باپ نے شمالی افریقہ کو فتح کیا اور قیروان
کی بنیاد (۶۷۰ء میں) رکھی تھی۔ مدینے کے مشرق میں آتش فشاں پہاڑ
کا میدان الحرہ واقع ہے۔ شامی فوج نے یہاں خیمے ڈالے اور ۲۶/اگست
۶۸۳ء کی جنگ میں فتح پائی۔ یہ حکایت کہ شامی سپاہی تین روز تک
۱۹۲ مدینۃ الرسولؐ کو تاراج کرتے رہے، بعد کی گھڑی ہوئی ہے۔ پھر یہ فوج
مکے پر بڑھی۔ ابن عقبہ راستے میں مر گیا۔ اس کی بجائے حسین ابن نمیر
سکونی نے قیادت سنبھالی اور اپنی منجنیقوں سے مکہ معظمہ کی مسجد حرم
شریف پر سنگ باری کرائی جہاں عبداللہ ابن زبیر نے پناہ لی تھی۔
اسی محاصرے میں خود کعبۃ اللہ میں آگ لگی اور وہ جل کر ایسا معلوم ہوتا تھا
"جیسے سینہ کوبی کرنے والی عورتوں کی چھاتیاں"۔[۲] خود حجر اسود کے (آگ
کی وجہ سے) تین ٹکڑے ہو گئے تھے۔ یہ جنگ جاری تھی کہ یزید لقمۂ
اجل ہوا اور ابن نمیر ڈرا کہ یزید کی موت پر شام میں فساد برپا ہوگا۔ اس

---

[۱] طبری - ج اول ص۴۲۲ - یعقوبی، ۲، ص۲۹۹ -

[۲] طبری - ۲ ص۴۲۷ - الفاکہی: "المنتقی فی اخبار ام القریٰ" (لائپ زگ، ۱۸۵۹ء)
ص۸ - ازرقی: "اخبار مکہ" ص۱۳۳ جو اموی لشکر کے واپس چلے جانے پر عبداللہ ابن
زبیرؓ نے کعبۃ اللہ کو دوبارہ تعمیر کرا دیا تھا۔

نے جنگ روک دی۔ مگر یہ حملہ ۲۴ ستمبر کو شروع ہوا تھا۔ ۲۷ نومبر (۶۸۳ء) کے دن موقوف ہوا۔ ملت اسلام کی دوسری خانہ جنگی، جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی جنگ کی طرح خاندانی ہی تھی، عارضی طور پر رُک گئی۔

اپنے حریف یزید کے مرنے اور شامی فوجوں کے عرب سے واپس چلے جانے پر عبداللہ ابن زبیرؓ نہ صرف حجاز میں جہاں ان کا صدر مقام تھا، بلکہ مشرقی، جنوبی عرب اور شام کے بعض اقطاع میں بھی خلیفہ تسلیم کر لئے گئے۔ عراق میں ان کے بھائی مُصعب نیابت کا فرض انجام دیتے تھے مگر دمشق پر نئے خلیفہ نے ضحاک ابن القیس الفہری کو عارضی طور پر مختار کل بنایا۔ ضحاک شمالی عرب کے قیسی گروہ کا رہنما تھا جو ابن زبیرؓ کی طرف داری کرتے تھے۔ ضحاک کو جولائی ۶۸۴ء میں مرج راہط کے مقام پر آخری اور سخت شکست جنوبی عرب کے کلبیوں کے ہاتھ سے نصیب ہوئی جو بڈھے مروان ابن الحکم اموی کے حامی تھے۔[۵۱] یہ معرکہ بنی اُمیہ کے حق میں دوسرا صفین ثابت ہوا۔ کلبی اصل میں شامی عرب تھے کہ ہجرت سے پہلے شام میں متوطن اور اکثر تعداد میں عیسائی ہو گئے تھے۔ مذکورہ بالا فتح سے بنی اُمیہ کی مروانی شاخ برسر اقتدار ہوئی۔ یزید کا بیمار بیٹا معاویہ ثانی (۶۸۳ء) صرف تین مہینے حاکم رہا اور بغیر کوئی وارث چھوڑے

---

۵۱ یہ مرج عذرا کے مشرق میں دمشق کے قریب ہی میدان ہے۔ دیکھو عقد، ۲ ص ۳۱۲ اور مسعودی، ۵ ص ۲۰۱۔ شمالی عرب کے قیسی نوواردوں اور جنوبی کلبیوں میں جو بنی اُمیہ کے پکے حامی تھے، یہی اندرونی نزاعات اموی خاندان کے زوال میں سُرعت کا باعث ہوئیں۔ (قیسی اور یمنی گروہ بندی کا لبنان و شام کی سیاسیات میں ابھی تک ذکر آتا ہے۔ ملاحظہ ہو آئندہ باب بست و دوم)

۵۲ یعقوبی، ۲ ص ۳۰۹۔

فوت ہوگیا تھا۔[۱] لہذا مروان جانشین ہوا (۶۸۳ء تا ۶۸۵ء) لیکن حجاز حریف خلیفہ کے ماتحت اور شام سے الگ رہا یہاں تک کہ مروان کے جانشین بیٹے عبدالملک نے اپنے فولاد باز و سپہ سالار حجاج کو شامی فوج دے کے دوبارہ اُدھر بھیجا۔ حجاج پہلے طائف میں مدرس تھا۔ خلافت دمشق کے مخالفین کا اسی نے خاتمہ کیا۔ اس نے ۲۵ مارچ ۶۹۲ء مکہ معظمہ کو آگھیرا تھا۔ ساڑھے چھ مہینے تک سخت محاصرہ کئے رہا اور من جنیقوں سے کام لینے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔[۲] ابن زبیرؓ اپنی والدہ حضرت اسماء[۳] بنت ابوبکر صدیقؓ (خواہر عائشہ صدیقہؓ) کی دلیرانہ ترغیب سے بڑی بہادری کے ساتھ یہ لڑائی جس میں کامیابی کی اُمید نہ تھی لڑتے رہے یہاں تک کہ جان سے گزر گئے۔ ان کا سر کاٹ کر دمشق بھیجا گیا۔ نعش کئی دن تک لٹکتی رہنے کے بعد بوڑھی ماں کے حوالے کی گئی۔ عبداللہ ابن زبیر کی موت نے قدیم عقائد کے آخری علم بردار کا خاتمہ کر دیا۔ مسلم ابن عقبہ کے ہاتھوں نہیں تو بے شبہ حجاج کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کے قتل کا پورا پورا انتقام لے لیا گیا۔ انصار مدینہ کی قوت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گئی۔ اسی ہزیمت کے بعد اُن میں سے کافی تعداد مکہ معظمہ اور مدینۂ منورہ چھوڑ کر چلی گئی اور شمالی افریقہ، اندلس اور دوسرے محاذوں کی فوجوں میں شریک ہوگئی۔ اسی لئے عرب کی آئندہ تاریخ میں

---

[۱] اُمیہ کا ایک بیٹا حرب اور اس کے پوتے امیر معاویہ تھے۔ حرب کا بھائی ابوالعاص اور اس کا پوتا مروان تھا۔

[۲] دینوری ۔ ص ۳۲۰ ۔ ابن عساکر ۔ ۴ ص ۵۰۔

[۳] طبری ۔ ۲ ۔ ص ۸۴۵۔

[۴] ” ” ص ۸۵۴۔

زیادہ تر اُن اثرات کا تذکرہ آتا ہے جو بیرونی دُنیا کے ملک عرب پر پڑے، نہ کہ اُن اثرات کا جو عرب بیرونی دنیا پر ڈالتا تھا۔ گویا قوم کے اصلی منبع (جزیرۂ عرب) کا پانی بہ گیا۔ طاقت صرف ہوگئی ؛

امیر معاویہ کی مثالی حکم رانی

اپنے مخالفین پر غلبہ پانے کے بعد امیر معاویہ (۶۶۱ - ۶۸۰ء) کو فرصت ملی کہ اسلام کے سب سے بڑے شمالی مغربی دشمن بازنطہ کے خلاف اپنی کوشش کا رُخ پھیر دیں۔ شام کی فتح کو زیادہ مدت نہ گزری تھی جب کہ انھیں عکّہ میں رومیوں کا بنا بنایا کارخانہ جہازسازی ہاتھ آیا۔ (عربی "دارالصناعہ"، جس سے انگریزی لفظ "آرسنل" بنا ہے۔) انھوں نے اس سے اسلامی بیڑا تیار کرنے کا کام لیا۔ مسلمانوں کی بحری تاریخ میں مصر کے بعد غالباً یہی دوسرا جہازی کارخانہ تھا۔ پھر بلاذری کے بقول[۱]، یہ شامی جہاز خانے آخری اموی خلفا نے شہر صور میں منتقل کر دئے تھے اور عبّاسیوں کے زمانے تک وہیں رہے[۲]۔ بیڑا ضرور یونانی اور شامی ملّاح چلاتے ہوں گے۔ جنھیں جہازرانی کی عادت تھی۔ ملّتِ اسلامی کے رُکن رکین حجازی عرب تھے۔ انھیں سمندر سے بہت کم واقفیت تھی۔ حضرت عمرؓ کی حکمت عملی کا ایک اصول یہ تھا کہ اُن کے اور اُن کے نائبوں کے درمیان سمندر کا قطعہ حائل نہ ہونے پائے۔ یہی سبب تھا کہ مثال کے طور پر، انھوں نے معاویہ کو جزیرہ

---

[۱] صفحہ ۱۱۷ [۲] ملاحظہ ہو لی اَسٹرینج کی "پیلسٹائن انڈر دی مسلمز" (بوسٹن ۱۸۹۰ء) ص ۳۴۲ نیز دیکھو ابن جبیر: "رحلہ" (لائیڈن ۱۹۰۷ء) ص ۳۰۵

قبرس پر مجوزہ حملے کی اجازت نہیں دی۔ ان کے جانشین حضرت عثمانؓ بھی بہ مشکل رضامند ہوے اور اس حملے کی نیم دلی سے اجازت دی۔ خلیفہ کے حکم کی تعمیل میں معاویہ کو فوج کشی کے وقت اپنی بیوی کو ساتھ لے جانا پڑا (۶۴۹ء)[1]۔ یہ گویا بدیہی دلیل تھی کہ قبرس زیادہ دُور نہیں ہو اور آسانی سے فتح ہو سکتا ہو ؛

امیر معاویہ کے عہد میں اسلامی مقبوضات کو استحکام ہی حاصل نہیں ہوا بلکہ توسیع بھی عمل میں آئی۔ شمالی افریقہ میں نئے علاقے فتح ہوے جس کا سہرا عُقبہ ابن نافع کے سر ہی۔ مشرق کی طرف بصرے کے جنگی مرکز سے عرب فوجیں بڑھیں کہ خراسان کی فتح کی تکمیل کریں (۶۶۳-۶۷۱ء)[1]۔ اُنھوں نے دریاے سیحوں کو عبور کیا اور ترکستان کے بعید ملک میں بُخارا پر چھاپہ مارا (۶۷۴ء)۔ اس طرح امیر معاویہ صرف ایک خاندان شاہی کے مورث نہ تھے بلکہ حضرت عمرؓ کے بعد خلافت کے دوسرے بانی بھی تھے ؛ اپنے اقتدار کی حفاظت اور اسلامی حکومت کی حدود بڑھانے میں وہ زیادہ تر شامیوں پر بھروسہ کرتے تھے۔ ان لوگوں کی اکثریت ہنوز عیسائی تھی۔ دوسرے شامی عربوں پر اعتماد تھا، جو بیش تر یمنی تھے۔ حجاز کے نئے مسلمان متوطنوں کو وہ الگ رکھتے تھے۔ شامی رعایا بھی اپنے نئے حاکم کی گرویدہ اور وفاداری کے جذبے سے سرشار تھی جیسا کہ عربی وقائع شہادت دیتے ہیں[3]۔ بہ حیثیت سپاہی کے امیر معاویہ حضرت

---

[1] اس کا ذکر پچھلے باب میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔

[2] یعقوبی۔ ۲۔ صـ۲۵۸۔ بلاذری صـ۴۱۰۔ طبری۔ ۲ صـ۱۶۲۔

[3] طبری۔ ۱ صـ۳۴۰۹، مسعودی۔ ۵۔ صـ۸۰۔ نیز دیکھو عقد، ۱ صـ۲۰۸۔

علی رضؓ سے یقیناً کم تر تھے لیکن تنظیمی قابلیت میں اپنے کسی ہم عصر سے کم نہ تھے۔ ان کی شامی فوج ایک کچا مسالا تھی جسے کوٹ کوٹ کر انھوں نے ملتِ اسلامی کی سب سے پہلی باقاعدہ اور منظم سپاہ بنایا۔ اپنے عسکری نظام کو انھوں نے قبائلی تنظیم کے فرسودہ طریقے سے نجات دلائی جو شیوخ عرب کے زمانے کی پرانی یادگار تھا۔ انھوں نے نظم ونسق کے بہت
۱۹ سے قدیم اوضاع ترک کر دئے اور سابقہ بازنطی نقشے پر ایک باضابطہ مستحکم حکومت مرتب کی۔ وہ بظاہر محض ہیولیٰ تھا جس سے انھوں نے مسلمانوں کی قوم کا قوام تیار کیا۔ مؤرخ انھیں یہ امتیاز دیتے ہیں کہ سب سے پہلے تحریری اسناد کا محافظ خانہ یا دفتر انہی نے ترتیب دیا اور ڈاک کے محکمے (دال برید[۱]) کی طرف سب سے پہلے وہی متوجہ ہوئے جو عبدالملک کے زمانے میں ترقی کرکے ایک باقاعدہ نظام بن گیا اور اس وسیع سلطنت کے دور دراز اقطاع کو اسی نے ایک شیرازے میں باندھ دیا۔

امیر معاویہ کی کئی بیویاں تھیں۔ ان میں وہ سب سے زیادہ میسون کو عزیز رکھتے تھے۔ وہ شامی عرب کلبیوں کے قبیلہ بنو بحدل کی تھی اور دمشق کی درباری زندگی کی ذرا پروا نہ کرتی تھی، بلکہ صحرای آزادی کی دلدادہ تھی۔ جو اشعار اس سے منسوب کئے جاتے ہیں، اگرچہ اس نے کبھی نظم نہ کئے ہوں، مگر ان میں وطن کی یاد اور دوری کی شکایت کے وہی جذبات بیان کئے گئے ہیں جیسا کہ اکثر بدویوں کے دل میں جو شہری

---

[۱] فخری ص۱۴۰۔ نیز دیکھو باب بست و پنجم، سرکاری محکموں کے بیان میں۔

زندگی کی طرف منتقل ہو رہے تھے، موج زن ہوتے ہوں گے[۵۱] میسون اپنی پیش رو اور حضرت عثمان رض کی بیوی نائلہ کی طرح کہ وہ بھی کلبی قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں، اصل میں یعقوبی فرقے کی مسیحیہ تھی۔ وہ اپنے لڑکے یزید کو جو امیر معاویہ کا جانشین ہوا، اکثر بادیہ یعنی صحرائے شام، خصوصاً تدمُر کی نواح میں لے جاتی تھی اسی صحرا میں اس کے قبیلے کے بدو گھومتے پھرتے تھے۔ یہیں نوجوان ولی عہد نے گھوڑے دوڑانے، شکار کھیلنے، شعر کہنے، شراب پینے کی عادتیں سیکھیں۔ بعد میں یہی ال بادیہ اموی شہزادوں کی درس گاہ بنا جہاں وہ خالص عربی زبان کی جو آرامی کی اثرات سے بالکل پاک ہو، تحصیل کرتے[۵۲] اور شہر کی متواتر وباؤں سے محفوظ رہتے تھے۔ آخری اموی خلفا نے جن میں عبد الملک اور ولید ثانی شامل ہیں اسی صحرائے شام کے کنارے پر دیہاتی محلات بنوا لئے تھے اور انھیں بھی "ال بادیات" کہنے لگے تھے۔

عربوں کے حملے کے وقت دمشق کے سقوط میں جن دغابازوں کا ہاتھ تھا، ان میں منصور ابن سرجون (= یونانی: سرجیوس[۵۳]) کا نام آتا ہے۔ یہ شخص ایک ممتاز مسیحی گھرانے کا فرد تھا۔ بازنطہ کی حکومت کے آخری زمانے میں اس خاندان کے لوگ نظارت خزانہ کے عہدوں پر فائز تھے۔ عربوں کے دور میں یہ عہدہ، سپہ سالاری کے بعد سب سے زیادہ اہم ہو گیا تھا۔ غرض اسی منصور کا پوتا وہ مشہور یوحنا دمشقی (سینٹ

---

۵۱ ابو الفدا۔ ج ۱ ص ۲۰۳، نکلسن "لٹریری ہسٹری" ص ۱۹۵۔
۵۲ عقد۔ ۱۔ ص ۲۹۳۔
۵۳ اس کے اور اس کے بیٹے سرجون ابن منصور کے ناموں میں عربی تاریخوں نے التباس کر دیا ہے جس کی مثالیں طبری (۲ ص ۲۰۵ وغیرہ) اور مسعودی (تنبیہ ص ۳۰۲) میں ملتی ہیں نیز دیکھو فانن ص ۲۶۵

جون ڈمے سین) گزرا ہے جو اپنی جوانی میں یزید کا خاص ندیم تھا۔ اسی طرح اس فرماں روا کا طبیب ابن آثال، مسیحی تھا کہ شروع میں امیر معاویہ نے 196 اسے صوبہ حمص کا دیوان مالیات بنادیا تھا[1] اور یہ وہ عزت ہے جو کسی دوسرے مسیحی کو اسلامی تاریخ میں حاصل نہیں ہوئی[2]۔ یزید کا ایک اور یار غار اور درباری شاعر الاخطل، حیرہ کے تغلبی عرب قبیلے کا فرد اور یوحنا کا دوست تھا۔ یہ درباری شاعر خلیفہ کے محل میں، صلیب گلے میں لٹکائے آجاتا اور اپنے اشعار سے مسلم خلیفہ اور اس کے درباریوں کو مسرور و محظوظ کرتا تھا۔ مسیحی فرقے، یعقوبی اور مارونی اپنے مذہبی جھگڑے تک خلیفہ کے سامنے پیش کرتے تھے[3] اور تھیوفانس کی روایت ہے[4] کہ اس نے (یعنی یزید نے) رہا (= اڈیسہ) میں ایک گرجا کو جو زلزلے سے منہدم ہوا، دوبارہ بنوایا تھا ؛

امیر معاویہ نے ۶۷۹ء میں جب اپنے بیٹے یزید کو جانشین نامزد کیا[5] اور صوبوں سے وفود بلوائے کہ اس کے ہاتھ پر بیعت کریں، تو گویا خلافت میں وراثت کا اصول داخل کیا جس کی آیندہ تمام مسلمان بادشاہ اور عباسی خلفا تک تقلید کرتے رہے۔ اسی نظریہ پر، حکومت کرنے والا خلیفہ اپنے بیٹے یا کسی عزیز قریب کو جسے سب سے اہل سمجھتا، اپنے جانشین بنانے کا اعلان کر دیتا اور اس کے حق میں پہلے ہی سے بیعت کا حلف

---

[1] ابن عساکر - ۵ - ص ۸ ؛
[2] یعقوبی، ۲ ص ۲۶۵ - ول ہاوزن اس تقرر کی روایت کو جعلی سمجھتا ہے - (ریش : ص ۸۳) ؛
[3] ول ہاوزن - ص ۸۳ - ع ۲ - ص ۳۵۶ ؛
[4] مسعودی - ۵ - ص ۶۹ - طبری - ۲ - ص ۱۷۳ ؛
[5] دینوری - ص ۲۳۲ - طبری ۲ - ص ۶۹ - ابن عساکر - ۵ - ص ۳۹۷ ؛

اپنے سامنے لے لیا تھا۔ اس کی ابتداداراالخلافت سے کی جاتی پھر سلطنت کے دوسرے بڑے شہروں کے لوگوں سے بیعت لی جاتی تھی ؛

امیر معاویہ کی کامیابی کا ایک بڑا سبب اُن کے معاونوں کو قرار دینا چاہیئے جن کا ایک حلقہ امیر موصوف نے اپنے گرد فراہم کرلیا تھا۔ ان میں مصر کی سرسبز سرزمین کے نائب امیر، عَمرو ابن العاص، پھر فتنہ انگیز کوفے کے والی، مُغیرہ ابن شعبہ اور شورش پسند بصرے کے حاکم، زیاد ابن ابیہ خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ یہ تین افراد اپنے سردار امیر معاویہ کے ساتھ عرب مسلمانوں کے "دہات"، یعنی بہترین سیاسی دماغ مانے جاتے تھے۔ زیاد کی ولدیت مشکوک تھی اس لئے اوّل اوّل "ابن ابیہ" کہلاتا رہا۔ اس کی ماں طائف کی بازاری عورت تھی اور عہدِ جاہلیہ میں ابوسفیان کا اس سے تعلق تھا لیکن زیاد حضرت علیؓ کا طرف دار تھا۔ امیر معاویہ نے ایک نازک موقع پر اسے اپنا علاتی بھائی تسلیم کرلیا[۲] (حضرت علیؓ کے بعد) زیاد اپنے خلیفہ بھائی کا قوت بازو ثابت ہوا۔ شیعیت کا (ابتدائی) مرکز بصرہ بنا تھا۔ زیاد کی سخت گرفت نے اُسے دبائے رکھا۔ المُغیرہ کی وفات کے بعد زیاد کو ترقی دے کر کوفے کی ولایت بھی تفویض کردی گئی جس کے معنی یہ تھے کہ وہ سلطنت کے مشرقی حصے کا، بہ شمول ایران و عرب، مالک و مختار بن گیا۔ اس کی فوج رکاب میں چار ہزار تربیت یافتہ سپاہی تھے اور کوتوالی و جاسوسی کی خدمت بھی وہی انجام دیتے تھے۔ ان کی مدد سے وہ جابرانہ حکومت

لہ دینوری۔ ص۲۳۳۔ طبری ۲۔ ص۶۹۔ ابن عساکر۔ ۵۔ ص۳۹۷ ؛

۲ہ دیکھو فخری، ص۱۴۰۔ عقد، مسعودی ؛

کرتا اور ایسے لوگوں کا کھوج نکال لیتا تھا جو اولادِ علی رضؓ کی حمایت یا معاویہ کی بدگوئی میں زبان کھولتے تھے ؛

خود امیر معاویہ میں ملک داری کا وہ نفیس مذاق پیدا ہوگیا تھا جس سے بہتر غالبًا کسی خلیفہ میں یہ وصف نہ تھا۔ ان کے عرب سوانح نویس ان کی سب سے بڑی صفت حِلم قرار دیتے ہیں۔ یہ وہ غیرمعمولی قابلیت ہے کہ جبر و طاقت کا استعمال صرف اس وقت کیا جائے جب کہ ایسا کرنا، ناگزیر ہو جائے۔ امیر معاویہ میں وہ عاقلانہ اعتدال تھا جس کے آگے دشمن کا غصہ فرو ہو جاتا اور مخالفت کرنے والے کا سر ندامت سے جھک جاتا تھا۔ وہ جلد مشتعل نہ ہوتے تھے اور اپنے مزاج پر ایسا قابو رکھتے تھے کہ ہر موقع پر آخر وہی ذر نکلتے تھے۔ اُن کا یہ قول مروی ہے کہ جہاں کوڑے سے کام نکل سکتا ہے، میں تلوار نہیں کھینچتا اور جہاں تک زبان کفایت کرتی ہے، کوڑے سے کام نہیں لیتا۔ اگر کسی بنی نوع سے میرا تعلق ایک بال کے برابر بھی قائم ہوا تو میں اُسے ٹوٹنے نہیں دیتا۔ اگر وہ کھینچتے ہیں تو میں ڈھیل دیتا ہوں اگر وہ ڈھیل دیں تو میں کھینچتا ہوں !" [۱]

امام حسن رضؓ جب حکومت سے دست بردار ہوئے تو کہتے ہیں امیر معاویہ نے یہ خط انھیں لکھ کر بھیجا : "مجھے اعتراف ہے کہ خاندان کے اعتبار سے تم اس جلیل منصب کا زیادہ حق رکھتے ہو اور اگر مجھے یقین ہوتا کہ تم اس کے فرائض انجام دینے کے بھی زیادہ اہل ہو تو میں بلا تامل تمھاری اطاعت کا حلف اٹھا لیتا۔ اب جو کچھ تم چاہو مجھ سے

---

[۱] یعقوبی، ۲ ص۲۸۳۔ عِقد - ۱- ص۱۰ ؛

طلب کر لو۔" اسی خط کے ساتھ ایک سادہ کاغذ اپنے دستخط ثبت کر کے بھیج دیا تھا کہ اس میں امام حسن جو شرائط چاہیں تحریر کر دیں[۱]۔

بہت سی خوبیوں کے باوجود امیر معاویہ اکثر مؤرخوں میں جن کی کتابیں ہم تک پہنچیں، مقبول نہ تھے۔ وہ انھیں ملت اسلامی کا پہلا ملک سمجھتے ہیں اور سچے عربوں میں یہ خطاب اس قدر مذموم تھا کہ سوائے عجمی فرماں رواؤں کے بہت کم کسی عرب کے لئے استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔ تاریخ نویسوں کی رائے میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کے خیالات جھلکتے ہیں جو امیر معاویہ کو الزام دیتے تھے کہ خلافتِ نبوۃ یعنی حکومتِ الٰہیہ کی بجائے انھوں نے اسلامی حکومت کو دنیاوی رنگ دیا اور خلافت (راشدہ) کو "ملک" یعنی بادشاہی سلطنت بنایا[۲]۔

ان کی چند بدعتیں یہ گنوائی جاتی ہیں کہ سب سے اول مسجدوں میں ۱۹۴
"مقصورہ" بنوایا۔ یہ خاص خلیفہ کے لیے کمانچہ سا ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ جمعے کا خطبہ منبر پر بیٹھے بیٹھے پڑھا کرتے تھے[۳]۔ پھر وہی پہلے شخص تھے جس نے شاہی تخت (= سریر الملوک) (پرنشست) کی رسم قائم کی[۴]۔ یہ عربی تاریخیں جو اکثر عباسی عہد میں یا شیعہ اثرات کے تحت تالیف کی گئیں، امیر کے تقویٰ پر بھی حرف گیری کرتی ہیں۔ لیکن

---

[۱] طبری - ۲ ص۶۔

[۲] ابن خلدون، مقدمہ ص۱۶۹ - یعقوبی ۲، ص۲۵۸۔

[۳] یعقوبی - ۲ - ص۲۶۵ وغیرہ۔

[۴] ابن العبری، ص۱۱۱

[۵] ابن خلدون - مقدمہ ص۲۲۸ والقلقشندی "صبح الاعشیٰ" ج ۳ (قاہرہ ۱۹۱۴ء) ص۶

شامی روایات ابن عساکر کی تاریخ میں محفوظ رہیں۔ ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دین دار مسلمان تھے۔ اپنے اموی اخلاف کے لیے انھوں نے رحم دلی، مستعدی، ہوشیاری اور تدبّر کی نظیر میراث میں چھوڑی اور ان اوصاف میں بہتوں نے ان کی نقل کرنی چاہی[1] اگرچہ کامیابی صرف چند کو میسّر آئی۔ بہرحال، معاویہ نہ صرف پہلے، بلکہ بہترین عرب بادشاہوں میں سے ایک تھے؛

---

[1] مسعودی۔ ۵ ص۔ امیر معاویہ کی قبر دمشق کے گورستان باب الصغیر میں ہے۔ اس کی اب تک زیارت کی جاتی ہے؛

باب ہژدہم (۱۸)

بائی زنطہ سے جنگی تعلقات

۱۹۹

جس زمانے میں امیر معاویہ کی نئی حکومت غیر محفوظ تھی اور وہ خانگی امور میں اُلجھے ہوئے تھے، انھیں مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ قیصر کونس تانس ثانی (۶۴۲ء تا ۶۶۸ء) سے عارضی صلح کرلی جائے۔ اس کا انھیں سالانہ معاوضہ ادا کرنا پڑا جس کی مقدار تھیو فانس نے تحریر کی[۱] اور بلاذری میں بھی اس کا ذکر آتا ہے[۲] لیکن زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ انھوں نے آیندہ روپیہ دینے سے انکار کردیا اور بائی زنطی مقبوضات پر اس شدت و تواتر سے برّی اور بحری حملے شروع کردئے کہ نہ پہلے ہوئے تھے نہ ان کے قریبی جانشینوں کے عہد میں ہوئے۔ حتیٰ کہ دو مرتبہ امیر کا طاقت ور ہاتھ دشمن کے دار السلطنت تک پہنچ گیا۔ "بلاد الروم" یعنی رومیوں کے علاقے (ایشیائے کوچک) پر ان حملوں کا بڑا مقصد صرف مالِ غنیمت حاصل کرنا تھا اگرچہ ممکن ہے کہ

---

[۱] ص ۳۴۴۔ [۲] ص ۱۵۹۔

بیدپس منظر میں شہر قسطنطنیہ کی دھندلی تصویر بھی حملہ آوروں کو اشارہ کر رہی ہو۔ بہرحال یہ حملے گرمیوں میں باقاعدہ سالانہ "رزیے" بن گئے اور ان سے یہ فائدہ بھی ہوا کہ عساکر خلافت چاق و چوبند، جنگ کے لئے تیار و آزمودہ کار رہنے لگے۔ بایں ہمہ عربوں کے قدم ایشیائے کوچک میں مستقل طور پر کبھی نہیں جمے۔ وہ مشرق و مغرب کی سمتوں میں جہاں مزاحمت کم تھی، بڑھتے رہے اور انہی اطراف میں ان کی توجہ مرکوز رہی ورنہ ادھر بڑھتے تو بازنطہ سے ان کے تعلقات اور ایشیائے کوچک بلکہ دردانیال کے پار کی تاریخ بھی شاید کچھ اور ہوتی۔ شمال میں طارس اور عقبی طارس کے بلند پہاڑوں کے سلسلے، گویا قضا و قدر کی بنائی ہوئی ابدی سرحد تھی کہ اس کی جنوبی ڈھلانوں پر معلوم ہوتا تھا عربی زبان منجمد ہو کے رہ جاتی ہے۔ آگے چل کر یہ ملک سلجوقی اور عثمانی ترکوں نے فتح اور اسلام کے ممالک محروسہ میں داخل کئے تاہم ایشیائے کوچک کا کوئی قطعہ کبھی عربی بولنے والا نہ بنا۔ انتہائی قدامت کے دور سے جس کا آغاز حطیوں کے زمانے سے ہوتا ہے، یہاں کی اصلی آبادی غیر سامی چلی آتی تھی اور قدرتی موسم اتنا شدید تھا کہ عربوں کا تمدن اس سرزمین میں گہری جڑ نہ پکڑ سکا۔

اسلامی قلعہ بندیوں کا طویل زنجیرہ ملطیہ سے شروع ہوتا تھا جو بالائی فرات کے کنارے واقع ہے اور ساحل ابیض کے قریب طرسوس تک جاتا تھا۔ سلسلے کے مشہور قلعے اذنہ، المصیصہ، اور مرعش تھے۔ ہر 200
قلعہ جنگی اہمیت کے مقام پر بنایا تھا جہاں جنگی شوارع ایک دوسرے کو قطع کرتے تھے۔ کوئی تنگ کوہستانی درہ وہاں سے شروع ہوتا تھا

یہ قلعے اور اُن کے نواحی اضلاع "عواصم" کہلاتے تھے لیکن محدود معنی میں عواصم کا لفظ "ثغور" کے مقابلے میں جنوب کے اندرونی سلسلۂ قلاع کے لیے آتا تھا کیوں کہ جنگی سرحدوں میں شمال کی بیرونی پٹی کو ثغور کہتے تھے[۵۱]۔ اگرچہ عباسیوں کے زمانے میں یہ پٹی بہت سُکڑ گئی اور بحرِ ابیض کے ساحلی مقام اولاس سے چل کر طرطوس پر سے گزرتی، اور کنارِ فرات سمیساط پر ختم ہو جاتی تھی[۵۲]۔ عراق کی حفاظت کے لیے جو دفاعی خط شمال مشرق میں بنایا گیا، اسے "الثغور الجزریہ" کہتے تھے اور شام کی عسکری سرحد "ثغور شامیہ" موسوم ہوتی تھی[۵۳]۔ اس طرف شہرِ طرسوس کوہستانِ طارس کے اس مشہور درّے کے جنوبی دہن پر واقع تھا جو پورے پہاڑ کو طے کر جاتا اور "سلیشیہ کا پھاٹک" کہلاتا ہے۔ درّے میں جانے کا راستہ اسی شہر کی زد میں تھا اور یہیں عربوں کی مرکزی چھاؤنی تھی جس کے آگے بڑھ کر وہ رومیوں کی سرزمین پر حملے کیا کرتے تھے۔ طرسوس کا فاصلہ آبنائے باس فورس سے (سیدھے خط میں) ساڑھے چار سو میل سے کم نہ تھا، ایک اور درّہ جس سے طارس پہاڑ کے پار ہو سکتے تھے، شمال مشرق کی طرف واقع اور درب الحدث موسوم تھا۔ یہاں سے بہ راہِ مرعش، ابولس تین تک جاتے تھے مگر اس راستے پر زیادہ آمد و رفت نہ تھی۔ یہ ساری سرحدی زمین "لائیملک" سمجھنی چاہیے۔ اس کے قلعے

---

۵۱ اصطخری صفحہ ۶۷-۶۸

۵۲ بلاذری، صفحہ ۱۵۶

۵۳ یاقوت، ۱ صفحہ ۵۳۶۔ مقابلہ کرو: لیسٹرنج کے لی فیٹ، صفحہ ۱۳۱ سے۔ بازنطی والے اسے ابلتاء یونانی: ارسے بی سوس اور متاخر زمانے میں عرب البستان کہتے تھے۔

بھی جنگ کے مد و جزر کے ساتھ کبھی ایک کبھی دوسرے فریق کے قبضے میں منتقل ہوتے رہتے تھے۔ پھر یہ لڑائیاں بھی شدت اور تواتر کے ساتھ امویوں اور عباسیوں، دونوں کے زمانے میں شاید قدم قدم پہ ہوتی رہیں۔ مشکل سے کوئی زمین ایشیا بھر میں ایسی ہوگی جو ان مقامات سے بڑھ کر انسانی خون میں نہائی ہو۔

مسلمانوں کے ابتدائی زمانے ہی میں جب کہ معاویہ حضرت
عثمانؓ کے ماتحت شام کے والی تھے، یعنی ۳۴ھ (م ۶۵۵ء) میں،
اُن کا بیڑا بائی زنطہ کی بحری قوت سے ٹکرایا۔ عربی بیڑے کے سردار
بُسر ابن ابی ارطاہ تھے[1] اور ان کی مدد کے لئے عبداللہ ابن ابی شرح
اپنے مصری جہاز لے کر آئے تھے۔ مقابلے میں خود قیصر کونس ٹانس (ابن
ہرقل) اپنا بیڑا لڑا رہا تھا۔ یہ عظیم معرکہ جنوبی ایشیائے کوچک کی
بندرگاہ فی نکس کے سامنے پڑا، (جسے آج کل فنی کہ کہتے ہیں) اور ملت
اسلامی کی پہلی بڑی بحری فتح پر منتج ہوا۔ عربی تاریخوں میں یہ لڑائی
(ذوصواری یا) ذات الصواری کے نام سے مذکور ہے جس کے معنی ہیں
مستولوں کی جنگ[2] عربوں نے اپنے ہر جہاز کو بائی زنطی جہاز سے باندھ کر
یہ بحری معرکہ بھی دست بہ دست جنگ کی صورت میں بدل دیا تھا[3]۔ ۲۰۱
اور واقع میں وہ دوسرا یرموک ثابت ہوا۔ بائی زنطہ کی بحری فوج

---

[1] ابن عبدالحکم، ص۱۸۱۔ ابن حجر، ا۔ ۱۵۳۔

[2] یا تو اس وجہ سے کہ اس ساحلی مقام کے قریب سرو کے درختوں کی کثرت بیان کی جاتی ہے جن سے مستول (= صواری) بنائے جا سکتے تھے اور یا واقعی صدہا جہازوں کے مستولوں کے باعث اس جنگ کا یہ نام پڑ گیا۔

[3] ابن عبدالحکم، ص۱۹۱۔

کامل طور پر برباد ہو گئی[1] طبری لکھتا ہے کہ سمندر کا پانی خون سے رنگین ہو گیا تھا[2] بایں ہمہ عربوں نے اس فتح سے پورا فائدہ نہ اٹھایا اور قسطنطنیہ تک نہیں بڑھے چلے گئے جس کا سبب غالباً حضرت عثمان رض کی شہادت (جو انہی دنوں واقع ہوئی) اور اسی سلسلے کے ملکی فسادات تھے؛ اموی فوجوں نے تین مرتبہ دارالسلطنت قسطنطنیہ پر فوج کشی کی۔ یہی تین موقعے تھے جب کہ شامی عرب اس طاقت ور شہر کی تہری اور بلند فصیلوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ پہلی دفعہ ۴۹ھ (م ۶۶۹ء) میں، ولی عہد یزید کی سپہ سالاری میں۔ اور یہ فخر اسی کی فوج کو حاصل ہوا کہ عظیم بائی زنطیوم پر اول مرتبہ نظریں جائیں[3] یزید کو اُس کے باپ نے سپہ سالار بنا کر اس لئے بھیجا تھا کہ فضالہ ابن عبید الانصاری کو بڑی معرکوں میں مدد دے۔ فضالہ، بائی زنطوم کے قریب کال سیدون تک بڑھے اور ۶۶۸-۶۹ء کی سردیاں اسی علاقے میں گزار رہے تھے۔ مزید برآں متقی مسلمانوں کو یزید کے آئندہ خلیفہ نامزد کئے جانے پر اعتراض تھا۔ ان لوگوں کو مطمئن کرنے کی غرض سے بھی مناسب معلوم ہوا کہ اسے جہاد کے واسطے بھیجا جائے۔ لیکن ۶۶۹ء کے موسم بہار میں یزید اور فضالہ نے جو محاصرہ ڈالا تھا، وہ اسی سال کی گرمیوں میں اٹھا لینا پڑا کیوں کہ بائی زنطہ میں بھی اب ایک نیا اور مستعد بادشاہ، کونس ٹن ٹائن چہارم (۶۶۸ء تا ۶۸۵ء) تخت قیصری پر متمکن ہو گیا تھا؛ بہر حال، اس جنگ اور قسطنطنیہ کے محاصرے میں، شہرت یہی ہے کہ یزید نے دلیری اور جفاکشی کی بدولت "فتی العرب" یعنی نوجوان عرب سورما کا

---

[1] تھیوفانس، ص ۳۳۲؛ [2] ج ۱ - ص ۲۶۰؛ [3] طبری ۲ / ۱ ص ۸۶؛

خطاب حاصل کیا۔ اغانی میں لکھا ہے کہ جب میدان کارزار گرم ہوا تو لوگوں نے دیکھا کہ دو الگ الگ خیمے لگے ہیں کہ جس وقت عرب مجاہدین جنگ میں بڑھتے ہیں تو ایک خیمے سے تحسین و مسرت کا شور بلند ہوتا ہے اور جس وقت بائی زنطی زور دکھاتے ہیں تو دوسرے خیمے سے خوشی کے نعرے سنائی دیتے ہیں۔ یزید کو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک خیمے میں جبلہ ابن ایہم (غسانی) کی لڑکی اور دوسرے میں قیصر روم کی بیٹی رونق افروز ہے۔ یہ سن کر یزید نے غسانی بادشاہ کی لڑکی کو نکال لانے کے لیے غیر معمولی جرأت و سرگرمی دکھائی ـــــ لیکن اس محاربے کی داستان کے اصلی ممدوح، بوڑھے ابو ایوب انصاری (رضی اللہ تعالےٰ عنہ) تھے جنھوں نے ہجرت کے وقت مدینے میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کی مہمانی، اور پھر آپ کی فوج کی علم برداری کا شرف حاصل کیا تھا۔ لیکن یزید کی فوج میں صحابی موصوف کی موجودگی کسی جنگی غرض کی بجائے زیادہ تر برکت کے لئے ضروری سمجھی گئی تھی۔ اسی محاصرے کے دوران میں ان کا پچیش سے انتقال ہوا اور وہ خاص قسطنطنیہ کی فصیل کے سامنے دفن کئے گئے۔ ان کی قبر تھوڑے ہی دن میں خود مسیحی یونانیوں کی زیارت گاہ 202
بن گئی جہاں امساکِ باراں کے وقت وہ بارش کی دعا مانگنے دور دور سے چل کر آتے تھے۔ یہ جب ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا، تو بہ طریق کرامت روشنی کی شعاعوں نے اس قبر کو منکشف کر دیا۔ یہ

۱؎ ۱۲ - ص۳۳ -

۲؎ ابن سعد - ۳ - ص۴۹ - طبری بھی یہی لکھتا ہے، ۳ ص۲۳۲۴ اور دونوں ماخذوں میں حضرت ابو ایوب کا سال وفات ۵۲ھ تحریر ہے۔

اسی طرح کا واقعہ تھا جس طرح قدیم صلیبی مجاہدین پر انطاکیہ میں مقدس نیزے کا انکشاف ہونا مروی ہے۔ پھر اسی جگہ ایک مسجد تعمیر کردی گئی اور یوں یہ مرد مدنی تین تین قوموں میں ولی مانے گئے۔ (رضی اللہ عنہ)

امیر معاویہ کے زمانے میں قسطنطنیہ پر دوسرا حملہ اُس محاربے کے دوران میں ہوا۔ جسے "جنگ ہفت سالہ" کا نام دیا گیا ہے۔[۱] (۵۴ تا ۶۰ ھ - ۶۷۴ — ۶۸۰ ء) یہ زیادہ تر بحری لڑائی تھی جو فریقین کے بیڑوں کے درمیان قسطنطنیہ کے سامنے ہوتی رہی۔ اصل میں عربوں نے مارمورہ کے جزیرہ نما (کی زی کوس) قزقوس میں ایک بحری چھاؤنی قائم کرلی تھی۔[۲] بظاہر اسی کو عربی تاریخوں میں جزیرۂ ارواد لکھا ہے[۳] جہاں حملہ آور فوج موسم سرما گزارتی اور ہر سال بہار کی فصل آتے ہی نکل کر دشمن پر حملے کرتی تھی۔ ان معرکوں کے عربی بیانات بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نفط کی آگ نے شہر قسطنطنیہ کو عربوں سے بچائے رکھا۔ یہ نہایت آتش گیر مرکب پانی پر بھی آگ لے جاتا تھا۔ اسے دمشق کے ایک شامی پناہ گزیں مسمّی کیلی نی کوس نے ایجاد کیا تھا۔ یونانی روایتوں میں دشمن کے جہازوں پر اس آگ کے تباہ کن اثرات کی کیفیت مزے لے لے کے بیان کی گئی ہے۔ تھیوفانس کے بعد کا لکھنے والا اگاپیوس دمن بجی[۴] بار بار لکھتا ہے کہ بائی زنطہ والے عموماً اسی "آتش یونان" سے کام لیتے تھے اور جنگ میں سب سے پہلے انھی نے اسے استعمال کیا۔

---

[۱] دیکھو بیوری کی تاریخ روم (لندن ۱۸۹۰ء) ۲ - ص ۳۱۰ حاشیہ ۲
[۲] تھیوفانس، ص ۳۵۳ -
[۳] طبری ۲، ص ۱۶۳ - بلاذری ص ۱۳۶ -
[۴] کتاب العنوان [illegible] ، [illegible] پیرس ۱۹۱۲ء) جلد ۸ - ص ۴۹۲

یہی زمانہ تھا جب کہ عربوں نے روڈس (= رودس[1]) اور کریٹ (= اقریطش) کے جزیروں پر (۶۷۲ء اور ۶۷۴ء میں) عارضی قبضہ کیا۔ انھیں چھوڑ جانے کے بعد، رودس پر ۷۱۷-۱۸ء میں بھی وہ دوبارہ قابض رہے لیکن اس پر پہلے قبضے سے بھی پیشتر انھوں نے چھاپے مارے تھے۔ ایک اسی قسم کی تاخت ۶۵۴ء میں مذکور ہے۔ اس کے دو سال بعد یہاں کے مشہور "عفریت" کے جو حصے باقی رہ گئے تھے انھیں پرانی دھات کے مول ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کیا گیا اور ان ٹکڑوں کو لے جانے کے لئے بھی کہا جاتا ہے کہ اسے باربرداری کے نو سو اونٹ سے کام لینا پڑا۔ آخری مرتبہ رودس کو اندلس کے آوارہ گرد عربوں نے بھی فتح کر لیا تھا۔

امیر معاویہ کے انتقال (۶۸۰ء) پر عربی بیڑا بوس فورس اور بحر اجیان سے واپس چلا گیا۔ لیکن رومی علاقوں پر حملوں کا سلسلہ پھر بھی برابر جاری رہا۔ چنانچہ قریب قریب ہر سال گرمیوں میں ہم ایسی پیش قدمیاں اور بحری تاختوں کا حال سنتے ہیں۔ موسم کی مناسبت سے یہ حملے "صائفہ" (یعنی گرمی والے) کہلاتے تھے۔ اگرچہ سلیمان کی خلافت سے پہلے بڑے پیمانہ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ البتہ سلیمان (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) کو خیال تھا کہ ایک مشہور حدیث شریف میں جو پیش گوئی کی گئی ہے کہ ایک خلیفہ (یا سلمان فرماں روا) قسطنطنیہ کو فتح کرے گا اور وہ ایک پیغمبر کا ہم نام ہوگا، اس سے خود وہ (= سلیمان) مراد ہے۔ اس کے عہد حکومت میں دوسری دفعہ قسطنطنیہ کا زبردست محاصرہ

---

[1] بلاذری، ص ۲۳۷۔

کیا گیا (اگست ۷۱۶ء تا ستمبر ۷۱۷ء)[۱]۔ اس کا انصرام خلیفہ کے سوتیلے بھائی مسلمہ کے ہاتھ میں تھا اور اس یادگار محاصرے کے حالات کئی کتابوں میں محفوظ رہنے کے باعث، سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ معلوم ہیں۔ یہ عربوں کا قسطنطنیہ پر نہایت خطرناک حملہ تھا اور انھیں بحر و بر دونوں طرف سے کمک پہنچتی تھی۔ مصری جہاز مدد دیتے تھے اور قلعہ شکن آلات کے علاوہ[۲] نفطہ کا بھی ان کے پاس ذخیرہ تھا۔ مسلمہ کے حفاظتی دستے کا سردار عبداللہ "البطال" تھا جس نے ان معرکوں میں مردانگی کے ایسے جوہر دکھائے کہ "بہادر اسلام" کا لقب حاصل کیا۔ اگرچہ وہ بہت مدت بعد ایک اور معرکے میں شہید ہوا (۷۴۰ء)[۳] تاہم روایتوں نے اسی بطال کو "سید غازی" کے نام سے ترکوں کا ایک قومی سورما بنا دیا ہے۔ آج بھی اس کی قبر، جس پر مسجد کے ساتھ ایک بکتاشی تکیہ (یا خانقاہ) تعمیر کرلی گئی تھی، عسکی شہر کے قریب دکھائی جاتی ہے۔ اس کی عیسائیوں میں تعظیم تکریم، ایک اور مثال ہے کہ کس طرح "ایک نامور مسلمان کا نصاریٰ نے اپنے گرجا میں مجسمہ بنایا"[۴] (اور اس کی تقدیس کرتے تھے)۔

آخر قیصر لیو ای سورین کا زمانہ آیا (۷۱۷ء تا ۷۴۱ء) جو اصل میں مرعش کا شامی نژاد غریب سپاہی تھا (کر ترقی کر کے مسند قیصری تک پہنچا) اور زبانِ عربی پر ایسی ہی کامل قدرت رکھتا تھا جیسے یونانی پر[۵] اس نے

---

[۱] طبری۔ ۲ ص ۱۳۲۶۔ مقابلہ کرو، بیوری، ص ۴۰۲ حاشیہ ۲ سے۔
[۲] کتاب العیون والحدائق " (لائیڈن ۱۸۶۹ء) جزو سوم ص ۲۴۔
[۳] طبری۔ ۲۔ ص ۱۷۱۶۔
[۴] مسعودی۔ ۸ ص ۷۴۔
[۵] "کتاب العیون "۔ ۳ ص ۲۵۔

مسلمہ کو چکمہ دے کر پائے تخت کو بچالیا۔ اسی محاصرے کے ضمن میں ہم پہلی مرتبہ اُس زنجیر کا تاریخی حال پڑھتے ہیں جو بوس فورس میں باندھی گئی تھی کہ حملہ آور بیڑا "شاخ زریں" میں داخل نہ ہونے پائے۔ نفطی آگ اور بلغاریوں کے پے در پے حملوں سے بھی عرب محاصرین کو سخت نقصان پہنچا۔ قحط، وبا اور اس سال کی غیر معمولی سردی کی شدائد مستزاد تھیں۔ پھر بھی مسلمہ اڑا رہا اور شام میں خلیفہ سلیمان کی موت کی خبر سن کر بھی محاصرہ سخت تر کرنے سے باز نہ آیا۔ حتیٰ کہ نئے خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز (۷۱۷ — ۷۲۰ء) کا حکم پہنچا جس کی تعمیل کرنی پڑی۔ واپسی میں ایک بحری طوفان نے حملہ آوروں کی تباہی کی، جسے بائی زنطیوں نے شروع کیا تھا، اچھی طرح تکمیل کر دی۔ اگر تھیوفانس کا قول مانا جائے تو ۱۸ سو جہازوں میں سے فقط پانچ شام کی بندرگاہ تک سلامت پہنچے۔[1] عرب کا زبردست بیڑا ہی ختم ہو گیا۔ بائی زنطہ میں اسی سوری خاندان کے شامی بانی کی تعریف کا غل غلا مچ گیا کہ اُس نے یورپ کو عرب مسلمانوں سے اسی طرح بچالیا جس طرح ہرقلی خاندان کے ارمن بانی ہرقلیس نے کچھ مدت پہلے کافر ایرانیوں کے ہاتھ سے مسیحی دنیا کو نجات دلائی تھی۔ اس واقعے کے بعد پھر صرف ایک مرتبہ اور یہ نوبت آئی کہ ایک عربی لشکر نے بڑھ کر خاص قسطنطنیہ کے سامنے نمودار ہونے کی جرات کی۔ یہ وہ موقع تھا جب کہ خلیفہ مہدی عباسی کے فرزند ہارون نے ۷۸۲ء میں سقوطری (کری سوپلس) میں پڑاؤ ڈالا اور قیصرہ آئرین نے گھبرا کر خراج ادا کرنا قبول کیا اور صلح کر لی۔[2]

---

[1] طا ص ۳۹۵، ۳۹۶۔

ورنہ آیندہ قسطنطین کے شہر نے کسی اسلامی لشکر کو اپنی فصیلوں کے نیچے نہ دیکھا یہاں تک کہ سات صدیاں گزر گئیں اور وہ وقت آیا جب کہ دین محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا پرچم ایک نئی نسل، یعنی مغلی ترکوں نے اپنے ہاتھ میں لیا۔

مسلمہ کی مہم جو بڑی مستعدی اور مصمم ارادے سے آئی تھی کامیاب نہ ہوئی لیکن سابقہ مہم کی طرح بہت سے عجیب عجیب افسانے ضرور یادگار چھوڑ گئی۔ انہی میں یہ روایتیں داخل ہیں کہ خلیفۂ شام کے اس بھائی نے خاص قسطنطنیہ میں ایک مسجد تعمیر کر دی تھی[۱] ایک اور مسجد اور فوّارہ اب دُس (ایبی ڈوس[۲]) میں بنوایا، اور یہ کہ ایک بار وہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایا صوفیہ کی عمارت میں داخل ہو گیا۔ ۹۸۵ء میں اپنی کتاب تالیف کرتے وقت المقدسی نقل کرتا ہے[۳] کہ جب مسلمہ ابن عبد الملک نے رومیوں کے ملک پر فوج کشی کی اور بڑھتا چلا گیا تو ایک شرط یہ کی تھی کہ بائی زنطی کتا (یعنی قیصر) خاص اپنے محل کے برابر ہپوڈروم (= میدان) میں مسلمان شرفا اور معززین کے لئے جو لڑائی میں اسیر ہو جائیں، ایک خاص عمارت بنوا دے![۴]

---

[۱] ابن تغری بردی، اپنی کتاب "النجوم الظاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ" (برکلے ۱۹۰۲ء) ج ۲ ص ۴۲، میں لکھتا ہے کہ اس مسجد میں فاطمی خلفا کا خطبہ پڑھا گیا تھا۔ نیز دیکھو ابن قلانسی کی "ذیل تاریخ دمشق" (بیروت ۱۹۰۸ء) ص ۶۸۔ عہد مالاک تک اس مسجد کی روایت چلی جاتی تھی۔

[۲] ابن خرداذبہ۔ ص ۱۰۳؛ مسعودی۔ ج ۴ ص ۳۱ میں مقام کا نام "اندلس" لکھا ہے۔ یاقوت نے "اندس" لکھا ہے جو "اب دُس" کی غلط املا ہے۔ [۳] ص ۱۴۷

[۴] اس عمارت "ال بلاط" کا یاقوت ذکر کرتا ہے کہ سیف الدولہ ہمدانی کے زمانے میں استعمال ہوتی تھی (ج ۱ ص ۷۰۹) لفظ بلاط کی تحقیق کتاب کے آیندہ باب ۳۴ کے ایک حاشیے میں ہم پڑھیں گے۔

عربوں کو جانب مغرب بڑھنے میں ایک رُکاوٹ مردیت (باغی) عیسائیوں کی ہنگامہ آرائی سے پیش آئی جو بائی زنطہ کی حمایت میں سرگرم رہتے تھے۔ عرب ان کو جراجمہ (اور کبھی پہلے ج پر پیش کے ساتھ جُراجمہ، اگرچہ یہ ٹھیک نہیں) بھی موسوم کرتے تھے۔ ان کی نسل کا صحیح حال معلوم نہیں۔ مگر یہ لکام (= امانوس) کے علاقے میں نیم آزاد زندگی بسر کرتے اور فوج بے قاعدہ میں بھرتی ہو جاتے تھے۔ شام کی عربی خلافت کو انھوں نے بار ہا پریشان کیا اور عرب و بائی زنطہ کی سرحد پر
205 ایک "برنجی دیوار" بن کر مسلمانوں سے ایشیائے کوچک کو بچایا[1]۔ ۶۶۶ء میں ان کے جتھے وسطِ لبنان میں داخل ہوئے اور بہت سے مفرور باغیوں کو اپنی بستیوں میں پناہ دینے لگے۔ انہی میں ماروی فرقے کے عیسائی شامل تھے۔ یہ مخالفت کا مضبوط گڑھ شامی دارالخلافے کے سر پر ایسا بنا تھا کہ معاویہ نے قیصر کو ایک بھاری پیش کش سالانہ ادا کرنا قبول کیا کہ وہ عربوں کے اس اندرونی دشمن کو آیندہ مدد دینے سے باز رہے۔ خود ان شورش پسندوں کو بھی خلافت شام روپیہ بھرتی رہتی تھی۔ ۶۸۹ء میں قیصر جسٹی نین ثانی نے ایک مرتبہ پھر ان پہاڑی مردیتوں کو شام پر لہکایا اور عبدالملک نے امیر معاویہ کی نظیر لے کر[2] قیصر کی پیش کردہ نئی شرطیں قبول کر لیں، یعنی جراجمہ کو ایک ہزار دینار فی ہفتہ ادا کرنے پر رضامند ہو گیا۔ آخر ان حملہ آوروں کی اکثر تعداد شام سے چلی گئی اور ایشیائے کوچک کے ساحل پر جا بسی جہاں انھوں نے ملاحی کا پیشہ اختیار کیا۔ تھوڑے سے لوگ جو شام ہی میں رہ گئے تھے، ماروی فرقے کا ایک جزو ترکیبی بن گئے۔ یہ فرقہ ابھی تک شمالی لبنان میں پھول پھل رہا ہے۔

۱؎ تھیوفانس، ص۳۶۳۔ ۲؎ بلاذری، ص۱۶۰۔

باب نوزدہم ۱۹

اموی قوت کا عروج

106

اموی خلافت کی مروانی شاخ کا مورث مروانؔ (۶۸۳ء تا ۶۸۵ء) فوت ہوا تو اس کا بیٹا عبدالملک خلیفہ بنا (۶۸۵ء تا ۷۰۵ء) جسے "ابوالملوک" کہتے ہیں۔ اسی بادشاہ اور اس کے چار بیٹوں کے زمانے میں جو تخت خلافت پر متمکن ہوئے[1]، دمشقی حکومت شوکت و اقتدار کے نصف النہار کو پہنچی اور الولید اور ہشام کے عہد میں اسلامی سلطنت نے اتنی وسعت پائی جو نہ پہلے پائی تھی نہ بعد میں پا سکی۔ وہ ایک طرف بحر اطلانتک (اوقیانوس) اور کوہستان پائی رینؔ سے پھیلتی اور دوسری طرف حدود چین اور دریائے سندھ تک مسلسل چلی جاتی تھی۔ یہ وہ وسعت ہے جس کی سابقہ زمانے میں مشکل سے نظیر ملے گی اور عہد حاضر

---

[1] ان کے نام یہ ہیں: ولید (۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) سلیمان (۷۱۵ء تا ۷۱۷ء) یزید ثانی (۷۲۰ء تا ۷۲۴ء) اور ہشام (۷۲۴ء تا ۷۴۳ء)۔ پسران عبدالملک کی بادشاہی میں کوئی تین سال کا وقفہ عمرؔ ابن عبدالعزیز کی (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) خلافت سے پڑ گیا تھا جو عبدالملک کے بھائی عبدالعزیز کے بیٹے تھے۔

میں بھی صرف سلطنت برطانیہ اور سلطنت روس ہی اس سے بڑھ سکی ہیں۔ اسی دور سطوت و اقبال میں ماوراء النہر کی فتح ہوئی اور نہ صرف شمالی افریقہ کی مکرر تسخیر و تامین کی گئی بلکہ ہسپانیہ پر قبضہ ہوا کہ یورپ کا اتنا بڑا ملک عربوں نے اور کوئی کبھی فتح نہ کیا تھا۔ پھر یہی زمانہ ہے جس میں نظم و نسق کو ملی یا عربی رنگ دیا گیا۔ خالص عربی سکہ چلایا گیا۔ محکمہ برید (ڈاک) کی توسیع و ترقی عمل میں آئی اور ایسی شان دار عمارتیں جیسے اسلام کے تیسرے مقدس مقام بیت المقدس کا قبۃ الصخرہ ہے، تعمیر کی گئیں۔

تخت نشینی کے وقت اور آیندہ دس برس تک عبد الملک کی خلافت بہت سے دشمنوں میں گھری رہی اور اپنے جلیل القدر پیش رو امیر معاویہ کی طرح، جن سے وہ بہت مماثلت رکھتا ہے، اسے بھی کئی محاذ پر مخالفین کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بایں ہمہ اپنی حکومت کے دوسرے دہے کے آخر میں جب اس کا انتقال ہوا تو اس نے اپنے بیٹے الولید کے لیے ایسی سلطنت ورثے میں چھوڑی جس میں امن و امان قائم اور ہر طرح اس کا استحکام کر دیا تھا اس میں نہ صرف تمام اسلامی ممالک شامل تھے بلکہ اس کی اپنی نئی فتوحات بھی تھیں۔ ایسے لائق باپ کا الولید بھی خلف رشید ثابت ہوا۔ شام و عراق، ایران و مصر پر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں قبضہ کیا گیا تھا۔ یہ اسلامی فتوحات کا پہلا دور تھا جو انہی دو حضرات پر ختم ہوا۔ فتوحات کے دوسرے دور کا اب عبد الملک اور الولید کے عہد حکومت میں آغاز ہوتا ہے اور اس دور کے درخشاں

۵ ابن رستہ، صفحہ ۲۱۶۔ ابن درید: "اشتقاق" صفحہ ۱۶۵۔

جنگی کارناموں کے محور، مشرق میں الحجاج ابن یوسف الثقفی اور مغرب
میں موسیٰ ابن نصیر کے نام ہیں ؛ 207

ایک پرجوش نائب خلیفہ: حجّاج

ان میں الحجاج، حجاز کے شہر طائف کا مدرس تھا[1] جس نے جوانی ہی میں قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور بنی اُمیّہ کی لڑکھڑاتی سلطنت کی حمایت میں تلوار سنبھال لی تھی۔ اکتیس برس کی عمر میں اس نے عبداللہ ابن زبیر جیسے طاقت ور مدعی کو جو نو سال تک خلیفہ کے خطاب اور اقتدار کے مالک رہے تھے، کامل شکست دی اور عرب کا والی بنا دیا گیا (۶۹۲ء)۔ حجاز اور اسی کے ساتھ ملک یمن بلکہ مشرق میں یمامہ تک امن امان قائم کرنے میں اسے دو سال لگے۔ پھر ۶۹۴ء کے آخر میں عبدالملک نے شورش پسند و نامطمئن عراق میں یہی خدمت انجام دینے کی غرض سے طلب کیا جہاں کے باشندے "اہل نفاق وشقاق" کہے جاتے تھے[2]۔ یہاں شیعیان علیؓ اور خوارج دونوں گروہ امویوں کو تنگ کرتے رہتے تھے۔ حجاج کا بلا اطلاع صرف بارہ شتر سواروں کے ساتھ ایک دم بھیس بدل کر پہنچنا اور کوفے کی مشہور مسجد جامع کے منبر پر بے تکان چڑھ جانا، پھر بھاری عمامہ جس نے چہرہ چھپا رکھا تھا، اُتار کر ایک آتشیں تقریر کرنا، تاریخ کے عجیب وغریب ہوش ربا واقعات میں شامل ہیں جنھیں عربی کتابوں میں بار بار نقل کیا گیا ہے۔ اس نے

---

[1] ابن رستہ، ص ۲۱۲۔ ابن درید: "اشتقاق" ص ۱۸۵؛

[2] یعقوبی، ۲ ص ۳۲۶۔ مسعودی، ۵ ص ۲۹۵؛

ایسے صاف صاف اور قطعی الفاظ میں اپنی حکمت عملی کا اعلان کیا جس سے عراقیوں پر پہلے ہی دن واضح ہوگیا کہ وہ سرکش رعایا سے معاملہ کرنے میں کسی نرمی اور اعتدال سے کام لینے والا شخص نہیں ہے۔ خطبے کا آغاز ہی اس نے ایک قدیم شاعر کے اس شعر سے کیا کہ ؎

انا ابن جلا و طلاع الثنایا

متی اضع العمامۃ تعرفونی

(ترجمہ: میں (چاند کی طرح) تاریکیاں کافور کرنے والا، اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھنے والا آدمی ہوں۔ جس وقت اپنا عمامہ اتاروں گا، تم مجھے (اچھی طرح) پہچان لوگے!)[۱]

پھر مقرر نے کہا: "اے اہل کوفہ، یقین جاننا مجھے سر نظر آرہے ہیں جو کٹنے کے لئے پک چکے ہیں۔ اور کچھ شک نہیں کہ اس کام کو کرنے والا میں ہوں کیوں کہ میں ڈاڑھیوں اور عماموں کے درمیان خون ہی خون چلتا دیکھتا ہوں ...... !"[۲]

حقیقت میں اس بے رحم نائب خلیفہ کے سامنے کوئی سر اتنا قوی نہ ثابت ہوا جسے وہ نہ کچل سکتا ہو اور کوئی گردن اتنی اونچی نہ نکلی جو اس کی گرفت میں نہ آسکتی ہو۔ حضرت انس ابن مالک (رضی اللہ عنہ) پیغمبر (علیہ الصلوۃ والسلام) کے محترم صحابی اور کثیر احادیث نبوی کے

---

[۱] (کتاب میں صرف انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ اصل شعر مجھے مکرمی قاضی اختر میاں صاحب نے کمال مہربانی سے مروج الذہب اور مبرد سے تلاش کرکے دیا۔ اور شاعر کا نام بھی بتایا: سحیم ابن وثیل، جو جاہلیہ اور ابتدائے اسلام کے عہد میں تھا۔ مترجم)

[۲] مبرد "کامل" ص ۲۱۵۔ یعقوبی، ۲ ص ۳۲۶۔ مسعودی، ۵ ص ۲۹۴۔

راوی جیسے بزرگوار پر جب یہ الزام لگایا گیا کہ مخالفین حکومت کی طرف میلان رکھتے ہیں، تو اُن کو گلے میں طوق پہننا پڑا جس پر حجاج کی مُہر لگی ہوئی تھی[1]۔ کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بیس ہزار انسانی جانیں عراق کے اس والی کے ہاتھوں تلف ہوئیں[2]۔ جسے عرب مورخ خون کا پیاسا ظالم اور بالکل نیرو جیسا سفاک بتاتے ہیں اگرچہ یہ مُورخ عموماً یا تو شیعہ ہیں یا عباسیوں کے عہد حکومت کے سُنّی ہیں۔ سفاکی پر مستزاد اس کی پُرخوری اور عیاشی ان مورخوں کا دل پسند موضوع ہے[3]۔

جائز تھیں یا ناجائز، حجاج کی یہ سخت تدبیریں اس حد تک کامیاب ضرور ہوئیں کہ بصرے اور کوفے، دونوں جگہ کے بغاوت پسند لوگوں میں ضبط و انتظام قائم ہوگیا اور اس کی تمام وسیع ولایات سے جن میں عراق و ایران شامل تھے، بدامنی جاتی رہی۔ اس کے فوجیوں نے جن کا سردار مہلّب ابن ابی صفرہ تھا ازرقی فرقے کو تقریباً فنا کر ڈالا (۷۸ھ یا ۶۹۹ء)[4] یہ خارجی گروہ میں اسلامی وحدت کے سب سے سخت دشمن تھے اور اپنے رہنما قطَری ابن الفجاءہ کی سرکردگی میں کرمان[5]، فارس اور کئی مشرقی اقطاع دبا بیٹھے تھے۔ دوسری طرف خلیج فارس کے مقابل کے ساحل پر عمان پوری طرح اب اموی سلطنت کا جزو بنا اگرچہ عہد رسالت[۲] میں عمرو ابن العاص

---

[1] طبری، ۲، ص ۸۵۴۔

[2] ابن العبری، ص ۱۹۵۔ نیز دیکھو مسعودی، ۵، ص ۳۸۲۔ طبری، ۲، ص ۱۱۲۳۔

[3] دینوری، "اخبار" ص ۳۲۲۔ مسعودی، ۷، ص ۲۱۸۔ طبری، ۲، ص ۱۱۲۳۔ ابن عساکر، ۴، ص ۸۱۔

[4] یہ اپنے سرگردہ نافع ابن الازرق کے نام پر ازرقی کہلاتے تھے۔ نافع کی تعلیم یہ تھی کہ خارجی عقائد ماننے والوں کے سوا سب (مسلمان) کافر اور اپنے بیوی بچوں سمیت دوزخی ہیں۔ شہرستانی ص ۸۹۔

[5] یاقوت حرف اوّل پر کسرہ دیتا ہے۔ ۴، ص ۲۶۳۔

اسے رسمی طور پر اسلام کا حلقہ بگوش بنا چکے تھے۔ حجاج نے اپنا نیا دارالحکومت دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر بصرے اور کوفے کے وسط میں بنایا اور اسی لیے واسط (یعنی وسطی) اس کا نام رکھا کہ وہ عراق کے ان کلیدی شہروں کے درمیان واقع تھا[1]۔ یہیں سے اس کی شامی افواج جملہ ولایات کو خلافت کا مطیع بنائے رکھتی تھیں۔ حجاج جس طرح بنی امیہ کا سچا وفادار تھا، اسی طرح خود ان شامی فوجوں پر بھی آنکھ بند کر کے بھروسہ کرتا تھا۔ دونوں کے ساتھ اس کا اخلاص بے پایاں تھا۔

جب اس کے علاقے میں امن امان اور نظم درست ہو گیا تو حجاج کی بے چین طبیعت کو فرصت ملی کہ اپنے ماتحتوں کو مشرق میں آگے بڑھنے کی اجازت دے۔ ان میں سے ایک عبدالرحمٰن ابن محمد ابن الاشعث، سجستان کا والی اور کندہ کے شاہی خاندان کا فرد تھا۔ آگے چل کر اسی نے حجاج کے احکام سے سرتابی کی اور خوفناک بغاوت کا بانی ہوا۔ لیکن بالفعل اسے کابل (موجودہ افغانستان کے دارالحکومت) کے ترک نژاد بادشاہ زنبیل سے لڑنے بھیجا گیا (۶۹۹ - ۷۰۰ء) جسے غلطی سے "رتبیل" بھی کہتے ہیں[2]۔ وہ مقررہ خراج ادا کرنے سے انکار
204 کر رہا تھا[3]۔ عبدالرحمٰن ایسی آراستہ پیراستہ فوج لے کر چلا تھا کہ وہ "موردل کی فوج[4]" کہلاتی تھی۔ اسے پوری کامیابی حاصل ہوئی لیکن یہ شاندار معرکے

---

[1] یاقوت۔ نیز دیکھو طبری۔ ۲ صفحہ ۱۱۲۵۔ اب یہ جگہ کھنڈروں کا ڈھیر ہے۔

[2] ول ہاوزن، صفحہ ۱۱۴۔ حاشیہ ۳۔

[3] اس بادشاہ اور وسط ایشیا کے اکثر بادشاہوں کی ماتحت رعایا ایرانی (یا آریہ نسل سے) تھی لیکن شاہی خاندان اور ان کی فوجیں ترک تھے۔

[4] مسعودی: "تنبیہ" صفحہ ۳۱۴۔

بھی قتیبہ ابن مسلم اور حجاج کے ایک عم زاد بھائی محمد ابن قاسم الثقفی کی فتوحات کے سامنے پھیکے پڑ گئے۔ حجاج کی سفارش سے قتیبہ ۷۰۴ء میں خراسان کا والی مقرر کیا گیا۔ اس کا دارالحکومت مرو تھا اور حجاج کے اس ماتحت والی کے تحت میں بلاذری اور طبری کے قول کے مطابق[1]، چالیس ہزار عرب سپاہی بصرے کے، سات ہزار کوفے کے اور سات ہزار موالی کا کثیر لشکر دیا گیا تھا۔

ایران و توران یعنی فارسی اور ترکی بولنے والی قوموں کے درمیان ابھی تک دریاے جیحون[2] حد فاصل رہا تھا۔ اگرچہ یہ سرحد تاریخی نہ تھی، روایتی تھی۔ سو یہ بھی خلیفہ ولید کے عہد میں پار کر لی گئی اور جیحون کے دوسری جانب مسلمانوں نے مستقل طور پر قدم جما لیے۔ قتیبہ کے پے بہ پے اور تابناک حملوں نے ۷۰۵ء میں طخارستان اور اس کا صدر مقام بلخ (یونانیوں کا "بیک ٹرا" یا باختر) فتح کیا۔ ۷۰۶ء تا ۷۰۹ء میں صوبہ صغد (سوگ دیانہ) کا دارالحکومت بخارا اور اس کا نواحی علاقہ قبضے میں لیا۔ اسی صوبے کا دوسرا بڑا شہر سمرقند اور مغرب میں خوارزم (جدید خیوا) کی تسخیر کی (۷۱۰ء تا ۷۱۲ء)۔ ۷۱۳ء تا ۷۱۵ء میں بالای جیحون کی ولایات پر فوج کشی کی جس میں فرغانہ کی جنگ سب سے اہم تھی۔ غرض پورے علاقے پر جو آج کل وسط ایشیا کی خانی ریاستوں سے موسوم ہوتا ہے، مسلمانوں کا رسمی قبضہ قائم کر لیا۔ ایرانی اور ترک قوموں کے درمیان،

---

[1] بلاذری ص۴۲۳ ۔ طبری ۲ ۔ ص۱۲۹۰۔

[2] جسے آج کل آمودریا کہتے ہیں۔ ایرانی اور عربی نام جیحون اور اس کے ساتھی سیردریا کے لیے، سیحون، توراۃ کی کتاب آفرینش کے "گیہوں" اور "پی زون" (۲ : ۱۳) سے تصرف کرکے بنائے گئے ہیں۔

نسلی اور سیاسی لحاظ سے قدرتی سرحد جیحوں نہ تھا، بلکہ آمو دریا (سیحوں) کو سمجھنا چاہیئے اور مسلمانوں کا اسی کو عبور کرنا، مغولی اقوام اور بدھ مت کو جنگ کی دعوت دینا تھا۔ سمرقند میں قتیبہ کو بہت سے بت ملے ان کے پرستار ایمان رکھتے تھے کہ جو کوئی ان بتوں کو گزند پہنچائے گا، وہ فوراً غارت ہو جائے گا۔ مسلمان سپہ سالار ان دھمکیوں کو ذرا بھی خاطر میں نہ لایا اور اپنے ہاتھ سے بت خانے میں آگ لگائی۔ یہ دیکھ کر بت پرستوں کی ایک خاصی تعداد نے دین اسلام قبول کر لیا[1]۔ لیکن اسلام کی وسیع پیمانے پر اشاعت درحقیقت خلیفہ عمر ثانی ہی کے عہد (۷۱۷ء تا ۷۲۰ء) میں ہوئی جب مسلمان ہونے والوں کو یہ رعایت ملی کہ ان سے کوئی خراج نہیں لیا جائے گا۔ سمرقند کے مندر کی طرح بخارا کا آتش کدہ اور اس کا عبادت خانہ بھی منہدم کرا دیا گیا اور یوں ولایت خوارزم، اور بخارا اور سمرقند، آیندہ بہت جلد وسطی ایشیا میں عربی تہذیب کے مرکز اور اسلام کا گہوارہ بن گئے جو خراسان کے مرو اور نیسابور (ایرانی
210 نیشاپور) کے مماثل تھے۔ مورخ طبری[2] اور بعض دوسرے مؤرخوں نے چینی ترکستان میں کاشغر کی فتح (۷۱۵ء میں) قتیبہ سے منسوب کی ہے بلکہ لکھا ہے کہ وہ چین خاص کے علاقے تک پہنچ گیا تھا مگر یہ روایت گویا قبل از وقت درج ہو گئی ہے یعنی نصر ابن سیار اور اس کے مابعد سپہ سالاروں کی فتوحات قتیبہ کے نام لکھ دی گئی ہیں[3]۔ نصر کا تقرر خلیفہ ہشام (۷۲۴ء تا ۷۴۳ء) کے عہد میں ولایت ماوراء النہر پر سب سے پہلے والی کی حیثیت سے کیا گیا

۱؎ بلاذری، ص ۴۲۱۔ ۲؎ ۲، ص ۱۲۷۵۔

۳؎ دیکھو گب کا مضمون رسالہ "اسکول اوف اورینٹل .... اسٹڈیز" لندن میں ج ۲ ۱۹۲۳ء ص ۴۶۷ و مابعد۔

تھا اور اسی کو ۷۳۰ء اور ۷۴۰ء کے درمیان بہت سا علاقہ جسے قُتیبہ پامال کرگیا تھا، دوبارہ باقاعدہ فتح کرنا پڑا ورنہ قتیبہ کے عامل مفتوحہ علاقوں میں محض فوجی نگرانی رکھتے اور مقررہ خراج وصول کرلیتے تھے۔ ملکی انتظامات غالباً دیسی حاکموں ہی کے ہاتھ میں چھوڑ دئے گئے تھے۔ نصر کی فتوحات کے چند سال بعد سمرقند کے شمال مشرق میں الشاش (= تاشقند) پر ۷۵۱ء میں عربوں نے قبضہ کیا اور اس طرح وسطِ ایشیا میں اسلام کی قطعی سیادت ایسی محکم ہوگئی کہ پھر چینیوں کو اس سے انکار وجدال کی مجال نہ رہی۔[1]

غرض خلفا کی بڑھتی ہوئی سلطنت نے بالآخر تمام ماوری النہر کا (یعنی سیحوں کے پار کا) علاقہ اپنے ساتھ الحاق کرلیا اور اسی سے دنیائے اسلام کا ایک نئی نسل کے لوگوں سے جن کی منگولی تہذیب جداگانہ اور بجائے خود قدیم تھی، پہلی مرتبہ نہایت قوی رابطہ پیدا ہوگیا۔ انہی سے دینِ اسلام کے تازہ دم سپاہیوں کی بھرتی ہوئی اور انھوں نے اسلامی تاریخ میں جو نمایاں حصّہ لیا، اس کو تفصیلی طور پر ہم آیندہ اوراق میں بیان کریں گے۔

فتوحاتِ ہند

قُتیبہ کی ترکستان میں معرکہ آرائی کے زمانے ہی میں اور اسی مشرقی سمت میں ایک اور لشکر محمد ابن قاسم کی سپہ سالاری میں جنوب کی طرف

---

[1] شاید سمرقند و خوارزم اور شاش کے دیسی حاکم مغربی ترکوں کے خان یا خاقان سے معاہدہ رکھتے تھے اگرچہ عرب تاریخوں میں ان کے القاب خُدا، شاہ، دہقان، فارسی تحریر ہیں۔ صغد کا رئیس سمرقند میں رہتا تھا، وہ، اور اسی طرح شاہ فرغانہ، "اخشید" کے فارسی لقب سے ملقب تھے دیکھو ابن خرداذبہ: صفحہ ۳۹ یعقوبی۔ ۲ صفحہ ۴۷۹۔ واضح رہے کہ سیحوں کے پار عرب ہر غیر ایرانی قوم کو "ترک" موسوم کرتے تھے۔

حرکت کر رہا تھا (سنہ ۷۱۰ء) حجاج کے اس عم زاد کے تحت میں خاصی
بڑی فوج تھی جس میں چھ ہزار جنگ آزما شامی تھے۔ اسی فوج سے محمد
نے مکران کو مطیع کیا اور اس علاقے سے جو آج کل بلوچستان کہلاتا ہے
بڑھتے بڑھتے سندھ میں داخل ہوگیا۔ یہ اسی نام کے دریا (=سندھ)
کی وادی زیریں اور شاخ دار دہانے کا علاقہ ہے جسے محمد نے ۷۱۲-۷۱۱ء
میں فتح کرلیا۔ مفتوحہ شہروں میں بندرگاہ دیبل بھی تھی جس میں بدھا
(= عربی بُد) کا ایک بت "چالیس درع تک بلند تھا"[1] ایک اور
شہر نیرون تھا جو اب حیدرآباد کہلاتا ہے۔ فتوحات کی مزید توسیع شمال
میں ملتان کی تسخیر سے ہوئی، کہ جنوبی پنجاب کا شہر ہے۔ ان دنوں یہاں
بھی بدھ مت کا ایک بڑا مندر تھا جس میں حملہ آوروں کو غول کے 212
غول زائر ملے اور انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ اس لشکرکشی کے نتیجے میں سندھ
اور جنوبی پنجاب پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا لیکن ہندوستان کے دوسرے
اقطاع متاثر نہیں ہوئے۔ یہ نوبت دسویں صدی عیسوی میں اس وقت
آئی جب کہ سلطان محمود غزنوی کی سپہ سالاری میں مسلمانوں کے ازسرنو
حملے شروع ہوئے۔ بہرحال، سرحد ہندوستان کے صوبے (عربوں کی
فتح سے) ہمیشہ کے لئے اسلامیت کے دائرے میں آگئے اور یہیں سامی
اسلام اور ہندی بدھ مت کا سب سے پہلا اہم اور مستقل تعلق پیدا
ہوا جس طرح دُور شمال میں ترکوں کی تہذیب اور مذاہب سے ربط کی
صورت نکل آئی تھی۔ حجاج نے وعدہ کیا تھا کہ محمد اور قتیبہ، جو اس کے
سب سے بڑے سرلشکر تھے، ان میں سے جس کا قدم سرزمین چین میں پہلے

---

[1] یعقوبی - ۲ ص ۳۴۶ ؛

پہنچ جائے گا، اسی کو وہاں کی حکومت کا خلعت دلوادے گا لیکن ان دونوں میں ایک بھی سرحد چین کے پار نہ ہوسکا۔ ہر چند خاص چین میں، ترکستان کو چھوڑ کر، اس وقت پچاس تا ستر لاکھ مسلمان آباد ہیں، لیکن یہ ملک کبھی ان کے حلقۂ اطاعت میں نہ آیا۔ پھر جس طرح شمال میں کاشغر اور تاشقند تھے اسی طرح اب جنوب میں سندھ خلافت اسلامیہ کی انتہائی مشرقی سرحد بنا اور آئندہ بھی بنا رہا۔

بائی زنطہ سے مقابلے

جس زمانے میں یہ عظیم مہمات ممالک مشرق پر بھیجی گئیں، بائی زنطہ کا محاذ بھی بالکل خالی نہیں چھوڑا گیا تھا۔ ابتدائی عہد حکومت میں جب کہ عبداللہ ابن زبیر سے خلافت کے لئے جنگ جاری تھی، عبدالملک نے امیر معاویہ کی نظیر لے کر[1] رومیوں کے جابر قیصر کو تاوان بھرنا قبول کیا تھا کہ اس کے گماشتے، یعنی لکام کے عیسائی جراجمہ ان دنوں لبنان میں گھس آئے تھے (۷۰ھ مطابق ۹۰ – ۶۸۹ء) لیکن جب اندرون ملک میں سیاسی مطلع صاف ہوگیا تو اس ابدی دشمن سے پھر جنگ چھیڑ دی گئی۔ قیصر جسٹی نین ثانی کو ۶۹۲ء میں عربی لشکر نے سلیشیہ کے سباس توپولس کے قریب شکست دی اور چند سال بعد (۷۰۰ء کے قریب) ان کے دوسرے صوبے کپادوسیہ کا سب سے زبردست قلعہ ال طوانہ (= ٹیانا) چھین لیا۔ قسطنطنیہ کے یادگار محاصرے کا جو اگست ۷۱۶ء سے ستمبر ۷۱۸ء تک جاری رہا، اوپر ذکر آچکا ہے۔

---

[1] جیسا کہ اوپر آچکا ہے۔ نیز دیکھو بلاذری ص ۱۶۰

مسلمہ نے یہ محاصرہ سردینس اور پرگاموس کو تسخیر کرنے کے بعد شروع کیا تھا۔ اسلامی لشکر جس نے ابی دوس پر آبنائے دردانیال کو عبور کیا قلعہ شکن آلات سے مسلح تھا۔ لیکن بیڑا شہر کی فصیلوں کے قریب ایک طرف بحر مارمورہ میں اور دوسری جانب بوس فورس میں لنگر انداز رہا کیوں کہ آبنائے "شاخ زریں" کا راستہ ایک بڑی زنجیر کے ذریعے روک دیا گیا تھا۔ گزشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ دوسرا موقع تھا جب کہ عرب لشکر نے بائی زنطہ کے دارالسلطنت کو بڑھ کر گھیر لیا لیکن سامان رسد کے قحط اور بلغاریوں کے حملوں نے انھیں مجبور کیا کہ پورے ایک سال محاصرہ جاری رکھنے کے بعد واپس جائیں[۱]۔ البتہ ارمنیہ میں خلافت دمشق کی فوج کام یاب ہوئی۔ یہ ولایت امیر معاویہ ہی کے
21 عہد میں حبیب ابن مسلمہ ال فہری نے بہت پہلے یعنی ۲۵-۶۴۴ء میں فتح کرلی تھی لیکن عبداللہ ابن زبیر کے میدان میں آنے سے ارمنیہ والوں نے موقع دیکھ کر بغاوت کا علم بلند کر دیا۔ بارے اب یہ ولایت دوبارہ خلافت اموی کے زیر نگیں لائی گئی[۲]۔

شمالی افریقہ اور مغربی یورپ کی فتوحات

حجاج کے سپہ سالاروں نے مشرق میں جیسی فتوحات حاصل کیں، مغربی ممالک میں موسیٰ ابن نصیر اور اس کے فوجی سرداروں کی جنگی کام یابیاں ان سے کچھ کم تعجب انگیز اور تابناک نہ تھیں۔ ملک مصر کی

---

[۱] ملاحظہ ہو تھیوفانس صفحہ ۳۸۶۔ نیز طبری، ۲، صفحہ ۱۳۱۵ اور ابن الاثیر، ۵، صفحہ ۱۷۔

[۲] بلاذری صفحہ ۲۰۵ و ما بعد۔

تسخیر کو (۶۴۰-۶۴۳ء) زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ مغرب کی طرف افریقیہ[1] پر تاخت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن اس علاقے کی مکمل فتح اس وقت تک عمل میں نہیں آئی جب تک کہ امیر معاویہ کے ایک فرستادہ سردار عُقبہ ابن نافع نے ۶۷۰ء میں شہر قیروان کی بنیاد نہ ڈالی اور اسے بربر قوموں کے خلاف لشکرکشی کا مستقل مرکز قرار نہ دیا یہ وہی عُقبہ تھے جن کی نسبت روایت مشہور ہے کہ اس وقت تک برابر بڑھتے چلے گئے جب تک کہ ان کے گھوڑے کو اوقیانوس کی موجوں نے نہ روک دیا! وہ موجودہ الجزائر کی بستی بِسکارا کے قریب جنگ میں شہادت سے سرخ رو ہوے (۶۸۳ء) جہاں ان کا مدفن ساری قوم کی زیارت گاہ بن گیا ہے۔ عُقبہ کی بیش قدمیوں کے باوجود یہ مغربی ممالک پوری طرح عربوں کے قبضے میں نہ آئے تھے اور ان کی شہادت کے بعد ان کے جانشین حاکموں کو یہ علاقہ چھوڑ دینا پڑا تھا۔

بائی زنطہ کی سیادت اور بربروں کی مزاحمت کا سلسلہ دس بارہ برس تک جاری رہا یہاں تک کہ حسّان ابن نعمان الغسانی والی مقرر ہوا (تخ ۶۹۳ تا ۷۰۰ء) اور اس نے ان کا خاتمہ کردیا۔ حسّان نے اسلامی بیڑے کی مدد سے اہل بائی زنطہ کو قرطاجنہ (کارتھیج) اور ساحلی شہروں سے دھکے دے کے نکال دیا (۶۹۸ء) اور ادھر سے فراغت حاصل کرکے بربروں کی طرف توجہ منعطف کی۔ اس زمانے میں ان اقوام کی سرگروہ

---

[1] یہ نام عربوں نے رومیوں سے مستعار لیا اور ملک بربری کے مشرقی اقطاع کو افریقیہ موسوم کیا۔ مغربی علاقے کے لئے "مغرب" کا لفظ مخصوص تھا۔ اب افریقیہ میں پورا براعظم افریقہ شامل ہے ؛

ایک (کاہنہ[1] یا) نبیّہ بن گئی تھی اور اپنے مقلدین پر عجیب طرح کا پُراسرار اثر قائم کر لیا تھا۔ یہ شورہ عورت آخر دغا سے لڑائی ہاری اور ماری گئی۔ وہ کنواں جس کے قریب اس کی جان گئی، ابھی تک اسی کی نسبت سے "بیر الکاہنہ" کہلاتا ہے۔

حسان، افریقیہ کا فاتح ثانی اور امن و انتظام قائم کرنے والا تھا لیکن اس کا جانشین موسیٰ ابن نصیر اس سے بھی ناموری میں بڑھ گیا۔ اسی کے عہد ولایت میں ان مغربی صوبوں کو مصر کی ماتحتی سے الگ کر کے جداگانہ ولایت قرار دیا گیا جس کا دار الحکومت قیروان تھا اور والی براہ راست خلیفہ دمشق کے حکم سے مقرر ہونے لگے۔ موسیٰ کا باپ ایک مسیحی اسیر جنگ تھا وہ اور پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے پہلے سوانح نویس ابن اسحاق کا دادا عین التمر کے گرجا میں کتاب مقدس تلاوت کر رہے تھے کہ حضرت خالد ابن ولید سپہ سالار اسلام کے ہاتھ پڑے[2]۔

214 موسیٰ نے اپنی ولایت کی حدود بڑھا کر طنجہ (مراکش) تک پہنچا دیں اور انہی جدید مقبوضات سے مسلمانوں کا رابطہ ایک اور نسلی گروہ، یعنی بربر اقوام سے مستقل طور پر قائم ہوا۔ یہ لوگ حامی نسل کی گوری یا سفید فام شاخ سے تعلق رکھتے تھے اور ماقبل تاریخ زمانے میں وہ غالباً سامی

---

[1] بلاذری، ص ۲۲۹۔ ابن خلدون، ۷، ص ۸۔ ابن عذاری: "البیان المغرب فی اخبار المغرب" (لائیڈن ۱۸۴۸ء) ۱، ص ۲۰۔ یہ بات کہ وہ کسی یہودی قبیلے کی تھی، مشکوک ہے۔

[2] بعض ماخذوں میں موسیٰ کو لخمی قبیلے کا (عرب) لکھا ہے اور بعض دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ یمنی تھا۔ ملاحظہ ہو بلاذری، ص ۲۳۰۔ ابن عذاری، ۱، ص ۲۴۔

خاندان ہی میں شامل تھی[1]۔ مسلمانوں کی فتوحات کے وقت اس قوم کے وہ گروہ جو سمندر سے ملی ہوئی، سرسبز پٹی میں آباد تھے مسیحیت کے دائرے میں داخل ہو گئے تھے۔ مسیحی بزرگوں میں جو یہاں آئے ترتولین، اور کپ رئین ولی اور سب سے بڑھ کر اوگس تاین ولی کو فضیلت کا تاج ملا۔ لیکن مذہب مسیحی قبول کرنے کے باوجود لوگوں میں رومی تمدن کوئی گہرا نقش نہیں بنا سکا تھا۔ کیوں کہ رومی فاتح اور پھر اُن کے جانشین بائی زنطہ والے بیش تر ساحلی شہروں میں سکونت رکھتے تھے اور ان کی تہذیب کا نمونہ افریقہ کے ان صحرائی اور نیم صحرائی باشندوں کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اس کے برخلاف، وہ تمدن کے جس درجے میں تھے اس میں اسلام اُن کے لیے خاص کشش رکھتا تھا[2]۔ مزید برآں سامی عربوں کا قدیم اہل فنیقیہ (یا کنعانیوں) سے نسلی رشتہ تھا۔ وہ گزشتہ دور میں شمالی افریقہ کے بعض حصوں میں نوآبادیاں قائم کر چکے تھے اور انہی نے قرطاجنہ کو ترقی دے کر اہل روم کا زبردست حریف بنا دیا تھا۔ اب دوبارہ عرب فاتحین نے اپنے حامی بنی عم سے بے تکلف دوستی

---

[1] انگریزی لفظ "بربر" کی اصل عربی بربر ہی سمجھی جاتی ہے مگر ممکن ہے یہ عربی کے ساتھ لاطینی (اور اصلاً یونانی) لفظ بربری سے آیا ہو جس کے معنی وحشی ہیں اور افریقہ کے رومی مقبوضات میں لاطینی بولنے والے اسے تمام اہل افریقہ پر جنھوں نے لاطینی زبان اختیار نہ کی تھی، اس کا عمومی استعمال کیا کرتے تھے۔

[2] (مصنف کے بیان میں اسلام کی سادگی اور عربوں کی بدویت پر ایک تعریض کا پہلو نکلتا ہے۔ بے شبہ رومیوں کے پاس دولت اور سامان عیش و عشرت کی فراوانی تھی لیکن یہ رومی حیائی طہارت اور ستر تک سے ناواقف تھے ان کی زندگی گندی اور اخلاق ایسے پست تھے کہ انھیں اسلامی نقطۂ نظر سے مہذب کہنا مشکل ہے۔ مترجم)

اور موالات کا تعلق پیدا کر لیا۔ فینقی زبان بعض دیہات میں مسلمانوں کی آمد سے کچھ پہلے تک بولی جاتی تھی۔ یہاں کے نیم وحشی قبائل دیکھتے دیکھتے اسلامی رنگ میں رنگ گئے ان کی زبان اور عقائد پر عربیت چھاتی چلی گئی اور پھر جدید فتوحات کی دوڑ میں، اسلام کو انہی قوموں کی ڈاک چوکیاں ملتی چلی گئیں۔ یہ سب ایک معجزہ سا نظر آتا ہو مگر اس کے وہ اسباب تھے جو اوپر بیان ہوے۔ فاتحین کے خون میں تازگی بھرنے کے لئے جدید اور وسیع میدان اور نوخیز اسلام کو دنیا کی سیادت کی بلند منزل پر چڑھنے کے لیے ایک عمدہ زینہ میسر آگیا۔

شمالی افریقیہ کے سواحل بحر اوقیانوس تک موسیٰ کے پنجۂ اقتدار میں آگئے تو جنوب مغربی یورپ کے ہم سایہ ملکوں کو فتح کرنے کا راستہ کھل گیا۔ ۷۱۱ء میں طارق نے جو موسیٰ کا ایک بربری مولیٰ اور فوجی سردار تھا، ہسپانیہ کی غارت گری کے سلسلے میں یہ یادگار اقدام کیا کہ سمندر پار اتر گیا۔ یہی تاخت بڑھتے بڑھتے پورے جزیرہ نماے اندلسیہ کی فتح بن گئی (تفصیل کے لیے دیکھو اس کتاب کا باب ۳۴) حقیقت میں یہ عربوں کی سب سے آخری اور سب سے زیادہ جوش انگیز اور عظیم معرکہ آرائی تھی جس کے نتیجے میں براعظم یورپ کا سب سے بڑا علاقہ اسلامی دنیا کا جزو بنالیا گیا تھا۔ عرب فاتح بڑھتے ہوے جنوبی غالیہ (فرانس) تک پہنچے اور وہاں کے بھی کئی شہر تسخیر کئے تاآں کہ ۷۳۲ء میں عرب
۲۱ و بربر لشکر کی پیش قدمی چارلس مارتل نے توار اور پوتیر کے درمیان روک دی۔ یہی مقام شمال مغرب میں عربوں کے نفوذ کی منتہا ثابت ہوا۔

۷۳۲ء عیسوی میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی رحلت کو پوری ایک صدی گزر گئی۔ آئیے اس تاریخی موقع پر ہم دنیائے اسلام کا ایک عمومی جائزہ لیں:

بانیٔ اسلام صلعم کی وفات کے ایک سو سال بعد آپ کے ماننے والوں کو ہم اتنی بڑی سلطنت کا مالک دیکھتے ہیں جو رومۃ الکبریٰ کے انتہائی عروج کے زمانے کی سلطنت سے زیادہ وسیع تھی۔ یہ اسلامی سلطنت خلیج بسکے (فرانس) سے دریائے سندھ اور حدود چین تک غرباً شرقاً پھیلی ہوئی تھی اور (شمالاً جنوباً) بحیرہ ارال سے بالائی نیل کی آبشاروں تک اسی کا عمل تھا۔ عرب نژاد عرب پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام خدائے بزرگ و برتر کے نام کے ساتھ ہزارہا میناروں سے کہ جنوب مغربی یورپ، شمالی افریقہ، مغربی اور وسطی ایشیا میں قریہ در قریہ پھیلے ہوئے تھے روزانہ پانچ دفعہ پکارا جا رہا تھا۔ اس باعظمت و وسعت سلطنت کا دارالخلافہ دمشق بن گیا تھا۔ یہ وہ شہر ہے جس کی نسبت روایت کی جاتی ہے کہ جوانی میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس میں داخل ہونے سے جھجکتے تھے کیوں کہ آپ کی خواہش تھی کہ جنت میں ایک ہی مرتبہ داخل ہوں[1]۔ باغوں کے زمردیں حلقوں میں یہ شہر گوہر تابدار کی طرح جڑا ہوا تھا اور اس کے عین وسط میں بنی امیہ کا چمکتا دمکتا قصر واقع تھا جہاں سے سارے ہرے بھرے میدان کوہ ہرمون[2] کی چوٹیوں تک زیر قدم نظر آتے تھے۔ اور خود یہ

---

[1] دمشق کی تعریف میں دوسرے اخبار و احادیث کے لئے دیکھو ابن عساکر، ا ص ۴۶
[2] اسے عربی میں "الجبل الشیخ" یعنی سفید مو پہاڑ کہتے تھے۔

پہاڑ دائمی برف کی دستار سے مزین رہتا تھا۔ قصر خلافت کا نام الخضرا[1] (یعنی سبز محل) تھا۔ اس کے بنانے والے خود بانی خاندان امیر معاویہ تھے۔ اسی کے پہلو میں ولید نے وہ نئی مسجد تعمیر کی اور اُسے دلہن کی طرح سجایا، جو فن عمارت کا جواہر پارہ معلوم ہوتی ہے اور جمالیات کے دل دادہ آج بھی اس کی زیارت کے لیے کھنچے ہوئے چلے آتے ہیں۔ قصر خلافت میں ایک چوکور نشست بیش بہا زربفتی مسند و تکیہ سے آراستہ، خلیفہ کے تخت کا کام دیتی تھی۔ خاص خاص تقریبات کے وقت خلیفہ درازدامن فاخرہ چغے میں اس پر چہارزانو متمکن ہوتا تھا۔ دست راست پر اس کے جدی رشتہ دار، سن وسال میں تقدم کے لحاظ سے کھڑے ہوتے اور دست چپ پر مادری رشتہ داروں کی صف ہوتی تھی[2]۔ درباری ندیم، شعرا، عرضی گزار ان کے عقب میں استادہ کیے جاتے تھے۔ لیکن زیادہ اہم رسوم کے لیے خلیفہ، مسجد اموی کی پرشوکت عمارت میں اجتماع کرتا تھا۔ آج بھی یہ مسجد دُنیا کے سب سے شان دار معابد میں شمار ہوتی ہے۔ ضرور اسی قسم کا خاص اجتماع ہوگا جب کہ خلیفہ ولید، یا بعض مورخ لکھتے کہ سلیمان نے جو اسی زمانے میں مسند خلافت پر بیٹھا تھا، ہسپانیہ کے فاتح موسیٰ ابن نصیر اور طارق کو باریاب کیا اور انھی کے جلو میں قطار
2/7 در قطار اسیران جنگ پیش ہوئے[3] جن میں شاہی خاندان غوطیہ

---

[1] ابن جبیر، ص ۲۶۹۔ اغانی میں "ال قبۃ الخضرا" (یعنی سبز گنبد) لکھا ہے۔ ۶۔ ص ۱۵۹۔

[2] اغانی، ۴ ص ۸۔

[3] مقری کے بیان کے مطابق اسیروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔ دیکھو "نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب" (لائے ڈن ۱۸۵۵ء) ۱ ص ۱۴۴ نیز ملاحظہ ہو ابن الاثیر۔ ۴ ص ۴۴۸۔

(= گوتھک) کے بھورے بال والے افراد شامل تھے اور بے حساب 217
قیمتی غنائم لائے گئے تھے۔ بنی اُمیّہ کے آفتاب عظمت و اقبال کے نصف النہار پر پہنچنے کی مثال بتانے کے لیے صرف ایک واقعہ بیان کرنا ہو، تو وہ یہ واقعہ تھا؛

عربیت کا عمل

عبد الملک اور ولید نے حکومت پر عربیت کا رنگ اس طرح چڑھایا کہ دفاتر کی زبان دمشق میں یونانی کی بجائے، اور عراق اور مشرقی ولایات میں پہلوی کی بجائے عربی رائج کی اور سکہ بھی عربی میں ضرب کرایا۔ زبان کی تبدیلی کے ساتھ حکومت کے عملے میں بھی لا محالہ تبدیلی واقع ہوئی۔ عرب فاتحین اوّل اوّل صحرای علاقوں سے آئے تو حساب کتاب اور مالیات سے بالکل بے خبر تھے اور انھیں شام میں یونانی نویس اور عراق و ایران میں فارسی نگار اہل کاروں کو محکمہ مال میں برقرار رکھنا پڑا کہ وہ لوگ اس کام سے واقف تھے۔ مگر اب صورتِ حال بدل چکی تھی۔ یہ درست ہو کہ اس عرصے میں بعض غیر عرب عمّال نے عربی زبان میں پوری دست گاہ بہم پہنچالی اور انھیں اپنی خدمتوں پر رہنے دیا گیا۔ علی ہذا سابقہ نظام بھی نہیں بدلا گیا۔ دوسرے، زبان کی تبدیلی بھی لازماً دیر میں ہوئی ہو گی کہ عبد الملک کے عہد سے شروع کی گئی اور اس کے جانشین کے زمانے تک ہوتی رہی۔ غالباً یہی سبب ہو کہ ہمارے بعض ماخذ اس تبدیلی کو باپ سے اور بعض اس کے بیٹے سے منسوب کرتے ہیں[1] بہر حال یہ قدم سوچ

---

[1] بلاذری صـ۱۹۳ و صـ۳۰۰، ماوردی صـ۳۴۹، ۵ عقد، ۲ صـ۳۲۲

سمجھ کر ایک اصول کے ماتحت اٹھایا گیا تھا۔ اس کی وجہ کوئی ایسا اتفاقی سبب نہیں ہو سکتا جیسا کہ بلاذری نے لکھ دیا ہے کہ کسی یونانی منشی نے دوات میں پیشاب کر دیا تھا (لہذا یونانیوں کو برطرف کیا گیا اور عربی زبان رائج کر دی گئی ہے[۵۱]۔ ملک عراق اور اس کے مشرقی توابع میں زبان کی تبدیلی کی بنا یقینًا تمام در حجاج ہی نے ڈالی تھی ۔

ماقبل اسلام زمانے میں رومی اور ایرانی سکے حجاز میں چلتے تھے۔ چاندی کے چند حمیری سکوں کا بھی چلن تھا جن پر یونانی اُلّو کی شکل ہوتی تھی۔ ایرانی اور رومی سکوں کو خلافت راشدہ میں بھی جاری رہنے دیا گیا اگرچہ حضرت عمرؓ اور امیر معاویہ کے زمانے میں ممکن ہے بعض سکوں پر آیات قرآنی کا ٹھپہ لگا دیا گیا ہو۔ عبد الملک کے عہد سے پیشتر سونے چاندی کے چند نئے سکے ضرور ضرب ہوئے لیکن یہ انھی بازنطی یا ایرانی نمونوں کی نقل تھے۔ عبد الملک پہلا مسلمان فرماں روا ہے جس نے خالص عربی دینار (طلائی) اور چاندی کے درہم ۶۹۵ء میں اوّل اوّل دمشق میں ضرب کرائے[۵۲]۔ دوسرے سال اس کے عراق کے نائب حجاج نے چاندی کے سکے کوفے کے دار الضرب میں تیار کئے[۵۳]۔

218 خاص اسلامی سکوں کو رواج دینے اور نظم ونسق پر عربیت کا رنگ چڑھانے کے علاوہ، عبد الملک نے ڈاک کے باقاعدہ انتظام کو ترقی دی[۵۴] اور دمشق سے لے کر ولایات کے صدر مقامات تک منزل

---

۵۱ ص ۱۹۳ ۔ ۵۲ بلاذری ص ۴۶۵ ۔

۵۳ طبری، ۲ ص ۹۳۹ ۔ بلاذری، ص ۲۴۰ ۔

۵۴ ملاحظہ ہو یاقوت کی "بلدان" ۴ ص ۹۸۲ ۔

۵۵ ال عمری، "التعریف بالمصطلح الشریف" (قاہرہ ۱۳۱۲ھ) ص ۱۸۵ ۔

بہ منزل گھوڑوں کی ڈاک چلای کہ مراسلات اور مسافروں کو لاتی، لے جاتی تھی۔ اس کی مقدم غرض سرکاری حکام اور ان کے رسل ورسائل کی ضرورتیں پورا کرنا تھا اور محکمہ برید کے مقامی حکام کے فرائض میں یہ کام بھی داخل تھا کہ اپنے اپنے علاقے کے جملہ اہم واقعات سے خلیفہ کو برابر اطلاع دیتے رہیں ؛

نیا سکہ جاری ہونے کے ساتھ نظم ونسق اور محکمۂ مال گزاری میں جو اصلاحات عمل میں آئیں، انھیں بھی یہاں مختصر طور پر بیان کر دینا مناسب ہے۔ واضح رہے کہ اصولاً کوئی مسلمان، کسی ملک یا قومیت کا فرد ہو، سوائے زکاۃ کے جو محتاجوں کی امداد کے واسطے مقرر ہے، اور کسی محصول ادا کرنے کا مکلف نہیں اگرچہ سرکاری محاصل سے یہ معافی عموماً اور عملاً صرف عرب مسلمانوں کو حاصل ہوا کرتی تھی۔ تاہم نومسلموں نے، خصوصاً عراق اور خراسان کی ولایات میں اس نظریے سے فائدہ اٹھانا چاہا اور دیہات سے جہاں وہ کھیتی کرتے تھے، جوق درجوق شہروں میں منتقل ہونے لگے۔ وہ امید رکھتے تھے کہ موالی[1] کی حیثیت سے انھیں فوج میں بھرتی کر لیا جائے گا۔ مگر اس میں سرکاری خزانے کو دُہرا نقصان ہوتا تھا کہ اوّل تو اسلام لانے کی وجہ سے ان کے واجب الادا محاصل بہت کم ہو جاتے تھے، دوسرے فوج میں داخل ہونے سے حکومت کو انھیں خاص وظیفہ دینا پڑتا تھا۔ تب حجاج نے

---

[1] یہ لفظ آخر زمانے میں آزاد شدہ غلام کے لئے بولا جانے لگا تھا لیکن زیر نظر عہد میں اس کے معنی میں کوئی کم تری کا پہلو نہیں رہا (اور عام طور پر غیر عرب کے لیے مستعمل ہونے لگا)

ایسی تدابیر اختیار کیں کہ وہ اپنے کھیتوں کو واپس جائیں[1] اور اسی قدر مالیہ ادا کریں جتنا اسلام لانے سے قبل دیا کرتے تھے۔یعنی مال گزاری
۲۱۶ اور جزیہ کی مجموعی رقم۔ اسی طرح وہ عرب آبادکار جنھوں نے لگان کی اراضی میں زمین لے لی تھی، اُن پر بھی اس نے مقرّرہ مالیہ لگا دیا؛

ان احکام سے نومسلموں میں لازماً ناگواری پیدا ہوئی۔خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز (۷۱۷ـ ۷۲۰ء) نے اسے دور کرنے کی کوشش کی اور اپنے ہم نام حضرت عمرؓ کا سابقہ طریقہ جاری کیا کہ کوئی مسلمان، خواہ عرب ہو یا مولا اس سے کوئی محصول (خراج) نہ لیا جائے گا۔البتہ انھیں اصرار تھا کہ لگان والی زمینیں ذاتی ملکیت میں شمار نہ ہوں گی بلکہ یہ تمام مسلمانوں کی مشترکہ ملک مانی جائیں گی[2] چناں چہ ۱۰۰ھ (مطابق ۷۱۸ـ۱۹ء) میں انھوں نے حکم جاری کیا کہ ایسی کوئی زمین جس پر حکومت لگان لیتی ہو،کسی عرب یا مسلمان کے ہاتھ نہیں بیچی جائے گی اور اگر ایسی زمین کا مالک اسلام لے آئے تو اس کی املاک شاملاتِ دیہہ یعنی گاؤں کی مشترکہ ملکیت ہو جائے گی۔البتہ وہ اس پر پٹّہ دار کے طور پر قابض رہ سکتا ہے؛

خلیفہ کی نیک نیّتی میں شک نہیں مگر یہ حکمت عملی زیادہ کام یاب نہ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری محاصل میں کمی آگئی اور شہروں میں نومسلم موالی کی تعداد بڑھ گئی[3] بہت سے بربر اور ایرانی موالی رعایتوں

---

[1] مبرّد، صفحہ ۲۸۶؛ [2] ابن سعد، ۵ صفحہ ۲۶۲۔ ابن عساکر، ۴ صفحہ ۔یعقوبی، ۲ صفحہ ۳۶۶
ابن الجوزی: " سیرۃ عمر ابن عبدالعزیز" (قاہرہ ۱۳۳۱ھ) صفحہ ۸۶؛
[3] ابن الجوزی، صفحہ ۹۹؛

سے متمتع ہونے کی خاطر مسلمان ہو گئے۔ آخر میں پھر وہی حجاج کا طریقہ، معمولی ترمیم کے بعد اختیار کیا گیا۔ اس سے قبل جزیہ اور خراج میں ٹھیک ٹھیک فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ اب ان کو متمیز کیا گیا کہ جزیہ وہ بار ہے جو قبول اسلام کے ساتھ، اُٹھ جاتا ہے۔ خراج (یا لگان) تخفیف میں نہیں آتا۔ چوں کہ جزئے کی رقم نسبتًہ بہت تھوڑی ہوتی تھی لہذا (لوگوں کے اسلام قبول کرنے سے) سرکاری مداخل میں کوئی بڑی کمی نہ آئی اور مال گزاری یا خراج بدستور وصول کیا جاتا رہا۔

بعض اور تہذیبی نیز زرعی اصلاحات حجاج کی ہمہ گیر ذہانت وقابلیت سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اُس نے عراق میں کئی نئی نہریں کھدوائیں اور وہ بڑی نہر جو دجلہ وفرات کو ملاتی تھی، ازسرِنو جاری کی۔ بہت سی غیر مزروعہ اور ایسی اراضی جو زیرِ آب پڑی تھیں، ان کا پانی خارج کرا کے وہاں زراعت کرائی۔ زبانِ عربی کی اِملا میں اعراب کی ایجاد و ترویج میں حصہ لیا کہ ب، ت، د، ذ وغیرہ مشابہ حروف نکتوں سے متمیز ہو جائیں۔ سُریانی علامات میں ترمیم کر کے عربی اعراب؛ ضمہ، فتحہ، اور کسرہ (یعنی پیش، زبر، زیر) اختیار کئے جو حروفِ صحیح کے اوپر یا نیچے لگائے جاتے ہیں۔ املا کی ان اصلاحات کا بڑا محرک اس کی یہ خواہش تھی کہ قرآن مجید کے پڑھنے میں لوگ غلطی 20- نہ کریں۔ ضرور ہے کہ خود اس نے (انہی اصول کے مطابق) احتیاط سے قرآن کا نسخہ تیار کیا ہوگا۔ وہ جو شروع ہی میں معلم رہا تھا، علم ادب اور خطابت سے اُس کا ذوق آخر تک نہ کم ہوا۔ وہ شاعری اور علوم حکمت کی سرپرستی میں ممتاز ہے۔ اموی دور میں شعر کی دنیا کے تین بادشاہ تھے:

بدو ہجونگار جریر، اور اس کے حریف فرزدق اور اخطل۔ ان میں جریر حجاج کا خاص قصیدہ خواں (اور خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کا درباری شاعر) گزرا ہے۔ ایک نصرانی تیاذوق حجاج کا طبیب خاص تھا[۵۰]۔ حجاج کو اس کے عراقی دشمن "ثقیف کا غلام" کہہ کے جلے دل کے پھپولے پھوڑتے تھے۔ جون ۷۱۴ء میں بہ مقام واسط، ۵۳ سال کی عمر میں اس نے وفات پائی اور اپنا وہ نام چھوڑ گیا جو بے شبہ اسلامی تاریخ کے بزرگ ترین ناموں میں شامل ہے۔

یادگار عمارات

اس دور کے نمایاں کارناموں میں بہت سی تعمیری یادگاریں ہیں جن میں سے بعض ہمارے زمانے تک سلامت رہیں۔

فلسطین میں خلیفہ سلیمان نے ایک قدیم تر شہر کے کھنڈروں پر ال رملہ[۵۱] آباد کیا اور وہیں اقامت اختیار کی۔ عالمگیر جنگ کے زمانے تک اس کے محل کے آثار نظر آتے تھے اور اس کی سفید مسجد، جسے مصر کے مالکہ نے چودھویں صدی عیسوی میں دوبارہ بنوایا تھا، ابھی تک قائم ہے۔ بنی امیہ کی جامع دمشق اور بیت المقدس کے قبۃ الصخرہ کے بعد یہ ملک شام کی تیسری ممتاز مذہبی عمارت تھی۔ سلیمان ہی کے زمانے سے دارالخلافہ میں خلفانے رہنا چھوڑ دیا تھا۔ ہشام شہر رصافہ میں رہا

---

۵۱ حرف اول کو عربی میں مکسور و مفتوح دونوں طرح لکھا ہے۔ دیکھو ابن العبری، ص ۱۹۰، یونانی لفظ "تھیودوکس" تھا۔

۵۲ بلاذری، ص ۱۴۳۔

کرتا تھا جو رقہ کے قریب رومیوں کی قدیم بستی تھی[51] ۶۹۱ء میں عبدالملک نے بیت المقدس میں قبۃ الصخرہ کی عالی شان عمارت بنوائی جس کا منشا یہ تھا کہ مکہ معظمہ جانے والے حاجی اِدھر آجایا کریں کیوں کہ مکہ اُن دنوں اس کے حریف عبداللہ ابن زبیرؓ کے قبضے میں تھا۔ یہ بات کہ عبدالملک ہی نے یہ عمارت بنوائی خطِ کوفی کے کتبے سے جو قبّے کے گرد لکھا ہوا اب تک محفوظ ہے، ثابت ہوتی ہے۔ اس عمارت کو فرنگی (مصنّف) مسجد عمرؓ کہتے ہیں۔ یہ اُن کی غلطی ہے۔ تعمیر سے سو برس بعد عباسی خلیفہ المامون (۸۱۳ — ۸۳۳ء) نے قبۃ الصخرہ کی مرمت کرائی اور بددیانتی سے عبدالملک کی جگہ اپنا نام لکھوا دیا لیکن تاریخ تعمیر کو بدلنا بھول گیا[52] اس کے علاوہ عباسی معماروں نے اُس ذرا سی جگہ میں جہاں عبدالملک لکھا تھا، عبداللہ الامام المامون کا پورا نام داخل کیا تو حرف بہت گنجان اور قریب قریب جمع کر دئیے[53] قبّے کے نزدیک اسی مقدس احاطے 21. کے جنوبی حصّے میں عبدالملک نے ایک اور مسجد شاید کسی سابقہ گرجا کی جگہ تعمیر کرائی تھی۔ مقامی محاورے میں یہی "مسجد الاقصیٰ" موسوم ہوتی ہے[54] لیکن عمومی طور پر یہ نام اس رقبے کی تمام دینی عمارتوں کے مجموعے کے لیے مستعمل ہے۔ اور اسی مجموعے کا دوسرا نام "حرم شریف"

---

[51] بعض لوگ کہتے ہیں کہ تدمر کے مشرق میں یہ حیر الشرقی کا مقام تھا۔

[52] اس وقت بھی کتبے میں مامون کے مذکورہ بالا نام کے آگے ۷۲ھ تحریر ہے۔

[53] دی ووگو نے اپنی کتاب "معبد یروشلم" (پیرس ۱۸۶۴ء) میں سب سے پہلے یہ چوری پکڑی تھی۔ (عجب نہیں یہ مرمت کرنے والے معماروں کی حرکت ہو اور مامون کی بلا اجازت اس کا نام لکھا گیا ہو۔ مترجم)

[54] قرآن مجید میں سورۂ بنی اسرائیل کی پہلی آیہ کریمہ میں یہی نام آتا ہے؛ اسی سے یہ مسجد موسوم کی گئی ہے۔

ہی جو مسلمانوں میں حرمین (مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ) کے بعد سب سے مقدس مقام ہی۔

مگر ان اموی خلفا میں سب سے بڑا بنا عبدالملک کا بیٹا الولید تھا جس کے زمانے میں فراغت اور نسبتہً امن امان رہا۔ کہتے ہیں اسے عمارتیں بنانے کی ایسی حرص تھی کہ جس طرح خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز کے وقت میں ہر طرف قرآن و حدیث کا، اور سلیمان کے زمانے میں خوب صورت ظروف اور نسا کا چرچا رہا، ولید کے عہد میں جہاں کہیں لوگ جمع ہوتے، گفتگو کا خاص موضوع خوش نما عمارات ہوتی تھیں[۵۱]۔ ولید نے صرف چالیس برس کی عمر پائی اور دس برس حکومت کی۔ اسی مدت میں مکہ معظمہ کی بڑی مسجد کو وسیع اور مزین کیا[۵۲]۔ مدینہ شریف کی مسجد از سر نو بنوائی۔ ملک شام میں بہت سی مسجدیں اور مدارس تعمیر کرائے اور اندھے، لولے اور کوڑھیوں کے واسطے محتاج خانے وقف کیے[۵۳]۔ قرون وسطیٰ میں شاید وہی پہلا فرمان روا تھا جس نے امراض مزمنہ کے بیماروں کے واسطے (علاحدہ) شفاخانے بنوائے اور کچھ مدت بعد ممالک یورپ میں جو جذام خانے جا بجا بنے یہ اسی مسلم خلیفہ کی تقلید میں بنے تھے[۵۴]۔ بعل بک کے ایک گرجا سے ولید نے پیتل کا ایک گنبد اتروا کر اپنے باپ کی بنائی ہوئی مسجد (واقع بیت المقدس) کے گنبد پر لگوا دیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا تعمیری

---

[۵۱] فخری، ص۱۴۳۔ طبری، ۲ ص۱۲۷۲۔

[۵۲] بلاذری، ص۴۷۔

[۵۳] طبری، ۲۔ ص۱۲۷۱۔ ابن الفقیہ، ص۱۰۶۔

[۵۴] دیکھو حتی کا مضمون "عربی مردانگی" پر "اِن سائی کلو پیڈیا اوف سوشل سائنسز" میں۔

کارنامہ یہ تھا کہ اس مقام پر جہاں کبھی حضرت یحییٰ کا کلیسا تھا، عیسائیوں سے زمین جبرًا لے کر وہ مسجد بنوائی جو دنیا کے سب سے پرشکوہ معابد میں شمار ہوتی ہے۔ حرمین شریفین اور بیت المقدس کے بعد ملت اسلامی کا سب سے مقدس مقام یہی اموی مسجد جامع ہے۔ الولید سے پہلے اس پاک احاطے کا صرف ایک حصہ مسلمانوں کے پاس تھا اور باقی ساری زمین عیسائیوں کی تھی۔ اس جزوی قبضے کی توجیہ میں یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ شہر کے مشرقی حصے کو مسلمانوں نے لڑکر تسخیر کیا تھا اور مغربی حصے کے لوگوں نے خود اطاعت قبول کر لی تھی۔ قبول اطاعت کا علم مشرقی فوجوں کو اس وقت ہوا جب کہ وہ بڑھتی ہوئی اس کلیسا 22 تک پہنچ گئی تھیں۔ یہ کلیسا ایک قدیم تر رومی مندر کی جگہ قریب قریب وسط شہر میں واقع تھا۔ اس کے احاطے کا پھاٹک اب تیغہ کر دیا گیا ہے، مگر اس کی سردل پر یونانی زبان میں یہ کتابہ ابھی تک پڑھا جا سکتا ہے:

"تیری سلطنت اے مسیح، دوامی ہے۔ اور تیری حکومت
نسل بالنسل تک قائم رہنے والی ہے"[1]

بنی امیہ کے دورِ عظمت و اقبال کے باقی خلفا کی نسبت اور کوئی خاص بات لکھنے کے لائق نہیں البتہ عمر ابن عبد العزیز اور ہشام کے باب میں یہ اضافہ کرنا مناسب ہوگا کہ عمر (ثانی۔ ۷۱۷ تا ۷۲۰ء) تمام تر علمائے دین کے زیر اثر تھے اور ہر اسلامی عہد میں

---

[1] دیکھو انجیل: مناجاتیں، (= مزامیر) ۱۴۵: ۱۳۔

ان کا زہد و تقویٰ مشہور و مقبول رہا۔ یہ اوصاف اس لئے اور بھی نمایاں اور درخشاں ہوئے کہ بنی امیہ عام طور پر ان سے محروم کہے جاتے ہیں۔ واقعی یہ خلیفہ اس خاندان کا ولی گزرا ہے۔ ایک متاخر روایت میں آتا ہے کہ ہر صدی کے آخر میں ایک شخص "مبعوث" ہوگا جو اسلام کی تجدید کرے گا۔ اسی کے مطابق عمر ابن عبد العزیز کو دوسری صدی ہجری کے آغاز (یعنی سنہ ۱۰۰ھ) کا مجدد قرار دیا گیا جس طرح تیسری صدی ہجری کے امام شافعی مجدد مانے جاتے ہیں۔ عمر ابن عبد العزیز کے سوانح نگار کا بیان ہے کہ وہ پیوند لگے کپڑے پہنتے تھے اور اپنی رعایا میں اس طرح بے تکلف گھلے ملے رہتے تھے کہ کوئی اجنبی عرضی پیش کرنے آتا تو اسے خلیفہ کے پہچاننے میں دشواری ہوتی تھی۔ ان کے ایک عامل نے انھیں لکھا کہ نومسلموں کے واسطے آپ نے جو مالی رعایتوں کا حکم نافذ کیا ہے اس سے سرکاری خزانہ خالی ہو جائے گا۔ انھوں نے جواب دیا "واللہ مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ سب لوگ مسلمان ہو جائیں اور مجھے اور تجھے پیٹ بھرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے زمین میں ہل چلانا پڑے"[1] عمر ابن عبد العزیز نے حضرت علیؓ کو جمعہ کے خطبے میں بددعا دینے کی رسم بھی موقوف کردی جو امیر معاویہ کے زمانے سے چلی آتی تھی[2]۔ ان کی نیکی اور دین داری ہی کی وجہ تھی کہ جب عباسیوں نے غلبہ پایا اور اپنے پیش رو خاندان کی قبروں کی بے حرمتی کی تو عمر ابن عبد العزیز کی قبر محفوظ رہی۔ ان کا ۳۹ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

---

[1] ابن الجوزی، ص ۱۲۵ وغیرہ۔
[2] ایضاً، ص ۱۰۰۔ "کتاب العیون والحدائق فی اخبار الحقائق" (لائیڈن، ۱۸۶۵ء)۔
[3] فخری، ص ۱۴۶۔

عبدالملک کے چوتھے بیٹے ہشام پر (۷۲۴ء تا ۷۴۳ء) زریں عہد اختتام کو پہنچا۔ امیر معاویہ اور عبدالملک کے بعد عرب مبصرین ہشام کو اموی خاندان کا تیسرا اور آخری مدبر مانتے ہیں[1] اور یہ درست ہے۔ اس کا جوان بیٹا معاویہ، جس سے اندلس کے اموی خاندان کی آیندہ نسل چلی، خود شکار میں گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ ہشام کو اطلاع ہوئی تو اس نے کہا: "میں نے اسے خلافت کے لئے پرورش کیا تھا اور وہ 223
لومڑی کے پیچھے دوڑ گیا!"[2] اسی کے والیٔ عراق خالد ابن عبداللہ القسری کی حکومت میں یہ ملک نہایت خوش حال ہو گیا جس کا خاص سبب حسان النبطی کی مہندسی اور نہر کاوی تھی۔ مگر خالد نے ایک کرور تیس لاکھ درہم کی فاضل آمدنی خود ہتیالی اور اس رقم کی سہ گنی دولت لہو و لعب میں برباد کر دی[3] آخر مواخذے کے شکنجے میں کھینچا گیا اور اس کا بھی وہی انجام ہوا جو اس جیسے دوسرے کئی سابقہ والیوں کا ہوا تھا کہ ۷۳۸ء میں پکڑا گیا۔ قید کی سزا پائی اور بڑی بڑی عقوبتیں دی گئیں کہ سرکاری روپے کا حساب دے اور جتنا روپیہ برباد کیا ہے، واپس ادا کرے۔ یہ مقدمہ صرف ایک مثال ہے اس بد نظمی اور ناجائز زرستانی کی، جو سلطنت میں پھیل گئی تھی۔ یہی خرابیاں بنی امیہ کی خلافت کی جڑیں کھودنے اور انھیں اپنے حریف عباسیوں کا صید زبوں بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔

---

[1] مسعودی، ۵ صفحہ ۴۷۹ نیز دیکھو یعقوبی۔ ۲ صفحہ ۳۹۲۔ "معارف" ابن قتیبہ صفحہ ۱۸۵۔ ابوالفدا۔ صفحہ ۲۱۲۔ "کتاب العیون" صفحہ ۹۹۔

[2] طبری، ۲ صفحہ ۱۷۳۸۔

[3] ۔ ۲ صفحہ ۱۶۴۲۔ یعقوبی، ۲ صفحہ ۳۸۷۔

باب بستم (۲۰)

اموی عہد کے ملکی انتظام اور معاشرت 224

امویوں کے عہد میں، بلکہ خلافت عباسیہ کے دَور تک سلطنت کی انتظامی تقسیم عموماً وہی رہی جیسی بائی زنطی اور ایرانی صوبوں کی صورت میں تھی۔ ان ولایات کے نام یہ ہیں:—

(۱) شام مع فلسطین۔ (۲) الکوفہ، بہ شمول عراق (۳) البصرہ مع ایران، سجستان، خراسان، بحرین، عُمان، غالباً بہ شمول نجد و یمامہ۔ (۴) ارمنیہ (۵) الحجاز۔ (۶) کرمان اور ہندوستان کے سرحدی اقطاع (= ثغور ہند) (۷) مصر۔ (۸) اِفریقیہ۔ (۹) الیمن اور باقی جنوبی عرب[1]

ان میں کمی باہمی اجتماع سے بہ تدریج کمی ہوئی اور پانچ امارتیں

---

[1] دیکھو ابن خلدون۔ ۳ ص۲ وغیرہ۔ نیز فان کریمر: "کلچر..... کے لی فن" جلد اوّل (وی انا، ۱۸۷۵ء) ص۱۶۲۔

(یا نیابتیں) وجود میں آئیں ۔ بصرے اور کوفے کی ولایتوں کو امیر معاویہ نے ملا دیا اور العراق کی وہ امارت بنائی جس میں ایران کے کئی اقطاع اور مشرقی عرب شامل تھے[1] اس کا دارالحکومت شہر کوفہ تھا۔ آگے چل کر یہیں کے امیر یا نائب خلیفہ کو اجازت مل گئی کہ خراسان اور ماوراء النہر میں ایک نائب والی مقرر کرے جو عموماً مرو میں قیام رکھتا تھا۔ پھر ولائت سندھ و پنجاب کا، عراق کے ماتحت اضافہ کر دیا گیا۔ ادھر حجاز میں دوسری امارت بنائی گئی جس میں وسطی عرب اور یمن شامل کر دئے گئے ۔ مشرق ہی میں تیسری امارت وہ بنائی گئی جس میں الجزیرہ (یعنی دجلہ وفرات کے درمیان کا شمالی حصہ) ارمنیہ ، آذر بی جان ، اور ایشیائے کوچک کے مشرقی اضلاع شامل تھے ۔ چوتھی امارت شمالی اور جنوبی مصر پر مشتمل تھی ۔ اس کے آگے مغرب میں تمام شمالی افریقہ کے ممالک ، ہسپانیہ ، صقلیہ اور قریب کے جزیرے ، پانچویں امارت کے تحت میں دئے گئے تھے ۔ اس کا مرکز حکومت قیروان تھا ؛

حکومت کے تین اہم فرائض ، یعنی ملکی انتظام ، وصول مال گزاری اور مذہبی اقتدار اب اصولاً الگ الگ تین عہدہ داروں کے تفویض کئے جانے لگے ۔ نائب خلیفہ یا امیر (یا صاحب) اضلاع میں اپنے عامل یا شحنہ خود مقرر کرتا اور صرف ان کے نام خلیفہ کی خدمت میں لکھ بھیجتا تھا ۔ ہشام کے عہد میں (۲۴، ـــ ۴۳،) ہم دیکھتے ہیں کہ ارمنیہ اور آذربی جان کا ایک نیا والی مقرر ہوا تو وہ دمشق ہی میں رہ گیا 225

[1] یعقوبی ، ۲ ، ص ۲۷۳ ؛

اور اپنی جگہ ایک نائب بھیجنے پر اکتفا کی۔ امیر ممالک کو اپنے صوبوں میں سیاسی اور جنگی معاملات میں پورا اختیار دیا جاتا تھا لیکن مالیات کا انتظام اکثر ایک خاص عہدہ دار "صاحب الخراج" کے سپرد کردیا جاتا جو براہ راست خلیفہ کو جواب دہ ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے اس جداگانہ عہدہ دار کو سب سے اول امیر معاویہ ہی نے مقرر کرکے کوفہ بھیجا[1] ورنہ پہلے اسلامی خلافت میں صوبے کی حکومت کا خاص مطلب یہی وہاں کے مالیات کا انتظام کرنا ہوتا تھا۔

ملک کی آمدنی کے ذرائع امویوں کے زمانے میں بھی وہی رہے جو خلفائے راشدین کے وقت میں تھے۔ ان میں سب سے بڑا ذریعہ محکوم رعایا سے محاصل کی وصولی تھا۔ صوبوں میں مقامی نظم ونسق کے سب مصارف، سرکاری وظائف، فوجیوں اور مختلف ملازمین کی تنخواہیں صوبے کی آمدنی سے ادا کی جاتی تھیں اور صرف فاضل رقم خلیفہ کے خزانے کو ارسال ہوتی تھی۔ مسلمانوں کے مقررہ سالیانے سے ۲½ فی صدی زکوٰۃ وضع کرنے کا قاعدہ امیر معاویہ نے بنایا تھا[2] اور یہ زمانہ حاضرہ کے محصول آمدنی (= انکم ٹیکس) سے بہت مشابہ ہے۔

عدالتیں صرف مسلمانوں سے واسطہ رکھتی تھیں۔ کیوں کہ تمام غیر مسلم قوموں کو کامل آزادی تھی کہ ان کے مذہبی پیشوا اُن کے مقدمات کا خود فیصلہ کریں۔ یہی سبب ہے کہ صرف بڑے شہروں میں مسلمان قاضی مقرر کئے جاتے تھے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اور آپ کے پہلے خلفا

---

[1] ابن خلدون، ۳ صہ ۴
[2] یعقوبی، ۲ صہ ۲۷۶

بذات خود مقدمات فیصل فرماتے اور صوبوں میں ان کے سپہ سالار یا عامل یہ خدمت انجام دیتے تھے۔ حکومت کے مختلف شعبوں کی اُس وقت تک تقسیم نہیں ہوئی تھی۔ اوّل اوّل صوبائی عدالت کے حکام کا تقرر وہاں کے والی کردیتے تھے لیکن عباسیوں کے دور میں ایسے تقررات عام طور سے خلیفۂ وقت کرنے لگے۔ اگرچہ ایک تاریخی روایت اسے بھی حضرت عمرؓ کا کارنامہ بتاتی ہے کہ انھوں نے بالکل شروع (یعنی ۲۳ ہجری م ۶۴۳ء) میں ملک مصر کا ایک جداگانہ قاضی مقرر کیا تھا[1] ۶۶۱ء کے بعد سے ہم اس ملک میں یکے بعد دیگرے مسلسل قاضیوں کا مقرر ہونا سنتے ہیں یہ ہمیشہ فقیہوں کے زمرے سے چنے جاتے تھے یعنی اُن علما کے گروہ سے جو قرآن اور اسلامی روایات سے خوب واقف ہوں فیصل خصومات کے علاوہ ان قاضیوں کے سپرد اوقاف کا انتظام اور یتیموں اور فاترالعقل لوگوں کی املاک کی نگرانی بھی کردی جاتی تھی۔

امیر معاویہ کو پتہ چلا کہ اُن کے بعض دستخطی مراسلات میں جعل سازی کی جاتی ہے تب انھوں نے ایک "دیوان الخاتم" (یعنی مُہر لگانے کا دفتر) الگ قائم کیا[2] جس کا کام یہ تھا کہ ہر سرکاری دستاویز پر مُہر لگانے اور جاری کرنے سے پہلے نقل کرے اور دفتر میں محفوظ رکھے۔ یہ اس زمانے کے سرکاری محافظ خانے کی مثل تھا اور عبدالملک کا عہد آنے 226
تک سرکاری اسناد کا باقاعدہ محکمہ دمشق میں مرتب ہوگیا تھا[3]۔

---

[1] الکندی، "کتاب الولاۃ" (بیروت، ۱۹۰۸ء) صفحہ ۳۰۔ نیز دیکھو ابن قتیبہ "عیون الاخبار" ۱، صفحہ ۶۱۔

[2] طبری، ۲، صفحہ ۲۰۵۔ فخری، صفحہ ۱۴۹۔

[3] مسعودی، ۵، صفحہ ۲۳۹۔

۲۹

فوجی تنظیم

اموی افواج بیش تر بائی زنطہ کی فوجی تنظیم کے نمونے پر منظم کی گئی تھیں۔ ایک لشکر میں پانچ حصے یا فوجیں ہوتی تھیں :۔ قلب۔ یمین۔ یسار۔ مقدمہ اور طلایہ۔ یہ پہلے کی طرح صفوں میں ترتیب دئے جاتے تھے۔ آخری اموی خلیفہ مروان ثانی (۷۴۴۔ ۷۵۰ء) کے عہد تک عام تنظیم یہی تھی۔ مروان نے اسے ترک کر دیا اور پیوستہ صفوں کے چھوٹے چھوٹے دستے مرتب کئے جو "کُردوس" (رومی، کوہورت) کہلاتے تھے^۱۔ لباس و پوشش جنگ کے اعتبار سے بھی عرب اور قدیم یونانی سپاہی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ اسلحہ اصولاً وہی تھے جو پہلے استعمال ہوتے تھے۔ رسالے کے سوار تقریباً گول اور ایسی ہی سادہ زین استعمال کرتے تھے جیسے بائی زنطہ والے۔ آج تک ٹھیک اسی وضع کے زین مشرقِ قریب میں مروّج ہیں۔ قلعہ شکن توپوں کی بجائے اُن دنوں عرّادہ، منجنیق، کبش و دبّابہ سے کام لیتے تھے۔ یہ بھاری سامان جنگ اور محاصرے کے آلات، نیز فوجی اسباب لشکر کے عقب میں اونٹوں پر چلتا تھا۔

دمشق میں جو فوجیں رہتی تھیں وہ زیادہ تر شامی اور شامی عربوں پر مشتمل تھیں۔ مشرقی ممالک کی فوجوں کے واسطے بھرتی کے بڑے مرکز کوفہ اور بصرہ تھے۔ ابتدائی اموی خلفا کے وقت میں باقاعدہ فوج کی تعداد ساٹھ ہزار اور اس پر سالانہ مصارف ۶ کروڑ درہم آتے تھے۔

---

۱ طبری، ۲ صفحہ ۱۹۴۴۔ ابن خلدون، ۳ صفحہ ۱۶۵۔ ابن الاثیر، ۵ صفحہ ۲۶۷

اسی میزان میں ان کے بال بچوں کے وظیفے بھی شامل ہیں[1] یزید ثالث (۱۲۶ھ/۷۴۴ء) نے سب مشاہروں میں دس فی صدی کی تخفیف کر دی اور اسی پر اُسے "ناقص" کا عُرف عام ملا (جس کے معنی گھٹانے والا اور گھٹیا، دونوں ہیں۔)[2] آخری امویوں کے عہد میں کہا جاتا ہے کہ فوج کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہوگئی تھی لیکن غالباً یہ عدد غلط ہے۔ اصل ہندسے میں ایک صفر کم اور کُل تعداد بارہ ہزار تھی۔

عرب بحریہ بھی بائی زنطہ کی نقل سمجھنا چاہیئے۔ اس میں ہر جنگی جہاز مستقل جُزو یا واحدہ قرار دیا گیا تھا۔ جہاز کے دو زیریں عرشے ہوتے اور ان پر پچیس پچیس نشستیں ہوتی تھیں۔ ہر نشست پر دو بحری سپاہی کام کرتے تھے اور ہر جہاز کے ملّاح سو یا کچھ زیادہ، مسلح رکھے جاتے تھے۔ لیکن بحری جنگ میں مہارت رکھنے والوں کی جگہ بالائی عرشے پر مقرر کی تھی۔

شاہانہ زندگی

خلفا کی راتیں تفریح اور مجلسی مشاغل کے لئے مخصوص ہوتی تھیں۔
امیر معاویہ کو تاریخی واقعات اور محاضرات، خصوصاً جنوبی عرب کے 27
متعلق، سننے اور اشعار پڑھوانے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق کی خاطر اُنھوں نے ملک یمن سے ایک قصہ گو مسمّی عبید ابن شریہ کو بلا کر رکھا تھا وہ رات گئے تک بہادرانِ سلف کے قصے سنا کر خلیفہ کو خوش کرتا تھا۔ ان

---

[1] مسعودی، ۵، ص ۱۹۵۔

[2] ابن الاثیر، ۵، ص ۲۲۰۔ یعقوبی، ۲، ص ۴۰۱۔

ان مجلسوں میں گلاب کا شربت سب سے پسندیدہ مشروب ہوتا، جس کی عربی اشعار میں تعریفیں گائی گئی ہیں[۵۱]، اور جو آج تک دمشق اور دوسرے مشرقی شہروں میں مزے لے لے کر پیا جاتا ہے۔ خصوصاً عورتیں اس شربت کو بہت پسند کرتی تھیں ؛

امیر معاویہ کا بیٹا یزید امویوں میں پہلا شراب خوار فرماں روا ہوا ہے جسے "یزید خمّار" (یعنی مے گسار یزید) کا لقب دیا گیا[۵۲]۔ اس کا ایک مذاق یہ تھا کہ ایک پالتو بندر "ابوقیس" کو سدھا لیا تھا کہ وہ بھی ان مے نوشی کے جلسوں میں شراب پیئے[۵۳]۔ کہا جاتا ہے کہ یزید روزانہ پیتا تھا۔ ولید اوّل ایک دن بیچ پر قناعت کرتا تھا ؛ ہشام ہر جمعے کو نماز جمعہ کے بعد۔ اور عبدالملک مہینے میں صرف ایک دفعہ پیتا، مگر اس کثرت سے کہ پھرتے اور دوائیں کھانی پڑتی تھیں[۵۴] ؛ یزید ثانی سلّامہ اور حبابہ، دو گانے والیوں کا ایسا دل دادہ تھا کہ جب ہنسی ہنسی میں ایک کے منہ میں انگور ڈالنے سے اس کا دم گھٹ گیا اور مرگئی تو عاشق مزاج خلیفہ بھی اسی کے غم میں گھل گھل کے تمام

---

[۵۱] اغانی، ۱۵ صہ ۱۴۸ ؛

[۵۲] "عقد" ۳ صہ ۴۰۳۔ نُوَیری: "نہایہ" ۴ صہ ۹۱ ؛

[۵۳] مسعودی، ۵ صہ ۱۵۷ ؛

[۵۴] (اموی اور عباسی) خلفا کی زندگی کا یہ غیر متین پہلو ہے جس کی معلومات ہمیں زیادہ تر کتاب الاغانی سے یا اسی قسم کی دوسری ادبی (قصے کہانی کی) کتابوں سے حاصل ہوئی ہے۔ ان روایتوں کو بالکل صحیح سمجھنا نہ چاہیئے۔ اغانی میں خود ہی اعتراف کیا گیا ہے (۱۵ صہ ۲) کہ یہ مؤلف اپنے ماخذ کا انتخاب "خوش نمائی کے معیار پر کرتا ہے" جو دیکھنے والے کو اچھی معلوم ہو اور سننے والے کا جی خوش کر دے !"

ہوگیا[1] مگر شراب خواری میں سب سے بڑھ جانے کا فخر اس کے فرزند ولید ثانی (۷۴۳ — ۷۴۴ء) کو حاصل ہو جس کی پینے سے کسی طرح سیری نہ ہوتی تھی، یہاں تک کہ کہتے ہیں وہ شراب کے حوض میں تیرتا اور پیتے پیتے اس کی سطح کو خاصا نیچا کر دیتا تھا۔[2] اسی اوباش کی نسبت یہ روایت ہو کہ ایک دن قرآن شریف کھولا تو یہ آیۂ کریمہ نظر کے سامنے آئی: "من ورائہ جہنم ویسقیٰ من ماءٍ صدید یتجرعہ — الآیہ"[3] یہ پڑھ کر ایسا طیش میں آیا کہ اس مقدس کتاب پر اپنی کمان سے تیر چلایا اور جواب میں متمردانہ خود اپنے دو شعر پڑھتا رہا۔[4]

یہی ولید ہو جس نے اپنی (چند روزہ) خلافت کا زمانہ زیادہ تر اپنے صحرائی قلعے میں گزارا جو دمشق و تدمر کے وسط میں قصبۂ قریتین کے پاس بنایا گیا تھا۔ کتاب الاغانی میں اس کی شراب خواری کے ایک جلسے کی کیفیت کسی عینی شاہد کی زبانی روایت کی گئی ہو۔ ان جلسوں میں دورِ شراب کے ساتھ ناچ گانے کا بھی لازماً انتظام کیا جاتا تھا۔ جو خلیفہ اپنی خودداری کا مناسب حد تک لحاظ رکھتے تھے، وہ محفل میں ایک طرف پردے ڈال کر، ناچ گانے والوں سے الگ بیٹھتے تھے لیکن ولید ثانی کی طرح جن کو اس کی پروا نہ تھی وہ مساویانہ شریک بزم ہو جاتے تھے۔[5]

---

[1] کتاب العیون" (۱۸۶۵ء) ص ۴۔ اغانی ۔ ۱۳ ص ۱۲۵۔

[2] ال نواجی: "حلبۃ الکمیت" (قاہرہ ۱۲۹۹ھ) ص ۹۔

[3] سورۂ ابراہیم۔ (آیۂ کریمہ کا نشان مؤلف نے ۲۰ دیا ہو۔ لیکن بظاہر محولہ بالا درمیں سے کوئی آیت ہی مراد ہوسکتی ہو جس کا نشان ۱۷ یا ۱۶ ہونا چاہئے۔ مترجم) [4] اغانی، ۶ ص ۱۱۵۔

[5] ال جاحظ: "التاج فی اخلاق الملوک" (قاہرہ ۱۹۱۴ء) ص ۳۲۔

یہ راگ رنگ کی مجلسیں بھی تہذیبی فائدے سے بالکل خالی نہ تھیں۔ بلکہ درحقیقت ان سے شاعری، موسیقی اور معاشرت کے دوسرے جمالیاتی پہلو کی نشوونما میں عمومی مدد ملتی تھی اور یہ محض رندی اور اوباشی کے جلسے نہ ہوتی تھیں ؛

خلفا اور اُن کے درباریوں کی وقت گزاری کے دوسرے بے عیب اور مقبولِ خواص مشاغل بھی تھے۔ جیسے شکار، گھڑ دوڑ اور نرد بازی۔ چوگان کا کھیل عباسیوں کے زمانے میں بہت شوق سے کھیلا جاتا تھا لیکن قرینہ کہتا ہے کہ امویوں کے آخر زمانے میں ایران سے (دمشق) پہنچ گیا تھا۔ انہی کے عہد میں مُرغ بازی بھی اکثر ہونے لگی تھی۔ شکار کا مشغلہ ملک عرب میں بہت پہلے سے ترقی کر چکا تھا۔ شروع شروع میں فقط سلوقی کتے سے شکار کھیلتے تھے (سلوقی، یمن کے "سلوق" سے لیا گیا ہے) ایک مدت کے بعد چیتا (فہد) لایا جانے لگا۔ کہانیوں میں مذکور ہے کہ عربوں میں سب سے پہلے جنگ بسوس کے شُور ما کُلیب ابن ربیعہ نے چیتے سے کام لیا۔ عربوں سے بہت پہلے ایرانی اور ہندی اس جانور کو سدھانے لگے تھے۔ امویوں میں ملتِ اسلامی کا سب سے پہلا بڑا شکاری یزید ابن معاویہ گزرا ہے۔ اور وہی پہلا شخص تھا جس نے شکاری چیتے کو گھوڑے کے پیچھے پر بیٹھنا اور شکار میں اس طرح آنا سدھایا۔ وہ اپنے شکاری کتوں کو طلائی پازیب پہناتا اور ہر ایک کے لیے ایک خاص غلام مقرر کرتا تھا[۱]۔ گھڑ دوڑ امویوں میں نہایت مقبول تھی۔ عبد الملک کا بیٹا ولید (اوّل)

---

[۱] فخری، ص ۷۶ ؛

سب سے پہلے خلفا میں سے ہے جس نے عام گھڑ دوڑ کا طریقہ جاری کیا اور اُن کی سرپرستی کی[۱] اس کا بھائی اور جانشین خلیفہ سلیمان قومی پیمانے پر گھڑ دوڑ کے سب انتظام کر چکا تھا کہ موت نے آ لیا[۲] انہی کا تیسرا بھائی ہشام اس شوق میں ان کا شریک تھا۔ ایک اسپ دوانی کے مقابلے میں جو اُس نے منظم کیا دوڑ میں حصہ لینے والے گھوڑوں کی تعداد چار ہزار ہو گئی تھی "جس کی نظیر اسلامی اور قبل اسلام زمانے میں نہیں ملتی"[۳] یہ گھوڑے خلیفہ اور دوسرے شہریوں کے اصطبلوں سے جمع ہوئے تھے۔ خود ہشام کی ایک عزیز لڑکی دوڑ کے گھوڑے رکھتی تھی[۴]۔

شاہی حرم سرا کی خواتین کو، معلوم ہوتا ہے اوروں کے مقابلے میں کچھ زیادہ آزادی حاصل تھی۔ ایک مکی شاعر ابو دہبل آل جمحی نے امیر معاویہ کی خوب صورت بیٹی عاتکہ کی جھلک دیکھ لی جب کہ وہ حج میں آئی اور پردے اٹھائے بے نقاب بیٹھی تھی۔ شاعر اسے ایک غزل میں خطاب کرنے سے نہ جھجکا بلکہ بعد میں اس کے پیچھے دارالخلافت تک پہنچ گیا۔ آخر خلیفہ کو اس کے لیے معقول وظیفہ اور ایک موزوں بیوی تلاش کرنی 229
پڑی اور اس طرح شاعر کی زبان قطع کی[۵]۔ ایک اور شاعر وضاح ابن یمن خود بہت خوب صورت تھا۔ وہ یہاں تک بڑھا کہ دمشق میں ولید اوّل کی ایک بیوی پر فریفتہ ہو گیا اور خلیفہ کی تنبیہ و تہدید کے باوجود

---

[۱] مسعودی، ۴ ص ۱۳۔

[۲] ابن الجوزی، "سیرۃ عمر" ص ۵۶۔

[۳] مسعودی، ۵ ص ۴۲۲۔

[۴] "کتاب العیون" (۱۸۶۵ء) ص ۶۹۔

[۵] اغانی - ۶ ص ۱۵۸۔

باز نہ آیا حتیٰ کہ اس گستاخی کی بدولت جان سے گیا۔[51] خلیفہ عبدالملک کی ملکہ، امیر معاویہ کی ایک حسین و ذہین پوتی تھی۔ اس کا نام بھی عاتکہ تھا۔ وہ اپنے شوہر خلیفہ کے مزاج میں بہت دخل رکھتی تھی۔ اس کی چیرہ دستی کی مثال میں یہ حکایت پیش کی جا سکتی ہے کہ ایک دفعہ خلیفہ سے ناراض ہو کر محل کے دروازے میں قفل لگوا دیا اور کھولنے سے انکار کرتی رہی یہاں تک کہ ایک منہ چڑھا درباری روتا ہوا آیا اور جھوٹ موٹ بیان کیا کہ اُس کے دو بیٹوں میں سے ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور اب خلیفہ قاتل بھائی کو بھی موت کی سزا دینے پر تُل گیا ہے۔[52] حرم سرا کا نظام جس میں خواجہ سراوں کی ایک جماعت شامل ہوتی تھی، غالباً کچھ مدت بعد، یعنی ولید ثانی کے زمانے میں قائم ہوا تھا۔[53] اور یہ پہلے خواجہ سرا بیش تر یونانی ہوتے تھے۔ عربوں میں ان کی آمد صریحاً بائی زنطہ والوں کی تقلید میں شروع ہوئی تھی۔[54]

دار الخلافہ

یہ کہنا احتیاط کے خلاف نہ ہوگا کہ شہر دمشق میں معاشرت کا جو رنگ اور مذاق خلفائے بنی اُمیّہ کے عہد میں بن گیا تھا، آج تک اس میں کوئی بڑا فرق نہیں پڑا ہے۔ جیسا کہ ہم آج کل مشاہدہ کرتے ہیں،

---

[51] اغانی - ۲ صـ۳۶ - ۹ صـ۴۹۔
[52] مسعودی: ۵ صـ۲۷۳۔
[53] اغانی - ۴ صـ۸۵۔
[54] بیوری: "دی امپی ریل سسٹم ... سین چری" (لندن ۱۹۱۱ء) صـ۱۲۰۔ پارلس دیہل: "بی زانٹ ....." (پیرس ۱۹۱۹ء) صـ۱۵۴۔

اُس زمانے میں بھی دمشق کے مسقف، تنگ بازاروں میں اہل شہر ڈھیلے پائنچے کی شلواریں، سرخ نوک کی جوتیاں پہنے، بڑے بڑے پگڑ باندھے اُن بنڈوں سے بھڑ بھڑ کے چلتے تھے جن کے رنگ تمازت آفتاب سے سنولائے ہوئے اور لباس، ڈھیلا کرتا، سر پر شالی رومال (= کوفیہ) عِقال سے بندھا ہوا ہوتا تھا۔ اور کبھی کبھی یورپی لباس کے کسی افرنجی[1] سے بھی مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ کہیں کہیں خوش حال دمشقی امیر زادے گھوڑوں پر سوار نظر آتے کہ سفید ریشم کی عبائیں، تلوار یا برچھے سے مسلح چلے جا رہے ہیں۔ خال خال عورتیں بازار کو عبور کرتی دکھائی دیتی ہیں وہ بھی سب برقع پوش۔ بعض اپنے مکان کے دریچوں سے جہاں سے بازار یا چوک نظر آتے تھے، چھپ چھپ کے جھانک رہی ہیں۔ شربت فروش، مٹھائی کے خوانچے والے اونچی سے اونچی آوازیں لگا رہے ہیں کہ اس پیہم شور میں دبنے نہ پائیں جو چلنے والوں اور جوق در جوق گدھوں اور اونٹوں کے قدموں کی چاپ سے پیدا ہو رہا ہے۔ یہ جانور زرعی اور صحرائی پیداوار سے لدے پھندے آئے ہیں۔ شہر کی ہوا ہر قسم کی خوش بُو یا بدبُو سے جسے قوت شامہ محسوس کر سکتی ہے، گراں بار ہو گئی ہے۔

عربی نژاد لوگ دوسرے شہروں کی طرح، دمشق میں بھی علاحدہ ۱
اور قبیلہ وار محلّے بنا کے رہا کرتے تھے۔ چنانچہ دمشق، حمص، حلب اور دوسرے شہروں میں اُن کے یہ محلّے (= "حارے") ابھی تک

---

[1] "افرنجی" یعنی فرینک (= فرنگی) تمام یورپ والوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ خاص کر محاربات صلیبیہ میں اس کا استعمال عام تھا۔

الگ نظر آتے ہیں۔ ان کے ہر مکان کا دروازہ گلی سے صحن مکان میں کھلتا تھا جس کے وسط میں عموماً پانی کا طاس بنا ہوتا اور اس میں فوارہ چلتا رہتا جو کبھی کبھی ہلکا سا چھڑکاؤ کر دیتا تھا۔ طاس کے قریب نارنگی یا لیموں کا درخت لگا دیتے تھے۔ صحن کے چاروں طرف رہنے کے کمرے بنے ہوتے اور بڑے مکانوں کے صحن میں کمانچہ (یا سہ دری) بھی بنا دیتے تھے۔ بنو امیہ کی دائمی عظمت اس میں ہو کر انھوں نے شہر دمشق میں آب رسانی کا ایسا نظام تیار کیا جس سے بہتر اُن دنوں ممالک مشرق میں کہیں نہ تھا اور جو آج کے دن تک جاری ہے۔ یزید کے نام پر ابھی تک ایک "نہر یزید" موجود ہے جسے امیر معاویہ کے اس فرزند نے بردہ سے کھود کر نکالا یا زیادہ قرین قیاس یہ ہے کہ اسے چوڑا کرایا کہ غوطہ کے علاقے کو پوری طرح سیراب کر سکے۔ غوطہ دمشق کے باہر وہ نخلستان ہے جس کے سرسبز اور کثیر باغوں کا وجود ہی محض رود بردہ کی بہ دولت ہے۔ نہر یزید کے علاوہ بردہ اپنے چار ہاتھ یا نہریں اور پھیلاتی ہے جن سے شہر کی گلی گلی میں تازگی اور سرسبزی پھیل جاتی ہے؛

معاشرہ

ع سلطنت کی آبادی ہر جگہ چار درجوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ سب سے اوپر کا درجہ قدرتی طور پر حکم راں قوم یعنی مسلمانوں کو حاصل تھا جن کے سرگروہ خلیفہ کا خاندان اور فاتحین عرب کے امیر زادے تھے۔ اس

---

۵۱ دیکھو "المطری" ص ۵۹۔ نیز ملاحظہ ہو "ژورنل ایشیاتیک" ج ۴، (۱۸۹۴ء) ص ۲۰۰ مضمون نوشتہ ایچ سوواژ، دمشق پر۔

قبضے کی صحیح تعداد بتانا ممکن نہیں۔ ولید اول کے عہد میں صرف دمشق اور اس کے ضلعے (= "جُند") کے عرب نژاد مسلمانوں کو جو سالانہ وظیفے دئے جاتے تھے ان کی تعداد ۴۵ ہزار تک ہوگئی تھی[1]۔ مروان اوّل کے زمانے میں حمص اور اس کے ضلعے کے وظیفہ پانے والوں کی فہرست میں بیس ہزار نام تحریر تھے۔ عمر ثانی کی (غیر مسلموں پر) پابندیاں لگانے سے قبل نومسلموں کی تعداد کچھ زیادہ نہیں ہوسکتی اور اگرچہ دارالخلافہ دمشق بنی اُمیّہ کے آخری زمانے تک شاید ایک اسلامی شہر کا نمونہ بن گیا ہو تاہم ملک شام تیسری صدی ہجری تک زیادہ تر مسیحی آبادی کا وطن رہا۔ چھوٹے قصبات ودیہات، خصوصًا پہاڑی علاقوں کے مواضع کہ ہاری ہوئی قومیں ہمیشہ انہی میں آرہتی ہیں، ان میں دیسی خصوصیات اور قدیم تہذیبی اوضاع محفوظ رہیں۔ بلکہ لبنان کا علاقہ تو اسلامی فتح کے صدیوں بعد بھی دینًا مسیحی اور لسانًا سُریانی رہا۔ مسلمانوں کی کامیابی سے صرف زور وقوت کی جنگ ختم ہوئی، مذہبی، نسلی، معاشری اور سب سے بڑھ کر لسانی کشمکش کا ان فتوحات نے محض آغاز کیا ؛ 32

موالی عرب مسلمانوں کے بعد دوسرا درجہ نومسلموں کا تھا۔ یعنی وہ لوگ جو جبرًا یا تحریک وترغیب سے اسلام لے آئے اور اصولًا اسلامی شہریوں کے جملہ حقوق کے حق دار ہوگئے۔ اگرچہ عملًا ایسا نہ تھا۔ کیوں کہ عربی عصبیت ان نظری حقوق کی مزاحم ہوتی تھی اور وہ اتنی قوی ثابت ہوئی کہ یہ حقوق عملی جامہ نہ پہن سکے۔ اس میں شک نہیں کہ بنی اُمیّہ کے قریب قریب سارے دَور میں زمیں دار خواہ مسلمان تھے یا غیر مسلم، اُن کو زمین کی مال گزاری (= خراج) برابر ادا کرنی پڑتی تھی۔

---

[1] ملاحظہ ہو لامنس: "لا سی ریہ..." (بیروت ۱۹۲۱ء) ا۔ ص ۱۱۹ ؛

صوبوں میں کسی بڑے پیمانے پر لوگوں کے اسلام لانے کی کوئی شہادت نہیں ملتی تاوقتیکہ خلیفہ عمرؒ ابن عبدالعزیز اور ال متوکل عباسی (۸۴۷-۸۶۱ء) کے سخت قوانین کا نفاذ نہیں ہوا۔ مصر میں دوسرے ملکوں کی نسبت، نئے مذہب کی مخالفت شروع سے کم سخت ہوئی اور (لوگوں کے اسلام لانے کی وجہ سے) اس ملک کی مال گزاری جو عمرو ابن العاص کے وقت میں ایک کرور چالیس لاکھ دینار سالانہ تھی، امیر معاویہ ہی کے عہد میں گھٹ کر پچاس لاکھ اور ہارون الرشید کے وقت (۷۸۶-۸۰۹ء) میں چالیس لاکھ رہ گئی[۱] حضرت عمرؓ کے زمانے میں عراق دس کرور محصول ادا کرتا تھا۔ عبدالملک کے عہد میں یہ میزان چار کرور ہو گئی[۲]۔ مالئے کی اس کمی کا سبب بلاشبہ لوگوں کا اسلام لانا تھا۔ اور بنو عباس کے دور کے آغاز ہی میں مصری، ایرانی، اور ارامی نومسلموں کی تعداد عربی النسل مسلمانوں سے بڑھنے لگی تھی (یہ نومسلم جو موالی کہلاتے تھے، مسلمانوں کی قوم میں سب سے نیچے درجے پر رکھے جاتے تھے اور یہ تذلیل ان کو سخت ناگوار گزرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اُن کو اکثر اوقات ایسی تحریکات میں پیش پیش دیکھتے ہیں جیسی کہ شیعیت عراق میں اور خارجیت ایران میں) تاہم ان میں بعض ایسے بھی تھے جن میں عام قاعدے کے مطابق نئے مذہب کا جوش پرانے مسلمانوں سے بھی زیادہ تھا اور غیر مسلموں سے بڑی سختی کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس قسم کے متشدد نومسلموں میں اوّل اوّل ایسے لوگ نمایاں ہیں جو

---

[۱] یعقوبی: "کتاب البلدان" (لائیڈن ۱۸۹۲ء) ص ۳۳۹۔

[۲] دیکھو تاریخ یعقوبی۔ ۲۔ ص ۲۲۷ نیز آرنلڈ "پریچنگ ..." طبع ثانی (لندن ۱۹۱۳ء) ص ۸۱

... یا ... تھے؛ ان قوموں میں تہذیب و تعلیم قدیم سے رہی تھی لہذا مس... ہونے کے بعد یہ قدرتی طور پر ملتِ اسلامی کے اُن افراد میں شامل ہوئے جنھوں نے سب سے پہلے تحصیل علوم اور فنونِ لطیفہ کو ترقی دینے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ پھر، جب علمی اور دماغی میدانوں میں وہ عرب مسلمانوں سے آگے نکل گئے تو لامحالہ ملک داری اور سیاسیات میں بھی مقابلہ کرنے اور اپنی فضیلت کا دم
3 بھرنے لگے۔ فاتحین سے شادی بیاہ کے ذریعے اُنھوں نے خالص عربی خون کو گھلا ملا کر ہلکا کرنے میں حصہ لیا یہاں تک کہ دوسری نسلوں کی ...میزش ہوتے ہوتے فاتح...ب کا نسلی امتیاز آخر میں موہوم سا ہو گیا۔

۳ ـ ذِمّی

آبادی کا تیسرا طبقہ دوسرے انبیائی مذاہب کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ "اہل الذمہ" کہلاتے اور وہ عیسائی، یہودی اور صابی لوگ تھے جن سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن و صلح ہو جاتا اور ان کے ساتھ رواداری کا برتاؤ مرعی رکھا جاتا تھا۔ صابی، قدیم مندلین ہی کو کہتے ہیں جو حضرت یوحنا دلی کے پیرو مسیحی اور ابھی تک دریائے فرات کے دہانے پر دلدلی علاقے میں باقی چلے آتے ہیں۔ قرآن مجید میں ان کا تین جگہ ذکر آیا ہے (:۔ بقرہ: ۶۲ ۔ مائدہ: ۳۰، ۔ حج: ۱۷)[۱]

۱؎ (مؤلف نے سورہ بقرہ کی آیت کا نشان ۵۹ دیا ہے۔ جو صحیح نہ تھا۔ اس کی مراد: ان الذین آمنوا، والذین ھادو ۔۔ الآیہ سے ہے۔ سورۂ حج کی جس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے اس میں صرف وہ مسیحی مذکور ہیں جو حضرت مسیحؑ کی الوہیت اور تثلیث کے قائل تھے۔ مسلمان مفسر عموماً صابی اُن لوگوں کو سمجھتے ہیں جو خدا کا اقرار مگر کواکب کی پرستش کرتے تھے۔ مترجم)

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ان لوگوں کو خدا پرست سمجھتے تھے۔ ان رعایت یافتہ مذاہب کی حیثیت تسلیم کرنا اور انھیں جزیے اور قبول اطاعت کے عوض میں اپنی حفاظت میں لینا پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی خاص سیاسی جدت تھی اور اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ آنحضرت صلعم کتاب مقدس کا احترام فرماتے تھے اور دوسرا ضمنی سبب یہ کہ غسّان، بکر، تغلب اور دوسرے عیسائی قبائل کے خاندانی امیرزادوں کی رعایت ملحوظ خاطر تھی۔

اس طبقے کے ذمّی زمین کی مقررہ مال گزاری اور جزیہ ادا کرنے کے بعد بہت کچھ آزادی سے بہرہ ور ہوتے تھے۔ دیوانی اور فوج داری عدالتی مقدمات میں بھی، سوائے اس کے جہاں ایک فریق کوئی مسلمان ہو، یہ لوگ عملاً اپنے ہی مذہبی پیشواؤں کے ماتحت تھے۔ اسلامی شریعت اتنی مقدس چیز تھی کہ انھیں اس کا پابند بنانے کے قابل بھی نہیں سمجھا گیا تھا۔ ان اصولِ حکومت کے اہم اجزا کا زمانۂ حال میں، عثمانی سلطنت بلکہ حکم برداری کے دَور تک عراق اور شام و فلسطین میں رواج چلا آتا تھا۔

شروع میں یہ رعایت صرف انہی لوگوں کو دی گئی تھی جنھیں قرآن "اہل الکتاب" کہتا ہے[1] اور جو مسلمانوں کی حکومت میں داخل ہوے لیکن آگے چل کر اس رعایت کو (مجوس) آتش پرستوں، حرّان کے بت پرستوں اور جاہلی بربروں تک وسیع کر دیا گیا۔ یہ لوگ اہل الکتاب میں شامل نہ تھے اور قانونی اعتبار سے

---

[1] سورۂ توبہ: ۲۹ - بقرہ: ۹۹ - آل عمران: ۶۲ تا ۶۵۔

اسلام کی حفاظت کے دائرے میں نہ آتے تھے۔ تاہم ایران کے زرتشتیوں اور شمالی افریقہ کے بربروں کے سامنے مسلمان حملہ آوروں نے جو تین شرطیں پیش کیں ان میں کبھی اسلام اور یا جنگ پر اتنا زور نہیں دیا جتنا تیسری صورت جزیہ پر۔ مسلمانوں کی تلوار اتنی لمبی نہ تھی کہ ان ملکوں میں ہر شخص کی گردن تک پہنچ جاتی لہذا قانون کی پابندی کی بجائے وقتی مصلحت غالب آئی۔ شام کے دشوار گزار کوہستانی علاقے لبنان میں عیسائی ہمیشہ چیرہ دست رہے اور بنی امیہ کی خلافت کے عروج یعنی عبدالملک کے عہد میں بھی اس سے سرکشی کرتے تھے[1]۔ لیکن حق یہ ہے کہ سارے شام اور بنی امیہ کے پورے دور میں بجز صاحبِ تقویٰ عمر ابن عبدالعزیز کے، خلفا کا برتاؤ عیسائیوں کے ساتھ بہت اچھا رہا۔ جیسا کہ ہم پڑھ چکے ہیں امیر معاویہ کی بیوی نصرانیہ تھی اور اسی طرح ان کا شاعر، طبیب اور دبیر مالیات عیسائی تھے۔ ہم صرف ایک استثنائی واقعہ یہ پڑھتے ہیں کہ عیسائی عرب قبیلۂ بنو تغلب کے سردار کو ولید اول نے اسلام قبول نہ کرنے پر قتل کرایا[2]۔ مصر میں قبطیوں نے بھی کئی بار اپنے بالادست مسلمانوں سے بغاوت کی حتیٰ کہ عباسی خلیفہ مامون (۸۱۳ – ۸۳۳ء) نے ان کا پوری طرح قلع قمع کر ڈالا[3]۔

میثاقِ عمرؓ

عمرؓ ابن عبدالعزیز کی شہرت فقط ان کے زہد و تقویٰ اور نو مسلموں

---

[1] جیسا کہ باب ہجدہم کے آخری اوراق میں ہم پڑھ چکے ہیں۔

[2] اغانی، ۱۰، صفحہ ۹۹ - "ژورنل ایشیاتیک" ج ۴ (۱۸۹۴ء) صفحہ ۴۳۸۔

[3] کِندی، صفحہ ۷۳ وغیرہ۔ مقریزی: "خطط" (بولاق ۱۲۷۰ھ) ۲ صفحہ ۴۹۷۔

کے محاصل معاف کرنے کی وجہ سے نہیں بلکہ بنی اُمیہ میں وہی اکیلے اور اسلامی تاریخ میں پہلے خلیفہ ہیں جنھوں نے عیسائی رعایا کو ذلت آمیز شرائط کا پابند بنایا۔ یہ احکام غلطی سے اُن کے سابق ہم نام اور پرنانا حضرت عمرؓ ابن الخطاب سے منسوب کر دئے گئے۔ "میثاق عُمر" سے حضرت عمرؓ (اول) کا حکم نامہ مراد لیا جاتا ہے جو زیادہ تر بعد کی تاریخوں میں کئی کئی طرح سے منقول ہوا ہے[۵۱] مگر خود اس کی دفعات ہی مسلمانوں اور عیسائیوں میں ایسا میل جول فرض کرتی ہیں کہ ابتدائی فتوحات اسلامی کے وقت میں ممکن نہ تھا۔ غرض یہ احکام اموی خلیفہ عمر ابن عبدالعزیز نے نافذ کئے تھے جن میں سب سے نمایاں یہ ضابطے ہیں کہ عیسائیوں کو سرکاری عہدہ نہیں دیا جائے گا۔ وہ عمامہ نہیں باندھ سکیں گے۔ پیشانی کے بال کتروا دیں گے۔ اپنا مخصوص لباس پہنیں گے اور اس پر چمڑے کا پٹکا باندھیں گے۔ گھوڑے پر بغیر زین یا صرف پالان سے سواری کریں گے۔ نیا عبادت خانہ نہیں بنائیں گے اور نماز میں آواز بلند نہیں کریں گے۔ مزید برآں خلیفہ کا فتویٰ تھا کہ مسلمان کسی عیسائی کو قتل کر دے تو صرف دئیت پر اکتفا کی جائے گی۔ یقین ہے کہ یہودی بھی ان میں سے بعض بندشوں کی زد میں آئے ہوں گے[۵۲] لیکن یہ احکام زیادہ عرصے تک نافذ نہیں رہے جس کا پتہ اس واقعے سے چلتا ہے کہ ہشام کے ماتحت عراق کے امیر خالد ابن عبداللہ ال قسری

---

[۵۱] ابن عبدالحکم ص۱۵۱۔ ابن عساکر، ۱ ص۱۷۸ نیز دیکھو ال اِبشیہی: "ال مستطرف" (قاہرہ ۱۳۱۴ھ) ۱ ص۱۰۰۔

[۵۲] یوسف: "کتاب الخراج" ص۱۵۲۔ ابن الجوزی: سیرۃ عمرؓ ص۱۰۰۔ "عقد" ۲ ص۳۹۹۔ ابن الاثیر ۵ ص۴۹۔ نیز دیکھو ٹریٹن: "دی کے لیفس..." (اوکسفورڈ ۱۹۳۰ء) ص۵۔

نے اپنی مسیحی ماں کی خوشنودی کے لئے کوفے میں ایک گرجا تعمیر کیا[1] اور نہ صرف یہود و نصاریٰ کو اپنے معبد بنانے کی اجازت دی بلکہ زرتشتیوں کو سرکاری خدمات پر بھی مقرر کیا۔

غلام

معاشرت کے سب سے نیچے طبقے میں غلاموں کا مقام تھا[2]۔ اسلام نے سامیوں کا قدیم آئینِ غلامی جس کا جواز توراۃ میں موجود ہے، قائم رکھ دیا لیکن غلاموں کی حالت بہت کچھ بہتر بنا دی۔ شریعت اسلامی نے مسلمانوں کو کسی مسلمان کے غلام بنانے سے روک دیا لیکن کوئی غلام جو اسلام قبول کر لے، اس کے لئے آزادی کا وعدہ نہیں کیا۔ اسلام کے ابتدائی زمانے میں غلام، جنگ کے قیدیوں سے جن میں بچے عورتیں شامل تھیں لئے جاتے تھے بجز اس کے کہ ان کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ جنگ کے علاوہ قیمت سے یا تاختوں میں جو (غیر مسلم) ہاتھ آئیں وہ بھی غلام ہوتے تھے۔ غلاموں کی تجارت جلد ہی تمام اسلامی ملکوں میں رونق پکڑ گئی اور پُر نفع چیز بن گئی۔ مشرقی اور وسطی افریقہ کے کچھ غلام سیاہ فام ہوتے۔ فرغانہ اور چینی ترکستان کے کچھ زرد رو اور مشرق قریب اور جنوبی اور مشرقی یورپ کے غلام گورے رنگ کے لائے جاتے تھے۔ ہسپانوی غلاموں کو وہاں کی زبان کے لفظ "اسکلاوو" کی تعریب کر کے "صقالبہ"[3] کہتے تھے اور ان کی قیمت فی کس

---

[1] ابن خلکان - ۱ ص۳۰۲۔

[2] عربی میں، خصوصاً کالے، غلام کو عبد (جمع 'عبید) ورنہ مملوک کہتے تھے۔

[3] اسلافی قوم کے لئے بھی عرب یہی لفظ بولتے تھے تفصیل کے لئے دیکھو اس کتاب کا باب بیس کا مقدم۔

کم و بیش ایک ہزار دینار اٹھتی تھی ۔ ان کے مقابلے میں ایک ترک غلام صرف چھ سو دینار میں مل جاتا تھا۔ اسلامی قانون کی رو سے ایک کنیز کے بچے جو غلام یا کسی غیر شوہر سے ہوں، غلام ہی ہوتے تھے۔ اور اگر آقا کے صلب سے ہوں اور وہ ان کو بیٹا تسلیم نہ کرے تو بھی وہ غلام ہی رہتے تھے لیکن آزاد عورت کی اولاد اگرچہ غلام مرد سے پیدا ہو، آزاد مانی جاتی تھی۔

اسلامی سلطنت میں روز افزوں فتوحات کی بہ دولت غلاموں کی جو بھر مار ہوئی اس کا کچھ اندازہ اس قسم کے مبالغہ آمیز اعداد سے ہو سکتا ہے: موسیٰ ابن نصیر کو افریقیہ سے تین لاکھ غلام ملے جن کا ایک پانچواں حصہ اس نے خلیفہ ولید کے پاس بھیج دیا[1] ہسپانیہ کے گوطی امرا کے غلاموں میں سے تیس ہزار کواری لڑکیاں ہاتھ آئیں[2] دوسری طرف صرف سغد میں قتیبہ کے اسیروں کی تعداد ایک لاکھ تھی[3] حضرت زبیرؓ ابن العوام نے اثاث البیت میں ایک ہزار لونڈی غلام ترکے میں چھوڑے تھے[4] عشقیہ شاعر عمر ابن ابی ربیعہ (وفات تخمیناً ۷۱۹ء) ستر سے کہیں زیادہ غلاموں کا مالک تھا[5] اموی شہزادوں میں کسی کے پاس ہزار کے قریب لونڈی غلام ہونا کچھ غیر معمولی بات نہ تھی۔ صفین کی جنگ میں ایک ایک شامی سپاہی کی خدمت کے لئے ایک سے دس تک آدمی موجود تھے[6]

---

[1] مقری، ۱ صـ ۱۴۸ ۔ [2] ابن الاثیر۔ ۴ صـ ۴۴۸ ۔
[3] ابن الاثیر۔ ۴ صـ ۲۰۴ ۔ [4] مسعودی ۔ ۴ صـ ۲۵۴ ۔
[5] اغانی ۔ ۱ صـ ۳۷ ۔
[6] مسعودی، ۴ صـ ۳۸۵ ۔ نیز دیکھو جُرجی زیدان "تاریخ التمدن الاسلامی" طبع سوم (قاہرہ ۱۹۲۳ء) ۵ صـ ۲۳ ۔

مالک کنیز کو بطور حرم رکھ سکتا تھا مگر نکاح کی اجازت نہ تھی [1] ایسے تعلق سے جو اولاد ہوتی وہ مالک کے بچے ہونے کی وجہ سے آزاد ہوتے تھے۔ لیکن کنیز کو صرف "اُمّ ولد" کا مرتبہ حاصل ہوجاتا جس کا 236
مطلب یہ تھا کہ مالک نہ اسے فروخت کرسکتا تھا نہ ہبہ، اور اُس کے مرنے پر وہ آزاد مان لی جاتی تھی۔ مختلف نسلوں کے اُس خلط ملط میں جو عربوں اور بیرونی قوموں میں واقع ہوا، بے شبہ غلاموں کی تجارت کا بھی بہت اہم حصّہ تھا۔

غلاموں کو آزاد کرنا، اوّل سے نیکی کا کام ("قربہ") اور آزاد کرنے والا مالک، عالمِ آخرۃ میں خاص ثواب کا مستحق سمجھا جاتا تھا۔ آزاد ہونے کے بعد غلام اپنے پہلے آقا کے مولیٰ کا درجہ حاصل کرلیتا اور آقا اس کا سرپرست یا بزرگ بن جاتا تھا۔ حتیٰ کہ سابقہ مالک کی وفات پر اس کا وارث نہ موجود ہو تو مولیٰ ہی اس کی جائیداد کا وارث ہوجاتا تھا۔

مدینۂ منوّرہ اور مکّہ معظّمہ

اموی خلافت کے دَور میں (جنگ وجدال کے بعد) مدینے میں زندگی خاموشی سے گزرتی تھی۔ ابتدائی اسلامی تاریخ کے تعلق نے اُسے وہ تقدس بخشا کہ علم دین کے جویا کشاں کشاں وہاں آتے اور اس کے مبارک ماضی کے آثار باقیہ کا مطالعہ کرتے اور شریعت کے رموز

---

[1] (مولّف کے بیان سے غلط فہمی کا احتمال ہے۔ مالک کو اختیار ہے جس وقت چاہے کسی کنیز کو آزاد کرے۔ پھر اس سے نکاح کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مترجم)

اور سنت کے قواعد و ضوابط سے واقفیت بہم پہنچاتے تھے۔ اس طرح مدینۃ النبی جو کہ آپؐ کے مرقد مبارک کا مقام تھا، اسلامی روایات کا بھی پہلا مرکز بن گیا اور انس رضؓ ابن مالک (رحلت مابین ۷۰۹ — ۷۱۱ء) اور عبداللہ رضؓ ابن عمر رضؓ ابن الخطاب (رحلت ۶۹۳ء) جیسے بزرگوں کی نگرانی میں علم حدیث نے اعلیٰ درجے کے ضابطہ علم کی صورت اختیار کرلی[۱]۔

دوسری طرف مکی مذہب (حدیث) کی شہرت عبداللہ ابن عباس رضؓ کی رہین منت ہے جن کی کنیت بھی ابوالعباس تھی (رحلت تخمیناً ۶۸۸ء) وہ رسول اللہ صلعم کے عم زاد بھائی اور عباسی خلفا کے جد امجد تھے۔ انھیں دینی اور دنیاوی احادیث کی بڑی وسیع واقفیت تھی۔ دین میں تفقہ اور تفسیر قرآن میں مہارت رکھتے تھے اور انہی اوصاف کی وجہ سے حبر الامت (یعنی قوم کے حکیم یا علامہ) کے قابل رشک لقب سے ملقب کئے گئے۔ لیکن زمانۂ حاضرہ کی تنقید نے ظاہر کردیا کہ وہ اوّل درجے کے وضّاع حدیث تھے[۲]۔

ان مقدس شہروں میں ایک اور بڑی تبدیلی امویوں کے عہد خلافت میں یہ واقع ہوئی کہ عرب کے سابقہ دارالحکومت یعنی مدینے

---

[۱] عبداللہ رضؓ حضرت عمر رضؓ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ محدث کے طور پر وہ ابن مالک سے زیادہ قابل وثوق مانے جاتے ہیں۔ ابن مالک کی حدیثوں کا مجموعہ مسند احمد امام ابن حنبل میں محفوظ ہے۔

[۲] (مؤلف نے بغیر حوالہ دئے ایسی عمومی رائے لکھ دی جسے اکثر مسلمان اہل علم سخت ناپسندیدہ سمجھیں گے۔ یہ بھی صراحت نہ کی کہ زمانۂ حاضرہ کی تنقید سے اس کا اشارہ مستشرقین کی طرف ہے یا اس میں مسلمان علما بھی شامل ہیں؟ مترجم)۔

میں بہت سے وہ لوگ آبسے جو عملی سیاسیات کے جھگڑوں سے الگ رہنا چاہتے تھے یا اس کثیر دولت سے جس کا عظیم فتوحات نے انھیں مالک بنایا، اطمینان کے ساتھ عیش کرنے کے خواہاں تھے۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کی پیروی میں بہت سے نئے دولت مند اسی شہر میں جمع ہو گئے تھے۔ چنانچہ اندر بڑے بڑے محل اور شہر کے باہر بہت سے بنگلے تعمیر ہوئے جن میں نوکروں اور غلاموں کی بھیڑ لگی رہتی اور صاحبانِ خانہ کے عیش و آرام کے جملہ لوازم مہیا ہوتے تھے[۱]۔ یہی حال مکہ معظمہ کا ہو گیا تھا کہ اپنے ساتھی شہر کی طرح، عیش و آرام کے طالب اُس میں 237 کھنچے چلے آتے تھے۔ پھر ان میں جس قدر تکلفات اور عیش کے لوازم بڑھے، زندگی کی بے اعتدالی میں بھی اضافہ اور اس کا چرچا ہونے لگا[۲]۔ سال بہ سال ساری اسلامی دنیا سے جو حاجی یہاں آتے وہ تازہ مال و زر لاتے تھے۔ اس افراط دولت کا اُن ابتدائی ایام سے مقابلہ کیجیے تو حیرت ہوتی ہو جب کہ حضرت عمرؓ کا گماشتہ بحرین سے پہلی مرتبہ پانچ لاکھ درہم کا خراج لے کر لایا اور یہ رقم سن کر حضرت خلیفہ کو اس کے ماننے میں تامل ہوا۔ پوچھا، اتنا روپیہ جمع ہونا ممکن ہی؟ اور جب دوبارہ عامل نے یقین دلایا کہ واقعی یہ رقم پانچ دفعہ ایک ایک لاکھ کا مجموعہ ہی تو حضرت رضؓ نے تمام شہر والوں کو طلب کر کے یہ اعلان فرمایا: "ابھی ابھی ہم کو بڑی بھاری دولت موصول ہوئی ہی۔ اب اگر تم چاہو تو اسے

---

[۱] مسعودی ۔ ۲ ص ۲۵۴ ؛

[۲] اغانی ۔ ۲۱ ص ۱۹۷ ؛

پیمانے سے سب میں بانٹا جائے گا ورنہ گن گن کر تقسیم ہو گی۔[1]

دولت کی گنگا بہہ بہہ کر آتی رہی تو پھر ان مقدس شہروں میں تقدس و تقویٰ کی پہلی شان باقی نہ رہی۔ بلکہ وہ عربی موسیقی اور دنیاوی تفریح و تفنن کی ترقی کے مرکز بننے لگے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مکے میں ایک تفریح گاہ قائم ہوئی جیسے آج کل کلب گھر ہوتے ہیں اور اس کے سرپرست جو وہاں آتے تھے، ان کے جبے اور لبادے ٹانکنے کے لئے میخوں کا بھی انتظام کیا گیا تھا ــــ یہ گویا حجاز میں ایک نئی چیز تھی۔ پھر وہ اطمینان سے بیٹھ کر چوسر، شطرنج، نرد کھیلتے یا کتاب خوانی سے دل بہلاتے تھے۔[2] مدینے میں رومی اور ایرانی مغنیہ کنیزیں ("قیان") روز افزوں تعداد میں چلی آتی تھیں۔ لہو و لعب کے دوسرے اسباب کے ساتھ غزل، یعنی عشقیہ شعر شاعری بھی ترقی پر تھی۔ "بیوت القیان" میں رونق رہنے لگی تھی اور فرزدق جیسے قومی شہرت کے معزز شاعر ان کی سرپرستی کرتے تھے۔[3] یہ گانے والی لونڈیاں مدھم سروں میں ساز بجا کر اپنے امیر کبیر مالکوں یا قدر شناسوں کو گانے سناتی تھیں اور وہ رنگ برنگ کے فاخرہ لبادوں میں چوکور گدوں یا چٹائیوں پر تکئے لگا کے بیٹھتے، عود و لوبان کے خوش بودار دھوئیں ان کے مشام کو معطر کرتے اور چاندی کی کوزیوں میں ملک شام کی عنابی شرابوں کی چسکیاں لگاتے رہتے تھے۔

مروانی خاندان کے ابتدائی خلفا ہی کے عہد میں مدینے کو یہ فخر

---

[1] ابن سعد، ۳ ص ۲۱۱۔ [2] اغانی، ۴ ص ۵۲۔

[3] اغانی، ۲۱ ص ۱۹۷۔

حاصل ہوا کہ اُس زمانے کی ایک ممتاز ترین خاتون، یعنی خوب صورت اور صاحب تمکنت سیدہ سُکَینہ (وفات ۱۳۵ھ / ۷۳۵ء) اس میں رہتی تھیں جو شہید امام حسینؓ کی صاحب زادی اور حضرت علیؓ کی پوتی تھیں[۵۱]، وہ رتبہ عالی اور علم و فضل کے ساتھ انھیں شعر و سرود کا نہایت شوق تھا۔ حُسنِ صورت و سیرت کو ان کے ذوق کی نفاست اور حاضر جوابی نے چار چاند لگا دئے تھے اور ان سب اوصاف کے جمع ہو جانے کی وجہ سے وہ حجاز کے مقدس شہروں کے خطے میں ادبیات و حُسن، آداب و اوضاع کے باب میں حکم بن گئی تھیں۔ لطائف و ظرائف اور لوگوں کو بیوقوف بنانے میں اُن کی شہرت تھی[۵۲]۔ اس زمانے میں جس قسم کے بھدّے مذاق کو اعلیٰ طبقے تک میں قبولیت حاصل تھی، اس کی مثال یہ ہے کہ ایک مرتبہ خاتون موصوفہ نے ایک بڈھے ایرانی کو انڈوں کے ٹوکرے پر بٹھایا اور 38
اس سے مُرغی کی بولی بلوائی۔ جسے سُن سُن کر ان کے مہمان خوب ہنسے۔ ایک اور موقعے پر سیدہ نے شحنہ شہر کو کہلا بھیجا کہ ایک شامی میرے کمروں میں نقب لگا کر گھس آیا ہے۔ خود شحنہ اور اس کا مددگار گھبرا کر حویلی پر پہنچے تو دیکھا کہ سیدہ کی خادمہ ایک لپتو کو پکڑے کھڑی ہے[۵۳]۔

---

[۵۱] "سیدہ" کا لقب شروع میں حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی (دختری) اولاد کے لئے مخصوص تھا۔

[۵۲] اغانی-۱۴، صفحہ ۱۶۴ (یہ اور اسی قسم کی روایات جنھیں مؤلف نے مزے لے کے بیان کیا ہے، عموماً کتاب الاغانی سے ماخوذ ہیں۔ اور خود مؤلف اس ماخذ کو پہلے ناقابلِ اعتماد بتا آیا ہے۔ درحقیقت یہ کتاب محض رندی اور عیاشی کے جھوٹے سچے افسانوں پر مشتمل ہے۔ اور گویا اسی مذاق کو ترقی دینے کے لئے مدوّن کی گئی تھی۔ اس کا مصنف اپنے اخلاق و عقائد کی خرابی کی وجہ سے مسلمانوں میں مطعون ہے اور دیوانہ ہو کر مرا تھا۔ البتہ جدید فرنگی ذوق سے کتاب کو مناسبت ہے اور اسی لئے وہ یورپ اور یورپ زدہ ایشیا میں آج کل خاصی مقبول ہو گئی ہے۔ لیکن خالص تاریخی اعتبار سے اسے کوئی وقعت و اعتبار حاصل نہیں ہے۔ مترجم)

[۵۳] اغانی-۱۶، صفحہ ۱۴۲ و ۱۷، صفحہ ۹۴۔

شامی پشتو اُن دنوں بھی صریحًا ایسے ہی مشہور تھے جیسے آج کل ⁂ سیدہ کا مکان زمانۂ حال کی اصطلاح میں ایک قسم کا سیلون (= عام دیوان خانہ) تھا جہاں شعرا اور فقہا کے مجمعے رہتے اور ان میں مالکہ خانہ کی بذلہ سنجی اور حاضر جوابی کی بدولت کبھی لطف و تفنن میں کمی نہ آتی تھی۔ انھیں اپنی عالی نسبی پر خاص فخر تھا اور اپنی صاحب زادی پر بھی نازاں تھیں جسے زیور سے خوب آراستہ رکھنا پسند کرتی تھیں اور اسی طرح اپنے بالوں پر ناز تھا جنھیں گوندھنے کی خاص وضع خود انھوں نے ایجاد کی تھی۔ یہ وضع "طُرّہ سُکینہ" کے نام سے لوگوں میں مقبول ہوگئی تھی اور آگے چل کر زاہد مزاج خلیفہ عُمر ثانی نے اس کی سختی سے ممانعت کا حکم نافذ کیا تھا[۵۱]۔ انھی خلیفہ کے ایک بھائی نے سکینہ سے یک جائی کے بغیر نکاح کیا تھا۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے جس قدر طالب گاروں سے وہ تھوڑی یا زیادہ مدت کے لیے نکاح کرتی رہیں ان کی تعداد دو ہاتھ کی انگلیوں پر شمار میں آنی مشکل ہے[۵۲]۔ ایک سے زیادہ موقعوں پر انھوں نے نکاح کے وقت اپنی آزادی کی پہلے سے شرط کرلی تھی ⁂

ان کی ایک ہم چشم طائف میں رہتی تھیں جہاں مکّہ مدینے کے لوگ گرمیاں گزارنے جاتے اور ان بیوی کے نئے نئے قصّے سنتے تھے۔ یہ عائشہ بنت طلحہؓ تھیں جن کے والد پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ممتاز صحابی اور والدہ حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی اور آں حضرت صلعم کی عزیز ترین بیوی

---

[۵۱] ابن خلکان، ۱ ص ۳۷۷ ⁂

[۵۲] اغانی - ۱۴ ص ۱۶۵ ⁂

[۵۳] ابن سعد، ۸ ص ۳۴۹ - ابن قتیبہ کی "معارف" (ص ۱۰۱) میں، اور ابن خلکان، ۱ ص ۳۷۷ - نیز اغانی میں نکاح کرنے والوں کی فہرستیں دی گئی ہیں ⁂

حضرت عائشہؓ کی بہن تھیں ۔ طلحہؓ کی یہ بیٹی عالی نسبی کے ساتھ اعلیٰ درجے کا حسن صورت اور نہایت پُرتمکنت مزاج رکھتی تھیں ۔ عورتوں میں ان تین صفات کی اہل عرب نہایت قدر کرتے تھے ۔ یہ بیوی جن کا مجمع عام میں آنا سیدہ سکینہ سے بھی بڑھ کر اثر انگیز ہوتا[۵۱] جس بات کی خواہش کرتیں، اس سے کسی کو انکار کرتے نہ بن پڑتی تھی ۔ ایک مرتبہ جب کہ وہ حج کے لیے گئے آئی تھیں، انھوں نے امام سے جو حاکم شہر بھی تھا، کہلا بھیجا کہ جب تک وہ کعبے کے سات طواف پورے نہ کر لیں، نماز کی جماعت کھڑی نہ کی جائے ۔ حاکم کو ان کی خاطر تعمیل کرنی ہی تھی مگر اسی کی سزا میں خلیفہ عبدالملک نے اُسے معزول کر دیا[۵۲] ۔ ان عائشہ کے 239

صرف تین نکاح ہوے[۵۳] دوسرے خاوند مصعب ابن زبیر تھے جنھوں نے سکینہ سے بھی شادی کی تھی اور ان دونوں بیویوں کو دس دس لاکھ درہم مہر ادا کیا تھا[۵۴] ۔ ایک مرتبہ انھوں نے عائشہ کو منہ پر نقاب نہ ڈالنے پر تنبیہ کی تو بیوی نے اپنے خاص مزاج کے مطابق جواب دیا کہ خدائے عزّ وجلّ نے اگر مجھے جمال عطا کیا ہے تو میں چاہتی ہوں کہ لوگ اسے دیکھیں اور خدا کی بخششوں کو یاد کریں ۔ میں کسی حال میں نقاب سے (اپنا منھ) نہ چھپاؤں گی[۵۵] ۔

---

۵۱ اغانی - ۱۰ ص ۶۰ ۔ ۵۲ اغانی - ۳ ص ۱۰۳ ۔ ۵۳ ابن سعد - ۸ ص ۳۴۲ ۔
۵۴ اغانی - ۳ ص ۱۲۲ ۔ ۵۵ ” - ۱۰ ص ۵۴ ۔

(مؤلف نے مذکورہ بالا روایتوں کو جن سے مسلمانوں کی عیش پسندی ثابت ہو، بڑے اہتمام سے تلاش کر کے لکھا ہے اور کہیں کہیں اصل روایت میں اپنی طرف سے رنگ آمیزی بھی کر دی ہے ۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا یہ روایتیں عموماً ضعیف اور مجہول ہیں ۔ لیکن اگر صحیح ہوں تو بھی اُمید ہے مسلمان ناظرین ان سے یہ سبق حاصل کریں گے کہ اخلاق و تقویٰ کوئی موروثی چیز نہیں ہیں دوسرے، جب کسی قوم میں دولت آتی ہے تو اپنے ساتھ عیش پرستی کی ترغیبات لاتی ہے اور جو ان سے احتراز و اجتناب نہیں کرتا وہ لازماً برباد و بدنام ہو جاتا ہے ۔ مترجم)

باب وبست ویکم
۲۱

بنی اُمیّہ کے عہد کی دماغی مساعی 240

صحرائی کشورستان اپنے ساتھ علم و فضل کی روایات اور کوئی تہذیبی ورثہ اُن ملکوں میں جنھیں فتح کیا، لے کر نہ آئے تھے۔ ملکِ شام، ملکِ مصر، ال عراق اور ایران میں ہر جگہ خود انھیں اپنی محکوم قوموں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا پڑا، مگر وہ ایسے شاگرد ضرور ثابت ہوئے جن کا جواب نہیں۔

تاریخی اعتبار سے دیکھئے تو خلافت بنی اُمیّہ کا زمانہ عہدِ جاہلیہ سے زیادہ بعید نہ تھا۔ پھر اس دور میں برابر اندرونی اور بیرونی جنگیں ہوتی رہیں اور ملت اسلامی کے معاشی اور معاشرتی حالات میں خلل آتا رہا۔ یہ سب اسباب اُس ابتدائی دور میں علمی ترقی کے نامساعد تھے۔ پھر بھی علوم کی تخم پاشی اسی زمانے میں کی گئی جنھوں نے آگے چل کر نہالِ سرسبز و میوہ دار کی صورت اختیار کرلی۔ یہ نشوونما جو علوم کو اولین خلفائے بنو عباس کے وقت میں، پایۂ تخت بغداد میں حاصل ہوئی، اُس کی جڑیں بلاشبہ سابقہ زمانے تک جاتی ہیں جب کہ یونانی، شامی اور ایرانی تہذیب مسلمانوں

میں آئی۔ پس مجموعی طور پر اموی عہد کو ہم گویا جنین کی پرورش کا زمانہ کہہ سکتے ہیں ؎

جس وقت ایرانی، شامی، قبطی، بربر اور دوسری قومیں فوج در فوج اسلام کے حلقے میں آئیں اور عربوں سے عام اختلاط و ازدواج ہونے لگا تو شروع شروع میں عرب والوں نے، عرب اور غیر عرب کے درمیان جو اونچی دیواریں کھڑی کی تھیں، وہ زمین پر آرہیں۔ مسلمانوں میں قومیت کا سوال پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ہر کلمہ گو، خواہ کسی نسل و وطن کا ہو ویسا ہی عرب سمجھا جانے لگا جیسے ملک عرب کے اصلی باشندے تھے۔ عرب کی تعریف ہی آیندہ یہ ہوگئی کہ جو دین اسلام کا پیرو اور عربی زبان بولتا اور لکھتا ہو، اس کی اصل نسل کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ عرب ہے۔ اسلامی تمدن کی تاریخ میں یہ بھی ایک نہایت حیرت انگیز اور اہم حقیقت ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ ہم جب "فلسفۂ عرب" یا "طب عربی" یا "عرب کے علم ریاضی" کے الفاظ بولتے ہیں تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ علوم و فنون خاص عربی دماغ کی پیداوار یا اُن لوگوں کے فروغ دادہ سمجھے جائیں جو جزیرہ نمائے عرب کے باشندے تھے بلکہ ان کا مطلب اُن جملہ علوم سے ہوتا ہے جو عربی زبان کی کتابوں میں مرقوم و محفوظ کئے گئے تھے۔ ان کے لکھنے والے زیادہ تر خلافت عرب کے دور میں پھولے پھلے اگرچہ نسلاً وہ ایرانی، شامی، مصری اور عرب سبھی قوموں کے افراد تھے بلکہ مسلمانوں کے علاوہ ان میں مسیحی اور یہودی بھی شامل تھے جنھوں نے اپنی معلومات یونانی، ارامی، انڈو ایرانی اور ممکن ہے دوسرے ماخذوں سے فراہم کی تھی ؎

حجاز کے دونوں ہمسایہ شہر یعنی مکہ اور مدینہ تو جیسا اوپر بیان ہوا. امویوں کے زمانے میں عیش وطرب. شعر و موسیقی کے گھر بن گئے تھے لیکن، ان کے مقابلے میں عراق کے دو توام شہروں میں یہی زمانہ انتہا درجے کی علمی کوشش و سرگرمی کا زمانہ تھا۔ ہماری مراد کوفے اور بصرے سے ہے جو ان دنوں تمدن اسلامی کی ذہنی مساعی کے سب سے بڑے دو مرکز تھے[1]۔

ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ملک عراق کے یہ دونوں صدر مقام اصل میں فوجی چھاؤنیاں تھیں جو حضرت عمرؓ کے حکم سے اسلامی سن ۱۷ھ (مطابق ۶۳۸ء) میں تیار کی گئی تھیں[2]۔ ان میں سے اول کو، جسے حضرت علیؓ نے اپنا دارالخلافہ بھی قرار دیا تھا، قدیم بابل کے کھنڈروں سے کچھ دور نہ تھا اور ایک اعتبار سے اسے لخمی نوکِ حیرہ کے سابقہ دارالحکومت کا وارث کہہ سکتے ہیں۔ ان کا محل وقوع بہت مناسب تھا اور تجارت و آبادکاری نے ان دونوں ساتھی شہروں کو تھوڑے ہی عرصے میں نہایت بارونق اور دولت مند بنا دیا تھا جن کی آبادی ایک ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ بلکہ بصرے کی نسبت کہا جاتا ہے کہ بالکل شروع ہی میں یعنی ۵۰ھ (= ۶۷۰ء) میں بڑھتے بڑھتے تین لاکھ آبادی کا شہر ہو گیا تھا جس میں ایک مدت بعد میں ایک لاکھ بیس ہزار (!) نہریں جاری تھیں[3]۔ امویوں کے دور میں خراسان تک جملہ ولایات کا

---

[1] انگریزی میں اس کا تلفظ "بصورا" ہو گیا ہے۔ زمانۂ حال کا بصرہ قدیم شہر سے ۲ میل شمال مشرق میں واقع ہے۔

[2] شاید کوفہ، بصرے سے ایک دو سال بعد بنایا گیا تھا۔ دیکھو یاقوت، ۴ ص ۳۲۲۔

[3] اصطخری ص ۸۰۔ ابن حوقل ص ۱۵۹۔

صدر مقام یہی بصرہ تھا جہاں سے ایران کی سرحد قریب تھی۔ یہیں زبان عربی اور اس کی صرف نحو کی علمی تحقیق و تدریس کا آغاز ہوا اور عجمی نومسلموں کی خاطر اور کسی حد تک خود ان کی مدد سے جاری رہا۔ پہلی وجہ تحریک تو یہ تھی کہ نومسلموں کی، جو قرآن مجید پڑھنا، سرکاری ملازمت اختیار کرنا یا عرب فاتحین سے مکالمت کرنا چاہتے تھے، لسانی ضروریات پوری کی جائیں۔ مزید برآں، روزمرہ کی زبان جو سریانی، ایرانی اور دوسری زبانوں یا بولیوں کے میل سے بگڑتی جاتی تھی اور قرآن مجید کی معیاری زبان سے اس میں روز افزوں بُعد ہوتا جاتا تھا، اِدھر متوجہ کرنے کا باعث ہوئی۔

غرض، یہ محض اتفاقی امر نہیں تھا کہ عربی صرف نحو کے مفروضہ بانی ابوالاسود دُؤلی (متوفی ۶۸۸ ء) نے شہر بصرہ میں فروغ پایا۔ مشہور سوانح نویس ابن خلکان کی روایت ہے[1] کہ دُؤلی کے واسطے خود حضرت علیؓ نے یہ اصول وضع کیا تھا کہ اجزاے کلام کی تین قسمیں ہیں: اسم، فعل، حرف۔ اور ہدایت کی کہ وہ اسی پر پورے قواعد مرتب کرے۔ چناں چہ اس نے یہ کام خاطر خواہ انجام دے دیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ عربی صرف و نحو کا بہ تدریج اور مدت میں ارتقا ہونا، اور بہت واضح طور پر یونانی منطق سے اثر پذیر ہونا، پایا جاتا ہے۔ الدُؤلی کا جانشین خلیل ابن احمد بھی بصرے کا فاضل تھا جس کی وفات ۷۸۶ء کے قریب ہوئی۔ خلیل نے سب سے پہلی عربی لغت "کتاب العین" تالیف کی۔ تذکرہ نویسوں نے عربی عروض اور اس کے قواعد کی دریافت کا سہرا

---

[1] جلد ۲ صفحہ ۲۲۳۔ نیز دیکھو ابوالفدا، ۱، صفحہ ۲۱۵۔

بھی خلیل کے سر باندھا ہی جو آج کے دن تک مسلّم چلے آتے ہیں۔ ایرانی سیبویہ (متوفی تخ ۷۹۳ء) اسی کا شاگرد تھا جس نے سب سے پہلی باقاعدہ عربی صرف نحو لکھی۔ یہ "ال کتاب" کے شان دار نام سے موسوم ہی اور اس مضمون پر عربوں نے آیندہ جو کچھ لکھا پڑھا وہ اسی کتاب کی بنیاد پر ہی ؛

احادیث اور قانون شریعت

قرآن شریف کی تعلیم اور تفسیری ضرورتوں نے جہاں لسانیات اور لُغت کے ہم اصل علوم کا آغاز کرایا، وہیں علم حدیث کی بھی بنا ڈالی جو مسلمانوں کے خاص اسلامی رنگ کا علمی کارنامہ ہی۔ حدیث کے لفظی معنی روایت یا سرگزشت کے ہیں۔ اصطلاحاً یہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) یا آپ کے صحابہؓ کے قول یا فعل کو کہتے ہیں[۲]۔ قرآن اور حدیث ہی مذہب کی وہ اساس ہی جس کے ایک پہلو کو علم الٰہیات اور دوسرے کو فقہ (= قانون) کہتے ہیں۔ زمانۂ حال کے قانون داں، قوانین کا تعلق زیادہ تر (عقلی) اصول سے سمجھتے ہیں۔ مسلمانوں میں ان کا مذہب سے رابطہ قوی تر ہی۔ بنی اُمیّہ کے عہد میں جو قوانین بنائے گئے، ان پر تالمود یا دوسرے واسطوں سے رومی قانون کا ضرور اثر پڑا مگر یہ پوری طرح تحقیق نہیں ہوئی کہ کس حد تک ؟ حقیقت یہ ہی کہ اس دور کی بہت کم کتابیں ہم تک پہنچی ہیں اور اس کے چند ہی محدث اور فقہا کا

---

[۱] دیکھو آیندہ باب بست و ہفتم ؛

[۲] (صحابہ رضہ کے قول و فعل کو ان اصطلاحی معنی میں حدیث نہیں کہتے۔ مترجم)

محدثین کے نزدیک قول و فعل صحابہ کو بھی حدیث کہتے ہیں۔

ہیں علم ہوا ہے۔ ان میں دو یعنی حسن البصری اور ابن شہاب الزہری (وفات ۷۴۲ء) زیادہ مشہور ہیں۔ امام زہری کا نسب پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے قبیلے تک پہنچتا ہے۔ وہ مطالعے میں اس قدر منہمک رہتے تھے کہ دنیوی امور کی طرف کچھ توجہ نہ تھی۔ چناں چہ ایک مرتبہ ان کی بیوی نے کہا تھا کہ واللہ تمھاری یہ کتابیں مجھے تین سوکنوں سے زیادہ ناگوار ہوگئی ہیں[۱]۔ حسن بصریؒ روایت حدیث میں نہایت بلند مرتبہ مانے جاتے تھے کیوں کہ باور کرتے ہیں کہ انھیں جنگ بدر کے شریک ہونے والے ستر صحابہ رضؓ سے ذاتی شناسائی تھی۔ ملت اسلام کی اکثر مذہبی تحریکات کا سلسلہ امام حسن بصری تک پہنچ جاتا ہے۔ ہر نسل و قرن کے صوفی اُن کے زُہد و تقویٰ کے اثرات محسوس کرتے ہیں۔ راسخ العقیدہ سنی[۲] اُن کے عارفانہ اقوال کو نقل کرنے سے کبھی نہیں تھکتے اور معتزلی تک اُن کو اپنے گروہ میں شمار کرتے ہیں۔ اسی ہر دل عزیزی کی وجہ سے، کچھ تعجب کا محل نہیں کہ جب ان کا انتقال ہوا اور (۱۰ اکتوبر ۷۲۸ء) جُمعے کے روز جنازہ لے کر چلے تو شہر بصرہ کی ساری آبادی نکل آئی کہ کہ قبرستان تک اس کی مشائعت کرے اور جامع مسجد میں جمعہ پڑھانے
243 اور نماز پڑھنے کے لئے کوئی باقی نہ رہا۔ مورخ کے الفاظ میں یہ ایسا واقعہ تھا جس کی تاریخ اسلام میں مثال نہیں ملتی"[۳]

۱ھ ابن خلکان – ۲ ص ۲۲۳ – ابوالفدا ۱، ص ۲۱۵ ؞

۲ھ اس لفظ کی تشریح آئندہ باب بست و ہفتم کے ایک ذیلی حاشیے میں کی گئی ہے ؞

۳ھ ابن خلکان ۱، ص ۲۲۸ ؞

اسلامی علوم اور زبان عربی کی ترقی میں بصرے والوں کے برابر نہیں تو بھی تقریباً اسی قدر اور ویسا ہی شاندار کام کوفے کے لوگوں نے انجام دیا۔ یہ ایسے پختہ مذہبی اور مستقل مزاج نہ تھے۔ اور ان میں سے اکثر شیعیان علی رض کے گروہ میں شامل ہو گئے تھے۔ اہل بصرہ سے ان کی چشمک کی بدولت، عربی ادب اور صرف نحو میں بھی اہل علم کے دو مستقل الثبوت مکتب تیار ہوئے جو ایک دوسرے سے علمی اختلاف رکھتے تھے۔ ان مشہور صحابیوں رض میں سے جنھیں علم حدیث میں مستند مانا جاتا ہے، چند حضرات نے حضرت عمر رض اور حضرت عثمان رض کے عہد خلافت میں کوفے کی سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان میں سُرخ بال اور پتلی ٹانگوں والے عبداللہ رض ابن مسعود (وفات تخ ۶۵۳ ع) بہت ممتاز ہیں کہ ان سے آٹھ سو اڑتالیس حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔[1]
ان صحابی رض کی خصوصیت یہ تھی کہ جب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے باب میں کوئی بات کہتے تو سر سے پاؤں تک کانپنے لگتے اور ان کی پیشانی سے پسینہ جاری ہو جاتا تھا۔ پھر وہ احتیاط سے سوچ سوچ کے ایک ایک لفظ ادا کرتے کہ کہیں کوئی بات غیر صحیح منہ سے نہ نکل جائے۔[2]
کوفے کے محدثین میں ایک اور نامی بزرگ عامر ابن شراحیل الشعبی (وفات تخ ۷۲۸ ع) گزرے ہیں کہ جنوبی عرب کے ان لوگوں میں تھے جنھوں نے اسلام کے قرن اول میں مرتبہ امتیاز حاصل کیا۔ امام شعبی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کوئی ایک سو پچاس صحابہ رض سے حدیث سنی اور

---

[1] النووی: "تہذیب الاسماء" (گوٹن جن ۱۸۴۲-۴۷ ع) صفحہ ۳۷۰۔
[2] ابن سعد ۳ صفحہ ۱۱۱۔

ایک سطر لکھے بغیر، جمہ احادیث (درواۃ) کو حافظے کی قوت سے دہرا دیتے تھے[1] اس کے باوجود عہد حاضر کے نقاد بھی ان کی ثقاہت کے متعلق عام طور سے اچھی رائے قائم کرتے ہیں۔ انہی امام شعبی کے شاگردوں میں امام اعظم ابوحنیفہ سب سے زیادہ نامور ہوئے ہیں۔ امام شعبی کی اپنی نسبت یہ روایت بھی منقول ہے کہ انھیں خلیفہ عبدالملک نے ایک اہم سفارت پر قسطنطنیہ کے بائی زنطی قیصر کے پاس بھیجا تھا۔

عراق کے ان ہم زاد شہروں کو علمی مساعی اور کارناموں میں انتہائی عروج خلافت عباسیہ کے زمانے میں حاصل ہوا جیسا کہ ہم آیندہ اوراق میں مطالعہ کریں گے۔ اس بعد کے ارتقا میں حدیث و فقہ کے یہ عراقی مذاہب قدامت پسندی کے اس قدر پابند نہیں رہے جس قدر کہ حجاز کے علما پابند تھے۔

تاریخ نویسی

عربی تاریخ نویسی کا آغاز اسی (اموی خلافت کے) زمانے میں ہوا۔ اسے بھی شروع میں حدیث کے طور پر روایت کرتے تھے۔ لہٰذا یہ قدیم ترین علمی ضابطہ تھا جسے عرب مسلمانوں نے سیکھا اور ترقی دی۔ ابتدائی خلفا کی خواہش تھی کہ اپنے زمانے سے پہلے شاہ و شہریار کے طور طریق سے آگہی حاصل کریں۔ اہل اسلام مشتاق تھے کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ 44 والسلام) اور صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے واقعات زندگی جمع کریں۔ یہی قصے آیندہ کتب سیر اور مغازی کی بنیاد بنے۔ تاریخ نویسی کا ایک اور محرک یہ ضرورت ہوئی کہ بیت المال سے ہر مسلمان عرب کو وظیفہ ملتا تھا۔

---

[1] سمعانی: "الانساب" (لائیڈن ۱۹۱۲ء) ورق ۳۳۴۔ نیز دیکھو ابن خلکان۔ ۱ ص ۴۳۶۔

اس کے تعیّن کے لئے خاندانی شجرے اور رشتوں کی تحقیقات کی جاتی تھی
عربی شاعری میں بعض اشعار کی تشریح اور مذہبی کتابوں میں اشخاص
اور مقامات کے جو نام آتے ہیں اُن کی تصریح کرنی ہوتی تھی۔ پھر، عربوں
کی نخوت اور ادّعاے فضیلت کے توڑ پر محکوم قوموں کو فکر ہوگیا تھا کہ
اپنے اسلاف کے سابقہ اوصاف اور کمالات کو (عربی میں) لکھیں۔
غرض یہ سب وجوہ تاریخ نویسی کی ممد ہوئیں اور تفتیش و تفحص کا نیا
باب کھُل گیا۔ سب سے پہلے مشہور قصّہ خوانوں میں جنوبی عرب کے
عبید یا عُبید ابن شریہ کا نام آتا ہی اگرچہ وہ خود ایک نیم افسانوی سا
آدمی تھا۔ کہتے ہیں وہ امیر معاویہ کی دعوت پر دمشق آیا تھا کہ خلیفہ کو
عرب کے قدیم بادشاہوں اور ان کی نسلوں کے متعلق معلومات بہم پہنچائے[1]
اس نے اپنے خاص فن میں اپنے سرپرست فرمانروا کے واسطے کئی
کتابیں تحریر کیں جن میں سے "کتاب الملوک و اخبار الماضیین" مورّخ
مسعودی (متوفی ۹۵۶ء) کے زمانے تک متداول تھی[2]۔ ایک اور قدیم
مصنّف جو "علم الاوائل" (یعنی اصل بنسل) کے ماہرین میں تھا، وہب
ابن مُنبّہ گزرا ہی۔ یہ ایک ایرانی نژاد یہودی تھا جو غالبًا اسلام لے آیا
اور صنعا میں تخمینًا ۷۲۸ء میں وفات پائی۔ حال میں اس کی ایک
کتاب شائع کی گئی ہی[3]۔ وہب کی ثقاہت بہت مشکوک ہی۔ لیکن قبل
از اسلام جنوبی عرب اور ممالکِ خارجہ کی غلط یا صحیح تاریخ کا بڑا راوی

---

[1] (ابن) الندیم: "ال فہرست" (لائپ زگ، ۱۸۷۲ء) ص ۸۹ نیز دیکھو ابن خلکان ج ۲ ص ۳۲۵

[2] دیکھو جلد چہارم ص ۸۹۔

[3] "ال تیجان فی ملوک حمیر" (حیدرآباد ۱۳۴۷ھ) جس میں عبید ہی کے قلم کا ضمیمہ "اخبار عبید" شامل ہی

اُن دنوں وہیں ہوگیا تھا[1]۔ ایک اور مصنف کعب الاحبار ہیں کہ ۶۵۲ یا ۶۵۴ء میں بہ مقام حمص فوت ہوے۔ یہ بھی یمن کے یہودی تھے جو خلیفہ اوّل یا ثانی کے عہد میں اسلام لاے اور معاویہ کے ہاں جب کہ وہ صرف شام کے والی تھے، ایک استاد اور مشیر کے طور پر کام کرتے رہے[2] (احبار، حبر کی جمع بمعنی یہودی عالم) یہی کعب، "اسلامی اسرائیلیات" کا سب سے قدیم ماخذ ہو گئے۔ اُن کے اور ابن منبہ وغیرہ دوسرے یہودی نومسلموں کے واسطے سے تالمود کے متعدد قصے اسلامی روایات میں داخل ہوے اور عربوں کے تاریخی ادب کا جز بن گئے۔

اموی دور میں ہم بہت سی اُن مذہبی اور فلسفی تحریکات کی تخم ریزی کا بھی سراغ چلا سکتے ہیں جنھوں نے آگے بڑھ کر ملت اسلامی کی جڑیں تک ہلا دی تھیں۔ آٹھویں صدی عیسوی کے نصف اول میں بصرے میں ایک شخص واصل ابن عطا نے نشو و نما پائی (وفات ۷۴۸ء) جو عقلیت کے مشہور و معروف مذہب معتزلہ کا بانی گزرا ہے۔ معتزلہ کے معنی دست بردار یا الگ ہوجانے والے کے ہیں۔ اس نام کی وجہ یہ کہ ان کا خاص عقیدہ تھا کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا، کافر نہیں ہوتا بلکہ اسلام سے الگ ہوجاتا ہے یعنی اس کا مقام کفر و ایمان کے بین بین ہوتا ہے۔[3] واصل، امام حسن البصری کے شاگردوں میں تھا۔ حسن بصری ایک زمانے

---

[1] ابن خلکان، ۳، ص ۱۰۱۔ طبری، ۳، ص ۲۴۹۳۔ نودی، ص ۶۱۹۔

[2] نودی، ص ۵۲۳۔ ابن سعد، ۷، ص ۱۵۶۔ ابن قتیبہ: "معارف" ص ۲۰۹۔

[3] مسعودی، ۶، ص ۲۲۔ ۷، ص ۲۳۴۔ نیز دیکھو شہرستانی، ص ۳۳۔ البغدادی: "اصول الدین" (استنبول ۱۹۲۸ء) ۱، ص ۳۳۵ اور اسی مصنف کی "مختصر الفرق بین الفرق" (قاہرہ ۱۹۲۴ء)۔ النوبختی: "فرق الشیعہ" ص ۵۔

میں قدری عقیدہ رکھتے تھے۔ معتزلہ مذہب میں دوسرا بنیادی عقیدہ یہی قدریت (یعنی آدمی کا صاحب اختیار ہونا) قرار پائی بعض اور لوگ بھی ایک زمانے میں اس عقیدے کے قائل اور جبریہ کے مقابل میں قدریہ کہلاتے تھے[1] قرآن مجید نے خدا کے قادر مطلق ہونے پر بڑا زور دیا ہے[2] اسی سے مسلمانوں میں عقیدۂ تقدیر میں بڑا تشدد آگیا تھا جو مسیحی اور یونانی اثرات کی غمازی کرتا ہے۔ قدریت اس تشدد کے خلاف ردعمل کے طور پر وجود میں آئی۔ دوسرے یہی وہ مذہب ہے جو مسلمانوں میں سب سے پہلا فلسفے کا مکتب بنا۔ اور اس کے خیالات کہاں کہاں تک پھیل گئے تھے، یہ اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اموی خلفا میں سے دو، یعنی معاویہ ثانی اور یزید ثالث، قدری تھے[3]۔

ارادے میں انسانی اختیار کے بنیادی عقیدے کے ساتھ معتزلہ نے ایک اور عقیدہ اضافہ کیا کہ صفات الٰہی، جیسے قدرت، حکمت اور حیات کا وجود وہ ذات الٰہی کا لازمہ نہیں مانتے تھے کہ اس سے اُن کے خیال میں توحید ذات میں فرق آتا تھا۔ اسی بنا پر انھوں نے اپنے فرقے کا نام "اہل العدل والتوحید" قرار دیا تھا۔ یہ مذہب آگے چل کر بنو عباس خصوصاً مامون (۸۱۳ — ۸۳۳ء) کے عہد میں بڑی قوت پکڑ گیا تھا جیسا کہ آئندہ اوراق میں ہم پڑھیں گے۔ دراصل علمی اعتبار سے بغداد کا آغاز ہی وہاں سے ہوتا ہے جہاں بصرہ اور کوفہ کا کام ختم ہوا۔

---

[1] ال ایجی۔ "کتاب المواقف" (لائپ زگ ۱۸۴۸ء) ص ۳۳۴۔

[2] آل عمران: ۲۶۔ الحجر: ۲۱۔ الانبیا: ۲۲ وغیرہ... نیز دیکھیے ابن حزم ۳۔ ص ۳۱۔

[3] ابن العبری، ص ۱۹۱۔ یعقوبی۔ ۲۔ ص ۴۰۳۔

یوحنا دمشقی

عیسائیوں کے علوم اور یونانی افکار، جو اس زمانے کے مسلمانوں میں متعارف ہوئے، ان کے بڑے اسباب اور وسائط میں ایک یوحنا دمشقی (= جوہانیس دمے سنیس) تھا جس کا لقب "کری سوروہاس" (یعنی "زریں زباں") پڑ گیا ہے تاکہ اپنے انطاکیہ کے ہم نام سے، جس کا لقب "کری سوستوم" تھا، ممیز کیا جا سکے۔ اگرچہ وہ یونانی میں تصنیف تالیف کرتا تھا لیکن حقیقت میں یونانی نہیں، بلکہ شامی نژاد تھا اور اپنے گھر میں 246
آرامی زبان بولتا تھا۔ ان دو کے علاوہ اسے عربی زبان آتی تھی۔ وہ اس منصور ابن سرجون کا پوتا ہے جو شام کی اسلامی فتوحات کے وقت دمشق کا ناظم مالیات تھا اور شہر کو حوالہ کر دینے میں دمشق کے بڑے پادری کی سازش سے اغماض کرتا رہا تھا۔ چناں چہ مسلمانوں کے زمانے میں اپنے عہدے پر بحال رہا پھر اس کے بیٹے (یعنی یوحنا کے باپ) کو وہی ملازمت مل گئی۔ جوانی میں یوحنا، امیر معاویہ کے فرزند یزید کا ہم پیالہ و ہم نوالہ تھا اور آگے چل کر اپنے باپ کی جگہ اسی عہدے پر جو عربی حکومت میں نہایت اہم مانا جاتا تھا، مقرر ہوا۔ وہ یہ خدمت ہشام کے زمانے (۷۲۴ — ۷۴۳ء) تک انجام دیتا رہا پھر ترکِ دنیا کر کے یروشلم کے قریب سینٹ سابا کی خانقاہ میں عزلت نشینی اور گیان دھیان کی زندگی اختیار کر لی۔ یہیں ۷۴۸ء کے قریب اس کا انتقال ہوا۔ اس یوحنا ولی کی تصانیف میں حضرت مسیحؑ کی الوہیت اور انسانی اختیار پر ایک "سارا سین" کے ساتھ مکالمہ بھی شامل ہے۔ یہ مسیحیت کی وکالت کے طور پر لکھا گیا

اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں سے مناظرہ کرنے میں نصاریٰ کی رہ نمائی کا کام دے۔ خود یوحنّا کو غالباً خلیفہ کی موجودگی میں اکثر ایسے مباحثے کرنے پڑے ہوں گے۔ مذہب قدریہ کی تشکیل میں اس کے اثرات کو تلاش کرنا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اسی سے برلام سنیاسی اور ہندو راج کمار جوزافت کی حکایت منسوب کرتے ہیں جو (یورپ کے) ازمنہ وسطیٰ میں شاید سب سے مشہور افسانہ تھی۔ عہد حاضرہ کے نقاد اس افسانے میں گوتم بدھ کی زندگی کے ایک واقعے کی عیسوی تعبیر دیکھتے ہیں۔ یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے مگر جوزافت یا "یوا سف" کے نام سے حقیقت میں بدھا ہی کو لاطینی اور یونانی کلیسا دونوں نے تقدس کا جامہ پہنایا تھا۔ اس طرح وہ دومرتبہ مسیحی ولی بنایا گیا۔ مگر اس قصے کا لکھنے والا ہمارا یوحنا دمشقی نہ تھا بلکہ یقیناً اس کا کوئی غیر معروف ہم نام، جو چھٹی صدی عیسوی میں اسی سینٹ سابا کی خانقاہ میں رہتا تھا۔ فہرستؔ[۵۱] میں ایک "کتاب البُدّ" (یعنی بدھا کی کتاب) اور ایک "کتاب بوداسف" کے نام مذکور ہیں۔ یہ دونوں صریحاً پہلوی اصل سے عربی میں ترجمہ ہوئی تھیں۔ یونانی قصے سے ان کا کچھ تعلق نہ تھا۔ بہر حال، مشرقی کلیسائے یونان کا سب سے معظم اور آخری عالم دین یوحنا دمشقی سمجھا جاتا ہے۔ دینی ادبیات میں اس کی منظوم مناجاتیں (کہ بعض ابھی تک پروٹسٹنٹ فرقے کے مجموعوں میں استعمال ہوتی ہیں) حسن بیان کی وہ معراج ہیں جن تک مسیحی مذہبی شاعر پہنچ سکے۔ اس مناجات نویسی کے علاوہ، علم دین، خطابت، مناظرہ، اور بائی زنطی فنون لطیفہ کی تدوین کے لحاظ سے بھی یوحنا دمشقی کلیسا کا زیدہ ہے۔

---

[۵۱] ص ۳۰۵۔

کہ عہد خلافت میں درخشاں ہوا۔

خوارج

ملت اسلامی کا سب سے قدیم فلسفی مذہب قدریہ تھا لیکن دینی
سیاسیات کا سب سے پہلا فرقہ خوارج بنا جو شروع میں حضرت علیؓ کے 247
حامی و مددگار تھے اور پھر اُن کے سخت دشمن ہو گئے ۔ قریش کا یہ امتیاز
کہ خلیفہ انہی کے قبیلے سے ہونا چاہیئے، انھیں قبول نہ تھا اور اس کے
خلاف بار بار انھوں نے تلوار سے احتجاج کیا[1] یہ دین میں پکے لوگ تھے
کہ اسلام کے ابتدائی جمہوری اصول کو قائم رکھنے کی خاطر کٹ مرے اور
تین اسلامی صدیوں تک خون کی ندیاں بہاتے رہے ۔ کچھ مدت گزرنے پر
اُنھوں نے (گزشتہ) اولیا کی تعظیم تکریم جو مقامی زیارات کو لازم کرتی تھی،
ناجائز قرار دی اور صوفیا کی حلقہ بندیوں کو بالکل ممنوع کر دیا۔ آج کل
یہ لوگ خارجیوں کی ایک شاخ اِباذیہ (اکثر لوگ الف کو مفتوح بولتے
ہیں) کے نام سے باقی ہیں جو ابنِ اباذ[2] سے منسوب ہے ۔ ابن اباذ پہلی صدی
ہجری کے آخری نصف میں گزرا ہے اور خوارج کے جتنے ذیلی فرقے بنے،
اُن کے بانیوں میں سب سے معتدل تھا ۔ یہ فرقہ اباذیہ بھی متفرق طور پر
الجزائر، طرابلس اور عُمان میں آباد ہے اور بعد میں آخری علاقے سے اس کے
پیرو سمندر پار کر کے زنجبار میں بھی آ گئے ہیں۔

مُرجیہ

ایک اور فرقہ جو کم تر شہرت رکھتا ہے اور بنی اُمیہ کے عہد میں پیدا

---

[1] ابن الجوزی: "نقد العلم والعلماء" (قاہرہ ۱۳۴۰ھ) ص۱۰۲۔

[2] شہرستانی، ص۱۰۰۔ بغدادی ص۷۲۔ ایجی ص۳۵۶۔

ہوا "مُرجیہ" کہلایا۔ ان کا بنیادی عقیدہ اِرجا تھا[۱] یعنی گناہ کرنے والے مسلمانوں کی نسبت کفر کا فتویٰ دینے میں توقف کرنا۔ خصوصی نظیر کے طور پر خلفائے بنی اُمیّہ نے قانون شریعت کو اگر معطّل کر دیا، تو بھی یہ فرقہ اسے جائز نہ سمجھتا تھا کہ ان بادشاہوں کی اطاعت سے انحراف کیا جائے جب کہ عملاً وہ مسلمانوں کے سیاسی سردار تھے۔ مرجیہ عقائد کے لحاظ سے بنی اُمیّہ کا رسماً ہی مسلمان ہونا ان کی اطاعت بجالانے کے کافی تھا۔ اسی طرح ان کے نزدیک عثمانؓ، علیؓ اور معاویہ سب خدا کے خادم تھے اور ان میں محاکمہ کرنا صرف خدائے تعالیٰ کا کام تھا۔ مجموعی طور پر مرجیہ عقائد سے رواداری کی تبلیغ ہوتی تھی۔ اس مذہب کے معتدل گروہ کے سب سے نامی گرامی نمائندہ امام اعظم ابوحنیفہ (وفات ۷۶۷ء) گزرے ہیں اور وہ فقہ اسلامی کے چار مسلّمہ مذاہب میں سب سے پہلے مذہب کے بانی تھے ؛

فرقہ شیعہ

ملت اسلامی کی پہلی تفریق خلافت کے قضئے سے پیدا ہوئی کہ مسلمان دو مخالف گروہوں میں بٹ گئے۔ اس تفریق نے اموی دور میں ایک مستقل صورت اختیار کر لی۔ (راسخ العقیدہ مسلمان یعنی) سنّی، اور شیعہ کے مابین امامت کا مسئلہ وجہ تفریق بنا اور اب تک چلا آتا ہے۔ شیعہ کا اساسی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت علیؓ اور اُن کے فرزند امام برحق ہیں۔ جس طرح رومن کیتھولک فرقے کے لوگ پیٹر (ولی) اور اُن کے جانشینوں کے باب میں اپنے عقیدے پر جمے ہوئے ہیں کچھ اسی طرح شیعہ بھی مذکورۂ بالا

---

[۱] دیکھو بغدادی، ص ۱۲۲۔ ابن حزم، ۲، ص ۸۹

عقیدے پر قائم ہیں اور یہی اب تک ان کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے۔ بانیٔ اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) نے خدا اور بندے کے درمیان صرف وحیٔ الٰہی، یعنی قرآن مجید کو واسطہ بنایا تھا۔ شیعوں نے ایک انسان، یعنی اِمام کو واسطہ بنا دیا[۵۱]۔ اسلامی عقیدہ تھا کہ :

248

"میں خدائے واحد پر ایمان لاتا ہوں اور قرآن پر جو خدا کی طرف سے نازل ہوا اور ازلی غیر مخلوق (کلام الٰہی) ہے، ایمان لاتا ہوں"

اِن کلموں میں شیعہ فرقے نے اب یہ اضافہ کیا کہ :

"میں امام پر ایمان لاتا ہوں جسے خدا نے خاص طور پر، ذات الٰہی کے ایک جز کا حامل منتخب کیا کہ وہی نجات کا راستہ دکھانے والا ہے"[۵۲]

امامت کا عقیدہ دنیاوی قوت کے نظریے کی مذہبی مخالفت کی طرف سے معرض وجود میں آیا۔ امامیہ نظریے کی رو سے، جسے سنّی تسلیم نہیں کرتے[۵۳]، امام خدا کی طرف سے اس منصب جلیل پر مامور ہوتا ہے اور مّلت اسلامی کا جائز سردار وہی ہے۔ وہ حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کی نسل میں، اور اس طرح پیغمبر (علیہ الصّلوٰۃ والسّلام) کی اولاد سے ہوتا ہے۔ وہ نصرت

---

۵۱ اِمام ایک عربی مادّے سے مشتق ہے جس کے معنی رہنمائی کرنا ہیں۔ قرآن مجید (سورۂ بقرہ، الحجر، الفرقان، یٰس) میں یہ لفظ غیر اصطلاحی طور پر آیا ہے اور معمولاً نماز جماعت پڑھانے والے پر بولا جاتا ہے۔ ابتدا میں یہ فرض رسول اللہ (صلعم) اور آپ کے خلفا یا اُن کے نائب انجام دیتے تھے۔ ابن خلدون، "مقدمہ" صفحہ ۱۵۹۔

۵۲ یہ بات بلا حوالہ لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے صرف اسماعیلی فرقے کا یہ عقیدہ ہو۔ مترجم)

۵۳ اس نظریے کے لیے دیکھو آگے صفحہ ۲۹۶۔

روحانی اور دینی بلکہ دنیاوی پیشوا بھی ہے اور اسے اپنے پیش روسے ایک پُر اسرار طاقت متوارث ہوجاتی ہے[1] ان وجوہ سے وہ جملہ بنی نوع انسان سے کہیں افضل اور "عصمت" (یعنی بے گناہ ہونے) کی صفت سے متصف ہوتا ہے[2] انتہا پسند شیعہ یہاں تک بڑھے کہ امام کو اس کی ربانی صفات اور نورانی وجود کے باعث خود باری تعالےٰ کا اوتار سمجھنے لگے[3] ان کی دانست میں حضرت علیؓ اور ان کی اولاد میں جو امام ہوئے وہ انسانی صورت میں مسلسل منزل من اللہ کلام (= قرآن ناطق) ہیں۔ ایک بعد کے شیعہ فرقے کا تو قول یہ تھا کہ حضرت جبرئیلؑ نے سہواً پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کو علیؓ سمجھ لیا ورنہ دراصل وحی حضرت علیؓ پر لانی مقصود تھی[4]۔ غرض ان سب امور میں شیعہ، سنی عقیدے کے خلاف عقیدہ رکھتے ہیں ؛

شیعیت کی ابتدا اور نشوونما کس حد تک ایرانی خیالات کی مرہون منت ہے اور کس حد تک یہود و نصاریٰ کے افکار کی ۔ اس کی تحقیق کرنا مشکل ہے۔ مہدیٔ موعود کا مفروضہ جس نے آگے چل کر امام منتظر کی شکل اختیار کی جو دنیا کے نجات دلانے والے رہنما ہوں گے اور آزادی و خوش حالی کا ایک نیا دَور لائیں گے، بے شبہ ظہور مسیحؑ اور اسی کے متعلقہ تخیلات کا پرتو تھا۔ یہی بات ہے کہ غالی شیعیت کا بانی مبانی عبداللہ ابن سبا ہوگیا جو یمنی یہودی تھا[5]۔ 249

---

[1] شہرستانی، ص۱۰۱۔ مسعودی، ۱ ص۹ ؛

[2] سنیوں میں صرف انبیاء (علیہم السلام) اور خصوصاً پیغمبر آخر الزماں (صلعم) خطا اور گناہ سے منزہ مانے جاتے ہیں۔ وہ بھی مختلف دارج میں۔ دیکھو ابن حزم ۔۴ ص۲۳۳۔ ایجی وغیرہ ؛

[3] دیکھو اس کتاب کا تیسواں باب ؛

[4] بغدادی، ص۱۵۷۔ ابن الجوزی: "نقد ..." ص۱۰۳ ؛

[5] ایجی ص۳۴۳ ؛

وہ حضرت عثمان رضؓ کے عہد خلافت میں اسلام لایا اور عجیب طرح کا بڑا پیچ آدمی تھا۔ اس کی حد سے زیادہ عقیدت مندی سے حضرت علیؓ گھبرا جاتے تھے ؛ امامت کے تصور کی تیاری میں لاادری فرقے کا بھی یقیناً حصہ تھا۔ اسلامی ممالک میں سب سے بڑھ کر عراق کی سرزمین شیعیت کی بارآوری میں سازگار ثابت ہوئی۔ اور عہد حاضر میں ملک ایران اپنی نشر اتنی لاکھ آبادی کے ساتھ اس مذہب کا مورچہ ہے[1] خود شیعوں میں چھوٹے بڑے بے حساب فرقے اور شاخیں پیدا ہوگئی ہیں۔ اہل البیت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں، جن سے وہ اولاد علیؓ مراد لیتے ہیں، مختلف افراد مختلف جماعتوں کا مرکز اطاعت بن گئے۔ اور ان جماعتوں میں طرح طرح کے لوگ داخل ہوگئے، جنھیں سواد اعظم (یعنی سُنیوں سے) کوئی مذہبی، سیاسی، عمرانی یا معاشی اختلاف یا انحراف تھا۔ ملاحدہ کے متعدد گروہ جو پہلی صدی ہجری میں نمودار ہوئے اور دراصل عرب کے دینِ غالب کے خلاف چھپی ڈھکی مخالفت کی وجہ سے پیدا ہوگئے تھے، یہ سب بھی تدریجاً شیعیت کے دائرے میں کھنچ آئے ہیں کیوں کہ شیعیت، مسلّمہ نظام اسلامی کی "حزبِ مخالف" ہے۔ اسماعیلیہ، قرامطہ، دروز، نصیریہ اور اسی طرح کے فرقے جن سے ہم آگے چل کر بحث کریں گے، سب کے سب شیعیت ہی کی شاخیں بن گئی ہیں ؛

---

[1] آج کل شیعہ افراد کی کل تعداد کوئی ڈیڑھ کروڑ، یعنی مسلمانوں کی سات فی صدی ہے۔ ان میں سے بیس لاکھ برطانوی ہند میں، پندرہ لاکھ عراق میں اور دس لاکھ یمن میں ہیں، جو زیدی کہلاتے ہیں شام ولبنان میں وہ متاولہ موسوم اور ایک لاکھ تیس ہزار ہیں۔ اگر شیعوں میں اسماعیلی، دروزی، نصیری، یزیدی، اور علی الٰہیہ کے غالی فرقوں کو ملا لیا جائے تو کل تعداد دو کروڑ بیس لاکھ اور اسلامی آبادی کی آٹھ فی صدی کے قریب پہنچ جاتی ہے ؛

خطابت

بنی اُمیّہ کے دَور میں عام تقریر کرنے کی مختلف پیرایوں میں ایسی ترقی ہوئی کہ پہلے کبھی نہ ہوئی تھی اور نہ آیندہ اس عہد کی خطابت سے کوئی بازی لے جاسکا۔ خطیب اس سے نماز جمعہ کے خطبات میں مذہبی تلقین کا کام لیتے تھے۔ سپہ سالار اپنی فوجوں میں اسی ذریعے سے جنگی جوش بھرتے تھے اور صوبوں کے والی رعایا میں وطن پرستی کے جذبات برانگیختہ کرنے میں یہی وارو پلایا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جب کہ تبلیغ و اشاعت کی خاص آسانیاں میتسر نہ تھیں، خیالات کے پھیلانے اور لوگوں کو اُبھارنے میں خطابت بہترین وسیلہ تھی۔ حضرت علیؓ کے خطباتِ پند و موعظت کہ قافیہ بندی اور حکیمانہ اقوال سے مزیّن ہیں، زاہد مرتاض حضرت حسن بصری (متوفی ۱۱۰ھ / ۷۲۸ء) کے مختصر وعظ جو خلیفہ عُمر ابن عبدالعزیز کے مواجہ میں کیے گئے اور خلیفہ کے سوانح نویس نے ان کو قلم بند کرلیا[51]، پھر زیاد ابن ابیہ اور آتش مزاج حجّاج کی جنگی اور حبّ قومی کی تقریریں، یہ سب نہایت بیش بہا ادبی خزانے ہیں جو اس ابتدائی زمانے سے ہم کو ورثے میں پہنچے ہیں[52]۔

اِنشا

250 خلفائے راشدین کے زمانے میں سرکاری مراسلت اتنی مختصر اور مطلب کے مطابق ہوتی تھی کہ کوئی تحریر مشکل سے ایسی ملتی ہے جو چند سطر

---

۵۱ ابن الجوزی، "سیرہ عمر ابن عبدالعزیز" ص ۱۲۱۔

۵۲ مطالعہ کرو ابن قتیبہ کی "عیون الاخبار" ۲ ص ۲۳۱ و مابعد۔ جاحظ: "بیان"

سے زیادہ طولانی ہوئے[1]۔ ابن خلکان کا بیان ہو کہ مرصّع مسجّع لمبی لمبی عبارتیں جن میں تکلف و تواضع کے رسمی فقرے آتے اور ایرانی اثرات کی چغلی کھاتے ہیں، اس طرز تحریر کا آغاز آخری اموی خلفا کے دبیر عبدالحمید الکاتب (بہ معنی منشی ۔متوفّی ۷۵۰ء) نے کیا تھا[2] پھر منشیوں کی نسل در نسل کے لیے یہی پُر تصنع طرزِ انشا نمونہ بن گیا ۔ ایک عربی قول بہت مقبول و زبان زد تھا کہ انشا پردازی کا فن عبدالحمید سے شروع ہوا اور ابن العمید پر ختم ہوگیا[3]۔ ایرانیوں کے ادبی اثرات کا بہت سے حکیمانہ اقوال اور امثال سے بھی پتہ چلتا ہو جو حضرت علیؓ یا اُن کے رفیق ابن قیس الاحنف بلکہ اکثم ابن سیفی تک سے منسوب کر دئے گئے ہیں ۔ احنف[4] (بہ معنی ٹانگوں بھرا، پنگا) کی وفات ۶۸۶ء کے بعد ہوئی اور اکثم قبل از اسلام شہرت کا آدمی ہو جس کے القاب میں "حکیم اہل العرب" کا لقب بھی شامل تھا[5]۔

شاعری

لیکن ذہنی مشاغل و مساعی میں ترقی کا سب سے نمایاں کرشمہ دیکھنا ہو تو وہ بے شبہ بنی اُمیّہ کے دور میں عربی شاعری کے کارناموں میں نظر آئے گا ۔ فنونِ جمیلہ کی یہ سب سے جمیل ملکہ تھی اور اہل عرب "شاعروں کی قوم" کہلاتے تھے لیکن اسلام کا ظہور شاعری کے حق میں بھی سازگار نہ تھا جیسا کہ اس حقیقت سے ظاہر ہو کہ اتنی عظیم فتوحات اور کشور کشائی

---

[1] نمونوں کے لیے ملاحظہ ہو قلقشندی "صبح" ۶ ص۳۸۸۔

[2] ۱ ص۵۵ نیز دیکھو مسعودی، ۶ ص۸۱۔

[3] ابن العمید، رکن الدولہ (بُویہی) کا ایک وزیر تھا۔ "صبح" ۶ ص۳۸۸۔

[4] جاحظ: "بیان" ۱ ص۵۸۔ نیز دیکھو ابن قتیبہ: "معارف" ص۲۱۶۔ طبری۔ ۲ ص۴۳۸-۱۔

[5] ایضاً ۲ ص۶۳ ۔ ایضاً ص۱۵۳۔

کے شان دار دور میں کوئی بلند پرواز شاعر نمودار نہ ہوا۔ دنیا دار امویوں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ آئی تو شعر و شراب اور موسیقی کی دیویوں سے پُرانے روابط بھی تازہ ہو گئے۔ عشقیہ شاعری کا عربی میں پوری طرح ظہور اسی زمانے کی یادگار ہے۔ قبل از اسلام شعرا اپنے قصیدوں کی تشبیب میں ضرور عشق و سرمستی کے چند شعر لاتے تھے۔ لیکن کسی کی نسبت یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خاص غزل کی عاشقانہ شاعری کرتا تھا۔ قدیم قصائد کی عشقیہ تشبیب (= "نسیب") نے ایرانی مطربوں کے زیر اثر، انہی کے نمونے دیکھ کر عربی غزل گوئی کی صورت اختیار کی ✤

جزیرہ نما میں اس صنف کا خاص نمائندہ عمرؓ ابن ابی ربیعہ (وفات تخم ۷۱۹ء) گزرا ہے[۵۱] یہ رئیس المتغزلین "عرب کا اُووِید" اور ایک خوش حال بدکردار قریشی تھا۔ اس کا کام ہی یہ تھا کہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ
251 میں حج کرنے جو لڑکیاں آتیں اُن سے، اور خود وہاں کی رہنے والی خوب صورت عورتوں سے عشق و محبت کی جائے[۵۲] جنس لطیف سے اپنی شیفتگی کا اظہار اُس نے نہایت جوش و خروش اور حد درجے نفیس الفاظ میں کیا ہے۔ اس کے کلام میں جو تازگی اور مردانہ تہذیب پائی جاتی ہے وہ ایک طرف اِمرا القیس کے بدوی جذبات سے، اور دوسری طرف بعد کے محسوسات سے جو رسوم و قیود کے پابند کر دئے گئے تھے، نمایاں

---

[۵۱] اس کا دیوان پال شوامذ کی تصحیح سے دو جلدوں میں چھپا ہے (لائپزگ۔ ۱۹۰۱ تا ۱۹۰۹ء)

[۵۲] اغانی، ۱، ص ۳۲۔ اس کی سیرت اور تصانیف کے لئے دیکھو جبرئیل جبّور کی کتاب "عمر ابن ابی ربیعہ" دو جلد۔ بیروت ۱۹۳۵ء (اس کی مقامی ممدوحات میں مؤلف نے سیدہ سکینہ کا نام بھی لکھا ہے اور ابن قتیبہ کی کتاب الشعر ص ۳۴۹ کا حوالہ دیا ہے۔ مترجم)

فرق و امتیاز رکھتی ہے۔[1]

اگر ابن ربیعہ شعر میں آزاد محبت کا وکیل ہے، تو اس کا ہم عصر جمیل (متوفی ۷۰۱ء) پاک محبت اور بے لوث عشق کی تعریف کے گیت گاتا ہے۔ وہ بنی عذرہ کا فرد تھا جو پہلے یمن کا ایک عیسائی قبیلہ اور بعد میں وہاں سے آکر حجاز میں متوطن ہوا۔ جمیل کے تمام اشعار میں اپنی محبوبہ بثینہ سے خطاب کیا گیا ہے۔ یہ اُسی کے قبیلے سے تعلق رکھتی تھی[2] اور اس کے کلام میں جو گداز پایا جاتا ہے وہ اس عہد کی شاعری میں اور کہیں نہیں مل سکتا۔ ان اشعار کی سادہ اور غیر مصنوعی زبان اور حُسنِ ادا میں وہ لطف ہے کہ اکثر عرب گویوں نے ان کی خاص خاص دُھنیں اور لحنیں تیار کی ہیں۔ صنف غزل میں جمیل کی طرح ایک اور شاعر انہی دنوں مشہور ہوا۔ یہ نیم افسانوی شخص مجنون لیلا تھا جس کا اصلی نام قیس ابن الملوح بتایا جاتا ہے[3] حکایتوں میں آیا ہے کہ وہ اپنے قبیلے کی ایک عورت لیلا کی محبت میں دیوانگی کے درجے کو پہنچ گیا تھا اور اسی لئے مجنون کے عرفی نام سے موسوم ہوا۔ لیلا بھی اس کے جواب میں محبت کرتی تھی مگر اپنے باپ کی مرضی پر چلنے کی خاطر دوسرے شخص سے شادی کرنے پر مجبور ہوئی۔ اس نامرادی نے قیس کو اور بھی دیوانہ کر دیا اور اس نے اپنی باقی عمر نجد کے کوہ و دشت میں آوارہ و نیم برہنہ پھر کر بسر کی۔ اس

---

[1] دیکھو پال گرےو: "اے سینز...." صفحہ ۲۶۹۔

[2] ابن خلکان۔ ۱ صفحہ ۱۳۵ بحوالہ اغانی۔

[3] الکتبی: "فوات الوفیات" (بلاق، ۱۲۸۳ھ) ۲ صفحہ ۱۴۳ میں اس کی وفات ۸۰ھ (۶۹۹ء) کے قریب بتائی ہے۔

عالم میں وہ اپنی محبوبہ کے حُسن کے گیت گاتا اور اس کو ایک نظر دیکھنے کی دیوانہ وار آرزو کرتا تھا۔ البتہ صرف لیلیٰ کا نام سن کر ہوش میں آجاتا تھا[۱]۔ اس طرح مجنوں لیلا بے شمار عربی، فارسی اور ترکی افسانوں کا خاص موضوع بنا جن میں محبّت کی لازوال قوّت کی مدح وثنا کی گئی ہے۔ کچھ شک نہیں کہ بہت سے اشعار جو جمیل اور مجنوں کے نام پر چسپاں کر دیے گئے، فی الواقع ان کے کہے ہوئے نہ تھے بلکہ اصل میں دوسرے گیتوں اور قطعات میں گائے جاتے تھے۔

غزل گوئی کے علاوہ، بنی اُمیّہ کی سرپرستی میں سیاسی شاعری کا بھی آغاز ہوا۔ اس کا پہلا موقع یہ تھا کہ جب یزید ولی عہد خلافت نامزد ہوا تو مسکین الدارمی سے استدعا کی گئی کہ اس کی یادگار میں نظم لکھے اور مجمع
عام میں گا کر سنائے[۲]۔ اسی زمانے میں ایک اور کوشش یہ ہوئی کہ 252
قبل از اسلام قدیم اشعار کی تدوین کی جائے۔ یہ کوشش حمّاد الراویہ نے کی تھی جس کا زمانہ تقریباً ۷۱۳ تا ۷۷۲ء ہے[۳]۔ حمّاد ایک دیلمی (= ایرانی) اسیر جنگ[۴] کا بیٹا تھا جو کوفے میں پیدا ہوا اور عربی زبان اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں بولتا تھا۔ تاہم وہ اُن لوگوں میں ہے جن کے غیر معمولی حافظے کو عربی تاریخوں نے خاص شہرت بخشی۔ خلیفہ ولید ثانی کے ایک سوال کے جواب میں وہ تیار ہوگیا کہ عربی حروف تہجی کے ایک ایک حرف کے قافئے کی کم سے کم سو سو نظمیں صرف عہد جاہلیہ کی

---

[۱] ابن قتیبہ: "شعر" صفحہ ۳۵۵۔
[۲] " صفحہ ۳۴۷۔ اغانی۔ ۸ صفحہ ۷۱۔
[۳] فہرست، صفحہ ۹۱۔ ابن خلکان، ۱ صفحہ ۲۹۴۔
[۴] ابن قتیبہ: معارف۔ صفحہ ۲۶۸۔

پڑھ کر سنا دے گا۔ ولید نے خود سننے اور دوسروں کو سننے پر مقرر کیا تو کہا جاتا ہے کہ فی الواقع دو ہزار نو سو قصیدے حماد نے زبانی پڑھ کر سنا دیے کہ خلیفہ کو دعوے کی صحت خاطر نشیں ہوگئی اور اس نے سنانے والے کو ایک لاکھ درہم دینے کا حکم دیا[1]۔ بے شبہ حماد کی ایک بڑی تعریف یہ تھی کہ وہ مشہور "قصائد زریں" جنھیں معلقات کہتے ہیں، اس نے جمع کیے ؛

بنی اُمیہ کے دور میں ولایات کے شعرا کے سرگروہ ال فرزدق اور جریر تھے اور پایۂ تخت میں یہ مرتبہ ال اخطل کو حاصل تھا۔ (پہلے کا زمانہ ۶۴۰ تا ۷۳۲ء اور تیسرے کا زمانہ ۶۴۰ تا ۷۱۰ء تخمین کرتے ہیں۔ جریر کی وفات غالباً ۷۲۹ء میں ہوئی) مگر یہ تینوں ملک عراق میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ یہ شاعر قصیدہ گو مداح بھی تھے اور ہجو نویس بھی۔ شعر گوئی میں تینوں، درجہ اوّل کے اُن عربی شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کی (نقادوں کو) متاخرین میں کوئی نظیر نہیں ملی۔ ال اخطل عیسائی تھا اور اُن حریفوں کے مقابلے میں جو دینی حکومت کے داعی تھے، بنی اُمیہ کی حمایت کرتا تھا[2]۔ عیاش فرزدق عبد الملک کا شاہی شاعر تھا پھر اس کے بیٹوں، ولید و سلیمان[3] اور یزید ثانی کے دربار میں یہی خدمت انجام دی۔ جریر اپنے زمانے کا سب سے بڑا طنز نگار، حجاج کی سرکار کا خاص شاعر رہا[4]۔ جہاں تک معاش کا تعلق ہے، ہجو سے

ف[1] ابن خلکان۔ ۱ ص ۲۹۲ - اغانی - ۵ ص ۱۶۴ - نیز دیکھو "عقد" ۳ ص ۱۳۷ ؛

ف[2] ابن قتیبہ: "شعر" ص ۳۰۱ ؛

ف[3] ایضاً ص ۲۹۷۔ ان خلفا کی فرزدق نے جو مدحیں لکھی ہیں، اُن کے لیے دیکھو اس کا دیوان (تدوین بوشے۔ پیرس ۱۸۷۵ء) ؛

ف[4] ابن قتیبہ ص ۲۸۳۔ اس کے قصائد مدحیہ کے نمونے اس کے دیوان، جلد اوّل میں ملیں گے (قاہرہ، ۱۳۱۳ھ) ؛

زیادہ قصیدہ نویسی ان شاعروں کا پیٹ پالتی تھی، اور ان قصیدوں سے یہ وہی فرض انجام دیتے تھے جو آج کل سیاسی فریقوں کے اخبار انجام دیتے ہیں۔ فرزدق اور جریر بارہا ایک دوسرے پر نہایت سخت دشنام آمیز حملے کرتے اور اخطل عموماً فرزدق کا ساتھ دیتا تھا۔ یہ شرابی مذہباً عیسائی تھا مگر مذہب کی دل میں کتنی وقعت تھی، اس کا اندازہ اس مثال سے ہو سکتا ہے کہ ایک دفعہ اس کی حاملہ بیوی برکت لینے کے لئے دوڑی کہ ایک راہ چلتے اسقف کا دامن چھو لے۔ یہ بزرگ پادری 253
گدھے پر سوار جا رہا تھا۔ عورت کا ہاتھ چغے تک نہ پہنچا۔ فقط گدھے کی دُم سے مس ہوا۔ تب اخطل نے یہ الفاظ کہہ کر بیوی کو تسلی دی کہ وہ جو گدھے پر سوار تھا، اس میں، اور اس کے گدھے کی دُم میں کچھ فرق نہیں ہے۔[۱]

تعلیم

رسمی نمونے کی تعلیم کا اُن دنوں عام رواج نہ تھا۔ بادیہ یعنی صحرائے شام ابتدائی اموی شہزادوں کی ایک طرح کی درس گاہ کا کام دیتا تھا، جہاں اموی فرماں روا اپنے نوجوان لڑکوں بھیج دیتے تھے کہ خالص عربی زبان سیکھیں اور شعر میں مہارت پیدا کریں۔ امیر معاویہ نے اپنے لڑکے اور آئندہ جانشین یزید کو یہیں بھیجا تھا۔ عامۃ الناس اُسے تعلیم یافتہ سمجھتے تھے جو اپنی زبان میں لکھنا پڑھنا، تیر کمان چلانا اور تیرنا جانتا ہو۔ ایسا شخص "الکامل" یعنی پورا فاضل کہلاتا تھا۔[۲] بحر روم کے ساحل

---

[۱] اغانی - ۷، ص۱۸۳۔

[۲] ابن سعد - ۳، ص۹۱ (حصہ دوم) نیز دیکھو، ۵، ص۳۰۹۔ اغانی، ۲، ص۱۲۵۔

کی سکونت نے تیرنے کے فن کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ اس زمانے کی کتابوں سے جہاں تک معلوم ہو سکا، تعلیم کے اخلاقی فوائد کا تصور یہ تھا "کہ تعلیم یافتہ آدمی میں اولوالعزمی اور پریشانی کے وقت صبر کی قوت ہو، ہمسائے کے حقوق اور ذمہ داریوں کا لحاظ کرے۔ مروت، فیاضی، مہماں نوازی، عورتوں کا خیال، عہد و پیمان کے پورا کرنے کے اوصاف رکھتا ہو"۔ غور کیجیے تو ان میں اکثر وہی باتیں ہیں جن کی بدوی زندگی میں بڑی قدر کی جاتی تھی۔

عبدالملک کے زمانے سے دربار خلافت میں ہم اتالیق یا معلم (= "موَدِّب") کا مستقل مقام دیکھتے ہیں۔ یہ عہدہ عموماً کسی مولیٰ یا عیسائی کے سپرد ہوتا تھا۔ عبدالملک کے بیٹوں کے اتالیق کو اُن کے باپ کی طرف سے یہ ہدایت کی گئی تھی: "انھیں تیرنا سکھاؤ اور اس بات کا عادی بناؤ کہ زیادہ نہ سوئیں"[1]۔ عمر ابن عبدالعزیز کے بچوں نے عربی صرف نحو کے قاعدوں کے خلاف بات کی تو وہ اس قدر ناراض ہوئے کہ جسمانی سزا دینے پر آمادہ ہو گئے تھے[2]۔ اُن کی ہدایات بھی، جو بچوں کے اتالیق کو سرکاری طور پر سنائی گئی تھیں، تاریخی اعتبار سے خاص معنی کی حامل ہیں۔ وہ یہ تھیں کہ "سب سے پہلا سبق ایسا بچوں کے ذہن نشین کیا جانا چاہیے کہ انھیں سامان عیش و تفنن سے نفرت ہو جائے کیوں کہ یہ شیطان کی اختراعات ہیں اور ان کا انجام خدا کی ناراضی ہوتا ہے"[3]۔

---

[1] مبرد، ص۴۴۔

[2] "معجم الادبا" از یاقوت ۱، ص۲۵ (لائے ڈن ۱۹۰۷ء)۔

[3] ابن الجوزی: "سیرۃ" ص۲۵۷۔ نیز دیکھو جاحظ: "بیان" ۲ ص۱۳۸۔

عوام الناس جنھیں اپنے بچوں کو تعلیم دلانی ہوتی تھی، جیسی کچھ بھی اُن دنوں تعلیم تھی، وہ مسجدیں بناتے تھے، جہاں طلبہ کو زیادہ تر قرآن مجید اور حدیث شریف کا درس دیا جاتا تھا۔ اسی لئے مسلمانوں میں سب سے پہلے اُستاد قرآن خوان (قُرّا) ہوئے ہیں۔ بالکل شروع یعنی سن ۱۷ ہجری (م ۶۳۸ء) ہی میں حضرت عمرؓ نے ایسے استاد
ہر سمت بھیجے اور حکم نافذ کیا تھا کہ لوگ جمعے کے دن اُن کے پاس 254
آیا کریں۔ عمر ثانی نے یزید ابن ابی حبیب (متوفی ۷۴۵ء) کو مصر کا صدر قاضی بنا کے بھیجا تھا اور بیان کرتے ہیں کہ وہ پہلے شخص تھے جس نے بحیثیت معلم وہاں شہرت حاصل کی[1]۔ کوفے میں ہم ایک شخص ضحاک ابن مزاحم (متوفی ۷۲۳ء) کا حال پڑھتے ہیں[2] کہ اس نے ایک ابتدائی درس گاہ (= کُتّاب) قائم کر رکھی تھی اور تعلیم کا کوئی معاوضہ نہ لیتا تھا[3]۔ بخلاف اس کے دوسری صدی ہجری میں ایک بدوی کا ذکر آتا ہے جو بصرے میں آ بسا اور وہاں مدرسہ چلاتا تھا جس میں تعلیم پانے کی اُجرت ادا کرنی پڑتی تھی[4]۔

علوم

عرب کہتے ہیں اور اس قول کو پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے منسوب کرتے ہیں کہ علم کی دو قسمیں ہیں: علم الادیان، جس کا تعلق دین مذہب سے ہے اور علم الابدان، جو جسمانیات سے واسطہ رکھتا ہے یعنی

---

[1] سیوطی: "حسن" ۱ صفحہ ۱۳۲۔ مقابلہ کرو کِندی: "ولاۃ" صفحہ ۸۹۔

[2] جاحظ: "بیان" ۱ صفحہ ۱۷۵ میں لکھتا ہے کہ وہ عبدالملک کے بیٹوں کا اتالیق تھا۔

[3] ابن سعد - ۶ صفحہ ۲۱۰۔

[4] یاقوت: "اُدبا" ۲ صفحہ ۲۳۹۔

طب۔ مگر جزیرہ نمائے عرب کی طب (اس وقت) بالکل بدوی حالت میں تھی۔ جائز ادویہ کے ساتھ، بدنظر سے بچانے کے گنڈے تعویذ اور جھوٹ منتر بھی چلتے تھے۔ چند نسخے جنھیں طب نبوی کا نام دے دیا گیا تھا، اور حدیث میں شامل ہوکر ہم تک پہنچے ہیں؛ علاج کو فصد اور سینگی لگانے اور شہد کھلانے تک محدود کرتے ہیں۔ باریک بیں ابن خلدون اپنے مشہور مقدمہ میں[1] اس قسم کی طب کو بہت ادنیٰ درجہ دیتا اور جتاتا ہے کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) دین کے اصول اور قوانین شریعت سکھانے کے لیے مبعوث ہوئے تھے نہ کہ طب کی تعلیم دینے کے لیے۔

عرب کا باضابطہ علم طب بیشتر یونانی اور جزوی حد تک ایرانی ماخذوں سے تیار ہوا۔ خود ایرانی طب، یونانی روایات کے زیر اثر آگئی تھی۔ پہلی صدی ہجری کے عرب طبیبوں کا سرگروہ حارث ابن کلدہ (متوفی تخ ۶۳۴ء) باشندہ طائف تھا جس نے ایران میں طب کی تعلیم پائی[2]۔ سارے جزیرہ نما میں یہی پہلا شخص ہوا ہے جس نے باقاعدہ اس علم کی تربیت حاصل کی اور "طبیب اہل العرب" کے اعزازی لقب سے ممتاز ہوا[3]۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق حارث کا بیٹا النضر طبابت کے فن میں باپ کا جانشین ہوا اور اس کی ماں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خالہ تھیں[4]۔

---

[1] ص ۴۱۲۔

[2] ابن ابی اصیبعہ: "عیون الانبا فی طبقات الاطبا"، (قاہرہ ۱۸۸۲ء۔ تصحیح و تحشیہ اے مُلر) ا ص ۱۰۹۔ ابن العبری ص ۱۵۶۔

[3] ابن العبری "۔ قفطی: "حکما" ص ۱۶۱۔

[4] ابن ابی اصیبعہ ۔ ا ص ۱۱۳ ۔ نووی: "تہذیب" ص ۵۹۳۔

جس زمانے میں عربوں نے مغربی ایشیا کے ملک فتح کیے، اس
وقت یونانی علم طب میں کوئی روح باقی نہ رہی تھی۔ یونانی یا سُریانی
شارحین اور طبیبوں کے ہاتھ میں وہ محض رسم کہن بن گیا تھا۔ بنی اُمیّہ
کے درباری طبیب اسی زمرے میں داخل ہیں۔ ان میں امیر معاویہ کا[1]
عیسائی طبیب ابن آثال اور حجاج کا (صریحًا یونانی نژاد) معالج تیاذوق[2] 255
سب سے نمایاں تھے۔ تیاذوق کے بعض حکیمانہ اقوال محفوظ ہیں لیکن
تین یا چار کتابیں جو اس سے منسوب تھیں، سب معدوم ہوگئیں۔ ایرانی
قوم کے ایک یہودی طبیب ماسرجویہ نے بصرے میں مروان ابن حکم کے
زمانے میں فروغ پایا اور طب پر ایک سریانی رسالے کا عربی میں ترجمہ
کیا (۶۸۳ء) جو اصل میں کسی عیسائی پادری آہرون نامے[3] نے یونانی
زبان میں تالیف کیا تھا۔ بہرحال یہی ماسرجویہ اسلام کی زبان میں سب
سے قدیم علمی کتاب لکھنے کا شرف رکھتا ہے۔ خلیفہ ولید کی نسبت کہا جاتا
ہے کہ جذام کے مریضوں کو علاحدہ رکھنے اور ان کے علاج کا خاص
انتظام کرنے کا طریقہ اسی نے جاری کیا تھا۔[4] اور یہ کام عمر ابن عبدالعزیز
سے منسوب کرتے ہیں کہ انھوں نے سکندریہ کے طبی مدارس کو جن میں
یونانی اصول طب کا رواج چلا آتا تھا، انطاکیہ اور حرّان میں منتقل
کرا دیا[5]۔

---

۱ ابن ابی اصیبعہ۔ ۱ ص ۱۱۶۔
۲ " " " ص ۱۲۱ نیز دیکھو گذشتہ انیسواں باب ص ۲۲۰۔
۳ ابن العبری ص ۱۹۲۔
۴ " ص ۱۹۸۔ طبری، ۲ ص ۱۱۹۶۔
۵ ابن ابی اصیبعہ۔ ۱ ص ۱۱۶۔

کیمیا

علم طب کی طرح کیمیا بھی اُن چند علوم میں شمار ہوتا ہی، جن کی ترقی میں آگے چل کر عربوں نے نمایاں حصہ لیا۔ اس کی تعلیم بھی ابتدائی دَور (بنی امیہ) سے شروع ہوگئی تھی۔ دوسرے اموی خلیفہ کا بیٹا خالد (متوفی ۷۰۴ یا ۷۰۸ء) کہ "آل مروان کا فیلسوف" (یا حکیم) گزرا ہی۔ مسلمانوں میں پہلا شخص تھا جس نے کیمیا، طب اور نجوم کی کتابوں کے یونانی اور قبطی زبان سے عربی میں ترجمے کرائے۔ یہ فہرست کی روایت ہی[1] اور وہی ہمارا سب سے قدیم اور بہترین ذریعہ معلومات ہی۔ ہرچند یہ اطلاع افسانوی ثابت ہوئی[2]، تاہم خالد سے اس علمی سرگرمی کا منسوب کیا جانا ایک اہمیت ضرور رکھتا ہی کہ یہ روایتیں بھی اس حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ عربوں نے اپنے علوم یونان ہی کے قدیم تر ماخذوں سے حاصل کئے اور وہی اُن کو تحریک دینے کا باعث ہوئے تھے۔ کہانیوں میں اسی اموی شہزادے کا رفیق شہرہ آفاق حکیم جابر ابن حیان کو بنا دیا ہی (جس کا لاطینی نام "جِبر" تھا) لیکن وہ متاخر، یعنی کوئی سنہ ۷۷۶ء کا آدمی ہی۔ اس کا تذکرہ ہم بنی عباس کے تحت میں کریں گے۔ اسی طرح نجوم اور کیمیا پر وہ رسالے جو حضرت علیؓ کی اولاد اور شیعہ فرقے کے بارہ اماموں میں سے ایک امام جعفر صادقؓ (متوفی سنہ ۷۶۵ء) کے نام منسوب کئے گئے تھے، زمانہ حاضرہ کی تحقیق نے اس انتساب کو صحیح نہیں مانا۔ بنی امیہ کے عہد

---

[1] ص ۲۴۲، ص ۳۵۴۔

[2] دیکھو جولیس رسکا کی جرمن کتاب عربی کیمیا پر، عنوان: خالد ابن یزید ابن معاویہ (ہائیڈل برگ سنہ ۱۹۲۴) ص ۔

کی علمی زندگی کے باب میں نہایت افسوسناک بات یہ ہے کہ تحریری صورت میں اُس زمانے کی کوئی دستاویز (= کتاب) اب ایسی باقی نہیں رہی جس
سے ہم ٹھیک ٹھیک اس دور کا اندازہ کر سکیں ۔ 256

فن تعمیر

اگر ملک عرب میں وہاں کا کوئی خاص طرز تعمیر تھا، تو اس کے آثار صرف یمن میں مل سکتے تھے۔ لیکن اس بارے میں ہماری تحقیق و تلاش ابھی تک اس قدر تشنہ ہے کہ کافی مواد فراہم نہیں ہو سکا۔ دوسرے جنوب میں یہ فن ہو بھی، تو جزیرہ نما کی شمالی آبادیوں میں کچھ زیادہ کام نہ دے سکتا تھا۔ کیوں کہ یہاں تو مسکن، معمولاً خیمے ہیں۔ عبادت گاہ کھلے میدان میں اور مدفن، صحرا کی ریت میں بن جاتا تھا۔ خال خال نخلستان تھے سو وہاں کے رہنے والے، جیسا کہ آج کل حال ہے، بھدی سی عمارتیں بنا لیتے تھے جن میں دھوپ کی سکھائی ہوئی اینٹیں، کھجور کی لکڑی اور مٹی کی چپٹی چھتیں ہوتی تھیں۔ اسی کو ان کا فن تعمیر سمجھ لیجئے۔ ان مکانات میں کسی قسم کی نقش نمائی، آرائش کا سامان نہ ہوتا تھا۔ وہ بہت ہی سادہ ضرورتوں کے لئے بنائے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ کعبہ جو پوری قوم کی پرستش گاہ تھا، وہ ایک مکعب شکل کی، بدویانہ چاردیواری تھی جس کے اوپر چھت تک نہ تھی۔ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے عہد (طفولیت) میں یہ خانہ کعبہ بھی ایک قبطی عیسائی مستری نے بنایا تھا اور اس میں کسی شکستہ رومی جہاز کی لکڑی تختے لگائے تھے جو ٹوٹ کر ساحل جدہ پر آ لگا تھا اور اس کے تختے وغیرہ عربوں نے پانی سے نکال لئے تھے۔ یہ درست ہے کہ مدائن صالح (قدیم الحجر) کے کوہ تراش

مقبرے، بِترا کے خوب صورت ایوان جو رنگ رنگ کے بھربھرے پتھر کی بلند پہاڑیوں میں چور س بنائے گئے ہیں، اور تدمر کے محلات و معابد کے ستون اور محرابیں۔ اسی طرح ایسے ایسے شان دار کلیسا جیساکہ شہید سرجیوس (ولی) کی قبر پر رصافہ میں غسّانی امیر مُنذر ابن حارث نے تعمیر کیا تھا۔ یہ سب خوب صورتی کے اعتبار سے اسلوب تعمیر کا بہت اعلیٰ نمونہ پیش کرتے ہیں لیکن یہ اسلوب یونان زدہ مصر و شام کا مانگا ہوا تھا، خاص عربی مذاق کا نہ تھا؛

عمارتیں بنانے کے فن میں سب سے پہلا اور مستقل قسم کا طرز تعمیر ہمیشہ مذہبی عمارات کی تیاری کے سلسلے میں نمایاں ہوتا ہے۔ عبادت کا مقام جسے خدا کا گھر ہی کہتے ہیں، وہ پہلی جگہ ہے کہ جب انسان میں روحانیت بیدار ہوتی ہے تو وہ سب سے اوّل اسی مکان کو ایسا بنانا چاہتا ہے جو انسانی سکونت کی مادّی ضروریات کے لئے مکتفی ہونے کی بجائے دیکھنے والے کے دل میں بلند تر تصوّرات کا نقش قائم کر سکے۔ مسلمان عربوں کے معاملے میں یہی مذہبی عمارتیں تھیں جن میں فن، بلند ترین مدارج پر پہنچا۔ مسلمان معماروں نے، یا جن لوگوں کو اس کام پر مقرر کیا گیا تھا، انھوں نے رفتہ رفتہ تعمیر کا ایسا نقشہ تیار کرلیا جو سادگی اور وقار کا آئینہ دار ہے۔ اس کی بنیاد سابقہ نمونوں پر تھی لیکن حیرت انگیز طور پر نئے مذہب کی اصلی روح کا مظہر تھا۔ اسی لئے اسلامی مسجد، اسلامی تمدّن کے ارتقا کی گویا مجمل تاریخ ہے جس میں ہم بین الاقوام اور بین الانسال روابط کے مختلف ادوار کا مطالعہ کرسکتے ہیں۔ ملت اسلام اور اس کے ہم سایوں نے ایک دوسرے پر جو تہذیبی

25 رنگ ڈالے اور قبول کیئے ان کی مسجد سے بڑھکر صاف اور واضح مثال شاید دوسری نہ ملے گی ؂

مسجد نبوی

مدینہ منورہ میں پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے جو سیدھی سادی مسجد بنائی، حرم مکہ کی بجائے وہی اتفاقات روزگار سے پہلی صدی ہجری کی جامع مسجدوں کا نمونہ بن گئی۔ مسجد نبوی میں اول اول ایک کھلا صحن تھا جسے مٹی کی کچی اینٹوں کی دیواروں سے احاطہ کردیا تھا[1]۔ لیکن پھر آس پاس کے مکانوں کی چھتیں بڑھاکر آں حضرت صلعم نے اُسے پورا مسقف بنادیا کہ دھوپ سے بچاؤ ہو جائے۔ یہ چھت کھجور کے تنوں پر قائم کی تھی اور اوپر شاخیں پھیلاکر مٹی سے چھوپ دیا تھا[2]۔ کھجور ہی کا ایک لکڑ زمین میں گاڑکر شروع میں منبر کا کام لیتے تھے[3] جس پر حضرت (سرور کائنات علیہ التحیاۃ والسلام) کھڑے ہوکر خطبہ ارشاد فرماتے تھے[4]۔ بعد میں اس کی جگہ اِملی کی لکڑی کا زینہ جس میں تین سیڑھیاں تھیں، 259 منبر کے طور پر جمادیا گیا تھا۔ یہ ملک شام کے عیسائی گرجوں کی نقل تھی۔ آیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس مسجد میں قبلہ نما محراب بھی بنوائی تھی، یا نہیں اس کی تحقیق نہیں ہوسکی۔ نماز کے وقت نمازی متوازی

---

[1] ابن ہشام، صفحہ ۳۳۶ ؂

[2] بلاذری صفحہ ۶۔ بخاری، ۱ صفحہ ۱۰۶ ؂

[3] دیکھو نولڈیکی کی جرمن کتاب "مشرقی مطالعے" (گاٹے سن ۱۹۰۶) ا صفحہ ۲۳۳ سی ایچ بیکر بتاتا ہے کہ منبر اصل میں حاکم کے لئے بلند نشست یا تخت ہوتا تھا اور عبادت سے اسے تلازم نہ تھا ؂

[4] ابن سعد ا صفحہ ۹ ۔ وسٹن فیلٹ کی جرمن "تاریخ ریاست مدینہ" (گوٹن جن ۱۸۶۰) صفحہ ۴۴ نیز دیکھو ترجمہ ا ۱۰۲

صفوں میں ایک ہی دیوار کے رُخ منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے۔ پہلے بیت المقدس کی سمت، بعد میں مکہ معظمہ کی طرف[1] مسجد کی چپٹی چھت پر کھڑے ہوکر بلال حبشیؓ اپنی گونجتی آواز میں اذان دیتے اور ایمان والوں کو نماز کے لیے پکارتے تھے[2] اسلامی مسجد جامع کے جملہ عناصر اپنی سادہ ترین شکل میں یہی تھے، یعنی صحن، نمازیوں کے لئے سایہ دار جگہ اور ایک منبر۔

جس وقت مجاہدین عرب دائروں کی صورت میں مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں فاتحانہ بڑھتے چلے گئے، تو مفتوحہ ممالک میں بے شمار عمارتیں اُن کے قبضے میں آئیں کہ بعض شکستہ اور بہت سی اچھی حالت میں سلامت تھیں۔ یہ فن تعمیر کی نہایت ترقی یافتہ صورت کی نمائندہ تھیں اور اس سے بھی بڑھکر یہ کہ ان فتوحات کی بدولت وہ جیتا جاگتا فن، اور اس کی معلومات و مہارت جو مفتوحہ اقوام کے کاریگروں کو زمانہ ماسبق سے ورثے میں ملی تھی، اب وہ سب فاتحین عرب کے ہاتھ آگئیں۔ ملتِ اسلامی کی مذہبی ضروریات مسجد نبوی کے تشکیل پانے سے واضح ہوتی تھیں۔ مختلف خطوں میں مقامی حالات کے مطابق مناسب ترمیم کرلی جاتی تھی۔ لہذا مذکورۂ بالا قوموں کی فنی مہارت سے کام لےکر رفتہ رفتہ وہ طرز عمارت تیار ہوگیا جسے (یورپ میں) سارسینک، عربی،

---

[1] ابن سعد - ۱ ص۳۔

[2] مدینہ شریف میں آنے کے ایک یا دو سال بعد عیسائی گرجوں کے گھنٹے وغیرہ پر غور کرنے کے بعد آں حضرت صلعم نے نماز کی شرعی دعوت کے لئے اذان کا طریقہ پسند فرمایا۔ ابن سعد - ۱ ص۔

اسلامی اور محمدیؐ[1] فن سے منسوب کرتے ہیں۔ عمارتی مصالحے کا فیصلہ،
خواہ پتھر ہو، خواہ اینٹ یا مٹّی، محض اُس خاص مقام کے سابقہ رواج 260
کی بنا پر کیا جاتا تھا۔ مُلک شام میں اسلامی طرز تعمیر پر پہلے کی بنی ہوئی
مسیحی عمارتوں کا اثر پڑا۔ یہ "شامی بائی زنطی" اسلوب تھا جس میں
وطنی نمونوں کے علاوہ قدیم رومی عمارات کی بھی جھلک تھی۔ اُن کے
مقابلے میں عراق و ایران کی اسلامی عمارتوں میں نسطوری اور ساسانی
اثرات نمایاں ہیں اور خود وہ عمارتیں اپنے ملک کی قدیم تر رسم و روایات
کے مطابق بنی تھیں۔ مصر میں بہت سے آرائشی نقش و نگار مقامی قبطیوں
نے فراہم کئے تھے۔ اس طرح عربی فن کے رفتہ رفتہ کئی جداگانہ طرز تیار
ہو گئے: (اوّل) شامی مصری، جس میں یونانی رومی اور مقامی نظائر کی
پیروی کی جاتی تھی۔ (ثانی) عراقی و ایرانی، جس کی بنا ساسانی، قدیم
خالدی اور اشوری اسالیب پر پڑی تھی۔ (ثالث) اندلسی اور شمال افریقی
فن، جو ہسپانیہ کے مقامی مسیحی اور وِس گاتھ طرز سے متاثر ہوا اور اکثر
"مُورِش" یا مغربی طرز تعمیر کہلاتا ہے۔ اور (رابع) ہندی جس میں ہندو
طرز کی کھلی نشانیاں موجود ہیں۔ پھر چین میں دیکھئے تو مسجد، بدھ مندر
کا قریب قریب مُثنّیٰ نظر آئے گی۔

صوبوں کی ابتدائی مسجدیں

سب سے پہلی مسجد جو مفتوحہ سرزمین پر تیار ہوئی، بصرے میں

---

[1] زمانہ حاضرہ کے مسلمان لفظ "محمڈن" کا استعمال پسند نہیں کرتے کہ یہ "کرسچین" کے ماثل بنایا گیا ہے جس کے معنی مسیح پرست کے تھے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ مسلمان پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) کی پرستش کرنے والے نہیں ہیں۔

عُتبہ ابن غزوان نے بنوائی تھی (۶۳۷ یا ۶۶۳۸) اسی نے شہر بصرہ کی بنا ڈالی کہ فوج سردیوں میں وہاں قیام کرے۔ شروع میں یہ عبادت گاہ کھلا ہوا احاطہ تھی جسے چار طرف سے نرسل کی باڑ لگا کے گھیر دیا تھا۔ بعد میں حضرت عمرؓ کے والی ابو موسیٰ اشعریؓ نے اسے کچی اینٹ (پلین) اور گارے سے بنوایا اور خس پوش چھت تیار کرائی[۱]۔ اسی سال یا ۶۶۳۹ میں ایران پر فوج کشی کرنے والے سپہ سالار حضرت سعدؓ ابن وقاص نے کوفے کی دوسری جنگی چھاؤنی قائم کی اور اس کے وسط میں ایک سادہ مسجد بنوائی۔ اسی مسجد سے متصل والی کا مکان یعنی "دارالامارہ" واقع تھا۔ بصرے کی طرح یہ مسجد بھی پہلے صرف باڑ لگا کے کھلے صحن کی صورت میں بنی پھر کچی اینٹ گارے سے کام لیا گیا[۲]۔ یہاں تک کہ امیر معاویہ کے والی زیاد نے اسے از سرنو تعمیر کیا اور اس میں ساسانی نمونے کے ستون لگائے۔ لیکن اور ہر لحاظ سے مسجد اسی نقشے کے مطابق تھی جو رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس وقت کے حالات کی وجہ سے مرتب فرما دیا تھا۔ اس مسجد یا بصرے والی مسجد کا اب پتہ نہیں چلتا اور کوفے کی مسجد علیؓ کا بھی جو ۶۶۵۶ء کے قریب بنی اور اندلسی سیاح ابن جُبیر نے اسے ۱۱۸۴ء میں دیکھا تھا[۳] پھر معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔

ملت اسلامی کی تیسری بڑی چھاؤنی عَمر ابن العاص نے فسطاط

---

[۱] بلاذری، ص۳۴۶ - یاقوت: "بلدان" ۱ ص۶۴۲

[۲] طبری، ۱، ص۲۴۸۹ - یاقوت، ۴، ص۳۲۳

[۳] دیکھو اس کا سفرنامہ، ص۲۱۱

(پرانا قاہرہ) میں آباد کی یہیں برّاعظم افریقہ میں مسلمانوں کی پہلی عبادت گاہ بنی۔ اس کی پہلی صورت بھی وہی تھی کہ ایک سیدھا سادہ مربع احاطہ کھینچ دیا گیا تھا۔ قبلے کا رُخ دکھانے کے لیے کوئی محراب یا اذان دینے کی غرض سے کوئی مینار (ماذنہ یا مئذنہ) نہ تھا۔ کوفے اور بصرے کی پہلی مسجدوں 261
کی طرح اس مسجد کا بھی اب نشان نہیں ملتا۔[1] لیکن عمرؓ نے کچھ مدت بعد اس میں منبر کا اضافہ کیا جسے نوبیہ کے عیسائی بادشاہ نے بنوا کے تحفۃً نذر گزرانا تھا۔ فُسطاط کی مسجد کے بعد ولایات افریقہ میں دوسری مشہور مسجد عُقبہ ابن نافع نے قیروان میں بنوائی (۵۰ھ - ۶۷۰ء) اس شہر کی بِنا بھی جنگی پڑاؤ کے طور پر پڑی تھی مگر یہاں عُقبہ نے پہلے مسجد اور سرکاری مکان بنایا پھر ان کے گرد لوگوں کے مکانات تعمیر کرائے[2] عُقبہ کے جانشین مسجد کی بار بار تجدید کرتے رہے۔ آخر میں اسے اغلبی خاندان کے بادشاہ زیادت اللہ اوّل (۸۱۷ تا ۸۳۸ء) نے از سرِ نو تعمیر کیا اور اس وقت سے آج تک یہ مسجد دنیائے اسلام کے عظیم ترین معبدوں میں شمار ہوتی ہے۔

ایسی صورتوں میں جہاں کہ فاتح مسلمان بسے بسائے شہروں میں آباد ہوئے، انھوں نے پہلے کی بنی ہوئی عمارتوں سے کام لیا۔ شہر مدائن میں حضرت سعدؓ ابن وقّاص نے خسروِ ایران کے خاص (محراب دار) ایوان سے اسلامی عبادت گاہ کا کام لیا[3] دمشق میں یوحنا ولی کے کلیسا کو

---

[1] مقریزی (بولاق) ۲ صفحہ ۲۴۸۔

[2] یاقوت، ۴ صفحہ ۲۱۳۔

[3] طبری۔ ۱ صفحہ ۲۴۴۳، و صفحہ ۲۴۵۱۔

ولید اوّل نے نئے سرے سے مسجد بنایا[1] لیکن کہا جاتا ہے کہ حمص میں ایک ہی عمارت مشترکہ طور پر مسجد اور گرجا، دونوں کا کام دیتی رہی[2]۔

محراب قبلہ جسے نماز کی سمت بتانے کے لئے اندر کے رُخ شملہ دے کے بناتے ہیں۔ مسجد کے لازمات میں آگے چل کے داخل کی گئی اور یہ بھی گرجا سے لی گئی تھی۔ خلیفہ ولید کے زمانے میں عُمر ابن عبد العزیز والی رہے تھے۔ انہی کی ولایت میں یہ اضافہ ہوا اسی لئے انھیں اور ولید کو محراب قبلہ کی بنا میں اولیّت دی جاتی ہے[3] اگرچہ بعض راوی امیر معاویہ سے اس کا آغاز منسوب کرتے ہیں[4] بہرحال، سب سے پہلی مسجد جس میں محرابِ قبلہ بنی، بظاہر مسجد نبوی ہی تھی۔ پھر بہت جلد سب مسجدوں میں یہ خصوصیت مشترک ہوگئی اور محراب نے سب سے بڑھ کر تقدس کا وہ مرتبہ حاصل کرلیا جیسا کہ مسیحی گرجوں میں قربان گاہ کو حاصل ہوتا ہے۔ اسی بنا پر مسلمان اسے طرح طرح کی تزئین سے آراستہ کرنے لگے حتیٰ کہ آرائش کے اسلامی فن میں جو پیہم تبدیلیاں ہوتی رہیں، ان کی تعیین کے لئے محراب قبلہ ہی ایک معیار سمجھی جا سکتی ہے۔

(مسجد میں ایک دنیاوی قسم کی بدعت، یعنی اوّل اوّل مقصورہ بنانے کا الزام عموماً امیر معاویہ کو دیا جاتا ہے[5] یہ مسجد کے اندر کٹہرہ کھینچ کر

---

[1] بلاذری، ص۱۲۵ – یاقوت، ۲ ص۵۹۱ – ابن جبیر، ص۲۶۳۔
[2] اصطخری، ص۶۱ – ابن حوقل، ص۱۱۷ – مقدسی، ص۱۵۶۔
[3] مقریزی، ۲ ص۲۴۷ – مقدسی، ص۸۰ – ابن بطوطہ، ۱ ص۲۷۱ – ابن دقماق، "الانتصار لواسطۃ عقد الامصار" (بولاق ۱۳۰۹ھ) جزو چہارم ص۶۲ – سیوطی، "حسن" ۲ ص۱۴۹۔
[4] ابن الفقیہ – ص۱۰۹۔
[5] یعقوبی، ۲ ص۲۸۳ – بعض روایتوں میں اسے مروان ابن الحکم سے منسوب کیا ہے اور مقریزی نے حضرت عثمانؓ سے (۲ ص۲۴۷)۔

علاحدہ بنایا جاتا اور خلیفہ کے واسطے مخصوص ہوتا تھا۔ اسے رواج دینے
21 کی مختلف وجوہ بیان کی گئی ہیں جن میں بڑی وجہ یہ ہے کہ خوارج نے
خلیفہ پر قاتلانہ حملہ کیا[1] تو اس کے بعد سے حفاظت کے لیے یہ تدبیر کی
گئی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مقصورہ سے خلیفہ تخلیہ کرنے، الگ بیٹھ کر سوچنے
یا آرام لینے کا کام لیتے تھے[2]۔)

(محراب قبلہ کی طرح: مینار کا رواج بھی بنی اُمیّہ نے شروع کیا۔ اسی
لئے ملکِ شام کو مینارِ مسجد کا گہوارہ کہنا چاہیئے۔ یہاں مینار نے مقامی
دیدبان کے بُرج کی صورت اختیار کی) یا اس کے جانشین گرجا کے بُرج
کی جو چوکور ہوا کرتا تھا[3]۔ ہمارے قدیم ترین ماخذوں میں سے ایک نے
اموی جامع دمشق کے بیان میں مینار کا ذکر کیا اور صراحتہً لکھا ہے کہ یہ پہلے
یوحنا ولی کے کلیسا کا ناطور یعنی دیدبانی بُرج تھا[4]۔ لیکن (مصر میں امیر معاویہ
کے ایک والی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اُس نے ماذنہ رائج کیا
اور عمرؓ ابن العاص کی مسجد فسطاط کے چاروں گوشوں پر ایک ایک مینار
بنوایا[5]۔ عراق کی جامع بصرہ میں امیر معاویہ کے والی زیاد نے پتھر کا مینار
تعمیر کیا تھا[6]۔ لیکن شام و حجاز کی مسجدوں میں بہت سے مینار بنوانے
کا سہرا بھی غالبًا بنی اُمیّہ کے مشہور بنّا ولید ہی کے سر بندھے گا جس کی
خلافت میں عمرؒ ابن عبدالعزیز نے بہ حیثیت والیٔ مدینہ مسجد نبوی میں اس

---

[1] دینوری، ص۲۲۹۔ مقدمہ ابن خلدون، ص۲۲۳۔ نیز دیکھو طبری، ۱، ص۳۴۶۵

[2] دیکھو اغانی۔ ۱۶، ص۱۱۶

[3] مقدسی، ص۱۸۲۔ [4] ابن الفقیہ، ص۱۰۱۔ نیز دیکھو ابن بطوطہ، ۱، ص۲۰۳

[5] مقریزی، ۲، ص۱۰۸۔

[6] بلاذری، ص۳۴۸

چیز کا آغاز کیا[1] ولید کے بعد جگہ جگہ کثرت سے مینار بنتے چلے گئے۔)

اگرچہ مسلمانوں میں مینار کی سب سے قدیم وضع دہی شام کا چوکور سنگی مینار تھی اور اسی نمونے کے مطابق دوسرے، خصوصاً اندلس اور شمالی افریقہ کے مینار بنتے رہے تاہم صرف یہی ایک وضع نہ تھی جسے امویوں کے عہد میں فروغ ہوا بلکہ ہر ملک میں جیسے بُرج پہلے سے مروّج تھے، مسلمانوں نے انھی کے مطابق اپنے مینار بنانے شروع کیے۔ مصر میں کئی صدی تک صرف اینٹ سے ان کی چنائی کرتے تھے اور بعض لوگوں کا خیال ہو کہ سکندریہ کا شہرہ آفاق (بحری) مینار "فاروس" کا بھی کچھ نہ کچھ تعمیری اثر پڑا۔ عراق میں نویں صدی عیسوی (دوسری، تیسری ہجری) کا ایک برج نما مینار سامرہ میں دجلے کے کنارے بنا اور قدیم اشوری "زی غورت" (یعنی شبہ نشین) کی جھلک دکھاتا ہو جس میں سات طبقے بنائے جاتے تھے۔ یہ سورج، چاند اور باقی پانچ سیاروں کی جو ان دنوں معلوم تھے، یاد دلاتے تھے[2]۔

قُبّۃ الصخرہ

توراۃ و انجیل کے تعلق کے باعث، نیز اسلام کا پہلا قبلہ[3] اور معراج کی رات آسمانوں کی مشہور سیر میں حسب روایات، رسول اللہ (صلعم) کا

---

[1] دشمن فیلٹ، "ریاست مدینہ" صفحہ ۔ ابن بطوطہ، ۱ صفحہ ۲۷۳۔

[2] "دی سوی لزیشن اوف بے بی لونیا اینڈ اسیریا" (فلیڈلفیا ۱۹۱۵ء) صفحہ ۳۷۶ نیز دیکھو ہماری کتاب کا آیندہ باب آٹھ تیس۔

[3] ابن سعد، ۱ صفحہ ۳۔ نیز دیکھو سورہ بقرہ: ۱۳۸۔

پہلا مقام ہونے کی وجہ سے بیت المقدس (یوروشلم) مسلمانوں کی نظر میں بالکل شروع سے نہایت مقدس ہو گیا تھا[1] ۶۳۸ء میں جب حضرت عمرؓ اس شہر میں آئے تو شاید انہی نے ایک سادہ سی عبادت گاہ موریہ پہاڑی پر اینٹ اور شہتیروں سے بنوائی جہاں کسی وقت ہیکل سلیمانؑ کی عمارت تھی اور بعد میں بت پرستوں کا معبد اور پھر ایک مسیحی گرجا بن گیا تھا (عبدالملک کو ضرورت محسوس ہوئی کہ ایسی جامع مسجد بنائے کہ عیسائیوں کے کلیسائے مرقدِ مسیحؑ سے زیادہ شان دار ہو[2] اور حرم مکہ کا مقابلہ کرے (جو اُن دنوں حریفِ خلافت عبداللہ ابن زبیرؓ کے قبضے میں تھا) تاکہ حاجیوں کو اُدھر جانے کی بجائے اِدھر آنے کی ترغیب ہو[3]۔ لہذا یوروشلم کے مذکورۂ بالا مقام پر ۶۹۱ء میں اس نے قبۃ الصخرہ تعمیر کیا جسے (اہل یورپ) غلطی سے مسجد عمرؓ کہنے لگے ہیں) اس طرح یہ گنبد ایسے قطعۂ زمین پر بنایا گیا جو دُنیا کا ایک مقدس ترین ٹکڑا ہے کہ یہودی، اور بت پرست اور نصاریٰ، اور مسلمان سبھی اس سے وابستگی رکھتے ہیں اور یہود و نصاریٰ کی روایتوں میں اسی کو وہ مقام سمجھا جاتا ہے جہاں حضرت ابراہیم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) نے اپنے بیٹے اسحٰقؑ کو قربان کرنے کا قصد کیا تھا[4]۔ گنبد کے گرد کوفی کتابہ کندہ ہے جسے خلیفہ مامون نے ایک مدت بعد محرّف کرنے کی

---

[1] بیت المقدس میں قیامت کے دن محاسبے کے متعلق دیکھو نُویری، ۱ ص ۳۳۴ ۔

[2] مقدسی، ص ۱۵۹ ۔

[3] یعقوبی، ۲ ص ۳۱۲ ۔

[4] (مسلمانوں کے اعتقاد اور تحقیق کی رُو سے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ یہود و نصاریٰ کا دعویٰ غلط ثابت ہو چکا ہے اور یورپ کے محقق خود حضرت ابراہیمؑ کے وجود ہی میں شک رکھتے ہیں۔ دیکھو اِن سائی کلو، برٹا ۔ "ابراہام"۔ مترجم)

کوشش کی تھی[۱]۔ اسلامی تحریروں میں جو آج تک سلامت رہیں یہ بھی ایک قدیم ترین تحریر ہی[۲]۔ عبد الملک نے اُن عمارتوں کے مصالحے سے کام لیا جنھیں شاہ ایران خسرو ثانی ۶۱۴ء میں شکستہ یا بالکل منہدم کر گیا تھا۔ کاریگر بھی مقامی تھے اور ممکن ہی ان میں سے بعض بائی زنطی نسل کے ہوں۔ لیکن بُنا نے نمونوں کے مقابلے میں یہ نقشہ ہی کچھ اور تھا جس میں مرقد مقدس کے کلیسا کی خوشنما چھتری سے بہتر گنبد تیار کرنا اور عمارت میں نگینہ کاری اور دوسری قسم کے گل بوٹے بنانے مقصود تھے[۳]۔ اس اہتمام کا نتیجہ ایک ایسی یادگار عمارت کی شکل میں نمودار ہوا جس کی خوب صورتی کی شان سے بہ مشکل دنیا کی کوئی تعمیر بازی لے جا سکتی ہی۔ مگر مسلمانوں کی نظر میں قبۃ الصخرہ فن کے حُسن و کمال اور آثار صنادید میں امتیاز رکھنے کے باعث ہی قدر و منزلت نہیں رکھتا بلکہ دینِ مُبین کا جیتا جاگتا نشان ہی۔ اس میں کچھ ترمیم اور دُرستی وقتاً فوقتاً بالخصوص ۱۰۱۶ء کے خوف ناک زلزلے کے بعد کی جاتی رہی[۴]، تاہم عمارت کے اصلی نقشے میں فی الجملہ کوئی فرق نہیں آیا اور اس لحاظ سے یہی مسلمانوں کی سب سے قدیم بنا ہی جو آج تک سلامت رہی۔ اس کی سب سے پہلی کیفیت جو ہمیں ملی، ابن الفقیہ نے ۹۰۳ء کے قریب تحریر کی تھی[۵] اور اس کے بعد کی

---

[۱] جیسا کہ انیسویں باب میں ذکر آچکا ہی۔

[۲] قاہرہ کے عربی عجائب خانے میں ایک لوحِ مزار پر، جو وہاں کے پُرانے قبرستان سے نکلی تھی، ۳۱ھ = ۶۵۱-۵۲ء کوفی خط کا ایک کتبہ دست یاب ہوا۔ دیکھو رسالہ الہلال، ۱۹۳۰ء صفحہ ۱۱۲۹۔

[۳] مقدسی ص ۱۵۹۔ ایک انگریز مصنف لکھتا ہی کہ یہ قبۃ بصرے کے کسی قدیم کلیسا کے نمونے پر تھا۔ موہمڈن آرکی ٹیکچر ...." از برگز۔ (اوکسفورڈ ۱۹۲۴ء) ص ۔

[۴] ابن اثیر، ۹ ص ۲۰۹۔ [۵] ص ۱۰۰۔

دوسری تحریر کوئی ۹۸۵ء کی المقدسی کی نوشتہ ہے[۱]

مسجد اقصیٰ

265

(قبۃ الصخرہ کی زیارت گاہ اور پورے حرم کو مسجد اقصیٰ کہتے ہیں)

ہم گزشتہ اوراق میں بتا چکے ہیں کہ عربی کتابوں میں یہ اصلاح اجمالی طور پر یہاں کی جملہ عمارات کے لئے بولی جاتی ہے جن میں خود قبۃ شریف، اور مقابر، زاوئے یا درویشوں کے تکئے، عام سبیلیں سبھی شامل ہیں۔ عبدالملک کے وقت سے لے کر عثمانی سلطان سلیمان اعظم (= "دی میگ نی فسنٹ") کے عہد تک بہت سے اسلامی خلفا نے یہ عمارتیں بنوائیں اور اب وہ کم وبیش چوں تیس ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اصلی معنی میں لفظ اقصیٰ کا اسی مسجد پر اطلاق کیا جاتا ہے جو قبۃ الصخرہ کے پاس ہی عبدالملک نے بنوائی تھی۔ اس کی چنائی میں ایک شکستہ کلیسا کے ملبے سے کام لیا گیا جو پہلے اسی جگہ قائم تھا۔ یہ قیصر جس تی نیان کا بنایا ہوا حضرت مریم کے نام کا کلیسا تھا جسے خسرو ایران منہدم کرا گیا تھا، اور قبے کی تعمیر کے وقت کھنڈر پڑا تھا۔ مسجد اقصیٰ کی تجدید ایک زلزلے کے بعد عباسی خلیفہ منصور نے ۷۷۱ء کے قریب کرائی تھی، پھر عیسائی حملہ آوروں نے حروب صلیبیہ میں ردوبدل کیا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی دوبارہ اسے ملت اسلامی کی تحویل میں لایا (۱۱۸۷ء) اس مسجد کی سب سے قدیم تحریری کیفیت بھی جو ہم تک پہنچی، قبہ شریف کی طرح ابن الفقیہ[۲] اور پھر مقدسی[۳] کی نوشتہ ہے۔

---

۱ ص ۱۶۹۔ ۲ ص ۱۰۰۔ ۳ ص ۱۶۸۔

جامع دمشق

(۷۰۵ء میں عبدالملک کے بیٹے وَلید نے وہ قطعہ زمین لے لیا جہاں اصل میں پہلے عطارد کا مندر تھا، پھر یوحنا ولی کے نام پر "باسلیق" (= درگاہ) بنائی گئی تھی۔ اور یہاں وہ عالی شان مسجد تعمیر کی جو امویوں کے نام سے منسوب ہوئی[1]) ولید کی اس عمارت میں اصلی گرجا کا کتنا حصّہ باقی رہنے دیا گیا، اس کا تعین کرنا مشکل ہے (جنوب کے دو مینار وہاں بنے ہوئے ہیں جہاں مسیحی درگاہ کے گرجا کے بُرج تھے[2]) لیکن شمالی مینار جس سے ماذنے کا کام لیتے تھے، بلاشبہ وَلید نے بنوایا اور آیندہ شام، شمالی افریقہ اور اُندلس کی مساجد میں ماذنوں کا نمونہ وہی قرار پاگیا تھا۔ یہ سب سے پُرانا خالص اسلامی مینار ہے جو آج تک سلامت رہا۔ تین گنبد اور ایک عرض کا دالان جس پر مسجد کا عظیم گنبد اُٹھایا گیا ہے اور ان میں پچی کا کام بھی اسی خلیفہ کی یادگار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے ایران و ہندستان کے کاریگر بُلوائے تھے، اور بائی زنطہ کے قیصر نے یونانی معمار اس کے لئے بھیجے تھے[3] حال میں قدیم مصری کاغذ کے اوراق دریافت ہوئے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصالحہ اور ماہر دست کار مصر سے بھی لائے گئے تھے[4] (تمام دیواریں سنگ مرمر اور نگینوں کی پچی کاری سے مزیّن کی گئی تھیں) جغرافیہ نویس مقدسی دسویں صدی عیسوی

---

[1] حلب، حِمص اور بیروت کی موجودہ چند بڑی بڑی مسجدیں اصل میں پہلے عیسائیوں کے گرجا تھے۔

[2] دیکھو یاقوت، ۲ ص ۵۹۳۔

[3] مقدسی، ص ۱۵۸۔ ابن عساکر، ۱ ص ۲۰۲۔ ابن جُبیر، ص ۲۶۱۔ نیز دیکھو طبری، ۲، ص ۱۱۹۳۔

[4] ایچ آئی بیل: "ڈر اسلام" (۱۹۱۱ء) ۲ ص ۲۶۹ و ص ۳۷۲۔

267 کے اواخر میں یہاں آیا تھا اور زر و جواہر کی نگینہ کاری جن سے طرح طرح کے درخت اور شہروں کے مرقعے بنائے اور خوب صورت کتابے نقش کئے تھے، اُن کی کیفیت لکھ گیا ہے[۱] ان مرقعوں کو بعد کے کسی دین دار خلیفہ نے مستور کرا دیا تھا لیکن ۱۹۲۸ء میں وہ دوبارہ برآمد کر لیئے گئے[۲] (اس مسجد میں ہم پہلی مرتبہ نیم دائرے کی محراب (برائے امام) کا رواج ہوتا دیکھتے ہیں۔ اسی میں گول کمان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مسجد کے نفیس نقش و نگار کی نقل قیروان میں بھی کی گئی تھی جب کہ نویں صدی عیسوی میں ملوک اغلبی نے وہاں کی مسجد جامع کو از سرِ نو تعمیر کرایا۔ جامع اموی پہلے ۱۰۶۹ء میں جل گئی تھی پھر ۱۴۰۰ء میں تیمور نے آگ لگوائی اور آخر میں ۱۸۹۳ء میں یہاں آگ لگی، بایں ہمہ مسلمانوں کے دلوں میں اس کا نقش قائم ہے اور وہ اُسے عجائبات عالم میں چوتھا اعجوبہ شمار کرتے ہیں) اور جیسا کہ اوپر (باب ۱۹) میں بیان ہوا (حرمین شریفین اور بیت المقدس کے بعد اسے دنیائے اسلام کا چوتھا مقدس مقام سمجھتے ہیں)۔

اس مدت کے درمیان جو مدینہ منورہ کی پہلی مبتدیانہ عبادت گاہ اور بیت المقدس اور دمشق کی دو پرتجمل جامع مسجدیں بننے میں منقضی ہوئی مسلمانوں کی مسجد جامع کا ارتقا تکمیل کو پہنچ گیا۔ واضح رہے کہ شروع سے جامع مسجد محض عبادت ہی کی اغراض کے واسطے نہ ہوتی تھی بلکہ سیاسی یا ملکی مقاصد کے لئے مقام اجتماع اور تعلیمی مباحث و افادات کے واسطے

۱؎ ص ۱۵۷۔ نیز دیکھو اصطخری، ص ۵۸۔ ابن رستہ ص ۳۲۶۔

۲؎ مساجد اور جامع دمشق پر دیکھو لری اور وان برچیم کی فرانسیسی کتاب مطبوعہ پیرس ۱۹۳۰ء اور کرس ویل کی "ارلی مسلم آرکی ٹیکچر" (اوکسفورڈ ۱۹۳۲ء) ص ۱۱۹۔

مرکز کا بھی کام دیتی تھی[1]۔ نئی تعمیر میں اب نمازیوں کی جسمانی ضروریات کا پورا انتظام کر دیا گیا کہ (سقفت دروازے اور نماز جماعت کے لئے سایہ دار دالان بن گئے۔ مذہبی ارکان ادا کرنے کی غرض سے مینار، محراب قبلہ اور منبر تیار ہوئے اور باہر طہارت و وضو کے واسطے فوارے یا نل لگا دئے گئے۔) رہیں سیاسی مصلحتیں، تو وہ عمارت کی شکوہ اور اندر تزئین و آرائش کی شان سے بخوبی پوری ہو سکتی تھیں۔ یہ دنیا کے سامنے کھلا ہوا مظاہرہ تھا کہ نئے مذہب کے پیرو کسی بات میں اُن سے ہیٹے نہیں ہیں جو مسیحی ممالک کے عالی شان کلیساؤں میں عبادت کیا کرتے تھے ؛

محلات وقصور

(مذہبی عمارات کے علاوہ تعمیر کے دوسرے میدانوں میں بنی اُمیّہ نے صرف چند یادگاریں چھوڑی ہیں۔ ان میں بڑی وہی صحرائی محلات ہیں جو خاندان خلافت کے شہزادوں نے بنوائے تھے) اکثر خلفا کے بھی، اپنے پیش رو غسانی حاکموں کی طرح مفصلات میں رہنے کے مکانات تھے، بلکہ امیر معاویہ اور عبدالملک کے سوا ان میں سے بہت کم دمشق میں مقیم رہے۔ یہاں اُن کے قصر خضرا[2] کا مشکل سے کوئی حصہ باقی بچا ہو جو بڑی مسجد کے متصل شاہی محل تھا۔ اسی طرح (واسط میں قبۃ الخضرا کے نام سے[3] حجاج نے جو محل بنوایا تھا، اس کا اب کوئی اثر و آثار نہیں ملتا)

[1] زمانہ حال میں مصر و شام میں فرنگی استیلا کے خلاف جو بڑے بڑے ہنگامے ہوئے ان کا آغاز جمعہ مسجدوں کے جلسوں سے ہوا تھا ؛
[2] ابن الاثیر، ۵ صفحہ ۲۲۴۔ اس عمارت کا ہم پہلے (باب ۱۹ میں) ذکر کر چکے ہیں ؛
[3] بلاذری، صفحہ ۲۹۰ ۔ مسعودی: "تنبیہ" صفحہ ۳۶۰ ۔ یعقوبی، صفحہ ۳۲۲ ؛

269 (البتہ صحرائے شام کے حواشی پر جا بہ جا محلات کے کھنڈر بکھرے ہوئے ہیں جو یا تو اصل میں رومی سرحدی قلعے تھے جنھیں اموی معماروں نے مرمت کر کے بنا بنالیا تھا اور یا خود بائی زنطی اور ایرانی نمونوں کے مطابق ان کی تعمیر کی تھی) صحرائے شام کے مشرقی کنارے اور موجودہ عین التمر سے تھوڑے ہی فاصلے پر ایک قصر کے آثار ملے ہیں جسے ال اُخیضر کے جدید نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ لیکن صحت کے ساتھ معلوم نہیں کہ اسے اموی متاخرین نے بنوایا تھا یا ابتدائی عباسیوں نے[1] (صحرا کے جنوب مغربی کنارے پر اموی آثار قدیمہ زیادہ تعداد میں ملتے ہیں۔ یہاں عبدالملک کے بیٹے یزید نے "موقر"[2] کے نام سے ایک محل تعمیر کیا یا مرمت کرایا تھا۔ اس کے تھوڑے سے کھنڈر رہ گئے ہیں۔ اس کے بیٹے ال ولید ثانی کو شکار اور اس سے بھی بدتر لہو و لعب کا شوق تھا، وہ قسطل[3] اور ازرق[4] میں آ کے رہتا تھا۔ یہ دونوں شرق اردن میں قدیم رومی چوکیاں تھیں۔ اسی فرماں روا سے اسی علاقے میں ایک اور محل کی تعمیر منسوب کی جاتی ہے جسے آج کل ال مشتا کہتے ہیں[5] اس نواح میں آثار قدیمہ کے ماہرین نے سب سے پہلے اسی قصر کا معائنہ کیا۔ بنانے والے بادشاہ کی وفات تک یہ عمارت مکمل نہ ہو سکی تھی۔ اس خوش نما قصر کی روکار جس پر اعلیٰ درجے

---

[1] بیل: "پیلیس اینڈ موسک ایٹ ال خیضر" (ادکس فورڈ ۱۹۱۴ء) ص ۱۶۷۔

[2] یاقوت، ۴ ص ۶۸۷۔ یہ محل ال بلقا میں تھا جو مشرقی اردن کا جنوبی ضلع شمار ہوتا تھا۔

[3] لاطینی "کاس ٹیلم" بہ معنی قلعہ ہے۔ یاقوت، ۴ ص ۹۵۔

[4] طبری، ۲ ص ۱۷۴۳۔

[5] بدوی لفظ "مشتیٰ" بہ معنی سرمائی مقام۔

کے نقش ونگار تماشے تھے، اب برلن کے فریڈرک عجائب خانے میں ہے[۵۱] لیکن یہاں کے جملہ محلات میں جن کا پتہ چلا، سب سے مشہور "قصیر عامرہ" ہے (قصیر بمعنی چھوٹا قصر) یہ رودِ اُردن کے مشرق کی طرف بحر لوط کے شمالی کنارے کی سید ھ میں واقع ہے۔ اسے ولید اول نے غالباً ۷۱۲ء تا ۷۱۵ء میں بنوایا تھا اور علمی دنیا پر الوا موزیل نے ۱۸۹۸ء میں اس کا انکشاف کیا[۵۲] "قصیر عامرہ" کا نام بظاہر قریب زمانے میں زبان زد ہوا ہے کیوں کہ عربی کتابوں میں کہیں اس کا پتہ نہیں چلتا۔ اس عمارت میں خاص طور پر ذکر کے لائق عجیب وغریب دیواری تصاویر ہیں جن کا آگے ذکر آتا ہے۔

مصوّری

بہت سے اسلامی علما کی رائے میں انسان اور حیوانات کی صورت گری صرف خلاق مطلق کا کام ہے اور جو بندہ اس میدان میں قدم دھرتا ہے وہ عبدیت کی حدود سے تجاوز کرتا ہے۔ شبیہ سازی ۲۷۱ کے فن سے یہ عداوت کا مذاق، نتیجہ ہے اس کامل توحید کی تعلیم اور بت پرستی کی مانعت کا، جس میں قرآن مجید کسی رعایت کا روادار نہیں اور اس کا صریحی حکم ایک حدیث شریف سے لیا جاتا ہے جو اطلاع دیتی ہے کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے فرمایا قیامت کے دن سب سے سخت سزا پانے والے مصوّر ہوں گے[۵۳] یہاں "مصوّروں" کا لفظ استعمال

---

۵۱ دیکھو بیدنو (مشراس برگ ۱۹۰۸ء) اور شلز کی جرمن کتابیں اسی موضوع پر۔

۵۲ دیکھو اس کی جرمن کتاب: "قصیر عامرا..." (دی آنا ۱۹۰۷ء) موزل کی رائے میں اس قصر کا بنانے والا ولید ثانی تھا۔ نہ کہ اول۔　۵۳ بخاری، ۷، ص۶۱۔

کیا گیا ہے کہ بُت گردوں پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اسی سبب سے کسی مسجد میں کہیں انسانوں کی شبیہ نہیں بنائی جاتی۔ اگرچہ کہیں کہیں محلوں یا کتابوں میں ہم تصویریں بنی ہوئی دیکھتے ہیں۔ ورنہ اسلامی فن کے جملہ آرائشی نقش ونگار ہندسی اشکال یا پھول پھل کی صورتوں سے لئے گئے ہیں۔ اِس میدان میں آگے چل کر مسلمانوں نے جو کمال حاصل کیا اُس کی ایک دلیل لفظ" ارابسک" ہے کہ اکثر یورپی زبانوں میں اسی طرز کے نقش ونگار کے معنی میں بولتے ہیں۔ خاص عرب کے لوگوں میں تو ایسی نقاشی یا تصویر کے فن کا کوئی احساس ترقی نہیں کرسکا تھا۔ جیسا کہ جزیرہ نما کے آثار قدیمہ سے یا عرب کی مساجد و مقابر کے تاریخی حالات پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم جسے اسلامی فن کہتے ہیں، وہ اصل میں منتخب عناصر کا مرکب تھا جس میں زیادہ تر محکوم اقوام کی کاریگری اور بیل بوٹے شامل تھے اگرچہ ان کی تہذیب و ترقی اسلامی سرپرستی میں اور مذہب اسلام کی مقتضیات سے خاص مناسبت کی بنا پر ہوئی؛

مسلمانوں کے (عہد کے) فن تصویر کا سب سے متقدم نمونہ قصیر عامرہ کی دیواری نقاشی ہے جس میں مسیحی نقاشوں کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ یہ اموی بادشاہوں کا شرق اردن میں عیش خانہ اور حمام تھا۔ اس میں چھ حکمرانوں کی تصویریں ہیں۔ انہی میں ایک خود ولید اور ایک ہسپانیہ کا آخری ویسی گوتھ بادشاہ راڈرک ہے جو ولید کی فوجوں سے لڑا تھا۔ دوسری رمزی تصویروں میں فتح، فلسفہ، تاریخ اور شاعری کو ممثل کیا گیا ہے۔ ایک شکار کے منظر میں شیر ببر کو گورخر پر حملہ کرتا دکھایا ہے۔ ناچنے، گانے اور ہنسی دل لگی کرنے والیوں کی کئی ننگی تصویریں بنائی ہیں۔ صناعی میں

قیمتی لباس، کھجوروں، تاکستانوں اور ظروف کے سارے لائق ذکر ہیں ۔ درختوں پر پھل کے خوشے، بلبلیں اور صحرائی پرندے دکھائے گئے ہیں ۔ کتبات بیشتر عربی ہیں، کہیں کہیں کوئی یونانی نام آگیا ہے اسلامی دنیا میں اور کہیں بھی دیواری تصویریں ایسی اچھی حالت میں سلامت نہیں رہیں[۵۱]

موسیقی

قبل از اسلام دور میں اہل عرب کے گیت کئی قسم کے ہوتے
تھے : کاروانی، جنگی، مذہبی اور عشقیہ ۔ ابتدائی مذہبی راگ کے سراغ
حاجیوں کی رسم "تلبیہ"[۵۲] میں باقی رہ گئے جو آج بھی حاجی ادا کرتے
ہیں ۔ شعر کے "انشاد" یعنی لَے سے پڑھ کر سنانے کی یادگار قرآن مجید 72
کی تجوید یا قرات ہے۔ لیکن عربوں کا دل پسند کاروانی نغمہ "حُدی" تھا
اور ان کی نظر میں یہی راگ کی پہلی صورت ہے۔ مسعودی نے یہ افسانہ
نقل کیا ہے[۵۳] کہ حدی کا آغاز اس طرح ہوا کہ نسل عرب کے مورثوں میں

---

۵۱ (موزل کی تحقیقات کے مطابق جس نے یہ قصر دریافت کیا اور اس پر مفصل کتاب لکھی بانی قصر ولید ثانی تھا جو بنی امیہ میں نہایت بدنام بدکردار بادشاہ گزرا ہے ۔ لیکن فاضل مؤلف ان برہنہ تصاویر کی صنعت کا شرف مشہور فاتح اور کامیاب فرماں روا ولید اول کو دینا چاہتا ہے۔ اصل کتاب میں تصویریں بھی صرف برہنہ طوائف کی نقل کی ہے۔ ممکن ہے اس کی تہ میں تعریض کا پہلو ہو لیکن اگر تصویر کشی کا کمال یہی عریانی ہے جس کا منشا عیاشی اور حیوانی جذبات کو تحریک و تقویت دینا ہوتا ہے، تو یہی بات ان علمائے اسلام کے حق میں ایک تائیدی دلیل بن سکتی ہے جنھوں نے اس فن کو مطلقاً ممنوع قرار دیا تھا ۔ مترجم)

۵۲ یعنی کلمہ لبیک، اللھم لبیک ... کہنا جو حاجی بہ آواز بلند پکارتے ہوئے حرم شریف میں داخل ہوتے ہیں ۔

۵۳ ۸ ص ۹۲ ۔

سے ایک شخص مُضَر ابن مَعَد[۵۱] اونٹ سے گرا اور اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا تو وہ اپنی مترنم آواز میں چلّانے لگا: "یا یداہ ، یا یداہ !" (یعنی اے میرے ہاتھ) اور یہ آواز اونٹ کے قدم دھرنے سے مطابقت رکھتی تھی اور اسی (تال) پر وہ چلتا رہا۔ مُضَر کی اسی فریاد سے بحرِ رَجَز پیدا ہوئی جو کاروانی گیتوں میں استعمال ہوتی ہے اور شعر کی سب سے سادہ بحر ہے۔

کچھ شک نہیں کہ جنوبی عرب میں وہاں کی راگ راگنیاں اور موسیقی کے ساز الگ تھے[۵۲] اگرچہ ان کی کیفیت بہت کم معلوم ہے لیکن اُن کے طور طریق کا شمالی عرب اور اس لئے حجازی مسلمانوں تک اثر پہنچا ہو، یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ قبل از اسلام ملک حجاز میں خاص خاص ساز یہ تھے: چوکور طنبورہ یا دف، شہنائی (= قصبہ یا قصابہ) اور بانسری جسے زمر یا مزمار کہتے تھے[۵۳] چمڑے کے تو بنے والے ساز، (مزہر) سے بھی انھیں واقفیت تھی[۵۴] بعثت نبوی کے قریب بعض باہر کے موسیقی اثرات پڑنے لگے تھے۔ غسانی ملوک یونانی پاتروں کے طائفے رکھتے تھے۔ حیرہ میں ایرانیوں کا چوبی ساز (عربی) عُود جس سے انگریزی لفظ "لیوٹ" بنا ہے) چل نکلا تھا۔ وہاں سے حجاز آیا۔ ایک روایت کہتی ہے کہ نضر ابن الحارث ابن کلدہ یہ ساز حیرہ سے لایا اور مکے میں اس کا رواج شروع کیا۔ یہ طبیب اور شاعر گویا تھا جو عوام کو

---

۵۱ دیکھو توراۃ میں "المودو" اخبار۔ ۱: ۲۰

۵۲ مسعودی، ۸ صفحہ ۹۳

۵۳ اغانی، ۲ صفحہ ۱۷۵

۵۴ "عقد" ۳ صفحہ ۲۳۶۔ مسعودی، ۸ صفحہ ۹۳

رجھانے کے لئے قرآن کے مقابلے میں اپنے جاہلی گیت گاتا تھا[1]۔ بعض روایتیں میں یہ کارنامہ ابن سُریج (متوفی تخ ۲۶ ۷ء) سے منسوب کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے یہ ساز سب سے پہلے ایرانی مزدوروں کے ہاتھ میں دیکھا جنھیں خانہ کعبہ کی ازسرِنو تعمیر کے لیے عبداللہ ابن زبیرؓ ۶۸۴ء میں عرب میں لائے تھے[2]۔ کچھ عرصے بعد مُنہ سے بجانے کی ایرانی نَے یا سیدھی نفیری وہیں سے لی گئی اور وہی نام عربی میں داخل کر لیا گیا[3]۔
76 بظاہر دَورِ جاہلیہ میں پیشہ ور گویّا، اکثر عورتیں ہوتی تھیں[4]۔ اغانی میں جو نغمہ و سرود ہی کی کتاب ہے، چند مغنّیہ عورتوں کے نام ابھی تک محفوظ ہیں[5]۔ عرب کے مشہور بہادر صخر کے ماتم میں اُس کی بہن خنسا نے جو نوحے کہے وہ بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ گیتوں کی طرح گائے جاتے تھے۔ خنسا، رسولِ اللہ (صلعم) کے زمانے میں تھی اور عرب کی سب سے بڑی شاعرہ مشہور ہے۔ قبل از اسلام بیش تر شعرا بظاہر اپنا کلام گا بجا کر سنانے ہی کے لیے تصنیف کرتے تھے۔

پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسّلام) نے جو شعرا کی مذمّت کی[6]، وہ شعرگوئی کے باعث نہ تھی بلکہ اس لئے کہ (وہ عقائدِ کفر کے ترجمان تھے)[1]۔ آپؐ نے ممکن ہے موسیقی کو بھی اسی بنا پر ناپسند فرمایا ہو کہ وہ بت پرستوں کی مذہبی رسوم سے تعلق رکھتی تھی[2]۔ ایک حدیث کی رو سے آپؐ سے یہ قول منسوب

---

[1] خیال کیا جاتا ہے کہ سورۂ لقمان کی آیہ کریمہ ۳۱: ۶ میں اسی شخص کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

[2] اغانی، ۱، ص ۹۸۔

[3] جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی (لندن ۱۹۲۹ء) ص ۱۱۹۔

[4] ایضاً، ص ۱۲۳۔　[5] ایضاً، ۱۲، ص ۱۳۱۔

[6] سورۂ شعرا: ۲۲۴۔

کیا جاتا ہے کہ موسیقی کے ساز شیطان کے موذن ہیں اور اسی کی پوجا کے لئے لوگوں کو پکارنے کا کام کرتے ہیں[1] اکثر مسلمان علما اور فقیہ موسیقی کو بری نظر سے دیکھتے ہیں۔ بعض ہر اعتبار سے ناجائز قرار دیتے ہیں۔ بعض نے حرمت کی بجائے اسے شرعاً مکروہ کہا ہے۔ لیکن عوام کی رائے کا اظہار اس مثل میں زیادہ اچھی طرح ہوتا ہے کہ "شراب جسم ہے، موسیقی روح اور مسرت ان کی بیٹی ہے"[2]

جس وقت دین کا وہ رعب جو اسلام نے اوّل اوّل دلوں میں پیدا کیا تھا۔ کم ہونے لگا تو حجاز کا عمرانی میلان آرائش و زیبائش کی طرف پھر گیا، خصوصاً حضرت عثمان کے زمانے میں جو دولت اور نمائش کا ذوق رکھنے والے پہلے خلیفہ تھے۔ پھر آواز اور ساز کے درمیان ہم آہنگی سیکھی گئی۔ فنی یا اعلیٰ درجے کا گانا حجاز میں رائج ہو گیا جسے عربی مصنف "الغناء المتقن" یا "الرّقیق" کہتے ہیں، اس میں ترنم کو موسیقی کی تال سُر (= ایقاع) کا پابند کیا جاتا ہے اور یہ گانے کی نہایت ترقی یافتہ صورت ہے۔ پھر پہلی مرتبہ پیشہ ور گانے والوں کا ظہور ہوا جو "مخنثوں" (یعنی زنانوں) کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں مہندی لگاتے اور عورتوں کی سی حرکتیں کرتے تھے۔ انہی میں مدینے کا طویس (= چھوٹا طاؤس۔ ۶۳۲ تا ۷۱۰ء) گزرا ہے جسے اسلامی دور میں گانے کا بانی مبانی سمجھتے ہیں۔ خیال کیا

---

[1] دیکھو نویری: "نہایہ" ج ۴ صفحہ ۱۳۲۔ فارمر: "اے ہسٹری آف عرب میوزک" صفحہ ۲۴۔ ودین پینک: "اے ہینڈ بک ... ٹریڈیشن" (لائیڈن ۱۹۲۷ء) صفحہ ۱۴۳۔

[2] ثعالبی صفحہ ۱۴۸۔ نیز دیکھو نویری، ج ۴ صفحہ ۱۳۸ (خدا معلوم مؤلف کی مراد کن "عوام" سے ہے۔ مسلمان عوام پر اس کا یہ "حسنِ ظن" صادق نہیں آتا۔ مترجم)

جاتا ہے کہ عربی گانے میں تال سُر اسی نے ایجاد کیے اور وہی پہلا شخص تھا جو طنبور کے ساز کے ساتھ عربی گیت گاتا تھا[1]۔

ان عرب (مسلمان) گویوں کی پہلی پشت، جس کا سرگروہ طویس تھا، تمام تر بیرونی نجوں پر مشتمل تھی۔ البتہ طویس شاگردوں کی ایک کھیپ تیار کر گیا، جن میں ابن سُریج سب سے ممتاز ہے (تخ ۶۳۴ تا ۷۲۶ء) یہ اسلامی دنیا کے چار بڑے گویوں میں شمار ہوتا ہے[2]۔ ایرانی عود کے عرب میں رواج دینے کا فخر حاصل کرنے کے علاوہ، روایت میں چھڑی سے سازندوں کو تال سُر بتانے کا آغاز بھی اسی سے منسوب کیا گیا ہے۔ ابن سُریج ایک ترک زادہ، آزاد کردہ غلام تھا اور اسے حضرت امام حسینؓ کی مشہور خوب صورت صاحب زادی سکینہ کی سرپرستی میسر تھی۔ اس کے استادوں میں مکہ معظمہ کے ایک حبشی مولا سعید ابن مسجح (یا مُسجح، متوفی تخ ۷۱۴ء) کا نام بھی آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سعید جو مکے کا پہلا مطرب اور شاید اموی دور کا بہترین گویا تھا، شام و ایران کی سیاحت کر چکا تھا اور سب سے اول اسی نے رومی اور ایرانی راگ عربی میں داخل کیے تھے[3]۔ بظاہر یہی شخص ہے جس نے عرب کے اصول غنا اور نیچے راگ کو باضابطہ مرتب کیا۔ اس کا ایک شاگرد الغریض تھا[4]۔ یہ دو غلا بربری تھا۔ اس کی حضرت سکینہ کے غلام کی حیثیت سے ابن سُریج نے بھی تعلیم تربیت کی[5] اور اپنے اُسی استاد کے بعد وہ دنیا کے

---

[1] اغانی، ۲ صـ۱۷۰۔ [2] ایضاً، ۱ صـ۹۸۔

[3] اغانی۔ ۳ صـ۸۴۔ [4] اس کا نام عبدالملک تھا۔ "غریض" کے معنی اچھا گویا۔

[5] ، ۱ صـ۹۹۔

اسلام کے چار گویّوں میں سے دوسرا بہترین گویّا ہونے کا قابلِ رشک امتیاز رکھتا ہے۔ باقی دو کے نام یہ ہیں: (۱) ابن محرز (متوفی تخ ۷۱۵ء) کہ ایرانی نسل سے تھا اور عوام الناس میں "عربوں کا جھانجی" (= صنّاج) کہلاتا تھا[1] اور (۲) معبد ایک مدنی، نیم فرنگی حبشی (متوفی ۷۴۳ء) کہ ولید اوّل، یزید ثانی اور ولید ثانی کے درباروں میں بہت مقبول رہا[2]۔ دارالخلافت میں سکونت اختیار کرنے سے قبل معبد سارے عرب میں گشت لگا چکا تھا۔ (موسیقی کی) اس پہلی پشت کی "قیان" یعنی مغنیہ عورتوں میں جمیلہ سب کی رانی تھی (متوفیہ تخ ۷۲۰ء)[3] یہ مدینے کی آزاد کنیز تھی جس کا گھر تکے مدینے کے نامی مطربوں اور گویّوں کا مرجع بن گیا تھا۔ ان میں بہت سے جمیلہ کے شاگرد تھے۔ سامعین میں جو اکثر جمیلہ کی محفل میں آتے، غزل گو عمر ابن ابی ربیعہ سب سے ممتاز ہے۔ اس کے شاگردوں میں حبابہ اور سلامہ وہ دو کنیزیں بھی شامل تھیں جنھیں یزید ثانی بہت چاہتا تھا۔ جمیلہ کی بوقلموں زندگی کا طرّہ یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑی دھوم دھام سے حج کرنے چلی تو زن و مرد گویّوں، مطربوں، دوست آشناؤں کی فوج کی فوج لباس فاخرہ پہنے پر تکلف ساز و یراق کی سواریوں میں اس کے جلو میں تھی[4]۔

کبھی کبھی کے جلسے اور اچھے اچھے گانے کی محفلیں جو امیر امرا

---

[1] ایضاً ص ۱۵۱۔ [2] " ص ۱۹۔
[3] " ص ۱۲۳۔ [4] " ص ۱۳۵۔ (مؤلف کو شاید یاد نہیں رہا کہ حج کے لئے احرام باندھنا لازم ہے۔ اور اس میں لباس فاخرہ کی گنجائش بہت کم رہ جاتی ہے۔ اس کی مذکورہ بالا روایتوں کا ماخذ کتاب الاغانی ہے جس کی تعریف ہم پہلے سن چکے ہیں۔ مترجم)

کی بیویوں کے گھروں میں ہوتی تھیں، ان میں نو آموز اور شوقین لوگ جوق در جوق جمع ہوتے تھے۔ حیرہ کے راستے ایران کا چوبی عُود حجاز میں پہنچ گیا تھا اور اب چمڑے کے تونبے والے عُود کی جگہ لیتا جاتا تھا۔ ایک اور تار والا ساز جو مقبول ہوا، مِعزَفہ یعنی ایک قسم کا دوتارا تھا۔ منہ سے بجنے والے ساز میں شہنائی (قصبہ) اور مزمار (یا بانسری) کے علاوہ بُوق (یا نرسنگھا) بھی شامل ہے۔ ہاتھ سے بجنے والوں میں، چوکور طنبورہ یا دف زیادہ تر عورتیں پسند کرتی تھیں اور ڈھول (طبل) اور جھانج (= صُنوَج) مذکور ہیں۔ گانے کے سُر جو جانتے تھے وہ شاگردوں کو زبانی سکھا دیتے تھے اس لئے اب اُن کا بالکل سُراغ نہیں ملتا۔ اغانی میں بہت سے اشعار موجود ہیں جن کی اموی دَور میں دُھنیں تیار کی گئی تھیں لیکن ان میں سے کوئی ہمارے لئے محفوظ نہیں رہی؛ ایک مرتبہ عراقی گویوں کا استاد حُنین، جو حیرہ کا باشندہ اور مذہبًا عیسائی تھا، حجاز آیا تو سیدہ سُکینہ کی حویلی میں اسے سُننے کے لئے اس کثرت سے لوگ جمع ہوئے کہ ڈیوڑھی کی چھت جہاں یہ محفل تھی، گر پڑی اور یہ نامی اُستاد بھی اسی حادثے میں جان سے گیا۔[1] سالانہ حج کے زمانے میں جب کہ تمام اسلامی دنیا کے مشاہیر و اکابر دُور دُور سے حجاز آتے تھے، حجازی گویوں کو اپنے کمالات دکھانے کا موقع ملتا تھا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ خاص خاص وقتوں پر قافلوں کی پیشوائی کے لئے جاتے اور راستے میں اپنا گانا سناتے تھے۔ اغانی میں ہم ایک اس قسم کی کاروانی منڈلی کی کیفیت پڑھتے ہیں[2] جس میں اس عہد کے شاعرانہ مذاق کا نمائندہ،

۱؎ اغانی، ۲، ص ۱۲۷۔　۲؎ ۵، ۱، ص ۱۰۲۔

عمر ابن ابی ربیعہ بہترین لباس میں پیش پیش تھا اور راستہ چلنے والیوں سے چھیڑ کرتا جاتا تھا۔ اسی کے ساتھ ابن شریح (ابن ابی ربیعہ کے) اشعار گا رہا تھا کہ اس گانے سے زائرین کی توجہ اُدھر بٹ جاتی اور مراسم زیارت ادا کرنے میں خلل واقع ہوتا تھا۔[۵۱]

غرض اموی عہد میں مکّہ معظمہ اور زیادہ خصوصیت کے ساتھ مدینۂ منورہ گیت کا گہوارہ اور موسیقی کا مخزن بن گئے تھے[۵۲] اسی خصوصیت کی بنا پر ان شہروں سے گانے والے روز افزوں تعداد میں دربار دمشق کی طلب پوری کرنے جاتے تھے۔ قدامت پسند اور علمائے دین ہرچند اعتراضوں کی بوچھار کرتے، گانے بجانے کا قمار و مے خواری کے ملاہی یعنی ممنوعہ اسباب عیش سے تعلق بتاتے، پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی احادیث سناتے[۵۳] جن میں یہ تفریحات شیطان کے انسان کو گمراہ کرنے کا سب سے قوی ذریعہ قرار دی گئی ہیں، لیکن یہ سیلاب رو کے نہ رُکتا تھا۔ فنون لطیفہ کی لوگوں میں قدر و منزلت اتنی بلند تھی کہ ان لفظی حملوں سے پست نہ ہوسکتی تھی۔ پھر ان فنون کے دل دادہ نبی کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) کی ایسی ہی زبردست حدیثیں روایت کرتے 275 تھے جن سے شاعری موسیقی اور سماع کی حمایت میں حجت پیش کی جاسکتی

۵۱ (حج کر کے مدینے آنے والوں کی پیشوائی کو شہر والے باہر تک آتے اور حمد و نعت یا تہنیت کے گیت گاتے ہوئے شہر میں لاتے تھے۔ مؤلف یا اس کے ماخذ نے اسے عام گانے کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے کہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ یوں بھی اس باب میں اکثر روایتیں اس نے بہت ضعیف و نامعتبر جمع کی ہیں جنھیں کوئی تاریخی وقعت نہیں دی جاسکتی۔ مترجم)

۵۲ "العقد" ۳ ص۲۳۷

۵۳ غزالی نے ان کو بھی "احیاء العلوم الدین" میں نقل کیا ہے۔ ۲ ص۲۳۸ (قاہرہ ۱۳۳۴ھ)

تھی کہ ہر حالت میں ان سے اخلاق کا بگڑنا لازم نہیں آتا بلکہ یہ باہمی معاشرت میں نفاست اور مرد و زن کے تعلقات میں علویت پیدا کرنے میں حصّہ لیتے ہیں[1]۔ جیسا کہ اوپر بیان ہُوا، دربار دمشق میں سرود و ساز کا آغاز یزید اوّل نے کیا جو کہ خود بھی شاعر تھا[2]۔ اسی نے شاہی محل میں عیش و طرب کے جلسے کرنے کی طرح ڈالی جن میں گانا اور شراب دونوں چلتے تھے اور اُس کے بعد سے مسلمانوں میں برابر لازم و ملزوم چلے آتے ہیں[3]۔ عبدالملک نے حجازی مطرب ابن مسجح کی سرپرستی کی۔ اس کا بیٹا ولید فنون لطیفہ کا مربّی تھا۔ اس نے ابن سریج اور معبد کو پائے تخت میں بلایا اور بڑا اعزاز اکرام کیا۔ زاہد خشک عمر ابن عبدالعزیز کا جانشین یزید ثانی ہوا جس نے حبابہ اور سلامہ کے ذریعے پھر شعر و موسیقی کو قبول عام دلوایا[4]۔ ہشام کی عنایات کا مورد حیرہ کا مطرب حُنین تھا۔ عیش پرست ولید ثانی خود عُود بجاتا اور گیت کہتا تھا۔ مطرب گویّے اس کے دربار میں ہاتھوں ہاتھ لئے جاتے تھے۔ انہی میں معبد شامل اور مشہور ہے[5]۔ اسی بادشاہ کے عہد میں حجاز کے شہروں میں موسیقی کا عروج ہوا۔ امویوں کے آخری زمانے میں موسیقی کو فروغ دینے کا شوق یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ ان کے دشمن یعنی بنی عباس کے حامی اسے بھی "بد مذہب غاصبوں" کے حکمراں خاندان کے خلاف اپنی تبلیغ کی ایک کارگر حجّت بناتے تھے؛

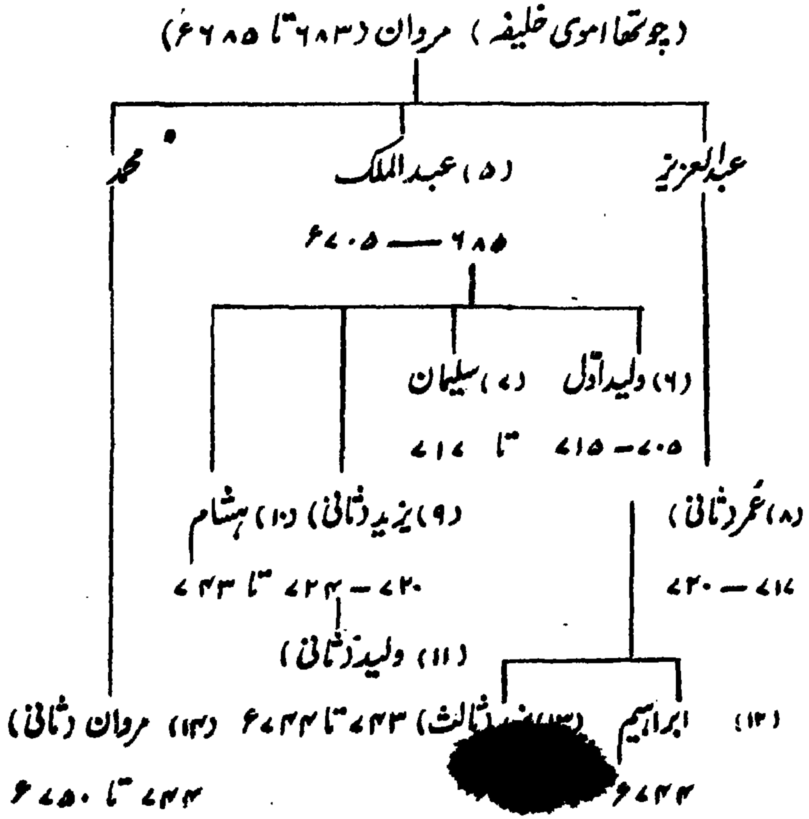
---

[1] "عقد" ۳ صفحہ ۲۲۵؛
[2] اغانی - ۱۶ صفحہ ۷۰ نیز مقابلہ کرو مسعودی، ۵ صفحہ ۱۵۶ سے؛
[3] دیہہ بھی مؤلف کا صریح مبالغہ ہے۔ بہت سے مسلـ [redacted] شراب سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے (مترجم)
[4] مسعودی - ۵ صفحہ ۴۴۶؛
[5] ایضاً - ۶ صفحہ ۴؛

باب بست و دوم 279

اموی خاندان کا زوال اور خاتمہ

اموی خاندان کی مروانی شاخ کے خلفا کا شجرہ حسب ذیل ہے :-



عرب مؤرخ ہشام کو اونچا مرتبہ دیتے ہیں اور جیساکہ پہلے بیان ہوا

اُسی کو امیر معاویہ اور عبدالملک کے بعد بنی اُمیّہ کا تیسرا اور آخری مدبّر بتاتے ہیں۔ اُن کی رائے درست ہے کیوں کہ ہشام کے باقی چار جانشینوں میں سوائے مروان کے، باقی سب اوباش اور مسخ فطرت نہیں تو سخت نااہل ضرور ثابت ہوئے۔ ہشام سے قبل ہی ان خلفا نے یہ عادت اختیار کی تھی جس کی پہلی مثال یزید ثانی تھا، کہ قرآن کی بجائے شعر و موسیقی میں محو رہتے اور امور جہاں داری کی جگہ شراب و شکار میں وقت گزارتے تھے۔ اسی زمانے میں خواجہ سراؤں کا نظام پوری طرح تیار ہوا جس سے "حرم سرا" کا جداگانہ ادارہ بنا ممکن ہوا۔ دولت کی افراط اور غلاموں کی حد سے بڑھی ہوئی بہتات نے عیش پرستی اور تن پروری کا سامان کثیر فراہم کر دیا۔ شاہی خاندان تک خالص عربی خون کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا۔ ملت اسلامی کا پہلا بادشاہ جو کنیز کے پیٹ سے پیدا ہوا یزید (ثالث) تھا[1] (۱۲۶ھ؍۷۴۴ء) اس کے دو جانشین بھی آزاد کردہ لونڈیوں کے بطن سے تھے[2]۔ حکم راں طبقے میں یہ خرابیاں اخلاق کی عام ابتری کی صریحی علامتیں تھیں صحرائے ۲۸۰
عرب کے بچوں کو تمدن کی مخصوص آفتوں نے، جو شاہد و شراب، رقص و سرود پر مشتمل ہیں، آگھیرا تھا اور نوخیز عرب قوم کے قوا میں گھن لگانا شروع کر دیا تھا۔

---

۱ طبری، ۲ صفحہ ۱۸۷۴۔ یعقوبی وغیرہ۔ نیز دیکھو کتاب کا باب ۲۶ جس میں عباسی خلفا کے خون میں آمیزش کا ذکر ہے۔

۲ یعقوبی، ۲ صفحہ ۴۰۳۔

قیسی اور یمنی کی نزاع

عرب کی قومی زندگی کی قدیم اور عادی کمزوری، انفرادیت کا غلبہ اور قبیلہ پرستی (عصبیت) اور باہمی جھگڑے تھے۔ ان خرابیوں نے پھر منہ نکالنا شروع کیا۔ وقت کے ساتھ دین اسلام نے جو بندھن تیار کیے تھے کہ ان مرکز گریز قوتوں کو جو قوم کے خمیر میں پڑی تھیں، قابو میں رکھیں، وہ قوم کے دُور دُور تک پھیل جانے اور تنظیم کا پیمانہ نہایت وسیع ہوجانے کے باعث، اب ڈھیلے پڑتے جاتے تھے۔ خاندانی پاس داری کی روح جسے مذہب نے دبائے رکھا تھا، حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت سے پھر ہاتھ پاؤں نکالنے لگی تھی۔

شمالی عرب کے کئی قبیلے آغاز اسلام سے پیش تر ملکِ عراق میں اٹھ آئے تھے اور دجلے کے کنارے انھوں نے دیارِ ربیعہ یعنی قبیلۂ ربیعہ کی بستی اور فرات کے کنارے "دیار مضر" آباد کیے تھے۔ بنی مضر میں سب سے ممتاز شاخ قیسیوں کی مانی جاتی تھی۔ دوسری طرف شام کے علاقے میں جو عربی قبائل آکر بسے وہ اصلاً جنوبی عرب سے آئے اور اس لیے یمنی کہلاتے تھے۔ شام کے اس یمنی گروہ کا ایک سربرآوردہ قبیلہ بنی کلب تھا۔ ایران کے شمال مشرق میں عرب آبادکار بیش تر بصرے سے آئے جس کا مطلب یہ کہ وہ شمالی عرب کے لوگ تھے۔ فرات کے قیسیوں کی طرح ان آبادکاروں میں قبیلہ تمیم سرگروہ تھا۔ خراسان کا یمنی گروہ اپنے نامی قبیلے کے نام

سے ازدی کہلانے لگا تھا۔ دوسرے ممالک میں قیسیوں کو نزاری اور مَعدی بھی موسوم کرتے تھے[۱] مگر ان کے نام جو کچھ بھی ہوں، ان میں اصلی حدِ فاصل شمالی اور جنوبی عرب ہی کی بنا پر کھینچا جاتا تھا۔ شمالی عرب اپنا نسب حضرت اسمٰعیلؑ تک لے جاتے اور مجموعی طور پر اپنے آپ کو عدنانی کہتے تھے۔ ان کی سرشت میں کوئی نسلی غرور اس قدر گہرا جما ہوا تھا کہ وہ جنوبی عربوں کے قحطانیوں سے پوری طرح کبھی شیر و شکر نہ ہو سکے۔ یہ قحطان جس تک اہل جنوب اپنا نسب پہنچاتے تھے، توراۃ کی کتاب آفرینش میں "جوک تن" کے نام سے مذکور ہے۔ (۱۰ : ۲۵ و مابعد) غرض شمال کے قیسی اور جنوب کے یمنی رفتہ رفتہ دو سیاسی گروہوں کی صورت اختیار کرنے لگے

اموی خاندان کے بانی امیر معاویہ نے اپنا شامی تخت یمنی قبائل کے کندھوں پر اٹھوایا تھا۔ ان کے بیٹے اور جانشین یزید نے کہ خود
اس کی ماں یمنیوں کے قبیلۂ بنی کلب کی میسون تھی، اپنی شادی 281
اسی قبیلے میں کی تھی۔ قیسیوں کو حسد ہوا اور انھوں نے یزید کے بیٹے معاویہ ثانی کی اطاعت قبول نہ کی بلکہ بنی امیہ کے حجازی حریف ابن زبیر کے ساتھ ہو گئے۔ جب کلبیوں نے مرج راہط کے میدان میں قیسیوں کو کامل شکست دی (۶۸۴ء) تو حکومت مروان کے حق میں مسلم ہو گئی جو بنی امیہ کی مروانی شاخ کا مورث ہوا۔ مگر اسی کے پوتے ولید اول کے عہد میں قیسیوں کی قوت حجاج کی بدولت نہایت عروج پر پہنچی

---

[۱] قبائل عرب کے متعلق دیکھو ابن درید کی کتاب "الاشتقاق" نیز وسٹن فیلڈ کی جرمن کتابیں ان کے شجروں پر (مطبوعہ گوٹن جن ۱۸۵۲ء و ۵۳ء)

جس کے معین و معاون اس کا ابن عم محمد ابن قاسم فاتح ہندوستان، اور وسط ایشیا کو زیرنگیں لانے والا قتیبہ، تھے۔ ولید کا جانشین بھائی، سلیمان یمنیوں کا حامی تھا۔ اگرچہ یزید ثانی اپنی مضریہ ماں کے اثر سے قیسیوں کا مربی بن گیا۔ اور ولید ثانی کا میلان بھی یہی رہا لیکن یزید ثالث نے اس بادشاہ (ولید ثانی) سے حکومت جبرًا چھینی تو اس میں یمنی فوج ہی کا اسے آسرا لینا پڑا۔ بہرحال، امویوں کے آخر زمانے میں معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ ساری سلطنت کی متفقہ تائید سے حکومت کرنے کی بجائے ایک خاص فریق کا سردار رہ گیا تھا[۵۱]۔

قیس و یمن کی یہ تفریق جو اور کئی ناموں کے پیرائے میں سامنے آتی ہے، اسلامی دنیا کو پوری طرح دو حصوں میں تقسیم کر گئی۔ اس نے خاندان بنی امیہ کے زوال میں سرعت پیدا کی اور اس کے بُرے نتائج سالہا سال تک دُور دُور کے اقطاع میں ظاہر ہوتے رہے۔ خود دمشق کے علاقے میں دو سال تک بے رحمانہ جنگ کا بازار گرم رہا اور بتایا جاتا ہے کہ اس کا سبب سوائے اس کے کچھ نہ تھا کہ ایک معدی نے کسی یمنی کے باغ سے خربزہ چرا لیا تھا۔ دور دست اندلس کے ضلع مورقیہ (= مرسیا) میں کئی برس خون کی ندیاں بہائی گئیں، محض اس بنا پر کہ کسی مضری نے ایک یمنی صحن سے انگور کا پتہ توڑ لیا تھا[۵۲]۔ اسی نسلی نزاع نے دو سیاسی گروہوں کی صورت اختیار کر لی تھی جو ایک دوسرے کو کھائے جاتے تھے اور اس کا اثر نہ صرف پائے تخت دمشق میں بلکہ

---

۵۱ ابوالفدا، ۲ ص ۱۴۱۔

۵۲ ابن عذاری: "بیان" ۲ ص ۸۴۔

ولایات ایران وعرب، سندھ کے کنارے، صقالیہ کے سواحل پر، صحرائے افریقہ کے حواشی میں، محسوس ہوتا تھا۔ یہی فرقہ بندی مسلمانوں کے فرانس میں بڑھتے ہوئے قدم پکڑ لینے میں ایک قوی زنجیر ثابت ہوئی اور اسی نے خلافت اندلس کو تنزل کا منھ دکھایا۔ لبنان و فلسطین میں اس جھگڑے نے اتنا طول کھینچا کہ ہمارے زمانے تک یہ حی وقائم چلا آتا ہے کیوں کہ ہمیں صحت سے معلوم ہے کہ اٹھارویں صدی کے ابتدائی حصے تک برابر ان فریقوں میں جم کر میدانی معرکے ہوتے تھے۔

جانشینی کا مسئلہ

ملت اسلامی میں اس واقعے نے بھی کچھ کم اختلال پیدا نہیں کیا کہ تخت خلافت کی وراثت کا کوئی قطعی اور مقررہ قاعدہ نہ تھا۔ امیر معاویہ نے بڑی دانش مندی اور دور بینی سے کام لے کر بیٹے کو نامزد کرنے کا طریقہ جاری کیا تھا لیکن عربوں کا دقیانوسی قبائلی اصول (کہ درازی عمر کے لحاظ سے جانشین مقرر ہو، فرماں روا کی طبعی خواہش میں ذکر بیٹے کو وارث بنایا جائے) برابر رکاوٹ ڈالتا رہا۔ چناں چہ تخت حاصل کرنے کا یقینی معیار یہ ہو گیا کہ عوام جس کی اطاعت قبول کریں، وہی فرماں روا ہو۔ بنی امیہ کے چودہ خلفا میں صرف چار ایسے ہوئے ہیں جن کے بعد ان کا بیٹا جانشین خلافت ہوا۔ یعنی امیر معاویہ، یزید اول، مروان اول اور عبدالملک۔ اس پیچیدہ مسئلے میں مزید پیچیدگی یہ نظیر پیدا کرتی تھی کہ مروانی شاخ کے بانی (مروان اول) نے اپنے بیٹے عبدالملک کو وارث نامزد کرنے کے ساتھ، اس کے بعد اپنے دوسرے فرزند عبدالعزیز

کو وارث خلافت قرار دیا[ل] جب اقتدار کی باگ عبدالملک کے ہاتھ میں آئی تو اُس نے قدرتی طور پر یہ کوشش کی کہ عبدالعزیز کی وراثت اُڑا دے اور اپنے بیٹے ولید کو جانشین بنائے۔ مزید برآں دوسرا جانشین بھی اُس نے اپنے دوسرے بیٹے سلیمان کو نامزد کر دیا[ل]۔ ولید نے اپنی باری آنے پر چاہا تھا کہ بھائی کا حق سوخت کرے اور اپنے فرزند کو تخت پہ لائے لیکن یہ کوشش نہیں چل سکی۔ بہر حال، ظاہر ہو کہ ایسے داؤ پیچ خاندان کے دوام اور استحکام کے لئے مفید نہ ہو سکتے تھے۔

ادھر اب شیعہ گروہ پہلے سے بھی زیادہ سرگرم کار ہو گیا تھا۔ یہ لوگ بنی اُمیہ کو غاصب سمجھتے تھے اور حضرت علیؓ اور حسینؓ کے ساتھ امویوں نے جو ظلم کیا اسے کسی طرح معاف نہ کرتے تھے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی اولاد سے اُن کی دلی عقیدت نے عام طور پر انہیں مسلمانوں کی طرف داری کا مرجع بنا دیا تھا۔ پھر وہ لوگ جنھیں بنی اُمیہ کی حکومت سے کوئی سیاسی، معاشی یا معاشری شکایت پیدا ہوتی، اکثر انہی مخالف شیعوں سے آملتے تھے۔ عراق کی آبادی میں اُن دنوں اکثریت شیعہ ہو گئی تھی لہذا وہاں کے باشندوں کی شامی خلافت سے بینائے مخاصمت کہ ملک عراق (خلفائے دمشق کے باعث) آزادی سے محروم کیا گیا، اب ایک مذہبی مخالفت بن گئی۔ ادھر سنیوں کی صفوں میں ارباب تقویٰ امویوں کو دنیا پرستی اور قرآن و حدیث کے احکام سے بے پرواہی کا الزام دیتے تھے اور جو کوئی بھی ان کی مخالفت پہ استادہ ہو، اسے ہر جگہ مذہبی اجازت دینے پہ تیار رہتے تھے۔

ل یعقوبی، ص۳۳۴۔

عباسی دعویٰ دار

ایک اور تخریبی قوت یہ مصروفِ عمل تھی کہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ایک چچا عباس رضؓ ابن عبدالمطلب ابن ہاشم کی اولاد نے تختِ حکومت کے لیے اپنا حق جتانا شروع کیا۔ وہ بنی اُمیہ سے مخالفت میں علویوں کے ہم آہنگ ہو گئے مگر چالاکی سے بنی ہاشم کے حقوق پر زور دیتے تھے۔ شیعہ فرقہ بنی ہاشم سے اوّلاً اولادِ علی رضؓ مراد لیتا تھا لیکن عباسیوں نے اپنے آپ کو قریش کی ہاشمی شاخ کے 283 افراد کی حیثیت سے جو بنی اُمیہ کی نسبت جناب رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قریب کا رشتہ رکھتے تھے، خلافت کے حق داروں میں شامل کر لیا۔[۱]

یہ دیکھ کر کہ امویوں سے عام ناراضی پھیل رہی ہے، بنی عباس نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دینِ حقہ کے حامی بن کر میدان میں آئے اور تھوڑے ہی عرصے میں مخالفین بنی اُمیہ کے سرگروہ اور تحریک کے علم بردار بن گئے۔ دعوت کا مرکز اور اپنا صدر مستقر حُمیمہ کو منتخب کیا۔[۲] جو بحرِ لوط کے جنوب میں چھوٹا سا گاؤں تھا، ظاہر میں دنیا سے الگ تھلگ، بے ضرر، گم نام سا مقام، لیکن حقیقت میں جنگی نظر سے کاروانی شاہ راہ اور حاجیوں کے راستوں کے نقطۂ اتصال سے قریب

---

[۱] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے والد عبداللہ اور حضرت علی رضؓ کے والد ابو طالب کے ایک بھائی عباس تھے اور یہ تینوں عبدالمطلب کے بیٹے اور ہاشم کے پوتے تھے۔

[۲] یعقوبی، ۲، صفحہ ۳۵۶۔ "فخری" صفحہ ۱۹۲۔ طبری، ۳، صفحہ ۳۳۔ یاقوت، ۲، صفحہ ۳۴۲۔ نیز دیکھو موزل: "ناردرن حجاز" صفحہ ۵۹ اور اس کا منسلکہ نقشہ۔

تھا۔ یہیں اسلامی سیاسیات کی سب سے پہلی اور سب سے گہری تبلیغی تحریک کی بساط جمائی گئی ؀

خراسانی حلیف

غیر عرب مسلمانوں میں عام طور سے اور ایرانی مسلمانوں میں خصوصیت سے، حکومت سے ناراض ہونے کی معقول وجوہ تھیں۔ انھیں عرب مسلمانوں سے معاشرت اور معاشی خوش حالی میں متوقع مساوات تو کیا ملتی، محض موالی کا سا مرتبہ رہ گیا تھا۔ بلکہ بعض اوقات غیر مسلموں سے جو جزیہ لیا جاتا تھا، اسلام لانے کے بعد بھی وہ اس سے مستثنیٰ نہیں کیے گئے تھے۔ انھیں زیادہ ناگواری اس خیال سے ہوتی تھی کہ وہ عربوں سے بہتر و قدیم تر تہذیب کے وارث تھے اور خود عربوں کو بھی اس بات کا اعتراف تھا۔ انہی دِل برداشتہ نومسلموں میں شیعی اور عباسی تبلیغ کا بیج خوب پھوٹا پھلتا تھا۔ ملک عراق ہمیشہ سے علوئین کا وفادار تھا۔ وہیں سے شیعہ مذہب ایران پہنچا اور خصوصیت کے ساتھ ایران کی شمال مشرقی ولایت خراسان میں اس نے جڑ پکڑ لی۔ خراسان آج کل کی نسبت اُن دنوں کہیں بڑا صوبہ تھا۔ مخالفت پھیلنے کی ایران میں ایک اور وجہ یہ ہوئی کہ اَزد و مُضر کی نسلی مخالفت عربوں میں دوامی ہوگئی تھی۔ اس نے خانہ جنگی کا راستہ ہموار کر دیا۔ لیکن اس سے بھی گہرے اسباب اندر ہی اندر کام کر رہے تھے اور شیعہ اسلام کے پردے میں ایرانی وطنیت پھر زندہ ہو رہی تھی ؀

خاندان بنی اُمیّہ کی زندگی کے آخری گھنٹے پر موگری اس وقت

پڑی جب کہ شیعیان علی، خراسانی اور عباسی فوجوں میں اتحاد کا معاہدہ ہوگیا، جسے عباسیوں نے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔ جتھے کا سرگروہ 84.
ابوالعباس رسول اللہ صلعم کے چچا عباسؓ کے پوتے کا پوتا تھا۔ اس کی قیادت میں انقلاب خواہ مسلمان حکومتِ وقت سے لڑنے پر تیار ہوئے وہ حکومت الٰہی کے بلند مقصد کا حیلہ اور شریعت حقہ کی ازسرنو بحالی کا وعدہ کرتے تھے۔ ایک مدت کے غور و فکر کے نتیجے میں، عباسی عامل ابومسلم نے ۹ جون ۷۴۷ء کو خراسان میں بغاوت کا سیاہ پرچم بلند کیا جو اصل میں رسول اللہ صلعم کے علم کا رنگ تھا اور اب عباسیوں کا نشان بنا۔ ابومسلم ایک ایرانی آ[redacted] غلام تھا جس کا نسب مجہول ہی[1] وہ قبیلہ ازد (یمنی) کی فوج لے کر خراسان کے دارالحکومت مرو میں داخل ہوگیا اگرچہ اس کے پیروکاروں میں عربوں سے زیادہ ایرانی کسان تھے[2] ہرچند خراسان کے والی نصر ابن سیار نے مروان ثانی سے مدد بھیجنے کی التجا کی، مگر کوئی مدد نہ ملی۔ ایک درد بھرے خط میں شاعری کا بھی سہارا لیا[3] لیکن مروان اپنے قریبی پیش روؤں سے ذاتی مستعدی اور قابلیت میں افضل ہونے کے باوجود نصر کی درخواست [redacted]کرسکا کیوں کہ اسے خود گھر کا انتظام سنبھالنا پڑ گیا تھا۔ انہی دنوں فلسطین سے حمص تک شورش برپا تھی جس کی علت وہی قیسی اور یمنی فساد تھا خلافت کے دوسرے امید واروں نے اس سے کام نکالنا

---

۱ دیکھو "فخری" ص ۱۸۶

۲ طبری - ۲ ص ۱۹۵۳ - دینوری، ص ۳۵۹

۳ "فخری" ص ۱۹۳ - نکلسن: "تاریخ ادبیات عرب" ص ۲۵۱

چاہا تو یزید ثالث اور ابراہیم کے زمانے میں یہ نزاع بڑھتے بڑھتے خانہ جنگی کی وسعت اختیار کر گئی تھی۔ یزید نے اور خرابی یہ کی کہ قدری فرقے کا طرف دار ہو گیا تھا۔ یمنی گروہ کی قیادت ابراہیم نے سنبھالی۔ ادھر قیسیوں نے مروان ثانی کا ساتھ دیا اور اس نے بڑی مہلک غلطی یہ کی کہ نہ صرف اپنی سکونت بلکہ سرکاری دفتر بھی دمشق سے عراق کے شہر حران میں منتقل کر دیا اور اس طرح تمام شامیوں کی تائید سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہی لوگ بنی امیہ کی اصلی قوت رہے تھے۔ ان کی ناراضی کے علاوہ دوسری مصیبت یہ آئی کہ عراق کے خوارج نے جنھیں ہر نظام حکومت سے دشمنی تھی [redacted] کہ اندلس میں خاندانی تنازعے پہلے ہی اسلام کی اس انتہائے مغرب کی ولایت کو پارہ پارہ کیے دیتے تھے۔ پھر بھی یہ شصت سالہ خلیفہ (= مروان ثانی) تین برس تک شامیوں کے خلاف اور خارجی باغیوں سے میدان داری کرتا رہا۔ تخت خلافت پر آنے سے قبل لڑائی میں مسلسل استقامت دکھانے کی بدولت اسے لوگوں نے "ال حمار" (یعنی جفاکش، گدھے) کا لقب دیا تھا[۱]۔ اب ثابت ہوا کہ وہ سپہ سالاری کی بھی قابلیت رکھتا ہے۔ مذکورہ بالا معرکوں میں اس نے جو فوجی تنظیم کی، اسی کے سلسلے میں فوج کو صفو[redacted] بجائے چھوٹے چھوٹے پیوستہ دستوں میں مرتب کرنے کا طریقہ بھی اس سے منسوب کرتے ہیں۔ یہ دستے "کردوس" (جمع کرادیس) کہلاتے تھے۔ صفوف کے قدیم اصول سے پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے کام لیا تھا

۱ھ طبری۔ ۲ ص ۱۹۴۳؛

۲ھ "فخری" ص ۱۸۳؛

اور اس لئے اسے ایک تقدس کا درجہ حاصل تھا۔ اب یہ نئی تبدیلی عمل میں لائی گئی مگر عام صورت حال اتنی بگڑ چکی تھی کہ مروان کے سنبھالے نہ سنبھلی۔ بنی اُمیّہ کے اقبال کا آفتاب لبِ بام آگیا اور سُرعت 285
سے رُو بہ زوال تھا۔

آخری ضرب

خراسان کے دارالحکومت مَرو کے سقوط کے بعد، ۷۴۹ء میں عراق کا ممتاز شہر کوفہ ہاتھ سے نکل گیا۔ [illegible] ابوالعباس کے چھپنے کی جگہ تھی اور بغیر کسی بڑی [illegible] عباسیوں کے حوالے کردی گئی۔ یہیں، پنجشنبہ ۳۰ اکتوبر (۷۴۹ء) کے دن شہر کی صدر مسجد میں ابوالعباس کے ہاتھ پر بہ حیثیت خلیفہ بیعت کی گئی[1] اور اس طرح بنی عبّاس کا پہلا خلیفہ تخت نشین ہوا۔ جگہ جگہ عبّاسیوں اور اُن کے حلیفوں کے کالے جھنڈوں کے سامنے سے امویوں کے سفید پرچم پسپا ہونے لگے۔ مروان نے ٹھان لی کہ آخری بار جان کی بازی لگادی جائے۔ وہ بارہ ہزار سپاہ لے کر حرّان سے بڑھا اور دجلے کی معاون ندی زاب کلاں کے بائیں کنارے پر (جنوری ۷۵۰ء میں)[2] حریف لشکر سے دوچار ہوا جس کی سپہ سالاری نئے خلیفہ کا چچا عبداللہ ابن علی کر رہا تھا۔ شامی فوج کے دل چھوٹے ہوئے تھے اور فتح و نصرت کی توقع باقی نہ تھی۔ میدان میں کامل شکست

[1] یعقوبی، ۲ ص ۴۱۷۔ طبری، مسعودی وغیرہ۔

[2] طبری۔ ۳ ص ۴۷۔ فوج کی تعداد کے متعلق دیکھو گذشتہ باب بستم۔

کھائی اور زاب کے اسی معرکے نے پورا شام عباسیوں کے قدموں میں ڈال دیا۔ اس کے بڑے بڑے شہروں نے یکے بعد دیگرے اپنے دروازے عبداللہ اور اُس کی خراسانی فوج کے لیے کھول دئیے۔ صرف دمشق میں محاصرہ کرنے کی ضرورت پیش آئی تھی لیکن چند ہی روز میں اس کا سرِ پُرغرور بھی جھک گیا اور ۲۶/ اپریل ۷۵۰ء کو اطاعت قبول کرلی۔ فلسطین سے عبداللہ نے ایک دستہ بھاگتے خلیفہ کے تعقب میں بھیجا تھا۔ اس نے حدود مصر میں بہ مقام بوصیر پناہ لی تھی۔ وہیں ایک گرجا کے سامنے جس میں چھپا تھا پکڑا اور مارا گیا۔ ابھی تک یہاں لوگ [illegible] قبر دکھاتے ہیں۔ اس کا سر اور بقول مسعودی، خلافت کا ماہی مراتب ابوالعباس کے پاس روانہ کیا گیا۔

اب عباسیوں نے خاندان بنی اُمیّہ کے کامل استیصال پر کمر باندھی۔ ان کا سپہ سالار عبداللہ اُن کے اعزا اقربا کو نیست نابود کرنے میں کوئی کام کرنے سے نہ رُکتا تھا۔ ۲۵/ جون (۷۵۰ء) کے دن اُس نے ان کے اسّی افراد کو دعوت دی اور ابو فطرس (قدیم: اینٹی پیٹ رس) کے مقام پر جو یافہ کے قریب رودِ عوجا پر واقع ہے، بلوایا اور عین ضیافت میں سب کو قتل کرا دیا۔ مقتولوں اور تڑپتے بسملوں پر چمڑے کے پارچے ڈلوا دئیے گئے اور عبداللہ اور اس کے

---

۱ اسے ابو صیر بھی کہتے ہیں اور غالباً یہ فیوم کے علاقے میں موجودہ بوصیر ال ملاق ہے۔ دیکھو ابن المقفع: "سیر البطارکہ ..." (ہم برگ ۱۹۱۲ء) صفحہ ۱۸۰ و مابعد۔ طبری، ۳ صفحہ ۴۹۔

۲ مسعودی، ۶ صفحہ ۷۷۔

فوجی سردار مرنے والوں کی کراہ سنتے اور کھانا کھاتے رہے![1] تمام اسلامی 286
دنیا میں جاسوس اور مخبر پھیلا دئے گئے تھے کہ شکست خوردہ خاندان شاہی کے ایک ایک فرد کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں جن میں سے بعض نے "زمین کی گہرائیوں میں پناہ لی تھی"[2] نوجوان عبدالرحمٰن ابن معاویہ ابن ہشام کا حیرت انگیز طریق پر بچ کر نکل جانا اور اندلس پہنچنا، جہاں اسے ایک نیا اور درخشندہ خاندان قائم کرنے میں کام یابی ہوئی، ایک آئندہ باب کے واقعات ہیں۔ عباسیوں کی تعذیب سے مرے ہوئے لوگ بھی نہیں بچ سکے۔ بلکہ عبداللہ نے دمشق، قنسرین اور دوسرے مقامات پر خلفائے بنی اُمیّہ کی قبریں کھدوا کر ہڈیاں تک پھنکوا دیں۔ سلیمان کی لاش دابق سے کھدوا ڈالی۔ ہشام کی، رصافہ کے مقبرے سے نکلوائی۔ وہ حنوط کی ہوئی رکھی تھی۔ اسے اسّی کوڑے لگوا کر آگ میں جلایا گیا۔[3] صرف دین دار عمر ثانی کی قبر بے حرمتی سے محفوظ رہی۔

بنی اُمیّہ کے خاتمے کے ساتھ ملک شام کی سیادت ختم اور شان شوکت بھی قصّہ ماضی ہوگئی۔ شامیوں کو بڑی دیر میں ہوش آیا کہ اسلام کا مرکز ثقل ان کی سرزمین سے ہٹ کر مشرق کی طرف چلا گیا۔ پھر انھوں نے کئی مرتبہ اپنی گذشتہ عظمت بحال کرنے کے لئے ہتھیار بھی اٹھائے لیکن کوئی کام یابی نہ ہوئی۔ آخر میں لے دے کر اس امید

---

۱ یعقوبی، ۲ صفحہ ۴۲۵۔ مسعودی، ۶ صفحہ ۷۶۔ ابن الاثیر۔ ۵ صفحہ ۳۲۹ مبرد، اغانی وغیرہ
توراۃ میں جیہو نے اہب کے خاندان کا جس طرح استیصال کیا، اس کے لئے دیکھو ملوک ۲۔
۹: ۱۳ ۔ اور اسی قسم کی تباہی حاکم مصر کی محمد علی کے ہاتھ سے ہوئی۔

۲ ابن خلدون ۔ ۴ صفحہ ۱۲۰

۳ مسعودی۔ ۵ صفحہ ۴۷۱ ۔ یعقوبی ۔ ۲ صفحہ ۴۲۷ ۔ "فخری" صفحہ ۲۰۴

کا سہارا لیا کہ مسیحا کی طرح کوئی سفیانی پھر آئے گا اور انھیں عراقی ظالموں کے پنجۂ ستم سے نجات دلائے گا[۱]۔ آج تک شام کے مسلمانوں میں یہ قول سنا جاتا ہے کہ امیر معاویہ کی اولاد میں کوئی شخص ظہور کرنے والا ہے؛ لیکن امویوں کے خاتمے سے شام ہی کو زوال نہیں آیا بلکہ درحقیقت اس کے معنی یہ تھے کہ اسلامی تاریخ کا اصلی عربی زمانہ گزر گیا اور مسلمانوں کی پہلی خالص عربی سلطنت کی بساط تیزی سے لپیٹی جانے لگی۔ عباسی اپنے ملک کو "دولت"[۲] اور ایک جدید دور کہتے تھے۔ بے شبہ یہ ایک نیا دور تھا۔ عراقی محسوس کرتے تھے کہ شامیوں کی غلامی سے آزاد ہوئے شیعہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے بدلہ لے لیا۔ موالی کو حریت حاصل ہو گئی۔ ایران کے کنارے پر نیا دار الخلافہ کوفے میں قائم کیا گیا۔ خراسانی، خلیفہ کی فوج
287 خاصہ میں اور ایرانی، بڑے بڑے دیوانی عہدوں پر رکھے گئے[۳]۔ عرب کے خاندانی شرفا کی بجائے حکومت پر وہ سرکاری عمال چھا گئے جو ممالک خلافت کی مختلف نسل اور نہ جانے کن کن خاندانوں کے افراد تھے۔ انہی طرح طرح کے عنصروں سے نئی حکومت کا سرگرم تیار ہوا[۴]۔ پرانے عرب مسلمان اور عجمی قوموں کے نومسلم ایک دوسرے میں اس طرح خلط ملط ہوئے کہ ان کے قومی رنگ پھیکے پڑ گئے[۵]۔ عربیت ختم ہوئی لیکن اسلام باقی رہا اور بین الاقوامی اسلام کے بھیس میں ایرانیت نے مزے سے فروغ پانا شروع کیا؛

---

[۱] طبری۔ ۳ صفحہ ۱۳۲۰۔ ابن مسکویہ: "تجارب الامم ....." (لائیڈن ۱۸۷۱ء) صفحہ ۵۲۶
یاقوت۔ ۴ صفحہ ۱۰۰۱۔ وغیرہ؛ [۲] طبری۔ ۳ صفحہ ۳۳ وغیرہ۔

باب بست وسوم

288

عباسی خاندان کا قیام

اسلام کی عظیم سیاسی داستان میں تیسرا باب وا ہوتا ہی عباسیوں کی محفل جمتی ہی جس کا صدر نشین خلیفہ ابوالعباس (۷۵۰ تا ۷۵۴ ء) تھا۔ نئی محفل کی بساط ملک عراق میں بچھی۔ ایک سال قبل کوفے کی جامع مسجد میں عباسیوں کے پہلے خلیفہ نے جو افتتاحی خطبہ دیا، اس میں اپنی نسبت خود ہی "سفاح"[۱] (یعنی خون بہانے والا) کا لفظ بولا تھا۔ آیندہ یہی اس کا عرفِ عام ہوگیا۔ اور حقیقت میں بُرا شگون ثابت ہوا کیوں کہ گزرنے والے خاندان کی نسبت آنے والے خاندانِ شاہی کو اپنی حکومت چلانے میں جو ... الذا اثرا۔
اسلام کی تاریخ جو ... بہا
کا قطع ہے

---

[۱] طبری - ۳ صفحہ ۳۰ - ۳۳ - ابن الاثیر - ۵ صفحہ ۳۱۷ ؛ فرض انجا ... ہم نے آیندہ باب ۳۳ میں بھی نقل کیا ہی ؛

بہرحال، یہ ال سفّاح، ملت اسلامی کے سب سے مشہور اور سب سے دیر پا[1] خاندانِ شاہی کا بانی ہوا جو تاریخ میں خلفائے راشدین اور بنی اُمیّہ کے بعد تیسری حکومت تھی۔ ۷۵۰ء سے ۱۲۵۸ء تک اسی ابوالعباس کے جانشین تختِ شاہی پر متمکن رہے اگرچہ زمامِ حکومت ہمیشہ اُن کے ہاتھ میں نہ ہوتی تھی؛

عباسیوں کو جس وقت اپنے حریفوں پر فتح حاصل ہوئی تو عام طور پر مسلمان خوش ہوئے کہ بنی اُمیّہ کی خالص دنیاوی حکومت (یا ملک) کی بجائے خلافت کا صحیح تصوّر یعنی حکومت الٰہی کا دور پھر عود کرے گا۔ عبّاسی خلفا، خلافت کی اس مذہبی نوعیّت کا اظہار کرنے کی غرض سے اپنی تخت نشینی یا نماز جمعہ وغیرہ کے خاص موقعوں پر ایک چادر اوڑھ لیتے تھے جیساکہ اُن کے بعید بنی عم جناب نبیٔ کریم (علیہ التحیاۃ والتسلیم) کا معمول تھا۔ علمائے شریعت اور فقہا کی جماعت اُن کے گرد ہوتی اور وہ اِن لوگوں کی سرپرستی کرتے۔ اِن سے امور مملکت میں مشورہ لیتے تھے۔ بنی اُمیّہ کے اقتدار کی جڑیں کھودنے اور عامۃ المسلمین کو اُن سے بدظن کرنے کے لیے تبلیغ و تلقین کا نہایت باضابطہ نظام قائم کیا گیا تھا۔ اب کمال ہوشیاری سے

... ر ہ :

ء اسی حکومت کے قیام و دوام کی تبلیغ کا

... ا یہ خیال جاگزیں

---

[1] سلسلِ سلطانی ...

... ہی کرتی رہی۔

... ہیں۔ مترجم)

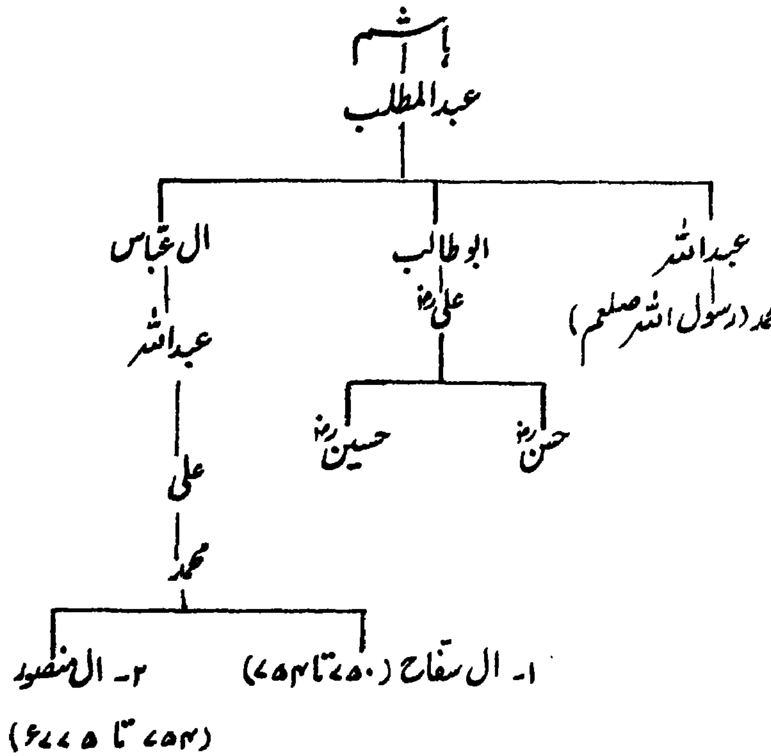
کرایا گیا کہ اقتدار کی باگ اُس وقت تک برابر بنی عباس کے ہاتھوں ۹۸ء
میں رہنی چاہیئے جب تک کہ مسیح موعود[ع] کا ظہور ہو اور عباسی یہ امانت
اُن کے حوالے کر دیں[1] پھر اس اعتقاد کی اشاعت کی گئی کہ اگر یہ
خلافت مٹی تو ساری کائنات درہم برہم ہو جائے گی[2]۔ بایں ہمہ
واقعہ یہ ہے کہ حکومت کے تغیر سے مذہبی احوال میں جو فرق پڑا وہ
اصلی نہ تھا بلکہ زیادہ تر نمائشی تھا۔ بغداد کا خلیفہ اپنے اموی
پیش رو کے برخلاف، دین داری کا لبادہ ضرور اوڑھے رہتا اور
ظاہرا بڑی مذہبیت جتاتا تھا۔ لیکن دمشق والے سے کچھ کم دنیادار
ثابت نہیں ہوا۔ نئی خلافت میں اموی خلافت کی نسبت کوئی بنیادی
فرق تھا تو یہی کہ وہ عربی سلطنت تھی اور عباسی خلافت زیادہ
بین الاقوامی نوعیت رکھتی ہے۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ عباسی سلطنت
نومسلموں کی سلطنت تھی جس کے مختلف نسلی اجزا میں عرب صرف ایک
جزو ترکیبی کا درجہ رکھتے تھے۔

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بنی عباس کا خاندانی رشتہ
دکھانے کی غرض سے ہم (دوبارہ) یہ شجرہ پیش کرتے ہیں:—

---

[1] طبری ۳، صـ ۳۳ - ابن الاثیر ۵ صـ ۳۱۷۔

[2] ان توہمات کو ہم نے آیندہ باب ۲۳ میں بھی نقل کیا ہے۔



اموی خلافت سے ایک اور فرق یہ تھا کہ اب خلافت پوری ملت یا ممالک اسلامی کے ہم معنی نہ رہی۔ اسپین، شمالی افریقہ، عمان، سندھ بلکہ خراسان تک[51] نئی خلافت کو پوری طرح تسلیم نہ کرتے تھے۔ مصر کی اطاعت بھی حقیقی نہ تھی بلکہ بہت کچھ رسمی تھی۔ خود عراق میں اموی عہد کا دارالحکومت واسط گیارہ مہینے تک مطیع نہ ہوا[52]۔ ملک شام میں آئے دن فساد ہوتے رہتے تھے اور بنی امیہ کے شاہی خاندان کے ساتھ جو مظالم کئے گئے، اُن کی وجہ سے یہ آگ رہ رہ کے بھڑکتی تھی۔ اِدھر عباسی علوی اتحاد کی بنیاد، ایک طاقت ور دشمن سے دونوں کی مشترکہ عداوت

---

۵۱ دینوری، ص ۳۲۳۔

۵۲ ایضاً۔ طبری، ۳، ص ۶۱۔ ابن الاثیر، ۵، ص ۳۳۵۔

کا جذبہ تھا۔ جب وہ دشمن تباہ ہوگیا تو ان کی دوستی زیادہ دن برقرار نہ رہ سکی۔ علوئین کے وہ اشخاص جو دل ہی دل میں سمجھے بیٹھے تھے کہ عباسی اُن کے واسطے جنگ کر رہے ہیں، اُن کی خام خیالی کا پردہ جلد چاک ہونے والا تھا۔

سفاح کو محسوس ہوا کہ شہر کوفہ علوئین کا حامی اور متلون مزاج ہے، یہاں وہ محفوظ نہ رہ سکے گا۔ لہذا اُس نے ہاشمیہ[1] کا شان دار محل (مورث اعلیٰ ہاشم کے نام پر) انبار[2] کے مقام پر تعمیر کیا۔ کوفے کا ۲۹۵
ساتھی شہر بصرہ بھی اس لئے نظر انداز کیا گیا کہ اول تو یہاں والے بھی اہل کوفہ کی مثل تھے، دوسرے یہ اس قدر جنوب میں واقع تھا کہ سلطنت کا مناسب مرکز نہ بن سکتا تھا۔ انبار کے نوآباد پائے تخت میں سفاح نے کہ ابھی چالیس برس کا بھی نہ ہوا تھا،[3] چیچک سے وفات پائی۔ (۷۵۴ء)

حقیقی بانئ خاندان: ال منصور

سفاح کے بھائی اور جانشین نے "منصور" (یعنی خدا کی طرف سے نصرت یافتہ) کے اعزازی لقب سے حکومت کی باگ سنبھالی۔ (۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) وہ اپنے خاندان میں سب سے بڑا اگرچہ نہایت بے اصول فرماں روا گزرا ہے۔ نئی خلافت کو سفاح سے بڑھ کر مضبوطی

---

[1] دینوری، یعقوبی، ۲ ص ۴۲۹۔

[2] یہ عراق کے شمال میں فرات کے بائیں کنارے پر تھا۔ اب اس جگہ بنجر زمین پڑی ہے۔

[3] یعقوبی، ۲ ص ۴۳۲۔ طبری، ۳ ص ۸۰۔

سے اسی نے قائم کیا۔ آیندہ جو بیس تیس عباسی خلیفہ ہوے وہ سب اسی کی اولاد میں تھے۔ خلافت کے لئے پہلا جھگڑا زاب کے نامی فاتح اور چچا (عبداللہ ابن علی) سے ہوا جو سفاح کے عہد میں ملک شام کا والی تھا۔ خلافت کے اس مدعی کو نصیبین کے میدان میں ابومسلم نے شکست دی (نومبر، ۷۵۴ء) عبداللہ سات برس قید میں رہا۔ پھر اُسے خاطر تواضع کے ساتھ ایک نئے مکان میں لے گئے جس کی بنیادیں جان کر آب شور پر اُٹھای گئی تھیں۔ اسی مکان نے دھنس کر قیدی کو زندہ درگور کر دیا۔[1] سپہ سالار ابومسلم کی باری پہلے یعنی فتح نصیبین کے بعد ہی آگئی تھی۔ وہ اپنی ولایت خراسان کو، جہاں قریب قریب خودمختاری سے حکومت کرتا تھا، واپس جارہا تھا کہ اُسے دربار خلیفہ میں آنے کی ترغیب دی گئی۔ وہ خراسان کا راستہ چھوڑ کر، دار الخلافت کو چلا آیا اور عین خلیفہ کے حضور میں باریابی کے وقت اس پر دغابازی سے حملہ کرکے قتل کر دیا گیا۔[2] عبداللہ کے بعد یہی خراسانی سپہ سالار تھا جس کی تلوار نے عباسیوں کو سلطنت دلوائی تھی ۞ انہی دنوں ایران میں ایک عجیب فرقہ راوندیہ پیدا ہوا جو خلیفہ کی ذات میں خدا کو جلوہ گر دیکھتے تھے۔ ان کی بڑی بے رحمی سے سرکوبی کی گئی (۷۵۸ء)۔[3] شیعیان علیؓ کہ اپنی ناکامی سے بہت جھنجھلائے تھے، امام حسنؓ کے پردتے ابراہیم اور ان کے بھائی

---

[1] طبری، ۳ ص ۳۳۰ ۞

[2] طبری، ۳ ص ۱۰۵ - دینوری ص ۳۷۶ ۞

[3] 〃 〃 ص ۳۳۰ - مسعودی - ۴ ص ۲۶ وغیرہ - بغدادی، ص ۳۷ - راوند، اصفہان کے قریب ایک قصبہ تھا ۞

محمد الملقب "بہ نفس زکیہ" کی سرکردگی میں لڑے اور بُری طرح کچل دئے گئے[1] محمد مارے گئے تو مدینۂ منوّرہ میں ان کی لاش سولی پر چڑہائی گئی (۶/ دسمبر ۷۶۲ء) ابراہیم کا آیندہ سال شورش پسند کوفہ کے قریب سر کاٹ کر خلیفہ کے پاس بھیجا گیا[2] وہ شیعانِ علیؓ جو ہٹ کے پورے تھے، اُنھوں نے عبّاسی خلفاء کو غاصب قرار دیا کہ خلافت کے جائز حق دار اُن کے نزدیک صرف حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں (امام) ہی ہو سکتے تھے۔ اسلامی دنیا کی سیاست میں علوئین آیندہ 291
بھی تخریبی اثر ڈالنے سے کبھی باز نہ آے اور اپنے اماموں کے متعلق برابر دعویٰ کرتے رہے کہ انھیں رسول اللہ صلعم کی طرف سے ایک خاص حکمت اور ایک قسم کی خُدائی نورانیت ورثے میں پہنچتی ہے؛ خراسان میں ابو مسلم کا انتقام لینے کے دعوے سے سنباد مجوسی نے بغاوت کی (۷۵۵ء) پھر استاذسیس نے (۷۶۷و۷۶۸ء) میں سر اُٹھایا۔ اِن دونوں بغاوتوں کو دبا دیا گیا[3] ایران میں وطنیت کے قومی جذبات قدیم زرتشتی اور مزدکی عقائد میں گندھے ہوے تھے لیکن کم سے کم سر دست وہ قابو میں آگیا۔ اس طرح اسلامی سلطنت کا بڑا حصّہ پھر ایک دفعہ نئی خلافت کے تحت میں مجتمع اور متحد ہوا، سوائے شمالی افریقہ کے جہاں قیروان کے آگے عبّاسی خلیفہ کا حکم نہ چلتا تھا۔ اسی طرح اسپین میں عبد الرحمٰن اموی، منصور کے مقابلے میں

---

[1] یہ دونوں عبداللہ بن حسن بن (امام) حسنؓ کے فرزند تھے؛

[2] طبری۔ ۳ صفحہ ۲۴۵ وغیرہ۔ مسعودی۔ ۴ صفحہ ۱۸۹ و مابعد۔ دینوری صفحہ ۳۸۱؛

[3] طبری، ۳ صفحہ ۱۱۹۔ یعقوبی، ۲ صفحہ ۴۴۱۔ ابن الاثیر، ۵ صفحہ ۳۶۸؛

دور آیا۔ (اس کی ماں بھی خلیفہ منصور کی ماں کی مثل، بربر کنیز تھی)[۱]؎

جب گھر کے معاملات حسب دلخواہ طے ہو گئے تو مغرب کے دائمی دشمن، بائی زنطہ سے پھر وہی موذی لڑائی چھڑ گئی جو ٹھہر ٹھہر کے ایک صدی سے زیادہ مدت سے لڑی جا رہی تھی۔ اس جنگ نے قریبی قلعوں پر ناگہانی حملوں کی صورت اختیار کی۔ سلیشیہ میں مصیصہ اور ارمنیہ خورد میں ملیطیہ کے سرحدی قلعے شکستہ ہوئے
خالی پڑے تھے، ان کو درست کیا گیا[۲] شمال میں باکو تک جہاں نفط کے 292
چشمے تھے، قدم بڑھایا اور ان چشموں پر محصول عائد کیا۔ بحر خزر کے جنوب میں طبرستان کا پہاڑی ضلع ابھی تک عملاً آزاد تھا اور گزشتہ ساسانی سلطنت کے اعلیٰ عمال کا ایک خاندان وہاں حکومت کئے جاتا تھا، اسے مسخر اور عارضی طور پر جزو سلطنت بنا لیا گیا[۳] ہندستان کی سرحد پر دوسرے مقامات کے ساتھ قندھار کی فتح عمل میں آئی۔ وہاں بدھا کا ایک بت ملا اسے منہدم کیا گیا[۴] بلکہ واقعہ یہ ہے کہ منصور کے سرداروں نے کشمیر (عربی "قشمیر") تک جو شمال مغربی ہمالیہ کی وسیع اور سرسبز وادی ہے، تاختیں کیں۔ جہازوں کا ایک بیڑا بصرے سے بھیجا گیا کہ دریائے سندھ کے دہانے تک بحری قزاقوں کو سزا دے جنھوں نے جدے کو لوٹنے کی جسارت کی تھی؎

---

[۱] یعقوبی: "بلدان" ص ۲۳۸؎

[۲] مسعودی۔ ۲ ص ۲۵ ۔ یاقوت۔ ۱ ص ۴۷۷؎

[۳] یعقوبی۔ ۲ ص ۴۴۶؎

[۴] " " بلاذری ص ۴۴۵۔ یاقوت، ۴ ص ۱۸۳؎

دار السلام

۷۶۲ء میں خلیفہ منصور نے اپنے نئے دارالخلافت بغداد کا سنگ بنیاد رکھا۔ ابھی تک وہ کوفے اور حیرہ[1] کے درمیان الہاشمیہ میں رہتا تھا۔ اب یہ شہر جس کی یاد کو شہرزاد نے "الف لیلہ ولیلہ" کے جوش انگیز افسانوں سے تابناک کر دیا ہے، اُس جگہ بسانا شروع کیا جہاں پہلے اسی نام کا ایک ساسانی موضع جس کے معنی "خداداد" کے ہیں، بستا تھا[2]۔ منصور نے کئی اور مقامات کی دیکھ بھال کر کے اسے پسند کیا۔ وہ سبب بھی بتاتا تھا کہ جنگی چھاؤنی کے لئے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ دوسرے دجلہ یہیں بہ رہا ہے جس کے ذریعے ہم عراق وارمنیہ اور ان کی حوالی سے اشیائے خورونوش کے علاوہ، سمندروں میں چین تک جا سکتے اور ہر قسم کا بحری سامان لا سکتے ہیں۔ پھر فرات قریب ہے کہ شام و رقہ اور ان کے مضافات میں جو کچھ پیدا ہوتا ہے، یہ شہر یہیں مہیا کرتا رہے گا[3]۔ منصور کے اس شہر کی تعمیر چار سال میں مکمل ہوئی۔ اسے اڑتالیس لاکھ تراسی ہزار درہم خرچ کرنے اور کوئی ایک لاکھ راج، مزدور، کاریگر لگانے پڑے جو شام و عراق اور سلطنت کی دوسری ولایات سے لائے گئے تھے[4]۔

---

[1] یعقوبی: "بلدان" ص۲۳۷۔

[2] یعقوبی: "بلدان" ص۲۳۵۔ بلاذری۔ ص۲۹۴۔ [3] طبری۔ ۳ ص۲۷۲۔

[4] دیکھو الخطیب کی "تاریخ بغداد" (قاہرہ ۱۹۳۱ء) ۱ ص۶۶ و مابعد۔ نیز طبری۔ ۳ ص۳۲۶۔ یعقوبی: "بلدان" ص۲۳۸۔ یاقوت۔ ۱ ص۶۸۳۔

منصور نے شہر کو سرکاری طور پر دار السلام (= سلامتی کا گھر) نام دیا۔ وہ دجلے کے مغرب کی طرف اسی میدان میں واقع تھا جس کے علاقے میں تاریخِ قدیم کی بعض قوی ترین تخت گاہوں کو جگہ ملی تھی۔ اسے گول بنایا تھا اور اسی لئے "ال مدّورہ" یعنی گول شہر بھی کہتے تھے۔ اینٹ کی دُہری فصیل اور گہری خندق شہر کی محافظ تھی اور وسطی رقبے کو ایک اور اندرونی فصیل سے گھیرا تھا جو نوّے
۲۹ فیٹ بلند تھی۔ شہر پناہ میں برابر کے فاصلے سے چار بڑے دروازے بنائے تھے۔ مرکز کے نقطے سے چار بڑی شاہ راہیں نکلتی اور ان دروازوں سے گزرتی ہوئی، پہیے کے اروں کی طرح سلطنت کے چار گوشوں تک پہنچ جاتی تھیں۔ اس طرح پوری سلطنت مرکز دار حلقوں میں بٹ جاتی تھی جس کا وسطی نقطۂ انشعاب قصر خلافت تھا۔ اس کے پھاٹک پر سونے کا ملمع کیا تھا اس لئے یہ "باب الذہب" (آستانۂ زرّیں) اور "قبۂ خضراء" کے ناموں سے موسوم تھا۔ محل کے قریب ہی بڑی مسجد بنی ہوئی تھی۔ ایوانِ دربار کا گنبد، جس کی وجہ سے یہ قصر قبۂ خضرا مشہور ہوا، ایک سو تیس فیٹ بلند بنایا تھا۔ بعد میں ایک روایت یہ کی جاتی تھی کہ گنبد کی چوٹی پر ایک نیزہ بردار سوار کا پتلا نصب کیا تھا اور اس کے نیزے کا رُخ ہمیشہ اُدھر پھرا رہتا تھا جدھر سے کسی دشمن کی آمدنی کا خطرہ ہوتا تھا[۵۱] مگر یہ مغالطہ آمیز روایت نظر باز یاقوت کی گرفت سے نہ بچی۔ وہ لکھتا ہے کہ نیزے کا رُخ ہر وقت کسی نہ کسی طرف رہتا ہوگا جس کے معنی یہ ہوئے کہ شہر ہمیشہ

---

۵۱ خطیب، ۱ ص۷۳

کسی دشمن کی زد میں رہتا تھا۔ پھر کہتا ہو کہ "مسلمانوں کی عقل سے بعید ہو کہ ایسی اختراعات پر یقین لائیں"[۵۱] نئے شہر کی تعمیر میں سابق ساسانی پایۂ تخت مدائن کے کھنڈروں نے کھدانے کا کام دیا اور بہت سا عمارتی مسالا فراہم کر دیا۔ اینٹیں مقام تعمیر کے قریب بھی تیار کی گئیں۔ اپنی وفات سے کچھ پہلے شہر پناہ کے باہر منصور نے دریا کے کنارے ایک اور محل بنایا اور "قصر الخلد" نام رکھا کہ اس کے باغ، جنّت کے باغوں کے مماثل تھے (قرآن مجید۔ الفرقان = ۱۶، ۱۷[۵۲]) شمال میں آگے بڑھ کر ایک اور محل "رُصافہ" (پُشتہ پل) موسوم ہوا۔ یہ خلیفہ کے فرزند المہدی ولی عہد سلطنت کے واسطے بنایا گیا تھا۔

وہ نجومی ساعت جب کہ منصور نے اس فوجی چوکی کی اپنے، اپنے خاندان اور اپنی خراسانی فوج رکاب کے لیے بنیاد ڈالی، واقعی ایسی ہی نیک اور سازگار ثابت ہوئی جیسی کہ شاہی منجّم نے پیش گوئی کی تھی[۵۳] چند ہی سال میں یہ بستی بیرونی تجارت اور ہر قسم کے سازوسامان کی بہت بڑی منڈی اور ایسا سیاسی مرکز بن گئی جسے دُنیا میں سب سے بڑھ کر بین الاقوامی اہمیّت حاصل تھی۔ معلوم ہوتا تھا گویا کسی جادوگر نے ایسا منتر پڑھا کہ یکایک مدائن اور بابل و نینوا، اُر اور دَور قدیم کے سارے مشرقی دارالسلطنتوں نے منصور کی بستی کو اپنی عظمت و جلال

---

۵۱ جلد اوّل صفحہ ۲۸۳

۵۲ (مؤلف نے جس آیۂ کریمہ کا حوالہ دیا اس کا نشان (۱۵) ہونا چاہیے۔ اس میں "جنّت الخلد" کے الفاظ آئے ہیں۔ اور باغوں کا ذکر نہیں ہو۔ مترجم)

۵۳ یاقوت۔ ۱ صفحہ ۶۸۳۔ خطیب۔ ۱ صفحہ ۶۷

کا وارث بنا دیا۔ بغداد کو شوکت و شان کا وہ مرتبہ حاصل ہوا جو شاید قسطنطنیہ کے سوا اور کسی شہر کے نصیب میں نہ آیا تھا۔ صدیوں کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد حال میں اس شہر کی دوبارہ قسمت جاگی اور وہ ایک حقیقی عرب بادشاہ، فیصل کی مملکت عراق کا پایۂ تخت بنایا گیا ہے۔

۲۹۴ بغداد کے محل وقوع نے مشرقی خیالات کی آمد کا راستہ کھول دیا تھا یہاں عباسی خلفا نے حکومت کا آئین ہی ساسانی کسرویت کے قالب میں ڈھال لیا۔ عربی اسلامیت ایرانی اثرات سے پچھڑ گئی۔ خلافت میں عرب کی جمہوری سرداری کی شان باقی نہ رہی بلکہ وہ ایرانی استبداد اور مطلق العنان بادشاہی کی نشاۃ ثانیہ سی ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ایرانی القاب، ایرانی بیویاں، ایرانی شاہد و شراب، ایرانی سرود، حتیٰ کہ ایرانی افکار و تخیلات خلافت پر چھا گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ایرانی ٹوپی سب سے پہلے منصور ہی نے پہننی شروع کی تھی۔ اسی کی دیکھا دیکھی رعایا میں خود بخود ان کا رواج پھیل گیا[۱]۔ اتنا خیال میں رہے کہ عربی بدویت کا کھردراپن ایرانی اثر سے ضرور کم ہوا اور ایک نئے دور کے آنے میں سہولت ہوگئی۔ یہ دور علم و حکمت کی آب یاری اور درس و تدریس کی ترقی میں شہرہ پانے والا تھا۔ صرف دو میدانوں میں اہل عرب کی فضیلت میں فرق نہ آیا: ایک تو یہ کہ سلطنت کا مذہب، اسلام رہا۔ دوسرے دفاتر حکومت کی سرکاری زبان بدستور عربی رہی۔

---

[۱] طبری۔ ۳ ص ۳۷۱ (یہ ایک قسم کی لمبی کلاہ ہوتی تھی، جس کا حال اگلے باب میں آتا ہے۔ اسے عربی میں "قلنسوہ" (جمع = قلانس) کہتے تھے۔ مترجم)

ایک ایرانی خاندان وزراء

منصور کے عہد میں وزارت، جو ایرانی حکومت کا عہدہ تھا، پہلی مرتبہ اسلامی سلطنت میں نمودار ہوئی۔ اس اعلیٰ عہدے کا پہلا حامل خالد ابن برمک تھا[51] خالد کی ماں، بلخ میں سپہ سالار قتیبہ ابن مسلم کے ہاتھ میں گرفتار ہوئی۔ (۸۶ھ ۷۰۵ء) اس کا باپ اسی شہر کی بدھ مت کی خانقاہ میں "برمک" یعنی صدر پروہت تھا[52] خالد کا سفاح سے اتنا خلا ملا ہوگیا تھا کہ اس خلیفہ کی بیوی نے خالد کی بیٹی کو اپنا دودھ پلایا اور خود اس کی بیٹی کو خالد کی بیوی نے پالا[53] عباسی خلافت کے آغاز ہی میں خالد ترقی کر کے محکمہ خزانہ کا صدر (= دیوان الخراج) مقرر ہوگیا تھا۔ ۷۶۵ء میں اُسے طبرستان کا حاکم بنایا گیا اور وہاں اس نے ایک خطرناک بغاوت کا قلع قمع کیا[54] بڑھاپے میں اس نے ایک باغی زنطی قلعے کی تسخیر میں نام پایا[55] اگرچہ وہ ان معنی میں، جن میں یہ لفظ آیندہ مروّج ہوا، واقعی وزیر نہیں مقرر ہوا تھا، تاہم یہ عجمی نژاد بارہا خلیفہ کے مشیر کی خدمت انجام دیتا رہا اور ایک نامی گرامی خاندان وزرا کا بانی ہوا[56]

---

[51] دیکھو ابن خلکان۔ ۱ ص ۲۹۔ جس میں ہمدانی کے لئے یہ لفظ غالباً قرآنی معنی میں لایا گیا ہے۔ طٰہٰ: ۱۹ (مؤلف نے آیہ کریمہ کا نشان ۳۰ دیا ہے۔ وزیر کے متعلق اس کا مذکورہ بالا بیان بھی محل نظر ہے۔ مترجم)

[52] ابن الفقیہ ص ۳۲۲۔ طبری وغیرہ۔

[53] طبری۔ ۲ ص ۸۴۰۔

[54] ابن الفقیہ۔ ص ۳۱۴

[55] طبری۔ ۳ ص ۴۹۷۔

[56] دیکھو "فخری" ص ۲۰۶۔ مسعودی: "تنبیہ" ص ۳۴۳ (مؤلف نے بلخی بتا کر خالد کو "ایرانی" لکھا ہے۔ یہ اس کا تسامح ہے۔ مترجم)

۷ر اکتوبر ۷۷۵ء کو منصور نے وفات پائی۔ وہ حج کرنے گیا تھا۔
مکّہ معظمہ کے قریب انتقال ہوگیا۔ ساٹھ سال سے کچھ زیادہ عمر پائی۔
اس محترم شہر کے جوار میں سو قبریں کھودی گئی تھیں مگر مخفی طور پر کسی اور
قبر میں دفن کیا گیا کہ دشمنوں کو پتہ چلانے اور بے حرمتی کرنے کا موقع
نہ مل سکے[51] وہ چھریرے بدن کا دراز قامت آدمی تھا۔ رنگ سانولا 295
اور ڈاڑھی چھدری تھی[52] خشک مزاج اور سخت گیر معلوم ہوتا تھا
اور اپنے اخلاف کے نمونے سے ذرا مشابہت نہیں رکھتا۔ تاہم اس کی
حکمت عملی کئی نسل تک آنے والوں کی رہ نمائی کرتی رہی جس طرح امیر
معاویہ کی حکمت عملی امویوں کی دلیل راہ رہی تھی۔

منصور کے جانشین المہدی نے (۷۷۵ - ۷۸۵ء) اپنے فرزند
ہارون کی تعلیم خالد برمکی کے بیٹے یحییٰ کے سپرد کی۔ ہارون اپنے بھائی
الہادی کی مختصر بادشاہی (۷۸۵ تا ۷۸۶ء) کے بعد خلیفہ ہوا تو اسی
برمکی کو جسے وہ از رہِ احترام "باپ" کہتا تھا، غیر محدود اختیارات
دے کر وزیر سلطنت مقرر کیا۔ یحییٰ، جس کا انتقال ۸۰۵ء میں ہوا
اور اس کے دو بیٹے الفضل اور جعفر، ۷۸۶ء سے ۸۰۳ء تک
عملاً سلطنت کو چلاتے رہے[53]

ان برامکہ کے محلات مشرقی بغداد میں تھے جہاں وہ بڑی
شان سے رہتے تھے۔ جعفر کا محل "الجعفری" موسوم تھا اور کئی

---

۵۱ ابن الاثیر۔ ۶ ص ۱۳۔
۵۲ " " ۔ طبری ۳ ص ۳۹۱ مسعودی: "تنبیہ" ص ۳۴۱۔
۵۳ یعقوبی۔ ۲ ص ۵۲۳۔

پرشکوہ حویلیوں کا مجموعہ بن گیا۔ یہ سب مکانات بعد میں مامون نے اپنے رہنے کے لیے پسند کئے اور آسے قصر خلیفہ (یا دار الخلافہ) کی صورت میں بدل دیا۔ یہ عمارتیں دجلے کے کنارے پر بنی ہوئی تھیں۔ ان کے عقب میں وسیع باغوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور انہی میں دوسری ابنیہ اور کوشکیں بنی تھیں۔ برمکی خاندان کے افراد نے بے حساب دولت جمع کی تھی۔ اپنے موالی، متوسلین یا بھٹئی کرنے والوں ہی کو وہ جب چاہتے، اتنا کچھ دیتے کہ غنی کر دیتے تھے۔ ان کی سخاوت ضرب المثل ہوگئی تھی۔ آج تک تمام عربی بولنے والے ملکوں میں لفظ "برمکی" فیاض کے معنی میں استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ تشبیہ کہ "فلاں شخص جعفر کا سا دریا دل ہے" ہر جگہ بولی اور سمجھی جاتی ہے[1]۔

بہت سی نہریں[2]، مسجدیں، رفاہ عام کے کام برامکہ کی ہمت اور شاہانہ سخاوت کی بدولت وجود میں آئے۔ یہ شرف کہ ماہ رمضان میں مساجد کے اندر فانوس روشن کرانے کا طریقہ سب سے پہلے اسی نے جاری کیا، الفضل کو دیا جاتا ہے۔ جعفر حسن بیان ادبی قابلیت اور انشا پردازی میں بڑی شہرت رکھتا ہے[3]۔ زیادہ تر اسی کی وجہ سے عرب مؤرخ برامکہ کو "اہل القلم" کے گروہ کا بانی بتاتے ہیں۔ لیکن وہ صرف ادیب ہی نہ تھا بلکہ ایجاد و اختراع میں بھی ممتاز ہوا۔ اس کی گردن لمبی تھی لہٰذا اونچے گریبان کی وضع اسی نے نکالی تھی۔ جعفر کا خلیفہ ہارون کی خلوت و جلوت میں ہم نشین ہونا، اس کے باپ یحییٰ کو پسند نہ تھا کہ اس پر

---

[1] دیکھو ابن خلکان۔ ۱ صفحہ ۱۸۵ و ما بعد۔ [2] طبری۔ ۳ صفحہ ۶۴۵۔ بلاذری صفحہ ۳۶۳
[3] طبری۔ ۲ صفحہ ۸۴۳۔ مسعودی۔ ۶ صفحہ ۳۶۱۔ [4] جاحظ: "بیان" ۳ صفحہ ۲۰۱۔

296 بد اخلاقی کا شبہ گزرتا تھا۔[۵۱]

آخر وہ وقت آگیا کہ خلیفہ نے اس عجمی جوے کو کندھے سے اُتار پھینکا۔ ہارون الرشید (۷۸۶ تا ۸۰۹ء) ارادے کا پختہ بادشاہ تھا اور یہ شیعہ برمکی حد سے زیادہ قوی ہوتے جاتے تھے۔ ہارون اپنی خلافت کے افق پر دو سورجوں کا چمکنا گوارا نہ کرسکا۔ سب سے پہلے ۸۰۳ء میں جعفر ہلاک کیا گیا۔ اُس کی عمر ۳۷ سال کی تھی۔ اس کا سر کاٹ کر بغداد کے ایک پُل پر بانس پر چڑھایا گیا اور جسم کے دو حصّے کر کے دوسرے دو پُلوں پر اُن کی اسی طرح نمائش کی گئی۔[۵۲] مؤرخوں نے عام طور پر وجہ یہ بتائی ہے کہ خلیفہ نے خلوت وجلوت کا ہم نشین ہونے کے باعث اجازت دی تھی کہ وہ صرف رسماً اس کی بہن عبّاسہ سے نکاح کرسکتا ہے۔ بعد میں جب خلیفہ حج کو گیا تھا، اُسے پتہ چلا کہ عبّاسہ کے پیٹ سے بیٹا ہوا جسے مخفی رکھا اور مکہ معظّمہ میں چھپا دیا گیا تھا۔[۵۳] سن رسیدہ یحییٰ اور اس کا نامی گرامی فرزند الفضل اور دو اور بیٹے بھی پکڑے اور قیدخانے میں ڈالے گئے۔ یہ اسی قید میں فوت ہوئے۔ خاندان برامکہ کا سب مال متاع ضبط کر لیا گیا۔ اس میں زر نقد ہی کی مقدار تین کرور چھ لاکھ چھتر ہزار دینار بتائی گئی ہے۔ محلات، مقطعے، فرش فروش اس کے علاوہ ہیں۔[۵۴] غرض یوں وہ خاندان جس کی خالد برمکی نے بنا ڈالی تھی، ہمیشہ کے لئے ختم ہوا۔

---

[۵۱] طبری۔ ۳۔ صفحہ ۶۷۴۔ [۵۲] عقد ۳ صفحہ ۲۸۔ طبری۔ ۳ صفحہ ۶۸۰۔
[۵۳] طبری۔ ۳۔ صفحہ ۶۷۶۔ مسعودی۔ ۶ صفحہ ۳۸۷۔ ابن خلدون وغیرہ۔
[۵۴] عقد ۳ صفحہ ۲۸۔

باب بست و چہارم

خلافت عبّاسیہ کا زمانۂ عروج 297

عباس ابن عبد المطلب

(۱) ال سفاح (جلوس ۷۵۰ء)　　(۲) ال منصور (۷۵۴ء)

(۳) ال مہدی (۷۷۵ء)

(۴) ال ہادی (۷۸۵ء)　　(۵) ہارون الرشید (۷۸۶ء)

(۶) ال امین (۸۰۹ء)　(۷) ال مامون (۸۱۳ء)　(۸) ال معتصم (۸۳۳ء)

(۹) ال واثق (۸۴۲ء)

(۱۰) ال متوکل (۸۴۷ء)

اسلامی تاریخ کے دوسرے شاہی خانوادوں کی طرح، خاندان عباسیہ

کی ملکی اور دماغی زندگی کا سب سے تابناک حصہ قیام حکومت کا قریبی زمانہ ہوا ہے۔ بغداد کی خلافت جسے سفّاح اور منصور نے قائم کیا، تیسرے خلیفہ ال مہدی سے لے کر نویں، ال واثق کے عہد تک، شباب پر رہی۔ اس میں بھی اسے زیادہ فروغ ہارون الرشید اور اس کے بیٹے ال مامون کے زمانۂ اقتدار میں حاصل ہوا۔ یہی وہ دو نامور خلیفہ ہیں جن کی بدولت پوری خلافتِ عبّاسیہ مسلمانوں کے تخیّل میں چمکتا چاند بن گئی اور اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ تذکرہ نویس ثعلبی (متوفیٰ ۱۰۳۸ء) نے یہ قول نقل کیا ہے کہ عباسی خلفا کا فتحِ باب منصور نے کیا۔ وسط، المامون تھا اور خاتم ال معتضد (۸۹۲ تا ۹۰۲ء)۔ یہ تاریخی اعتبار سے دور از حقیقت نہیں ہے۔ سلطنت کا آفتاب الواثق کے زمانے سے ڈھال پر آ گیا تھا یہاں تک کہ خاندان کے سینتیسویں جانشین خلیفہ ال مستعصم کے وقت، ۱۲۵۸ء میں وہ مغلوں کے ہاتھ سے بالکل فنا ہو گئی۔ انتہائے عروج اور اپنے بہترین دَور میں خلافت عباسیہ کی عظمت و شان اور تہذیب و ترقی کی کیفیت دیکھنی ہو تو ہمیں اوّل تو بیرونی ممالک سے اُس کے تعلقات پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ دوسرے دارالخلافت بغداد میں اُس کی درباری اور
298 امرا کی معاشرت کا مطالعہ کرنا اور اسی کے ساتھ اس بے مثال ذہنی بیداری کا جائزہ لینا ہوگا جو المامون کے زیر سرپرستی نہایت کمال کو پہنچ گئی تھی۔

فرنگیوں سے تعلقات

نویں صدی عیسوی کے آغاز میں دو بادشاہوں کے نام دُنیا کی

سیاسیات میں سب سے ممتاز تھے: ممالک مغرب میں شارل مین اور مشرق میں ہارون الرشید۔ ان دونوں میں ہارون بے شبہ زیادہ طاقتور بادشاہ اور بلندتر تہذیب کی نمایندگی کرتا تھا۔ ان میں باہم دوستانہ روابط قائم ہوئے جس کا سبب ظاہر ہو کہ یہ ان کے باہمی مفاد کا تقاضا تھا۔ شارل مین اس لئے ہارون سے دوستی بڑھاتا تھا کہ اپنے مخالف بائی زنطہ کے مقابلے میں ایک حلیف مل سکتا تھا اور ہارون کی خواہش تھی کہ اپنے رقیب اور جانی دشمن، یعنی اندلس کے امویوں کی روک تھام رکھنے میں شارل مین سے کام لے۔ کیونکہ امویوں نے انہی دنوں مغرب میں بڑی خوش حال اور طاقت ور سلطنت بنالی تھی۔ انہی دلی خیالات نے، مغربی مصنفوں کے بقول، سفرا اور تحائف کے رُسل رسائل کا پیرایہ اختیار کیا۔ ایک فرنگی مصنف جس کی شارل مین سے ذاتی ملاقات تھی بلکہ کہیں کہیں اس کے دبیر خاص کی حیثیت سے تذکرہ آیا ہو، بیان کرتا ہو کہ مغرب کے اس بڑے بادشاہ کے ایلچی شاہ ایران، "آرون" کے دربار سے قیمتی عطیئے لے کر وطن واپس آئے۔ جن میں پارچہ جات، بخور اور ایک ہاتھی بھی تھا[1]۔ یہ روایت "اے نلیز رائیلیس" پر مبنی ہو[2]۔ جس میں آگے چل کر ایک پیچیدہ قسم کی گھڑی کا ذکر آتا ہو کہ وہ بھی بغداد کے تحائف میں شامل تھی۔ لیکن نفیر کی قسم کا ساز جس کا ہارون کی طرف سے شارل مین کے پاس بھیجا جانا مروی ہو تاریخ کے بعض دوسرے لطائف کی طرح، بناوٹی[3] ہو۔ یہ کہانی بظاہر

---

[1] ایجن ہارٹ کی "حیات شارل مین" (پیرس ۱۸۴۳ء) ص ۴۷ ۔

[2] دیکھو "اے نلیز ریجنی فرانکورم" جلد ۴۳ ص ۱۱۲ ۔

اصلی ماخذوں میں ایک لفظ (کلپ سی ڈرا) کے غلط ترجمے پر مبنی ہو جس کے اصلی معنی پانی کے ذریعے وقت کا حساب لگانے کے ہیں اور اس سے وہی گھڑی مُراد ہو جو تحفۃً بھیجی گئی تھی۔ اسی طرح یہ روایت کہ ہارون کی منظوری سے مزار مسیح کے کلیسا کی کنجیاں شارل مین کے حوالے کردی گئیں، پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی ہے[۱]

سفرا کی آمد و رفت اور تحائف کے ان مبادلوں کے متعلق جو ۷۹۷ء اور ۸۰۶ء کے درمیان واقع ہوئے، عجیب بات یہ ہو کہ مسلمان اہلِ قلم بالکل خاموش ہیں۔ دوسری سفارتوں کا آنا، اور ان کی خاطر تواضع کا ذکر بارہا آتا ہو مگر شارل مین اور اس کے سفیروں کا نام تک مذکور نہیں۔ عقد[۲] میں اموی خلفا کی قیصر روم سے مراسلت کے کئی واقعے لکھے ہیں۔ عباسیوں کے زمانے میں "شاہ ہند" کے ایک وفد بھیجنے کا حال بیان کیا ہو کہ ہارون کی خدمت میں بیش بہا تحفے لایا اور اس کا دھوم دھام سے استقبال ہوا۔ ایک اور ماخذ[۳] میں لکھا ہو کہ خلیفہ المامون کو اس کے ہم عصر "رومیوں کے بادشاہ" نے خاص طور پر گراں بہا تحفہ ارسال کیا تھا۔ یہ بادشاہ مائیکل ثانی ہو سکتا ہو۔

سلطنت بائزنطہ کے ساتھ ایک صدی سے زیادہ پرانی جنگ عباسیوں کے تیسرے خلیفہ المہدی (۷۷۵ـ۷۸۵) نے دوبارہ تازہ کردی تھی لیکن جدال و قتال کے معرکے نہ زیادہ متواتر تھے نہ کچھ بہت کامیاب ہو سکے۔ اصل میں حکومت عرب کو خانہ جنگی نے انتشار

---

[۱] ہم نے آیندہ اوراق (باب ۴۵) میں بھی یہ روایت نقل کی ہو۔

[۲] ۱، صفحہ ۱۹۷۔ [۳] قطبی: "فوات" ۱، صفحہ ۳۰۲۔

میں مبتلا کردیا تھا اور اسی کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ دمشق کی بجائے بغداد جیسے بعید مقام پر دارالخلافہ منتقل کیا گیا تھا۔ اسی سے قیصر کونس ٹن ٹائن پنجم (۷۴۱ء تا ۷۷۵ء) کو موقع ملا کہ ارمنیہ اور ایشیائے کوچک میں اپنی سرحدیں پھر آگے بڑھالے[۵۱] اور جتنی دُور تک قیصر کے قدم بڑھے اسی قدر مسلمانوں کے سرحدی قلعے (= ثغور) شام سے ارمنیہ تک پیچھے ہٹے ٭

ال مھدی نے بائی زنطہ کے خلاف جہاد کو دوبارہ جاری کیا تو مہم کی قیادت خود اپنے نوجوان فرزند اور آیندہ وارث سلطنت ہارون کے تفویض کی اور بڑی تیزی اور کامیابی سے دشمن کے خاص پایۂ تخت پر حملہ کرایا۔ ۷۸۲ء[۵۲] میں عساکر عرب اگر قسطنطنیہ نہیں تو ساحل بوس فورس تک ضرور پہنچ گئے[۵۳]۔ بائی زنطہ میں ملکہ آئی رین اپنے بیٹے کونس ٹن ٹائن کی طرف سے بطور اتالیق سلطنت حکومت کررہی تھی۔ اسے کوئی چارہ کار نہ بن پڑا تو صلح کی التجا کی اور نہایت ذلت آمیز شرائط قبول کیں حتیٰ کہ ستر ہزار سے نوّے ہزار دینار ششماہہ خراج دینے کا عہد کرلیا[۵۴]۔ اسی معرکہ آرائی میں ہارون نے ایسا نام پیدا کیا کہ باپ نے خوش ہوکر "الرّشید" (یعنی سیدھے یا

---

[۵۱] اے اے وسی لیو: "ہسٹری اوف دی بای زن ٹائن ایمپائر" (میڈی سن ۱۹۲۸ء) ص ۲۹۱۔ نیز دیکھو ڈاہیل کی تاریخ مترجمہ ای دس۔ ص ۵۵ ٭

[۵۲] "کتاب العیون"، ص ۲۷۸ میں مہم کا سال ۱۶۳ھ (یعنی ۷۸۰ء) تحریر ہے۔ یعقوبی ۱۶۴ اور طبری ۱۶۵ھ بتاتا ہے۔

[۵۳] تھیوفانس نے اپنی کتاب ۸۱۳ء میں لکھی تھی۔ اس کا بیان ہے کہ ہارون کرسوپولیس یعنی موجودہ سقوطری کے مقام تک بڑھ آیا تھا۔ ص ۴۶۵ ٭ [۵۴] طبری۔ ۳ ص ۵۰۴ ٭

سعادت مند) کا اعزازی لقب عطا کیا اور اپنے بڑے بیٹے موسیٰ ال
ہادی کے بعد دوسرا وارث سلطنت اُسے قرار دیا ؎

یہی آخری موقع ثابت ہوتا ہے جب کہ جنگ جو عربوں کی فوج
قیصر کے پُرغرور دارالسلطنت کی فصیلوں کے سامنے تک چڑھ آئی
مجموعی طور پر عربوں کی چار بار قسطنطنیہ (بائی زن طیوم) پر فوج کشی
ہوئی۔ پہلی تین مہمات امویوں کے عہد میں امیر معاویہ اور سلیمان نے
بھیجی تھیں جیساکہ اٹھارویں باب میں ہماری نظر سے گزرا۔ چوتھی یہ تھی
جو عباسی خلیفہ مہدی نے بھجوائی مگر شہر کے واقعی محاصرے کی
نوبت صرف دو مرتبہ آئی تھی۔ اوّل تو یزید کی سپہ سالاری میں (۴۹
300 م ۶۶۹ء)۔ ترکی روایات میں محاصروں کی تعداد سات یا نو تک
بتائی جاتی ہے جن میں سے دو ہارون سے منسوب ہیں۔ الف لیلہ اور
دوسری رزمیہ عربی داستانوں میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کی کئی بار
فوج کشی کے قصے لکھے ہیں مگر ان میں بہت رنگ آمیزی ہوئی
اور حروب صلیبیہ کے زمانے میں اور بھی حاشیے چڑھائے گئے تھے ؎

ملکہ آئی رین نے خود سلطنت دبالی تھی (۷۹۷ تا ۸۰۲ء)
اور بائی زنطہ کی تاریخ میں وہی ایسی عورت گزری ہے جو کامل شاہانہ
اقتدار کے ساتھ فرماں روائی کرتی رہی۔ اس کا جانشین نیس فورس
اوّل ہوا (۸۰۲ — ۸۱۱ء)[۱] جس نے صلح نامہ کی شرطیں ماننے سے

---

[۱] عربی کتابوں میں اسے "نق فور" لکھتے ہیں۔ وہ نسلاً عرب تھا اور ممکن ہے کہ جبلہ غسانی
کی اولاد میں ہو۔ دیکھو طبری۔ ۳ صفحہ ۶۹۵ می جل لا سی ریان : "کرانکل" (پیرس ۱۹۰۵ء)،
صفحہ ۱۔ آئی رین اس اشوری یا شامی خاندان کی آخری فرماں روا تھی جس کی بنیاد (بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷۱ پر)

انکار کر دیا بلکہ خلیفہ سے، جو اب خود ہارون الرشید تھا، مطالبہ کیا کہ جتنا خراج پہلے دیا گیا ہو وہ سب بائی زنطہ کو واپس کیا جائے۔ ہارون غصّے سے آگ ہوگیا۔ قلم دوات طلب کی اور قیصر کے حقارت آمیز نامے کی پشت پر یہ جواب تحریر کیا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

امیر المومنین ہارون کی طرف سے۔ رومی کُتّے نِق فورس کے نام۔ اے کافرہ ماں کے بیٹے۔ تحقیق میں نے تیرا خط پڑھا۔ رہا جواب، وہ تیری آنکھوں کو دکھا دیا جائے گا کانوں کو سنایا نہیں جائے گا۔ والسّلام[۵۱]

پھر جیسا کہا تھا اسی کے مطابق خلیفہ نے جنگ کے سلسلے کا آغاز کر دیا۔ اپنی پسندیدہ اقامت گاہ رقّہ سے کہ فرات کے کنارے واقع اور شام کی سرحد اس کی زد میں تھی، فوجیں بڑھانی شروع کیں۔ ان فوجوں نے ایشیائے کوچک کو تاراج کر ڈالا اور بالآخر ہراکلیہ (عربی: ہرقلہ) اور ٹیانا (عربی: ال طُوانہ) کو ۸۰۶ء میں فتح کر لیا۔ پھر بائی زنطہ سے نہ صرف خراج وصول کیا بلکہ قیصر روم کو خود اپنی ذات کا اور اس کے خاندان کے ہر فرد کو جزیہ دینا قبول کرنا پڑا جس سے بڑھ کر شرم کے قابل کوئی شرط نہ ہو سکتی تھی[۵۲]۔ ہارون الرشید کے عہد میں یہ سال اور یہ

(بقیہ حاشیہ ص۴۷۰) لیو ثالث (۷۱۷ — ۷۴۱ء) نے رکھی تھی۔ یہ قیصر اور اس کے جانشین عیسائیوں میں بت شکنی کی تحریک کے سرگروہ تھے اور اس تحریک میں اسلامی اثرات نظر آتے ہیں۔ تھیوفانس نے لیو کو "عرب مزاج" بادشاہ تحریر کیا ہو۔ ص۴۰۵۔

۵۱ طبری۔ ۳ ص۶۹۶۔

۵۲ " — یعقوبی، ۲ ص۵۱۹۔ دینوری؛ مسعودی وغیرہ۔

واقعہ، خلافت عباسیہ کے سارے دَور میں انتہائی اقتدار اور اقبال مندی کا کمال کہے جا سکتے ہیں ؛

۸۰۶ء میں صرف ایک مرتبہ اور کوہستان طارس کے پار واقعی قدم جمانے کے ارادے سے فوج کشی، معتصم کے عہد یعنی ۸۳۸ء میں بھی کی گئی معتصم کا لشکرِ عظیم ایسے ساز و سامان سے آراستہ تھا کہ "اس سے پہلے کوئی لشکر اس شان سے تیار ہو کر نہ آیا تھا"[۱] اور وہ
301 رومیوں کی سرزمین کے قلب تک بڑھتا چلا گیا یہاں تک کہ اموریم (عربی : عموریہ) پر وقت کے وقت قابض ہو گیا جو فرماں روا خاندانِ قیاصرہ کے بانی کی ولادت گاہ بھی تھا[۲] بایں ہمہ مجموعی طور پر مہم ناکام رہی۔ عساکر عرب سے اُمید تھی کہ قسطنطنیہ تک بڑھتے چلے جائیں گے لیکن انھیں وطن میں ایک جنگی سازش ہونے کی خبر ملی لہذا وہ گھبرا کر واپس چلے آئے حال آں کہ قیصر تھیوفی لوس (۸۲۹ تا ۸۴۲ء) جو اس وقت حکومت کرتا تھا، اپنے دار السلطنت کو بچانے سے اتنا مایوس ہو چکا تھا کہ اس نے وینس اور فرنگ کے بادشاہ، نیز اندلس کے اموی دربار تک قاصد دوڑائے تھے اور ان سے دست گیری کی التجا کی تھی۔ یہاں یہ اور بیان کر دینا چاہیئے کہ تھیوفی لوس کو چند سال پہلے بھی مشرق کی طرف سے ایسا ہی خطرہ لاحق ہوا تھا جب کہ المامون خود فوج لے کر بائی زنطہ پر چلا تھا لیکن طرسوس کے قریب خلیفہ کا انتقال ہو گیا۔ (۸۳۳ء)۔

---

[۱] ایضاً [۲] ڈی جل لاسیریاں ۔ ۳ ص ۴۳ ؛

[۳] قدامہ : "کتاب الخراج" (لائےڈن ۱۸۸۹ء) ص ۲۵۹ ؛

بہرحال، معتصم کے بعد عربوں کی طرف سے کوئی خاص جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا۔ معتصم کے بعض جانشینوں نے سرحد پار فوجیں بھیجیں بھی، تو ان کا مقصد کشور کشائی کی بجائے غارت گری ہی سمجھنا چاہیئے۔ ان حملوں نے کوئی بڑی اہمیت حاصل نہیں کی اور نہ عباسی فوجیں زیادہ دُور تک بڑھیں اگرچہ نویں صدی عیسوی میں یہ معرکے مشرقی سرحد پر قریب قریب ہرسال ہوتے رہے۔ یہ ایسی رسم سی پڑگئی تھی کہ ایک عرب جغرافیہ نویس[۱] ہمیں بتاتا ہے کہ سال میں تین بار فوج کشی کا معمول ہوگیا تھا: ایک دفعہ سردیوں میں یعنی آخر ماہ فروری سے اوائل مارچ تک۔ دوبارہ موسم بہار میں یہ حملہ دس مئی سے شروع ہوکر ایک مہینے تک جاری رہتا تھا۔ پھر گرمیوں میں دس جولائی سے معرکہ آرائی کا آغاز ہوتا اور یہ سلسلہ ۶۰ دن چلتا تھا۔ یہ ترک تازی اہل سپاہ کو کیل کانٹے سے لیس رکھتی اور اموال غنیمت بھی ہاتھ آتا رہتا تھا لیکن مسلمانوں کے ابتدائی محاربات میں جو مذہبی جذبہ سب سے قوی محرّک کا کام دیتا تھا، یا ابتدائی عربی قومیت کا جوش، یہ دونوں عناصر اب (عہد عباسی میں) کوئی بڑی وجہ تحریک نہیں رہے تھے۔ خلافت اسلامی کی اندرونی کمزوری، اس کے بیرونی تعلقات پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ دسویں صدی میں خلافت سے ٹوٹ کر جو چھوٹی چھوٹی نئی حکومتیں قائم ہوئیں، ان میں سے ایک حلب کے ہمدانی خاندان کی حکومت تھی اور اس نے بائی زنطہ کے خلاف ہتھیار سنبھالے تھے۔ لیکن یہ واقعات ہم آیندہ، اپنے مقام پر بیان کریں گے۔

---

[۱] قدامہ: "کتاب الخراج" (لائیڈن ۱۸۸۹ء) ص ۲۵۹۔

بغداد کی شوکت وشان رفتہ

تاریخ اور فسانہ دونوں متفق ہیں کہ شہر بغداد کا سب سے درخشاں زمانہ ہارون الرشید کا عہد خلافت (۷۸۶ تا ۸۰۹ء) تھا۔ اُس کی فرماں روائی کے وقت شہر کی عمر پچاس برس کی بھی نہ تھی لیکن اسی عرصے میں بغداد کتمانِ عدم سے نکل کے عظیم دولت ومال اور بین الاقوامی شہرت کا مالک بن گیا تھا۔ دنیا کے بڑے شہروں میں صرف وہ بائی زن طیوم کا مد مقابل تھا۔ بغداد کی شان وشوکت اس دولت عظمیٰ کی ثروت وخوش حالی کے ساتھ ساتھ بڑھی تھی جس کا وہ دار السلطنت
302 تھا۔ تب ہی وہ رفتہ رفتہ "ایسا شہر ہو گیا کہ دنیا بھر میں کوئی شہر اُس کی جوڑ کا نہ تھا"۔[1]

قصر شاہی کے ملحقات میں صدہا عمارتیں تھیں جن میں شاہی بیگمات، خواجہ سرا اور خاص خاص عمال رہتے تھے اور "مدوّر شہر" کا ایک تہائی حصہ انہی عمارتوں سے گھرا ہوا تھا۔ مگر قصر شاہی میں سب سے عالی شان درباری ایوان اور اس کا سامان آرائش، یعنی وہ فرش وقالین، پردے اور تکیے تھے کہ اُن سے بہتر ممالک ایشیا فراہم نہ کر سکتے تھے۔ خلیفہ کی بنتِ عم ملکہ زبیدہ کو آنے والی نسلوں نے اپنے شوہر کے جاہ وجلال کی روایتوں میں برابر کا حصہ دار قرار دیا ہے۔ وہ اپنے دسترخوان پر صرف جواہر جڑے ہوئے سونے چاندی کے ظروف آنے دیتی تھی اور ایک جوڑ کے برتنوں کا طریقہ بھی اُسی نے

---

[1] خطیب۔ ۱ صـ ۱۱۹۔

جاری کیا تھا۔ علی ہذا وہی پہلی خاتون تھی جس نے جوتیوں میں اصلی جواہرات ٹکواے[1]۔ ایک ہی حج کے سفر میں، کہا جاتا ہو کہ اس نے تیس لاکھ دینار خرچ کئے۔ انہی اخراجات میں پچیس میل دور کے چشمے سے مکۂ معظمہ تک آب رسانی کا انتظام شامل ہو[2]۔

زبیدہ کی ایک حریف ہارون کی علاتی بہن اور ال مہدی کی بیٹی عُلَیّہ تھی۔ پیشانی کا ایک داغ چھپے رہنے کی خاطر اس نے ایک جواہرنگار فیتہ باندھنے کی وضع ایجاد کی تھی۔ یہ اسی کے نام سے موسوم، اور بہت جلد بناؤسنگھار کی دنیا میں سب سے مقبول وقت زیور بن گیا تھا[3]۔

خاص خاص تقریبات میں، جیسے نئے خلیفہ کی مسند نشینی، شادی بیاہ، سفرِ حج یا بیرونی سفیروں کی باریابی کے موقع پر ہم شاہی دولت اور جاہ وجلال کا سب سے زیادہ اظہار ہوتے دیکھتے ہیں۔ خلیفہ مامون کی شادی ۸۲۵ء میں وزیر سلطنت حسن ابن سہل کی ہشتاد سالہ بیٹی بوران سے ہوئی[4] تو اتنا بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا کہ عربی کتابوں میں اعجوبۂ روزگار کے طور پر اس کے تذکرے باقی ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایجاب وقبول کے وقت دولہا دلھن ایک زرباف حصیر پر جس میں موتی اور پکھراج ٹکے تھے، آکر بیٹھے، تو طلائی کشتی بھرکر

---

[1] مسعودی۔ ۸ صفحہ ۲۹۸۔

[2] ابن خلکان۔ ۱ صفحہ ۳۳۷۔ نیز دیکھو برک ہارٹ: "اسفار"، ۱ صفحہ ۱۹۶۔

[3] اغانی۔ ۹ صفحہ ۸۳۔

[4] اس لڑکی کی نسبت مامون سے پہلے ہی ہوچکی تھی، جب کہ وہ دس سال کی تھی۔ ابن خلکان۔ ۱ صفحہ ۱۶۶۔

ایک ہزار موتی اُن پر سے نچھاور کیے گئے کہ ہر ایک دُرِّ بے بہا تھا۔ کچے عنبر کی دو سو رطل وزن کی موم بتی روشن کی گئی کہ رات کے وقت دن کی روشنی معلوم ہوتی تھی۔ شاہی خاندان کے افراد اور معزز مہمانوں میں سے ہر ایک پر مشک کی گیند پھینکی گئی جس کے ساتھ ایک پرچہ بھی تھا اور اس پر کوئی بیش قیمت تحفہ جیسے زمین کا قطعہ یا کسی غلام کا نام لکھا ہوا تھا۔[1] تزک و احتشام کی ایک اور کیفیت ہم خلیفہ المقتدر کے دربار میں رومی سفیروں کی آمد کے سلسلے میں مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ، نوجوان قیصر کونسٹنٹائن ہفتم کے بھیجے ہوئے،
303 ۹۱۷ء میں بغداد آئے تھے اور بظاہر قیدیوں کا تبادلہ اور فدیہ طے کرنا، سفارت کا مقصود تھا۔[2] اس موقع پر دربار خلافت کی جو فوجیں قطار در قطار کھڑی کی گئیں، ان کے سوار و پیادہ کی تعداد ایک لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ سات ہزار زنگی اور فرنگی خواجہ سرا، اور سات سو حاجب صف بستہ تھے۔ فوجی جلوس میں ایک سو شیر ببر بھی چل رہے تھے۔ ایوان شاہی، ہر طرف ۳۸ ہزار پردوں سے جن میں ۱۲½ ہزار گنگا جمنی تھے، مزین تھا۔ اور فرش پر ۲۲ ہزار غالیچے بچھے تھے۔ سفیروں پر ایسا رعب چھایا کہ پہلے خلیفہ کے حاجب اور پھر وزیر کے دیوان کو بادشاہ کا دربار سمجھے۔ انھیں سب سے بڑھ کر جس ایوان نے حیرت زدہ کیا وہ "دار الشجرہ" تھا جہاں سونے چاندی کا مصنوعی درخت نصب کیا تھا۔ اس کا وزن پانچ لاکھ درم (= تقریباً پانسو

---

[1] طبری، ۳، ص ۱۸۰۱؛ مسعودی، ابن اثیر وغیرہ۔ نیز دیکھو مقدمہ ابن خلدون، ص ۱۴۴۔

[2] مسعودی: "تنبیہ" ص ۱۹۳۔

مثقال، کم وبیش پانچ من) تھا۔ اس کی شاخوں پر انہی قیمتی دھاتوں کے طیور بناکر بٹھائے تھے اور انھیں ایسے کمال سے بنایا گیا تھا کہ کل دبانے سے چہکنے لگتے تھے۔ قصر کے باغوں میں کھجور کے چھوٹے چھوٹے درخت دیکھ کر سفیر حیران رہ گئے جن کا مصنوعی تدابیر سے قد گھٹایا اور اس طرح اُگایا گیا تھا کہ ان میں نادر ترین اقسام کی کھجوریں پھل دے رہی تھیں۔[۱]

ہارون الرشید اسلامی بادشاہی کا سب سے پاکیزہ نمونہ تھا۔ اس کی اور اس کے قریبی جانشینوں کی شاہانہ داد و دہش مقناطیس کا حکم رکھتی تھی کہ پائے تخت میں دُور دُور سے شاعر، مطرب، گویے، نچنئے،[۲] مسخرے، کتّے اور مُرغ لڑنے والے اور ہر طرح کے ارباب تفریح ونشاط کھنچے چلے آتے تھے۔ گانے والوں کے طائفوں کے سرخیل ابراہیم الموصلی، سیاط اور ابن جامع تھے۔ رند مزاج شاعر ابو نواس خلیفہ ہارون الرشید کا ندیم خاص تھا اور اکثر اُس کے شبانہ گشت میں شریک و رفیق رہا۔ اس عہد اقبال کی رنگین درباری زندگی کی وہ ایسے اشعار میں تصویریں کھینچ گیا ہے جو کبھی فراموش نہ ہوں گے۔ کتاب اغانی کے اوراق اسی قسم کے تمثیلی محاضرات سے بھرے ہوئے ہیں جن سے اصل حقیقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ خلیفہ الامین (۸۰۹ — ۸۱۳ء) نے ایک رات اپنے چچا ابراہیم ابن مہدی کو جو باقاعدہ گویا تھا، ابو نواس کی چند بیتیں گاکر سنانے کا صلہ تین لاکھ دینار عطا کیا۔ خلیفہ نے ابراہیم کو پہلے جو انعام دئے

---

[۱] خطیب، ۱ صنا۔ ابوالفدا۔ ۲ صـ۳۔ یاقوت۔ ۲ صـ۵۲۰

[۲] (مؤلف نے "پیشہ ور" کا لفظ لکھا ہے۔ مترجم)

تھے، اُن میں یہ رقم ملائی جائے تو انعاموں کی مجموعی مالیت دو کروڑ درہم
ہو جاتی ہے۔ یہ چند ضلعوں کی مال گزاری سے زیادہ نہ تھی[1]۔ مورخ ابن
اثیر نے تو خلیفہ الامین کے حالات میں کوئی تعریف کی بات لکھنے کے
لائق ہی نہیں پائی[2] تھی البتہ اس کے متعلق تحریر کیا ہے کہ دجلے میں سیر
و ضیافت کے جلسے جمانے کے لئے اُس نے طرح طرح کی بہت سی
کشتیاں بنوائی تھیں۔ یہ مختلف جانوروں کی شکل کی تھیں کسی کی صورت
شیر ماہی کی تھی، کوئی شیر ببر سے اور کوئی عقاب سے مشابہ تھی۔ ایک
کشتی کی لاگت تیس لاکھ درہم آئی تھی[3]۔ اغانی میں ایک رنگین مجلس
رقص و طرب کا قصہ لکھا ہے جو تمام رات جمی رہی[4]۔ خود خلیفہ امین گانے
بجانے کی ہدایات دیتا جاتا تھا۔ بڑی تعداد میں نوخیز و حسین ناچنے والیاں
304 ساز کے ہلکے ہلکے تال سُر پر ناچتی جاتی تھیں اور اُن کے ساتھ ساتھ
جملہ اہل مجلس گاتے جاتے تھے۔ مسعودی کا بیان ہے[5] کہ اسی گویے
ابراہیم نے اپنے بھائی ہارون الرشید کے اعزاز میں ایک دعوت کی
تو کھانوں میں مچھلی بھی تھی جس کے قتلے بہت چھوٹے چھوٹے نظر
آتے تھے۔ سوال کرنے پر میزبان نے بتایا کہ وہ مچھلی کی زبانیں تھیں
اور خانساماں نے صراحت کی کہ طشتری میں ڈیڑھ سو زبانیں تھیں کہ
صرف ان کی قیمت ہزار درہم سے زیادہ ہوتی تھی۔ بے شبہ اہل مشرق
کی عجائب پسندی اور تخیل نے بغداد کی درباری زندگی کی شان تجمل

---

[1] اغانی - ۹ ص - نیز دیکھو آیندہ باب میں مال گزاری کے اعداد۔

[2] ۶ ص ۲۰۰۔ [3] ، - طبری - ۳ ص ۹۵۱۔

[4] ۱۲ ص ۱۳۸۔ [5] ۶ ص ۳۴۹۔

بڑھا چڑھا کے دکھائی ہے لیکن ساری حاشیہ آرائی کو دُور کر کے بھی دیکھئے تو وہ ہمیں مبہوت کئے بغیر نہیں رہتی ؛

حضرت خلیفہ کے بعد، عیش و تکلف کی زندگی بسر کرنے میں دوسرا درجہ عباسی خاندان کے افراد، پھر وزرا، اُمرا، عمال دولت اور شاہی خاندان کے دوسرے متوسلین کا تھا۔ بنی ہاشم کے لوگ جو عباسیوں کا اصل قبیلہ تھا، شاہی خزانے سے باقاعدہ بیش قرار وظیفے پاتے رہے تاآں کہ خلیفہ معتصم (۸۳۳ — ۸۴۲ء) نے یہ رسم ترک کردی[۵۱]۔ کہتے ہیں ہاروں رشید کی ماں خیزران کی آمدنی ۱۶ کروڑ درہم تھی[۵۲]۔ ایک (عباسی) محمد ابن سلیمان فوت ہوا اور اُس کی املاک خلیفۂ موصوف نے ضبط کی تو اس کے مال متروکہ میں پانچ کروڑ درہم نقد برآمد ہوئے اور جائداد کی آمدنی ایک لاکھ درہم روزانہ نکلی[۵۳]۔ برامکہ جس شان سے زندگی بسر کرتے تھے وہ خاندان خلافت کے افراد سے کچھ زیادہ کم نہیں ہوسکتی۔ رہے بغداد کے عامتہ الناس، ان کی روزانہ زندگی لشتم پشتم گزرے جاتی تھی۔ اُن کے محسوسات کا ہمارے تاریخی ماخذوں میں کچھ زیادہ پتہ نہیں چل سکتا۔ البتہ زاہد مرتاض ابو العتاہیہ کی منظوم تصانیف کو شاید ہم مستثنیٰ کرسکتے ہیں ؛

۸۱۹ء میں المامون نے ۶ سال کی خانہ جنگیوں کے بعد فتح حاصل کی۔ اس کی لڑائیاں اپنے بڑے بھائی امین اور چچا ابراہیم

---

۵۱ دیکھو ثعالبی: "لطائف" صـ۱۷ ؛

۵۲ مسعودی۔ ۶ صـ۲۸۹ ؛　　۵۳ ایضاً ؛

ابن مہدی سے ہوئیں۔ بھائی کو تو باپ نے ولی عہد خلافت بنایا تھا اور ابراہیم نے خود خلافت کا دعویٰ کیا۔ ان حریفوں کو شکست دے کر مامون شہر بغداد میں داخل ہوا تو اس کا بڑا حصہ ویران پڑا تھا۔ "گول شہر" کا تو ہم آیندہ ذکر ہی نہیں سنتے۔ مامون نے قصر جعفری میں اقامت اختیار کی۔ یہ محلات دریا کے بائیں جانب اصل میں جعفر برمکی نے بنوائے تھے۔ لیکن زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ شہر میں پھر وہی گہما گہمی، اور تجارتی اور علمی سرگرمیاں ہونے لگیں۔ اصل میں بغداد کا محل وقوع ہی ایسا تھا کہ اس شہر کی مرجعیت زائل نہ ہو سکتی تھی۔ وہ دجلہ و فرات کی وادی میں بڑی
30: بڑی تخت گاہوں کے سلسلہ علیہ کا جو شہر آر اور بابل سے شروع ہو کر مدائن پر منتہی ہوا، وارث صحیح تھا۔ ان دنوں دنیا کے جن ملکوں تک جہازی آمدورفت جاری تھی، ان میں بغداد کو مرکزی جگہ حاصل تھی۔ سمندر سے براہِ دریا یہاں جہاز پہنچتے تھے۔ اس کے جہازی گودام ساحل دجلہ پر میلوں پھیلے ہوئے تھے اور ان کے سامنے صدہا کشتیاں پڑی رہتی تھیں۔ انہی میں جنگی جہاز اور تفریح کے بجرے شامل ہیں اور طرح طرح کی دریا نورد سواریاں، چینی "جنک" یعنی چپٹی کشتیوں سے بانس کے ٹھاٹر تک۔ جو مشکوں کے سہارے موصل سے بہتے آتے تھے۔ اور کچھ اسی نمونے کے ہوتے ہوں گے جیسے آج کل نظر آتے ہیں۔ بغداد کے بازاروں میں چین کے نفیس برتن، ریشم اور مشک۔ ہندستان اور جزائر ملایا کے مسالے، دھاتیں، رنگ۔ وسط ایشیا کے تاتاری علاقوں سے، یاقوت، لاجورد، پارچہ

غلام ۔ روس اور سکنڈی نیویہ سے ، شہد ، موم ، پوستین اور بھورے غلام ۔ مشرقی افریقہ سے ، ہاتھی دانت ، سونے کا سفوف اور حبشی غلاموں کی کھیپیں آتی تھیں ۔ خاص چینی اشیا کی خرید فروخت کا بازار الگ تھا۔ سلطنت کی ولایات اپنی دیسی پیداوار سمندر یا قافلوں کے ذریعے بھیجتی تھیں ۔ مصر سے چاول ، غلہ ، ململ آتی تھی ۔ شیشے اور دھات کی مصنوعات نیز میوہ ، شام سے ۔ کارچوب ، موتی اور اسلحہ عرب سے ۔ ریشم ، عطریات اور بقولات ایران سے پہنچتے تھے[1] ۔ شہر دریا کے دونوں جانب آباد تھا ۔ ان میں آمد رفت کی آسانی کے لئے تین تختہ پل بنے ہوئے تھے جیسے آج کل کے بغداد کے پل ہیں خطیب نے[2] اپنی تاریخ کی ایک فصل انہی پلوں پر لکھی ہے ۔ ایک اور فصل میں بغداد کی انہار کا حال بیان کیا ہے ۔ بغداد من جملہ ان مرکزوں کے ایک تھا جہاں سے عرب سوداگر یورپ اور افریقہ کا پارچہ ، زیورات ، حلبی آئینے ، شیشے کے مُہرے یا دانۂ تسبیح ، مسالے وغیرہ مشرق بعید کو جہاز میں روانہ کرتے تھے[3] حال میں روس ، فنستان[4] ، سویڈن ، جرمانیہ جیسے بعید شمالی ملکوں میں ڈھیروں عربی سکے دستیاب ہوئے اور شہادت دیتے ہیں کہ اس عہد اور زمانۂ بعد کے مسلمانوں کی تجارتی مساعی کس قدر عالمگیر پیمانے پر ہوتی تھیں ۔ الف لیلہ کی مشہور ترین کہانیوں میں سندباد جہازی کی جہاں پیمائیوں کا قصہ ہے ۔ اور یہ بات

---

[1] مطالعہ کرو لی اسٹرینج کی " ایسٹرن کے ل فیٹ " نیز آیندہ باب ۔

[2] ا ص ۱۱۱ ۔		[3] دیکھو آیندہ باب ۔

[4] وہاں کے صدر مقام ہلسنکی کے عجائب خانے میں یہ سکے بڑی تعداد میں موجود ہیں ۔

ایک زمانے سے تسلیم کی جا چکی ہو کہ مسلمان تاجر اپنے بحری اسفار کے جو حالات سناتے تھے، یہ قصّہ اُن واقعی اطلاعات پر مبنی ہو۔

شہر بغداد کی آبادی میں سوداگروں کا بہت نمایاں حصّہ تھا۔ ہر صنعت و حرفت اور ہر قسم کی تجارت کرنے والوں کی دکانیں ایک ہی بازار یا سوق میں لگتی تھیں[1] جیساکہ آج کل بھی وہاں دستور ہو۔ بازار کے معمولی کاروبار میں وقتاً فوقتاً شادی یا ختنہ کے کسی جلوس گزرنے سے تنوّع پیدا ہوتا رہتا تھا۔ دوسرے پیشہ ور لوگ جیسے طبیب، فقیہ، ادیب اور اساتذہ وغیرہ مامون کی سرپرستی کی بدولت زیادہ نمایاں ہوے اور شہری زندگی میں امتیازی مرتبہ حاصل کرنے لگے
تھے۔ جس زمانے میں النّدیم نے اپنی معرکۃ الآرا "فہرست" مرتّب 306
کی (=۹۸۸ء) جس میں اُس وقت کی عربی کتابوں کے نام وغیرہ درج کئے گئے ہیں، تو مخطوطات کی تعداد کثیر شایع ہو چکی تھی جن میں عمل توجہ، نیرنجات و شعبدہ بازی، تلوار نگلنا، شیشہ چبانا جیسے مضامین تک زیر بحث لائے گئے تھے[2]۔ طبقہ اہل علم کے ایک فرد کی روزانہ زندگی کی کیفیت ابن خلکان کی مہربانی اور ہماری خوش قسمتی سے محفوظ رہی[3]۔ یہ حُنین ابن اسحاق کا تذکرہ ہو جسے مؤرخ ایک فصل کے تحت میں لکھ گیا اور جس سے پتہ چلتا ہو کہ اُن دنوں بازار میں علمی قابلیت کی اچھی خاصی قیمت مل جاتی تھی۔ سب سے پہلے صبح کی سواری کے بعد حُنین کو کرائے کے حمّام میں دکھایا ہو جہاں خدّام اسے نہلاتے دُھلاتے ہیں۔ حمّام سے باہر آ کے وہ ایک ڈھیلا ڈھالا

---

[1] ص ۳۱۲۔		[2] ص ۳۰۸، ۲۹۸۔

چغہ پہنتا، کوئی مشروب پیتا اور ایک ٹکیہ کھا کے لیٹ جاتا اور کبھی کبھی سو جاتا ہی۔ آرام لینے کے بعد وہ بخور جلاتا اور اپنے جسم کو دھونی دے کر کھانا لانے کی فرمائش کرتا ہی۔ کھانے میں عموماً شوربا، پلا ہوا چوزہ اور روٹی ہوتی ہی۔ پھر وہ دوبارہ قیلولہ کرتا ہی اور بیدار ہوکر پرانی شراب چار رطل کے بقدر پی لیتا اور تازہ پھل کو جی چاہے تو اسی میں بہی اور شامی سیب کا عرق شامل کر لیتا ہی۔

علمی اور دماغی بیداری

مہدی اور ہارون کے عہد میں ازلی دشمن یعنی سلطنت بائی زنطہ کی لڑائیوں میں اسلامی فوجوں کو جو فتوحات نصیب ہوئیں، بے شبہ ان کی چمک دمک نے اس عہد کو اور بھی درخشاں کر دیا۔ معاشرت میں عیش و آرام کے سامان میسر آنے سے وہ تاریخ اور قصص میں اور بھی مقبول عام ہوا۔ لیکن خاص بات جس کی بدولت یہ زمانہ دنیا کی تاریخ میں خاص ناموری کا مستحق ٹھیرا، درحقیقت وہ دماغی بیداری تھی جو اسلامی تاریخ میں سب سے زیادہ یادگار اور عقل و تہذیب کی پوری سرگذشت میں سب سے بڑھ کر اہمیت رکھتی ہی۔ یہ بیداری بڑی حد تک بیرونی اثرات کی رہین منت تھی۔ ان میں کچھ تو ہند اور ایران سے آئے اور بیشتر یونانی تھے۔ علمی ترقی کا آغاز عربی زبان میں تراجم سے ہوا، جو ایرانی، سنسکرت، سُریانی اور یونانی السنہ سے کئے گئے تھے۔ عرب مسلمان اس میدان میں داخل ہوا تو اُس کا اپنا حکمت و فلسفہ اور ادب کا ذخیرہ نہ ہونے کے برابر تھا لیکن صحرا

سے وہ علمی تجسس کا قوی مادہ اور علم کی سیر نہ ہونے والی اشتہا اور دوسری مخفی صلاحیتیں لے کر آیا تھا۔ چناں چہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ وہ بہت جلد زیادہ قدیم اور مہذب قوموں کا جنھیں اُس نے مغلوب کیا یا جو اس کے مقابل ہوئیں، علم کی جاگیر میں وارث بن گیا۔ جس طرح ملک شام میں وہاں کا مروجہ ارامی تمدن (جو خود بھی بعد کے یونانیوں سے متاثر تھا) اُس نے قبول کیا اسی طرح عراق میں یہی تمدن اختیار کرلیا، اگرچہ یہاں اس میں ایرانیت کا رنگ آمیختہ تھا۔ بہرحال، بغداد کو بسے ہوئے تین چوتھائی صدی گزری تھی کہ اس عرصے میں عربی خوان ناظرین کے قبضے میں حکیم ارسطو کی فلسفے کی کتابیں، نو افلاطونی شارحین کی شرحیں، حکیم جالی نوس کی اکثر طبی تصانیف
307 اور ایران و ہندستان کی کتب علمیہ، آگئی تھیں[1]، جن علوم کی تیاری میں یونانیوں کو صدیاں لگی تھیں، عربوں نے انھیں برسوں میں سیکھ سمجھ لیا۔ یہ صحیح ہے کہ یونانی اور ایرانی دونوں تہذیبوں کے نمایاں اجزا جذب کرنے میں اسلامی ملت نے بہت کچھ اپنی وہ اصلیت کھودی جس سے صحرائی حقیقت کا رنگ ٹپکتا تھا اور عربی قومیت کا ٹھپہ لگا ہوا نظر آتا تھا لیکن۔ یہی وہ تبدیلی تھی جس کی بدولت وہ ازمنۂ وسطیٰ میں جنوبی یورپ اور مغربی ایشیا کی تہذیبی زنجیر ملانے میں سب سے قوی کڑی بنی۔ یاد رہے کہ اس تہذیب کے اصلی منبعے مصر، بابل، فنیقیہ اور یہودیہ تھے اور انہی سے یہ دھاریں

---

[1] انیسویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں مشرقی عربوں میں دوبارہ علمی ترجموں کا دور آیا ہے۔ یہ ترجمے زیادہ تر فرانسیسی اور انگریزی سے کیے جارہے ہیں۔

بہ بہ کر یونان آئی تھیں اور اب یونانی حکمت و تہذیب کی شکل میں واپس ممالک مشرق کو پلٹ رہی تھیں۔ آیندہ اوراق میں ہم پڑھیں گے کہ کس طرح یہی ندی اندلس اور صقلیہ کے عربوں نے دوبارہ مغرب کی طرف موڑی اور اسے یورپ میں پہنچایا کہ یورپ کے نشاۃ ثانیہ میں اس سے مدد ملی۔

عربوں کی علمی بیداری میں ہندستان کا بھی شروع شروع میں حصہ تھا۔ خصوصاً اخلاقی ادب اور ریاضیات میں۔ ۱۵۴ھ (۷۷۱ء) کے قریب ہندستان کا ایک مسافر علم نجوم پر ایک رسالہ بغداد لایا۔ خلیفہ منصور کے حکم سے اس "سدھانتا" (عربی: "سند ہند") کا ترجمہ محمد ابن ابراہیم ال فزاری (متوفی ۷۹۶ تا ۸۰۶ء) نے کیا اور نتیجے میں وہی مسلمانوں میں پہلا منجم ہوا[1]۔ عربوں کو صحرای زمانے سے یقیناً ستاروں سے بڑی دل چسپی تھی۔ لیکن زیر نظر ایام سے پہلے انھوں نے علمی طریق پر نجوم کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ مذہبی اعتبار سے ایک ضرورت یہ پیدا ہوگئی تھی کہ نماز میں کعبے کی سمت ٹھیک ٹھیک معلوم کی جاے۔ شہرہ آفاق خوارزمی (متوفی تخ ۸۵۰ء) نے اپنی مشہور معروف زیچ کی بنیاد فزاری کی کتاب پر رکھی اور یونان و ہند کے نجومی نظام میں تطبیق دی۔ اسی کے ساتھ اپنے مشاہدات کا اضافہ کیا۔ نجوم کی کتابوں کے چند اور ترجمے فارسی زبان سے عربی میں ہارون الرشید کے صدر مہتمم کتب خانہ الفضل

---

[1] دیکھو سعید ابن احمد (قاضی الاندلسی) کی کتاب "طبقات الامم" (بیروت ۱۹۱۲ء) یاقوت وغیرہ۔

ابن نوبخت (متوفی تخ ۸۱۵ء) نے کیئے[1]۔

وہی ہندستانی سیاح جس کا اوپر ذکر آیا، ایک ریاضی کا رسالہ لایا تھا۔ اعداد ہندسی اسی رسالے سے اخذ کئے گئے جو یورپ میں
308 "ارےبک" یعنی عربی کہلاتے ہیں اور خود عرب ان کو ہندی (یا ہندسہ) کہتے ہیں۔ آگے چل کر نویں صدی عیسوی میں عربی علم ریاضیات کو کسورِ اعشاریہ کا اہم قاعدہ بھی ہندستانیوں سے ہاتھ لگا۔

فنون لطیفہ یا انشا پردازی کے ماسوا ایران کے علمی ذخیرے میں اور کوئی ایرانی چیز ایسی نہ تھی کہ عربوں کی تحریک میں اضافہ کرسکتی۔ لیکن اہل ایران کا مذاقِ حُسن پسندی، سامی عربوں کی تہذیبی زندگی میں ایک لازمی جزو ضرور تھا۔ فنون لطیفہ کے علاوہ ایران کے ادبی اثرات بھی بہت نمایاں اثر انداز ہوے اگرچہ یہ علم وحکمت سے تعلق نہیں رکھتے۔ عربی زبان کی سب سے پہلی ادبی کتاب جو ہم تک آئی، کلیلہ دمنہ (بیدپا کے افسانے) ہے۔ یہ پہلوی سے ترجمہ کی گئی تھی۔ خود پہلوی کتاب سنسکرت سے منتقل ہوی اور انوشیرواں (۵۳۱ - ۵۷۸ء) کے عہد میں ہندستان سے شطرنج کے کھیل کے ساتھ ایران لائی گئی تھی۔ عربی کتاب کو بڑی اہمیت اسی لیے حاصل ہے کہ پہلوی متن، قدیم سنسکرت اصل کی طرح، مفقود ہو چکا ہے اگرچہ یہ قصے پنج تنتر میں زیادہ مطوّل شکل میں ابھی تک مل سکتے ہیں۔ بہرحال اس کتاب کے اب تقریباً چالیس زبانوں میں، جن میں یورپی

---

[1] اس فارسی نام "نوبخت" کے معنی خوش نصیب ہیں۔ اس خاندان کے کئی افراد علم ہیئت میں مشہور ہوے۔ دیکھو طبری۔ ۳ صـ ۳۱۷۔

زبانوں کے علاوہ، ترکی، عبری، حبشی ملایائی، آئس لینڈی تک شامل ہیں جس قدر ترجمے متداول ہیں یہ سب اسی عربی متن پر مبنی ہیں۔ کتاب کا مقصد سلاطین و ملوک کو جانوروں کی کہانیوں کے پیرائے میں اُمور ملک داری سکھانا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ ابن المقفّع نے کیا تھا[1] یہ ایک زرتشتی نومسلم تھا جس پر منافقت کا شبہ کرتے تھے اور اسی سلسلے میں وہ ۷۵۷ء کے قریب آگ سے ہلاک کیا گیا[2]۔

ابن المقفّع کا ترجمہ خاص طرز میں ہوا اور بجائے خود انشاپردازی کا ایک نمونہ تھا۔ عبّاسی خلافت کے دَور میں عربی نثرنگاری عام طور سے ایرانیوں کی پُرتصنع طرز نگارش، رنگین خیال آرائی اور شاعرانہ لفاظی سے متاثر ہوگئی تھی۔ قدیم عربی تحریر نہایت جاں دار، قل ودل ہوا کرتی تھی۔ اس کی بجائے اب ساسانی دَور کے دقیق صنائع بدائع اور تکلّفات رواج پا رہے تھے۔ آدابِ مجلس، پند و موعظت، تاریخ اور آئینِ ملک داری کے مباحث پر خصوصیت کے ساتھ عربی ادبیات (جیسے الاغانی، عِقدالفرید، اور طرطوشی کی کتاب الملوک[3]) میں قدیم ہندی ایرانی کتابوں کے جگہ جگہ حوالے

---

[1] کلیلہ و دمنہ کے مطبوعہ نسخوں کے متعلق ملاحظہ ہو دی ساسی کا مطبوعہ نسخہ (پیرس ۱۸۱۶ء، بُلاق، ۱۲۴۹ھ وغیرہ) ابن مقفّع کے لئے دیکھو "فہرست" ص ۱۱۸۔ ابن خلکان۔ ۱ ص ۲۶۶۔

[2] (مؤلف کے بیان سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔ ابن المقفّع کی نسبت یہ شبہ ضرور تھا کہ وہ مزدکی عقائد رکھتا ہے لیکن سزائے موت کا سبب یہ ہوا کہ اس نے ایک صلح نامہ لکھنے میں بھروسہ کرنے والے آقا، منصور کو دھوکا دیا تھا۔ مترجم)

[3] عربی میں اسے "جندے سابور" کہتے تھے۔ اصل نام کے معنی "شاپور کا مفتوحہ" لیکن اسے ساسانی بادشاہ شاہ پور اوّل ہی نے بسایا تھا۔ جنوب مغربی ایران کے صوبہ خوزستان میں، موجودہ موضع شاہ آباد کے قریب واقع تھا۔

آتے ہیں۔ درباری وقائع لکھنے کے باب میں بھی ہم آگے پڑھیں گے، کہ عربی میں یہ فن ایرانی سانچوں میں ڈھالا گیا تھا ؛

۷۶۵ء میں خلیفہ منصور معدے کے کسی مرض میں مبتلا ہوا اور اس کے طبیب صحیح تشخیص نہ کر سکے تو جند شاپور[۱] سے وہاں کے شفاخانے کا صدر طلب کیا گیا۔ یہ نسطوری عیسائی جورجیس[۲] (= جورج) ابن بختیشوع تھا (جس کی وفات ۷۷۱ء کے قریب واقع ہوئی —) جند شاپور کے بیت الحکمت اور دانش گاہ کی انوشیروان اعظم نے ۵۵۵ء میں بنیاد ڈالی تھی اور اسی وجہ سے یہ شہر مشہور ہو گیا تھا یہاں جو علوم پڑھائے جاتے تھے وہ قدیم یونانی عقائد پر مبنی تھے لیکن تعلیمی زبان ارامی تھی۔ جورجیس منصور کے دربار میں بہت جلد خلیفہ کا معتمد علیہ اور شاہی طبیب مقرر ہو گیا اگرچہ وہ اپنے مسیحی دین پر قائم رہا۔ خلیفہ نے اسے اسلام لانے کی تحریک کی تو اس نے یہ جواب دیا کہ بندہ اپنے باپ دادا کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے — وہ دوزخ میں ہوں یا جنت میں[۳]۔ ابن بختیشوع بغداد میں ایک نامی گرامی خاندان کا بانی ہوا۔ اُس کے افراد چھ سات پشت تک کر ڈھائی صدی کے زمانے کو گھیرتی ہیں، بہت سے نشیب و فراز گزرنے کے باوجود دربار شاہی میں قریب قریب بلا شرکت غیرے مسلسل طبابت کرتے رہے۔ علوم حکمیہ بھی اُن دنوں زرگری وغیرہ پیشوں

---

[۱] ابن ابی اصیبعہ نے "بخت" کو خادم کے معنی میں سُریانی لفظ خیال کیا ہے۔ اصل میں یہ پہلوی "بوخت" تھا جس کے معنی ہیں "حوالہ کردہ" یس خاندانی نام کے معنی عیسیٰ کا حوالہ کردہ یا دیا ہوا، ہوں گے ؛

[۲] ابن عبری ص ۲۱۱ ؛

اور دست کاریوں کی طرح موروثی چیز سمجھے جاتے اور باپ سے بیٹے کو پہنچا دئے جاتے تھے۔ جورجیس کا بیٹا بختیشوع (متوفی ۸۰۱ء) ہارون الرشید کے شفاخانے میں صدر طبیب تھا اور اُس کا بیٹا جبرئیل (گیب رئیل) ۸۰۵ء میں بادشاہ کا ذاتی معالج مقرر کیا گیا تھا۔ اسی نے ہارون کی عزیز کنیز کا کامیاب علاج کیا تھا کہ اختناق الرحم سے اُس کے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تو حکیم نے سب کے سامنے مریضہ کے کپڑے اُتارنے کا حیلہ کیا[1] (کہ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی)

یونانیت

جس وقت عربوں نے ہلال خصیب کے ممالک فتح کئے تو کوئی شک نہیں کہ انھیں سب سے بڑی دولت یہ ہاتھ لگی کہ وہاں یونان کے علوم کا ترکہ موجود تھا۔ آگے چل کر عربی زندگی پر بیرونی اثرات میں سب سے قوی اثر لامحالہ یونانیت کا پڑا۔ عیسائی شامیوں کا بڑا مرکز اِڈیسا (= الرُہا) تھا۔ بت پرست شامیوں کا صدر مقام حرّان تھا۔ یہ لوگ نویں صدی میں اور آیندہ زمانے میں صابیہ ہونے کا دعویٰ کرنے لگے تھے[2]۔ انطاکیہ قدیم یونانی بستیوں میں سے ایک بڑی بستی تھی۔ سکندریہ مغرب و مشرق کی فلاسفی کا مقام اتصال تھا۔ پھر شام و عراق دونوں ملکوں میں بے شمار خانقاہیں بنی ہوئی تھیں جن میں نہ صرف مذہبی علوم بلکہ حکمت و

---

[1] ابن العبری ص ۲۲۶۔ قفطی ص ۱۳۴ +

[2] ان کے حالات آیندہ باب ۲۶ میں آتے ہیں +

فلسفہ کی تعلیم دی جاتی تھی - یہ سب کے سب مقام وہ مرکز تھے جن سے یونانیت کی شعاعیں پھیلتی تھیں ۔ رومیوں کی سرزمین پر جو مختلف تاختیں، خصوصاً ہارون الرشید کے تحت میں کی گئیں، ان میں دوسرے غنائم کے ساتھ یونانی قلمی کتابیں بھی لائی جانے لگیں۔ یہ زیادہ تر عموریہ اور ان کا ئی را (= انقرہ) سے ہاتھ آئیں [۵۱]
مامون کی تعریف میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے یونانی کتابوں کی تلاش میں دُور دُور، قسطنطنیہ اور خود قیصر لیو (ال ارمن") تک قاصد روانہ کئے تھے - کہتے ہیں خلیفہ منصور نے بھی اپنے ہم عصر قیصر سے درخواست کی اور اُس نے جواب میں بہت سی یونانی کتابیں، جن میں اقلیدس بھی تھی، اسے ارسال کی تھیں [۵۲] لیکن عرب لوگ ابھی تک یونانی زبان نہ جانتے تھے اور مجبور تھے کہ شروع میں اپنی یہودی، بُت پرست اور خصوصاً نسطوری عیسائی رعایا کے تراجم پر انحصار کریں۔ اس طرح وہ شامی نسطوری جنھوں نے پہلے سُریانی میں اور پھر سُریانی سے عربی میں یونانی تصانیف کا ترجمہ کیا، یونانیت اور اسلام کے مابین سب سے مضبوط کڑی بن گئے اور آگے چل کر ساری دنیا میں یونانی تہذیب کے ایشیای میر ساماں ثابت ہوئے۔ عربوں کے دل و دماغ میں جگہ پانے سے پہلے یونانیت کو شامی قالب میں سے گزرنا پڑا ٭

ال مامون کے عہد میں یونانی اثرات اوج کمال کو پہنچ گئے۔

---

۵۱ یاقوت - ۲ ص۶۴۰ ٭

۵۲ مقدمہ ابن خلدون ص۴۰۱ ٭

یہ خلیفہ عقلیت کی طرف مائل تھا۔ معتزلہ کے عقائد کا حامی ہوگیا تھا جن کی حجت یہ تھی کہ مذہبی تعلیم عقل کے فیصلوں کے مطابق ہونی چاہیئے۔ پس مامون کو اپنے مسلک کی تصدیق چاہنے کے لئے یونان کی کتب فلسفہ کی مدد ڈھونڈنی ضروری ہوئی۔ "فہرست" میں یہ واقعہ اس پیرائے میں بیان ہوا ہے کہ خلیفہ نے خواب میں حکیم ارسطو کو دیکھا۔ وہ یقین دلاتا تھا کہ عقل اور شریعت مذہبی میں کوئی حقیقی فرق نہیں ہے[1]۔

غرض مامون نے اپنے پیش نظر مقاصد کے سلسلے میں ۸۳۰ء میں بغداد کا مشہور بیت الحکمۃ قائم کیا جو کتب خانہ، تحقیق گاہ اور دارالترجمہ کا مجموعہ تھا۔ تیسری صدی قبل مسیح کے نصف اول میں متحفِ سکندریہ کی تاسیس کے بعد سے کوئی تعلیمی ادارہ کسی اعتبار سے اتنا باعظمت نہیں بنا تھا جتنا بغداد کا یہ بیت الحکمت ثابت ہوا۔ اس سے پہلے عیسائی، یہودی اور بعض تازہ نومسلم اپنے طور پر مختلف کتابوں کے ترجمے کرتے رہے تھے۔ لیکن اب یہ کام بیش تر بیت الحکمۃ کے علمی شعبے میں مرتکز ہوگیا اور مامون کے وقت میں شروع ہوکر اس کے قریبی جانشینوں کے زمانے تک یہیں ہوتا رہا۔ عباسی دور میں تراجم کا زمانہ ۷۵۰ء سے لےکر ایک صدی آگے تک چلا۔ چوں کہ اکثر مترجم ارامی بولنے والے لوگ تھے لہذا اول اول بہت سی کتابیں یونانی سے پہلے ارامی (سُریانی) میں اور پھر عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ متن کی مشکل عبارتوں کا ترجمہ لفظ بہ لفظ کردیا جاتا تھا اور جہاں یونانی اصطلاح کا ہم معنی لفظ عربی میں نہ ملتا تھا، وہاں اصل یونانی کو

---

[1] ۵ ص ۲۲۳۔

خفیف تصرف کے ساتھ عربی حروف میں لکھ دیا جاتا تھا[1]۔

عربی میں ترجمہ کرنے والوں نے یونانیوں کی ادبی قسم کی تصانیف میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ اسی لئے یونانی تمثیل، یونانی شاعری اور یونانی تاریخوں سے عربوں کی طبیعت کو کوئی خاص مناسبت پیدا نہیں ہوئی۔ اس میدان میں ایرانی اثر دیگر اثرات کی نسبت غالب رہا۔ ثاوفیل ابن توما (= تھیوفی لوس۔ متوفی ۷۸۵ء)[2] نے ہومر کی نظم "الیڈ" کا جزوی ترجمہ کیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے اس عربی لباس میں وہ کسی کے دل نشین نہ ہوئی اور یہ ترجمہ محفوظ ہی نہیں رہا۔ ثاوفیل خلیفہ مہدی کا مسیحی نجومی تھا۔ بخلاف ادبیات کے، یونانی طب، ریاضیات اور متعلقہ علوم، نیز یونانی فلسفے کا تعارف عربوں کے علمی انکشافات کے سفر میں پہلا سنگ منزل بن گیا۔ یونانی طب کے نمائندے جالی نوس (= گیلن متوفی تخ ۲۰۰ء) اور اجی نا کا پولوس (زمانۂ فروغ تخ ۶۵۰ء) تھے[3]۔ ریاضیات کے استاد حکیم اقلیدس (= یوکلڈ، زمانہ فروغ ۳۰۰ ق م) اور بطلی موس (= پٹولمی۔ زمانۂ فروغ تخ نصف اوّل دوسری صدی عیسوی) تھے۔ عربوں میں فلسفہ وہ آیا جس کے بانی افلاطون و ارسطو اور شارح نو افلاطونی حکما تھے۔

---

[1] چنانچہ: ارث ماطیقی۔ موسیقی۔ جغرافیہ۔ اکسیر۔ ارغون۔ وغیرہ اسی قسم کے یونانی الفاظ ہیں جو عربی میں تھوڑے سے ردّ و بدل کے ساتھ اختیار کر لئے گئے تھے۔ ان کے بارے میں دیکھو خوارزمی کی "مفاتیح العلوم" کا اشاریہ۔ "فہرست" رسائل "اخوان الصفا"۔

[2] ابن العبری ص۱۲۱، ص۲۲۰۔ [3] ایضاً ص۱۷۶۔

مترجمین

یونانی سے ترجمہ کرنے والوں کا ایک سرخیل ابو یحییٰ ابن البطریق (متوفی ۷۹۶ تا ۸۰۶ء) گزرا ہے، مشہور ہے کہ (خلیفہ منصور کے لئے جالی نوس اور بقراط (= ہپوکراتیس، زمانۂ فروغ تخ ۴۳۶ ق م) کی بڑی بڑی طبی کتابیں اسی نے ترجمہ کیں/ اور کسی دوسرے مربی کے واسطے بطلیموس کی "کوادری پارتی تم" کو عربی کا جامہ پہنایا[1] اسی مصنف کی ہیات پر عظیم کتاب "ال ماجست"[2] اور "مبادی اقلیدس" بھی) اگر مسعودی کی ایک روایت مانی جائے[3] تو اسی زمانے کے قریب عربی میں منتقل ہوئیں۔ یونانی میں "مجستی" کے معنی "اعظم" ہیں۔ اسی سے کتاب کا یونانی نام مشتق تھا اور عربی میں "ال مجسطی" (اوّل مفتوح یا مکسور) بنا۔ مگر یہ سب ترجمے یقیناً اچھے نہیں کئے گئے تھے کہ ہارون الرشید اور مامون کے زمانے میں ان کی نظر ثانی کرنی پڑی یا بالکل نئے سرے سے کئے گئے۔ شروع زمانے کا ایک اور مترجم شام کا عیسائی یوحنا (یحییٰ) ابن ماسویہ (متوفی ۸۵۷ء) تھا[4] وہ جبریل بختیشوع کا شاگرد اور حنین ابن اسحٰق کے اساتذہ میں ہے۔ 3/2 خلیفہ ہارون انقرہ اور عموریہ سے یونانی مخطوطات لے کر آیا تو ان میں

---

[1] فہرست۔ ص۲۴۳۔ [2] یعقوبی۔ ۱ ص۱۵۱۔

[3] ۸ ص۲۹۱۔ نیز دیکھو اسی باب کے آیندہ اوراق۔

[4] لاطینی میں اسے "مسوے (اکبر)" کہتے تھے کہ اپنے ہم نام سے جو قاہرہ کے فاطمی خلیفہ کے دربار میں طبیب تھا اور ۱۰۱۵ء میں فوت ہوا، امتیاز کیا جا سکے۔

سے گئی، خصوصاً طب کی کتابوں کا انہی حنین نے بادشاہ کے لئے ترجمہ کیا تھا[1] خود یوحنا ہارون اور اس کے جانشینوں کی ملازمت میں رہا۔ ایک مرتبہ کسی شاہی مصاحب نے اُسے چھیڑا تو اُس نے یہ جواب دیا کہ "اگر وہ حماقت جس میں تو مبتلا ہے، فراست سے بدل دی جائے اور سو کیڑے مکوڑوں میں تقسیم کردی جائے تو ہر کیڑا ارسطو سے زیادہ عاقل و دانا ہو جائے گا"[2]

حُنین ابن اسحاق

(مترجمین کا سردار یا عربوں کی زبان میں "شیخ المترجمین" حُنین ابن اسحٰق (جوانی ٹی اس - ۸۰۹ - ۸۷۳ء) تھا کہ فضلائے عصر میں شامل اور نہایت شریف مزاج شخص گزرا ہے۔ حُنین شہر حیرہ کا عبادی یعنی نسطوری عیسائی تھا۔ لڑکپن میں وہ حکیم ابن ماسویہ کے دواخانے میں عطاری کرتا تھا۔ ایک مرتبہ آقا نے بگڑ کر طعن سے کہہ دیا کہ حیرہ والوں کو دوا سازی سے کیا واسطہ۔ تو بھی جا، بازار میں دلالی کی دکان کھول لے[3] حنین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اُس نے نوکری چھوڑ دی اور ٹھان لی کہ یونانی زبان سیکھے بغیر نہ رہوں گا۔ پھر آسے موسیٰ ابن شاکر کے تین علم دوست لڑکوں نے جو بطور خود علمی تحقیقات میں مصروف تھے، مختلف یونانی زبان کے اقطاع

---

[1] ابن العبری صـ۲۲۷ - ابن اصیبعہ وغیرہ۔

[2] فہرست، صـ۲۹۵۔

[3] ابن العبری - صـ۲۵۰ - ابن ابی اصیبعہ - ۱ صـ۱۸۵۔

میں روانہ کیا کہ قلمی کتابیں تلاش کر کے لائے۔ اس کے بعد وہ خلیفہ مامون کے درباری طبیب جبریل ابن بختیشوع کی ملازمت میں رہا اور آخر میں خلیفہ نے اسے اپنی دانش گاہ کی کتابوں کا مہتمم مقرر کیا۔ اس خدمت میں علمی کتابوں کے جملہ تراجم کی نگرانی بھی سپرد تھی اور اس کا بیٹا اسحٰق[1] اور بھتیجا حُبیش ابن الحسن مددگار تھے[2] حبیش کی خود اس نے تعلیم و تربیت کی تھی۔ کثیر تعداد میں جو ترجمے حُنین سے منسوب کئے جاتے ہیں، ان میں سے بعض کو بے شبہ ان دو مددگاروں اور دانش گاہ کے دوسرے ارکان یا طلبہ کا کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ جیسے عیسیٰ ابن یحییٰ[3] اور موسیٰ ابن خالد[4] پھر یہ بھی صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حنین اکثر صورتوں میں یونانی سے سُریانی میں پہلا ترجمہ کر دیتا تھا اور اس کے رفیق سُریانی ترجمے کو عربی میں منتقل کرتے تھے[5] مثال کے طور پر حکیم ارسطو کی "ہرمن یوتی کا" پہلے باپ نے یونانی سے سُریانی میں لکھی۔ پھر بیٹے (اسحاق) نے اسے عربی کا جامہ پہنایا۔
وہ باپ سے بہتر عربی کا فاضل تھا[6] اور ارسطو کی تصانیف کا سب سے 313
بڑا مترجم وہی ہے (من جملہ دوسری عربی کتابوں کے، کہا جاتا ہے کہ جالی نوس، بقراط، اور دیوس کوریدِ (زمانۂ فروغ، تخ ۶۵۰) کی کتابیں، نیز افلاطون کی "ریپ لیک" (= سیاسہ)[7] اور ارسطو کی

---

[1] ابن خلکان ۔ ۱ صـ ۱۱۶ ۔
[2] حبیش کا ایک ہاتھ لُنجا تھا۔ اس لئے "الاعسم" پکارتے تھے۔ فہرست صـ ۲۹۷۔ ابن ابی اصیبعہ۔ ۱ صـ ۱۸۷ وغیرہ ۔
[3] فہرست صـ ۲۹۷ ۔ [4] عیسیٰ نے فارسی زبان سے بھی ترجمے کئے۔ ایضاً
[5] فہرست، صـ ۲۴۹ ۔ [6] ۔ صـ ۲۹۸۔ منقول قفطی صـ ۸۰ ۔ [7] ایضاً ۔

"کاٹیگوریز" (= مقولات)[۵۱] "فزکس" (= طبیعات) اور "ماگنا موریلیا" (= خلقیات)[۵۲] کے ترجمے حُنین نے کئے۔ ان میں بھی اس کا بڑا کام یہ تھا کہ جالی نوس کی قریب قریب ساری تصنیفی کائنات کو سُریانی اور عربی کی آغوش میں لے آیا[۵۳]۔ علم تشریح پر جالی نوس کے سات مقالے اصل یونانی میں مفقود ہو گئے تھے۔ خوش نصیبی سے عربی میں سلامت رہے[۵۴] (توراۃ کا بھی حُنین نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا وہ محفوظ نہیں رہا[۵۵])

تاریخوں میں آتا ہے کہ ابن شاکر کے بیٹوں کی ملازمت میں اُسے اور دوسرے مترجمین کو پان سو دینار (تقریباً ۲۵۰ پونڈ[۵۶]) ماہانہ مشاہرہ ملتا تھا۔ خلیفہ مامون اُن کتابوں کے، جن کا وہ ترجمہ کرتا، ہم وزن سونا اُسے عطا کرتا تھا۔ یہ روایتیں حُنین کی ترجمے کی قابلیت کی گواہی دیتی ہیں لیکن اس کے انتہائی عروج کا وقت وہ تھا جب کہ مترجم کی بجائے طبیب کی حیثیت سے خلیفہ متوکل (۸۴۷ - ۸۶۱ء) نے اُسے اپنا ذاتی معالج مقرر کیا۔ اسی خلیفہ نے ایک مرتبہ سال بھر اُسے قید میں ڈال دیا تھا کیوں کہ وہ کسی دشمن کے واسطے زہر تیار کرانا چاہتا تھا۔ حُنین نے یہ کام کرنے سے انکار کیا اور بڑے

---

۵۱ ۔ عث قفطی ص۳۸ ۔

۵۲ ابن ابی اصیبعہ - ۱ ص۱۸۸ ۔

۵۳ ایک اور مخطوطہ "الصناعۃ الصغیرہ" کے لئے جس میں جالی نوس کے ۱۶ میں سے دس مستمات کے رسائل موجود ہیں اور ۵۷۲ھ کا لکھا ہوا ہے، دیکھو حتی وغیرہ کی "فہرست مخطوطات عربیہ مخزونہ گیرٹ" (پرنسٹن، ۱۹۳۸ء)

۵۴ قفطی ص۳۸ ۔ ۵۵ ابن ابی اصیبعہ - ۱ ص۱۸۷ ۔

۵۶ (یہ ۔۔۔) اس وقت کا حساب ہے جب کہ پونڈ کی قیمت ۳۳ فی صدی نہیں گھٹی تھی (مترجم)

بڑے انعام کا لالچ بھی قبول نہیں کیا۔ دوبارہ جب وہ خلیفہ کے سامنے لایا گیا اور قتل کی دھمکی دی گئی تو اس وقت بھی یہی جواب دیا کہ مجھے صرف بیماروں کو اچھا کرنا آتا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ میں نے نہیں پڑھا"[1] آخر یہ کہہ کر کہ میں صرف اپنے طبیب کی دیانت آزماتا تھا، خلیفہ نے دریافت کیا کہ سچ بتا مہلک زہر تیار کرنے سے کس چیز نے تجھے باز رکھا؟ تو حنین نے جواب میں کہا:

"دو باتوں نے۔ اوّل میرے دین نے۔ دوسرے میرے پیشے نے۔ میرے دین کا حکم ہے کہ دوستوں کا تو کہنا ہی کیا ہے ہمیں اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی نیکی کرنی چاہیئے۔ رہا میرا پیشہ سو وہ خدمتِ خلق کے لئے بنا ہے اور اس کا کام آرام دینے، علاج کرنے تک محدود ہے۔ علاوہ ازیں ہر طبیب کو حلف اُٹھانا پڑتا ہے کہ وہ کسی کو مہلک دوا کبھی نہ دے گا"[2]

ابن العبری اور القفطی کی رائے ہے کہ "حنین حکمت کا سرچشمہ اور نیکی کی معدن تھا" اور (فرانسیسی مصنف) لیک لیرک لکھتا ہے کہ وہ نویں صدی عیسوی کی بہت بڑی شخصیت ہے....." وہ نہ صرف علم و دانش میں بلکہ اپنی سیرت کے اعتبار سے بھی بہترین افراد میں تھا جن سے ہم تاریخ میں دوچار ہوتے ہیں"[3]

---

[1] ابن ابی اصیبعہ - ا ص۱۸۷ - ابن العبری ص۲۵۱

[2] ابن العبری ص۲۵۱

[3] "ہستوار .... اریب" (پیرس ۱۸۷۶ء) ا ص۱۳۹

ثابت ابن قرہ

جس طرح حُنین نسطوری مترجمین کے گروہ کا سردار ہوا ہی، اسی طرح حرّان (قدیم کارہی) کے بُت پرست صابیوں سے جو لوگ بھرتی ہوکر آئے، ان کا سرگروہ ثابت ابن قرہ (تخ ۸۳۶-۹۰۱ ع) تھا[1] یہ صابی[2] فرقہ کواکب پرستی کرتا تھا اور اسی ضمن میں اُسے قدیم الایام سے ریاضیات و نجوم سے تعلق پیدا ہوگیا تھا۔ ال متوکل کے عہد خلافت میں فلسفے اور طب کی ایک درس گاہ جو اولاً سکندریہ سے انطاکیہ میں منتقل ہوئی تھی اب حرّان میں لاکر قائم کی گئی۔ اسی فضا میں ثابت اور اس کے شاگرد سرسبز ہوے۔ کہا جاتا ہو کہ انھوں نے یونانی ریاضیات اور ہیات کی قریب قریب سب کتابیں ترجمہ کرڈالی تھیں جن میں حکیم ارشمیدس (متوفی ۲۱۲ ق م) اور اپولونیوس (باشندہ پرگا۔ ولادت تخ ۲۶۲ ق م) کی تصانیف بھی شامل ہیں[3] دوسرے انھوں نے سابقہ تراجم کی اصلاح کی۔ مثال کے طور پر حُنین کے ترجمۂ اقلیدس کی ثابت نے نظر ثانی کی[4] خلفا میں اسے معتضد (۸۹۲ — ۹۰۲ ع) کی سرپرستی حاصل ہوئی اور وہ بہت جلد اس کا ندیم اور ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوگیا۔[5]

---

[1] اس کی کتاب "الذخیرہ فی علم الطب" قاہرہ میں چھپ چکی ہی۔

[2] یہ محض نام ہنا د صابی تھا جیسا کہ ہم نے آیندہ باب ۲۶ میں صراحت کی ہی۔

[3] فہرست، ص ۲۶۷۔

[4] ابن خلکان - ا ص ۱۷۷۔

[5] ابن ابی اصیبعہ - ا ص ۲۱۶۔

اس عظیم علمی خدمت میں ثابت کے جانشین اس کا بیٹا سِنان (متوفی ۹۴۳ء) دو پوتے، ثابت و ابراہیم اور ایک پروتا ابوالفرج تھے کہ ہر ایک علم و فضل اور ترجمہ کرنے میں ممتاز ہوا۔[1] لیکن صابی گروہ میں ثابت کے بعد سب سے زیادہ ناموری البتّانی کو نصیب ہوئی (متوفی ۹۲۹ء)۔ لاطینی مصنف اسے "ال بے ٹن یوس" لکھتے ہیں) جس کا پورا نام ابوعبداللہ محمد (ابن جابر ابن سنان) ظاہر کرتا ہے کہ یہ خاندان مسلمان ہوگیا تھا۔ لیکن بتّانی کی شہرت حقیقت میں اس کی علم ہیات پر اپنی تصنیفات کی وجہ سے ہوئی۔ وہ مترجم نہ تھا۔ حرّانی گروہ کے ہیات و ریاضیات کے مترجمین میں آگے آگے چلنے والا حجّاج ابن یوسف ابن مطر تھا۔ (زمانۂ فروغ ۷۸۶ء تا ۸۳۳ء)۔ اقلیدس کی "مبادی" کا سب سے پہلا ترجمہ اور بطلیموس کی "ال ماجسطی" کے ابتدائی ترجموں میں سے ایک کو عموماً اسی کا کارنامہ بتاتے ہیں۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ حنین سے پیش تر پہلی کتاب کے اُس نے دو ترجمے کئے تھے۔ ایک ہارون الرشید کے واسطے اور دوسرا مامون کے لئے[2] ہیات کی نامی کتاب ال ماجسطی کو حجّاج نے ۸۲۹–۳۰ء میں کسی سابقہ سُریانی ترجمے سے 115 عربی میں منتقل کیا۔ اس سے بھی پہلے یحییٰ ابن خالد برمکی وزیر ہارون کے وقت میں پہلی بار یہ کوشش کی گئی تھی[3] مگر نتیجہ کچھ قابل اطمینان نہ نکلا تھا۔

---

[1] ثابت کی وفات ۹۷۳ء اور ابراہیم کی وفات ۹۴۶ء میں ہوئی۔ ان کے نیز ابوالفرج کے متعلق دیکھو ابن ابی اصیبعہ ص ۲۲۴-۲۲۶ - نیز قفطی ص ۵۷ - فہرست، ص ۲۷۲ -

[2] فہرست ص ۲۶۵۔ [3] ایضاً۔

ایک مدت بعد اس ترجمے کی تطبیق اور درستی ابوالوفا محمد ال بُزجانی الحسیب نے کی (۹۴۰ تا ۹۹۷ یا ۹۹۸ء) جو ہیات و ریاضی کے بزرگ ترین مسلمان علما میں شمار ہوتا ہے[1] ریاضی اور فلسفے کی کتابوں کا ترجمہ کرنے والوں میں بعد کے زمانے کا ایک اور مترجم قسطا ابن لوقا (متوفی تخ ۹۲۲ء) گزرا ہے یہ بعل بک کا رہنے والا مسیحی تھا۔ فہرست میں خود اس کی تصانیف کی تعداد چونتیس ہوتی ہے[2]

"مونوفیزی" عقائد کے فرقے (یعنی یعقوبی نصاریٰ) کا علمی میدان میں ظہور دسویں صدی عیسوی کے آخری حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کے مترجمین کے نمائندے یحییٰ ابن عدی اور ابوعلی عیسیٰ ابن زرعہ بغدادی[3] (متوفی ۱۰۰۸) تھے۔ پہلا ۸۹۳ء میں تکریت میں پیدا ہوا اور ۹۷۴ء میں بہ مقام بغداد وفات پائی۔ وہ اپنے فرقے کے کلیسا کا صدر اسقف ہوگیا تھا۔ فہرست کے مصنف سے گفتگو میں ایک مرتبہ اس نے دعویٰ کیا کہ میں دن رات میں اوسطاً سو ورق نقل کرلیتا ہوں[4] ان یعقوبی اہلِ قلم نے ارسطو کی تصانیف کے مروجہ نسخوں کی نظرِ ثانی اور یا انھیں از سرِ نو ترجمہ کرنے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ مزید برآں بہت کچھ یہی لوگ تھے جو عربی دنیا میں نوافلاطونی نظریات و روحانیات کے رواج دینے کا باعث ہوئے ۔

---

[1] قہستان میں بوزجان اس کا مولد تھا۔ اور "حسیب" کے معنی حساب داں یا ریاضی داں۔

[2] ص ۲۹۵ نیز دیکھو قفطی، ص ۲۶۲ ۔

[3] فہرست۔ ابن ابی اصیبعہ وغیرہ ۔

[4] ص ۲۶۴ ۔

تراجم کا دور آخر ہونے سے پہلے، ارسطو کی تقریباً ساری کتابیں، جن میں سے کئی یقیناً جعلی تھیں، عربی خوانوں کی دست رس کے اندر آگئی تھیں۔ ابن ابی اصیبعہ[۱] اور اس کے بعد القفطی[۲] نے کم سے کم سو کتابوں کے نام دئے ہیں جو "حکیم یوناں" یعنی ارسطو سے منسوب تھیں۔ عربی ممالک میں یہ سب کام ان دنوں تکمیل کو پہنچے جب کہ یورپ، یونانی فلسفے اور علوم سے قریب قریب بالکل بے خبر تھا۔ کیوں کہ جس وقت ہارون و مامون، یونان و عجم کی حکمت کے مطالعے میں مستغرق تھے، ان کے مغربی معاصرین یعنی بادشاہ شارل مین اور اُس کے اُمرا کی نسبت تحریری شہادت بتاتی ہے کہ وہ اپنے نام لکھنے ہی کا فن سیکھنے میں غلطان و پیچاں تھے۔ ارسطو کی منطق (اُرگانن) عربی میں بدیع و بیان اور علم عروض پر مشتمل ہو گئی تھی۔ یہ اور اسی طرح فرفریوس (= پرفی ری) کی ایساغوجی بہت جلد عربی قواعد صرف و نحو کے پہلو بہ پہلو شریک درس کر لی گئیں جس پر مسلمانوں میں ساری تعلیم کی بنیاد رکھی جاتی تھی۔ یہ صورت آج تک قائم ہے۔ نو افلاطونی شارحین کا یہ نظریہ بھی مسلمانوں میں مقبول ہو گیا تھا کہ افلاطون و ارسطو 3/6
کے فلسفے مجموعی طور پر یکساں ہیں۔ سب سے بڑھ کر نو افلاطونی فلسفے کا اثر مسلمانوں کے علوم روحانیات یا تصوّف میں ظاہر ہوا تھا۔ ابن سینا ("اوی سینا") اور ابن رشد ("اے ورروس") کی وساطت سے افلاطونیت اور فلسفہ ارسطو نے لاطینی زبان میں راہ پائی جیسا کہ ہم آیندہ اوراق میں پڑھیں گے، اور زمانہ وسطیٰ کے یورپی اہل مدرسہ پر قطعی

---

[۱] ا ص ۵۴ و مابعد۔ [۲] ص ۳۴ و مابعد۔

اثرات ڈالے ؎

(خلافت عباسیہ کے حصۂ اول میں تراجم کا یہ دَور خاصا طولانی اور نتیجہ خیز تھا) اسی کی ذیل میں اصل عربی تصانیف کا دَور آتا ہے جس پر ہم ایک علاحدہ باب میں بحث کریں گے۔ وہی عربی زبان جو ظہور اسلام سے قبل محض شعر شاعری کی، اور بعثت نبوی؂ کے بعد وحی اور مذہب کی زبان تھی، کوئی تین ہی قرن میں، یعنی دسویں صدی عیسوی کے آتے آتے بالکل اس کی کایا پلٹ ہوگئی (یہ ایک عجیب اور بے مثال انقلاب تھا جس نے عربی کو بلند ترین فلسفیانہ خیالات اور اعلیٰ درجے کے علمی افکار ادا کرنے کا ایسا سہل و دل پذیر ذریعہ بنا دیا) ادھر اتنی ہی مدت میں وہ وسط ایشیا سے لے کر شمالی افریقہ کی تمام لمبائیاں طے کرتی ہوئی اندلس تک پہنچی اور سیاسی رسل و رسائل اور تہذیبی روابط کی زبان بن گئی) اس وقت سے آج تک نہ صرف عراق و شام و فلسطین بلکہ مصر و تیونس الجزائر و مراکش کے بسنے والے اپنے بہترین خیالات کا اظہار عرب والوں ہی کی بولی میں کر رہے ہیں ؎

بابِ بست و پنجم ۲۵

317

عبّاسی نظام حکومت

(خلافت عباسیہ کے نظام حکومت میں مملکت کا سردار اعلیٰ خلیفہ تھا اور کم سے کم اصولاً وہی تمام اقتدار کا سرچشمہ مانا گیا تھا۔ وہ اپنے دیوانی اختیارات، وزیر کے اور عدالتی اختیارات قاضی (= جج) کے تفویض کرسکتا تھا۔ علیٰ ہذا جنگی قیادت کا کام سپہ سالار (= "امیر") کو سونپ سکتا تھا اور معمولاً یہی ہوتا تھا کہ مذکورۂ بالا فرائض ان عہدہ داروں کے حوالے کر دئے جاتے تھے بایں ہمہ امور مملکت کا آخری فیصلہ ہمیشہ خلیفہ کے ہاتھ میں رہا) بغداد کے ابتدائی خلفا اپنے شاہی فرائض و اعمال میں قدیم ایرانی نمونے کی تقلید کرتے تھے لیکن آخری اموی خلفا کی بدمذہبی سے عام لوگوں کی ناراضی دیکھ کر انھوں نے فائدہ اٹھایا اور امویوں کے مقابلے میں خود نکلنے کے وقت اس بات پہ زور دیا کہ خلیفہ مسلمانوں کا امام ہوتا ہی اور یہ منصب ایک مذہبی نوعیت اور تقدس کا حامل ہی۔ آگے چل کر بھی جب اُن کے ملکی اقتدار میں

واقعی کمی آنے لگی تو اسی نسبت سے یہ عباسی خلفا اسی مذہبی نوعیت کا زیادہ سہارا لینے لگے تھے۔ آٹھویں خلیفہ معتصم باللہ (۸۳۳ تا ۸۴۲ء) کے وقت سے اس خاندان میں اللہ کے نام سے مرکب القاب اختیار کئے جانے لگے اور یہ سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ زوال ہی کے زمانے میں ان کی رعایا نے انھیں ایسے مبالغہ آمیز القاب سے نوازنا شروع کیا جیسے "خلیفۃ اللہ" (یعنی نائب خدا) اور "ظل اللہ فی الارض" (= زمین پر خدا کا سایہ) وغیرہ۔ یہ کلمات سب سے اوّل صریحًا متوکل باللہ کے عہد (۸۴۷ تا ۸۶۱ء)[۱] میں اضافہ کئے گئے تھے اور پھر عثمانی خلافت کے آخری ایام تک برابر بولے جاتے رہے۔

بنی امیہ نے وراثت بادشاہی کا غیر معین سا موروثی اصول قائم کیا تھا، اسی پر عباسی خلفا آخر تک چلتے رہے اور اس کے وہی بُرے نتائج ان کے دَور میں پیدا ہوتے رہے (خلیفۂ وقت اپنے کسی بیٹے یا رشتہ دار کو جسے اہل سمجھتا یا زیادہ چاہتا تھا، اپنا ولی عہد نامزد کر دیتا تھا۔ السفاح نے اپنے بھائی منصور کو ولی عہد بنایا۔ منصور کا جانشین اسی کا بیٹا مہدی نامزد ہوا)[۲] مہدی کا وارث اس کا فرزند اکبر ہادی بنا اور ہادی کے بعد اس کا بھائی ہارون الرشید مسند نشین ہوا[۳]۔ ہارون نے اپنا پہلا جانشین

---

۵۱ مسعودی۔ ۷ ص۲۷۸۔

۵۲ دیکھو یعقوبی۔ ۲ ص۴۳۷۔ نیز "فخری" ص۲۳۶۔

۵۳ "فخری" ص۲۶۱۔ طبری۔ ۳ ص۵۲۳۔

بڑے بیٹے امین کو اور اس کے بعد خلافت کے لئے دوسرے اور زیادہ لائق بیٹے مامون کو منتخب کیا اور سلطنت کی ان دونوں میں تقسیم بھی کردی تھی کہ خراسان کی حکومت جس کا صدر مقام مرو تھا[۵۱] مامون کے نام لکھ دی لیکن بھائیوں میں شدید جنگ ہوئی اور نتیجے میں امین تلوار کے گھاٹ اتارا گیا (ستمبر ۸۱۳ ء)۔ تخت خلافت پر مامون زبردستی قابض ہوگیا۔ چار سال بعد مامون نے عباسیوں کی سیاہ عبا پر شیعوں کی سبز عبا کو ترجیح دی اور اولاد علیؓ میں (امام) علی رضا کو اپنا ولی عہد نامزد کیا جس سے اہل بغداد اتنے غصے میں آئے کہ انھوں نے مامون کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ منتخب کر لیا (جولائی ۸۱۷ ء) تخت کے لئے پھر خانہ جنگی ہوئی اور اپنے پیش رو (امین) کی موت کے کہیں چھ برس بعد جا کے مامون اس قابل ہوا کہ دارالخلافت میں خلیفہ بن کر داخل ہو۔ مامون نے وفات سے کچھ پہلے اپنے بیٹے کو نظر انداز کر کے اپنے بھائی المعتصم کو ولی عہد بنایا حالاں کہ فوج والے اس کے بیٹے کے بڑے حامی تھے اور قریب تھا کہ بغاوت ہو جائے معتصم کا جانشین اس کا فرزند واثق (متوفی ۸۴۷ ء) ہوا اور اسی پر خاندان عباسیہ کے جاہ و جلال کا زمانہ ختم ہوگیا۔ شروع کے چوبیس عباسی خلفا میں جن کا عہد حکومت قریب قریب دو صدی پر محیط ہے (۷۵۰ء تا ۹۹۱ء) صرف چھ ایسے تھے جن کے بعد پہلے ان کے بیٹے ہی جانشین سلطنت ہوئے۔

(خلیفہ کی ذات خاص سے متعلق حاجب کا عہدہ ہوتا تھا۔ خلیفہ کے

---

۵۱ یعقوبی۔ ۲ ص ۵۰۰۔ "تنبیہ" مسعودی ص ۳۴۵۔

حضور میں عمال سلطنت اور باضابطہ سفیروں کو پیش کرنا اُسی کا کام تھا لہذا یہ قدرتی طور پر نہایت با اثر عہدہ ہوگیا تھا (بغداد کے دربار میں جلّاد کی صورت بھی الگ نظر آجاتی تھی۔ عربوں کی تاریخ میں سب سے پہلے انہی خلفا کے عہد میں زیر زمیں تہ خانوں کا نام آتا ہے جن سے مجرموں کی تعذیب کا کام لیا جاتا تھا۔ اسے بھی عبّاسی خلفا، جلّاد کی طرح ایران ہی سے لائے تھے۔)

وزیر

(خلیفہ کے نیچے وزیر کا مرتبہ تھا۔ اس عہدے کی اصل ایرانی تھی[۱] وزیر سائے کی طرح خلیفہ کے ساتھ رہتا اور اس کی نیابت کی خدمت انجام دیتا تھا) جب اس کا آقا اپنا زیادہ وقت حرم سرا کے عیش وعشرت میں بسر کرنے لگا تو وزیر کا اقتدار بڑھ گیا۔ خلیفہ الناصر باللہ (۱۱۸۰ تا ۱۲۲۵ء) نے اپنا وزیر مقرر کرتے وقت جو سند لکھ کر دی وہ بادشاہ کے ربّانی حق کے عقیدے کی کامل تمثیل پیش کرتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"محمد ابن برز ال قمّی ساری زمین پر اور ہماری تمام رعایا کے درمیان ہمارا قائم مقام ہے۔ پس جو اس کی اطاعت کرتا ہے وہ ہماری اطاعت کرتا ہے وہ خدا کی اطاعت کرتا ہے اور خدا اپنی اطاعت کرنے والے کو جنّت میں جگہ دے گا۔ برخلاف ازیں، وہ شخص جو ہمارے وزیر

---

[۱] دیکھو ابن العباس کی کتاب: "آثار الاُوَل فی ترتیب الدّول" (قاہرہ ۱۲۹۵ھ) ص ۶۲

319 کی نافرمانی کرتا ہے وہ ہماری نافرمانی کرتا ہے اور جو ہماری
نافرمانی کرتا ہے وہ خدا کی نافرمانی ہے اور جو خدا کی
نافرمانی کرے، خدا اُسے دوزخ میں ڈال دے گا۔[1]

جیساکہ برامکہ کے معاملے میں ہوا، وزیروں کو اکثر انتہائی اختیارات حاصل ہوجاتے تھے اور وہ صوبے کے والیوں اور عدالت کے قاضیوں تک کا عزل و نصب کرسکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ کہنے کو یہ کارروائیاں خلیفہ کی رضامندی سے ہوا کرتی تھیں۔ حد ہے کہ وزیر موروثی اصول کے مطابق خود اپنا عہدہ (اپنی اولاد کو) منتقل کردیتے تھے۔ ایک اور رواج یہ تھا کہ جس طرح والی اپنے ماتحت عمّال اور عام شہریوں کا مال اسباب ضبط کرنے کے مجاز تھے، وزیر معتوب والیوں کی املاک ضبط کرلیتا اور خود خلیفہ اسی قسم کی سزا معزول وزیر کے لئے صادر کرتا تھا۔[2] مال متاع کی یہ ضبطی اکثر اوقات سزائے موت کے ساتھ عمل میں آتی تھی۔ آخر میں ضبطیوں کے لئے ایک جداگانہ دفتر[3] سرکاری محکمے کے طور پر قائم کیا گیا تھا۔ وزیر کا مشاہرہ خلیفہ معتضد کے عہد میں ایک ہزار دینار ماہانہ تھا۔ الماوردی[4] اور دوسرے اصول قانون کے مجتہد، وزارت کی بھی الگ الگ دو قسمیں بتاتے ہیں۔ ایک "تفویضی" جس میں غیر محدود کامل اختیارات وزارت کو حاصل ہوں۔ دوسرے "تنفیذی" جس میں صرف محدود تعمیلی اختیار دیا جائے۔ کامل اختیارات

---

[1] فخری۔ ص ۲۰۵۔　[2] ابن الاثیر۔ ۶ ص ۱۹

[3] ملاحظہ ہو ہلال الصابی کی کتاب "تحفۃ الامرا فی تاریخ الوزرا" (بیروت ۱۹۰۴ء) ص ۳۰۶

[4] ص ۳۳ تا ۴۷۔

کا حامل شاہانہ اقتدار سے کام لیتا تھا بجز اس کے کہ وہ اپنا جانشین نام زد نہ کرسکتا تھا۔ محدود اختیارات والا وزیر خود کوئی حکم نہ دیتا، نہ اقدام کرتا تھا بلکہ اس کا فرض یہ تھا کہ خلیفہ کی ہدایات کے مطابق احکام شاہی کی تعمیل کرائے۔ خلیفہ المقتدر (۹۰۸ء تا ۹۳۲ء) کے عہد کے بعد سے ایک نئے عہدہ دار نے وزارت کو پس پشت ڈال دیا۔ یہ امیر الامرا یعنی سپہ سالاروں کا سردار تھا کہ آگے چل کر یہ منصب خاندان بُوَیہ کے ہاتھ میں آگیا تھا۔

دیوان محاصل

(سلطنت کے ہر محکمے کا اعلیٰ حاکم سرکاری مجلس کا رکن ہوتا اور اس جماعت کی صدارت وزیر کرتا تھا جو حقیقت میں وزیر اعظم کا مرتبہ رکھتا تھا) اس لئے کہ بعض اوقات مختلف محکموں کے رئیس وزیر کہلاتے تھے لیکن ان کا درجہ ہمیشہ اصلی وزیر کے ماتحت ہوتا تھا۔ (عباسیوں کے زمانے میں سلطنت کی تنظیم پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پیچیدہ ہوگئی تھی اگرچہ امور مملکت، خصوصاً عدالت کے انتظام اور وصول محاصل کے کام میں زیادہ باقاعدگی آگئی تھی۔ حکومت کو سب سے زیادہ مالیات پر توجہ کرنی ہوتی تھی لہذا محکمہ خزانہ جسے "دیوان خراج" (= محاصل) کہتے تھے، حکومت کا سب سے اہم شعبہ رہا جیسا کہ بنی اُمیہ کے زمانے میں تھا۔ اس کے رئیس کو اکثر "صاحب الخراج" کے نام سے یاد کرتے تھے اور وہ خلیفہ کی حکومت میں سب سے ممتاز عہدہ دار ہوتا تھا)

32

(سلطنت کے ذرائع آمدنی میں زکوٰۃ شامل تھی اور مسلمانوں پر یہی قانونی محصول واجب الادا تھا۔ زکوٰۃ، زرعی اراضی، مواشی کے گلوں، سونے چاندی، تجارتی اموال اور املاک کی ایسی اشیا پر لی جاتی جن میں قدرتی اضافے یا کاروبار میں لگانے سے افزونی اضافہ ہوسکتی ہو) ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ مسلمان کوئی جزیہ نہیں ادا کرتے تھے (سرکاری محصل اراضی، مواشی، وغیرہ کی تشخیص کرتا تھا لیکن ذاتی اموال، بہ شمول سونا چاندی کی زکوٰۃ لوگوں کے اپنے ایمان پر حصر کردی جاتی تھی۔ مسلمانوں سے جتنا روپیہ وصول کیا جاتا وہ مرکزی بیت المال سے مسلمانوں ہی کی ضرورتوں میں خرچ ہوتا تھا) جیسے یتامی، مساکین، مسافر، دینی جہاد کے فی سبیل اللہ (رضاکار) مجاہدین کے لئے اور جنگی قیدی یا غلاموں کی آزادی کے فدئے میں ہ سرکاری مداخل کے دوسرے ابواب بیرونی دشمنوں سے خراج یا تاوان جنگ کی رقوم، غیر مسلم رعایا سے جزیہ، زمین کی مال گزاری (= خراج[1]) اور عشر یعنی مال تجارت پر دسواں حصہ جو غیر مسلم اسلامی ملک میں درآمد کرتے ہوں۔ ان جملہ (مدات میں سب سے بڑی اور سرکاری آمدنی کی اصلی مد مال گزاری تھی جو غیر مسلموں سے وصول کی جاتی تھی) زیر نظر زمانے میں اسے قرآنی اصطلاح میں "فے" کہتے تھے (سورۂ حشر: ۷) (اور یہ روپیہ خلیفہ،

---

[1] جیسا کہ ہم نے پندرہویں باب میں لکھا تھا، یہ زمانہ ہو جب کہ خراج اور جزیہ کے معنی میں ٹھیک ٹھیک فرق کیا جانے لگا۔ کچھ اور مدت گزرنے پر جزیہ "بدل العسکری" یعنی جنگی خدمت سے استثنا کا معاوضہ ہوگیا تھا اور اسی نام سے دولت عثمانیہ میں غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جاتا تھا۔

فوجوں کے مصارف، راستے، پُل، مساجد اور مسلمانوں کی رفاہ عام کے دوسرے کاموں میں خرچ کرتا تھا۔[۱]

سرکاری مداخل کی نسبت مختلف شہادتیں جو عباسیوں کے کے زمانے سے ہم تک پہنچی ہیں، تصدیق کرتی ہیں کہ اس دور کی پہلی صدی میں بڑی خوش حالی تھی اور اسی کی وجہ سے خلفا کا ایسی شان و شوکت سے زندگی بسر کرنا ممکن ہوا جس کا اوپر حال بیان کیا گیا ہے۔ بعد کی ہر صدی میں یہ آمدنی تدریجاً گھٹتی چلی گئی۔ ایسی تین اطلاعیں جو محفوظ رہیں، ان میں سب سے قدیم یعنی مامون کے عہد کی مال گزاری ابن خلدون نے تحریر کی ہے۔ قدامہ چند سال بعد، شاید معتصم کے وقت کی میزان نقل کرتا ہے اور تیسری اطلاع جس میں تیسری صدی ہجری کے نصف اول کے مداخل درج ہیں، ابن خرداد بہ کی کتاب
321 میں ملتی ہے۔ (ابن خلدون[۲] کے قول کے بموجب سواد (= زیریں عراق، قدیم بابل) جنس کے علاوہ نقد جو مالیہ ادا کرتا تھا وہ مامون کے زمانے میں دو کروڑ اٹھتر لاکھ ہوتا تھا) ولایات خراسان کی مال گزاری دو کرور اسی لاکھ تھی۔ مصر (بہ شمول سکندریہ) سے ۲,۳۰,۴۰۰۰۰ وصول ہوتے تھے۔ شام و فلسطین[۳] مع حمص سے ۱,۴۷,۲۴۰۰۰ اور پوری سلطنت سے ۳۳,۱۹,۲۹۰۰۸ درہم جن میں جنس کی قیمت

---

۱ ماوردی صفحہ ۳۶۶۔

۲ مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۱۵۱۔ واضح رہے کہ یہ فہرست اور اسی طرح قدامہ اور خرداذ کی میزانیں بالکل صاف اور صحیح نہیں سمجھنی چاہئیں۔

۳ اس میں قنسرین، دمشق وغیرہ کی الگ الگ میزان درج ہے۔

محسوب نہیں کی گئی ہے۔ قدامہ[1] کی جدول سے محاصل کا یہ تخمینہ ہوتا ہے:

سواد۔ نقد و جنس دونوں) =	۱۳ / ۰۲ / ۰۰۰۰۰
خراسان:۔	۳ / ۷۰ / ۰۰۰۰۰
مصر:۔	۳ / ۷۵ / ۰۰۰۰۰
شام (مع فلسطین و حمص)	۱ / ۵۸ / ۶ / ۰۰۰۰۰
کل سلطنت (نقد و جنس سمیت) =	۳۸ / ۸۲ / ۹۱ / ۳۵۰ / ۰۰۰۰۰

ابن خرداذبہ نے مختلف ابواب کی فہرست درج کی ہے جن کا حساب کرنے سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ سواد کی مال گزاری نقد و جنس ملاکر ۳۴۰، ۱۹، ۸۳ و ۷ درہم

خراسان اور اس کے توابع کی :	۰۰۰ ۴۶، ۴۸ و ۴
شام و فلسطین کی :	۵۰۰۰۰، ۹۸ و ۲
اور پوری سلطنت کی :	۶۵۳۴۰، ۹۲، ۲۹ درہم ہوجاتی تھی

بیان کیا گیا ہے کہ جب خلیفہ منصور کا انتقال ہوا تو خزانے میں ساٹھ کرور درہم اور ایک کرور چالیس لاکھ دینار سُرخ موجود تھے[2] ہارون الرشید نے اپنی وفات کے وقت نو کرور سے زیادہ دینار[3] چھوڑے اور المکتفی کی رحلت (۹۰۸ء) پر زرنقد اور جواہرات وظروف اور سازوسامان کی مالیت کی مجموعی رقم دس کرور دینار تک پہنچتی تھی۔[4]

---

[1] دیکھو اس کی کتاب خراج، ص۲۳۷۔ قدامہ نے نقد و جنس کے الگ الگ اعداد لکھے ہیں، ان کے مجموعے میں فرق پایا جاتا ہے۔

[2] مسعودی۔ ۶ ص۲۳۳۔　　[3] طبری۔ ۳ ص۷۶۳۔

[4] ثعالبی: "لطائف" ص۷۳۔

دوسرے محکمے

(محاصل کے محکمے کے علاوہ عباسی خلافت میں تنقیح یا محاسبی کا الگ دفتر تھا۔ اُسے "دیوان الزّمام" کہتے تھے۔ خلیفہ مہدی نے اُسے قائم کیا تھا، ایک سررشتہ مراسلات یا محافظ خانے کا "دیوان التوقیع" تھا جس کا کام سرکاری مراسلات، سیاسی دستاویزوں اور شاہی احکام اور ہدایات سے متعلق تھا۔ شکایات کے معائنے کے لئے ایک نظارت قائم تھی۔ پولس اور ڈاک کے الگ الگ محکمے تھے۔

شکایات کی تنقیح کی نظارت جسے "دیوان النظر فی المظالم" کہتے تھے، ایک قسم کی صدر عدالت اس غرض سے بنائی تھی کہ سیاسی یا انتظامی محکموں میں کسی کو بے انصافی کی شکایت ہو تو تحقیق کے بعد اس 322 کی اصلاح کرے) اس کی بنا بہت پہلے، امویوں کے زمانے میں پڑی تھی کیونکہ (ماوردی کا بیان ہے[1] کہ ان میں) عبدالملک پہلا خلیفہ تھا جس نے ایک خاص دن مقرر کیا کہ اس روز وہ پورا وقت اپنی رعایا کی شکایات اور عرضیاں خود سماعت کرنے میں صرف کرتا تھا) عمر ثانی نے اس طریق کی دلی سرگرمی سے تقلید کی۔ مگر عباسی دور میں بظاہر مہدی پہلا خلیفہ تھا جس نے یہ رسم جاری کی۔ اس کے جانشین ہادی، ہارون، مامون اور بعد کے خلفا ان شکایات کو دربار عام میں سماعت کرتے تھے۔ یہ سلسلہ المہتدی تک (۸۶۹ - ۸۷۰ء)

---

[1] ص ۱۳۱۔ نیز دیکھو ابن الاثیر - ۱ ص ۴٦۔

چلتا رہا۔ ایک نورمن بادشاہ رُوجر ثانی (تا ۱۱۵۴ء) نے اسی قسم کی عدالت لگانی شروع کی تھی۔ پھر یورپ میں یہ اصول جڑ پکڑ گیا پہلہ

(پولس کے محکمے "دیوان الشرطہ" کا صدر ایک بڑا عہدہ دار ہوتا تھا جسے "صاحب الشرطہ" کہتے تھے۔ وہ محکمے کا حاکم اعلیٰ ہونے کے ساتھ شاہی فوج رکاب کا بھی صدر ہوتا اور آخر زمانے میں کبھی کبھی وزیر کے عہدے پر فائز کر دیا جاتا تھا۔ ہر بڑے شہر کی اپنی خاص پولس الگ مقرر تھی۔ یہ فوجی خدمت بھی انجام دیتے اور عموماً معقول تنخواہیں پاتے تھے۔ شہری پولس کا حاکم محتسب کہلاتا تھا کیونکہ اخلاق و اعمال کی نگرانی اس کے سپرد تھی۔ وہ بازار کا بھی ناظر ہوتا اور یہ دیکھتا کہ لین دین میں صحیح اوزان اور پیمانوں سے کام لیا جا رہا ہے، واجبی قرضے وقت پر ادا ہو رہے ہیں یا نہیں (اگرچہ اُسے عدالتی اختیارات حاصل نہ ہوتے تھے) نیز یہ کہ اخلاقی احکام کی پابندی کی جاتی ہے۔ شریعت نے جن باتوں کو منع کیا ہے، جیسے قمار بازی، سود خواری اور سر بازار شراب فروشی، ان کی خلاف ورزی تو نہیں ہو رہی؟ یہ سب امور اُس کے فرائض میں داخل تھے۔ ماوردی نے پولس کے اس فوجدار کے بہت سے دلچسپ فرائض گنوائے ہیں۔ انہی میں لکھا ہے کہ محتسب نگرانی کرتا ہے کہ صنفی تعلقات اخلاقی معیار سے نہ گرنے پائیں اور ان لوگوں کو بھی سزا دیتا تھا جو فرقہ نسا میں رسائی پانے کی خاطر اپنے سفید بالوں کو خضاب سے

لہ امری: "سٹوریا.. بسیلیا" صفحہ ۴۵۲ - فان کریمر "گشیخٹے" ۱ صفحہ ۲۲۰

سیاہ کرتے ہوں! (ص ۲۱۷ و ۲۳۱) ×

(عباسی حکومت کا ایک اہم جزو ڈاک کا محکمہ تھا[۱] اس کے حاکم اعلیٰ کو "صاحب ال برید" کہتے تھے۔ جیساکہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں، بنی امیۃ میں امیر معاویہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ڈاک کے انتظام پر خاص توجہ کی، عبدالملک نے اسے تمام سلطنت میں وسیع کیا اور ولید نے اپنی عمارتیں بنانے کے سلسلے میں بھی اس محکمے سے کام لیا) 32
اہل تاریخ یہ بھی ہارون الرشید کے کارناموں میں محسوب کرتے ہیں کہ اپنے برمکی مشیر یحییٰ کی وساطت سے اس نے یہ انتظام نئے سرے سے مرتب کیا تھا۔ اگرچہ محکمہ برید کے قیام کی اصل غرض یہ تھی کہ سرکاری رسل و رسائل کی خدمت انجام دے لیکن وہ علیۃ الناس کی نجی خط کتابت لانے لے جانے کا بھی کسی حد تک کام کرتا تھا[۲]
(ہر صوبے کے دار الحکومت میں ڈاک خانے بنائے گئے تھے۔ دارالخلافت سے سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں تک سیدھی سڑکیں تیار کی تھیں[۳] اور ان سب راستوں میں ڈاک چوکی کا باقاعدہ انتظام تھا۔ ان ڈاک چوکی راستوں کی پوری تعداد ضرور صدہا تک پہنچتی تھی۔ ولایات ایران کی منزلوں کے واسطے گھوڑے اور خچر کام میں لائے جاتے تھے۔ شام و عرب میں اونٹوں سے کام لیا جاتا تھا[۴]۔ نئے والی

---

[۱] "دیوان ال برید" یعنی ڈاک کا محکمہ۔ برید سامی لفظ ہی — اس کا لاطینی "ویردس" سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے مقابلے میں دیکھو "بردن" یعنی تیز گھوڑا۔ عربی میں "برذون" کے معنی باربردار گھوڑے کے ہیں۔ (اصفہانی: "تاریخ" ص ۳۹) ×

[۲] مسعودی، ۶ ص ۹۳ × [۳] ابن خردادبہ ×

[۴] ملاحظہ ہو ابن الاثیر ۔ ۶ ص ۴۹ ×

مقرر ہوکر اپنی ولایتوں کو جاتے تو محکمۂ برید سے مدد لیتے اور فوجوں کے سازو سامان کے ساتھ نقل و حرکت کرنے میں بھی اس محکمے کی سواریاں کام دیتی تھیں[1] عام لوگ سرکاری برید سے معقول اُجرت دے کر کام لے سکتے تھے۔

خط پہنچانے کی غرض سے کبوتر بھی پالے اور سدھائے جاتے تھے۔ اس کی سب سے پہلی تاریخی مثال یہ ملتی ہے کہ جب خرمی فرقے[2] کا سرغنہ بابک باغی گرفتار ہوا تو یہ اطلاع اسی (پیام بر کبوتر کے) ذریعے ۲۳۸ء میں خلیفہ معتصم کو پہنچی تھی[3]۔

محکمہ برید کے صدر دفتر واقع بغداد میں پوری سلطنت کے راستوں کے نقشے موجود تھے جن میں مختلف منزلوں کے مقامات اور اُن کے فاصلے درج ہوتے تھے۔ ان نقشوں سے مسافر و سیاح، سوداگر اور حجاج سب کو مدد ملتی تھی اور انہی پر آیندہ جغرافی تحقیقات کی بنیاد پڑی۔ سب سے ابتدائی عرب جغرافیہ نویسوں نے اپنی کتابیں مرتب کرنے میں ان برید کے ہدایت ناموں سے کام لیا۔ ان کا ایک سرگروہ ابن خردادبہ گزرا ہے (وفات تخ ۹۱۲ء) جس کی کتاب "المسالک والممالک" تاریخی مقامات (=

---

[1] ایضاً۔ ۴ ص ۳۴۳۔

[2] یہ ایران کے ایک ضلعے کے نام پر "خرمی" موسوم ہوئے۔ اس فرقے کی شورش کا ایک سبب صریحاً مشہور سپہ سالار ابومسلم خراسانی کا قتل تھا۔ ان میں کچھ ایسے لوگ تھے جو ابومسلم کی موت سے انکار اور یہ پیش گوئی کرتے تھے کہ وہ دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے دوبارہ ظہور کرے گا۔ دیکھو مسعودی۔ ۶ ص ۱۸۶، بغدادی، ص ۱۶۲۔ فہرست، ص ۳۴۲۔

[3] مسعودی۔ ۷ ص ۱۲۶۔

خطط بلاد) کے حالات کا بہت اہم ماخذ ثابت ہوئی۔ ابن خردادبہ، خلیفہ المعتمد کے زمانے میں ولایت جبال (قدیم میڈیا) کا صاحب البرید تھا اور اس نے اپنی کتاب سرکاری کاغذات کے اعداد و شمار کی بنیاد پر تیار کی تھی۔ شوارع کے وسیع نظام کا مرکز انشعاب دارالخلافہ بغداد تھا لیکن یہ تنظیم گذشتہ ایرانی سلطنت سے ترکے میں (عباسیوں کو) ملی تھی۔ شوارع میں سب سے بڑی شاہ راہیں یہ تھیں:

خراسان کی بڑی شاہ راہ جو ہمدان، رے، نیشاپور، طوس، مرو، بخارا اور سمرقند سے گزرتی تھی اور بغداد کو دریائے جیحوں کے سرحدی مقامات اور حدودِ چین سے ملاتی تھی۔ اس شاہی راستے کے بڑے بڑے شہروں سے شمال اور جنوب کی طرف سڑکیں نکلتی تھیں اور آج کے دن تک ایران میں ڈاک کے راستے، جن کا مرکز قدیم رے کے قریب موجودہ پائے تخت طہران ہے، انہی پرانی لیکوں پر چل رہے ہیں۔

دوسری بڑی شاہ راہ بغداد سے واسط اور بصرہ ہوتی ہوئی، خوزستان کے صدر مقام اہواز اور وہاں سے فارس کے بڑے شہر شیراز آتی تھی۔ اس کے شہروں اور بڑی بستیوں سے بھی کئی راستے اِدھر اُدھر پھوٹتے تھے اور آخر میں خراسان والی شارع عام سے جا ملتے تھے۔ انہی راستوں سے (مشرقی ملکوں کے) حاجی بغداد آتے اور پھر

حج کا وہ راستہ اختیار کرتے جو کوفے یا بصرے سے ہوتا ہوا مکہ معظمہ پہنچ جاتا تھا۔ حاجیوں اور مسافروں کے آرام کے لئے ان عام شوارع پر جا بہ جا کارواں سرائیں، دار الشفا اور حوض بنے ہوئے تھے۔ خراسان کی بڑی شاہ راہ پر یہ سرائیں "خان" کے نام سے بہت پہلے، یعنی عمر ثانی ہی کے عہد میں تعمیر کردی گئی تھیں۔[۱]

تیسری بڑی شاہ راہ بغداد کو موصل، عمید (دیار بکر) اور سرحدی قلاع سے ملاتی تھی۔ شمال مغرب میں بغداد کا سیدھا راستہ انبار اور رقہ سے گزرکر دمشق اور شام کے دوسرے شہروں کو لے جاتا تھا۔

محکمہ برید کے رئیس اعلیٰ کو شاہی ڈاک کے انتظام اور مختلف ڈاک خانوں کی نگرانی کرنے کے علاوہ ایک اور اہم خدمت بھی انجام دینی ہوتی تھی۔ وہ جاسوسی نظام کا بھی حاکم اعلیٰ ہوتا تھا اور برید کا پورا محکمہ اس نظام کی مدد دینے پر مامور تھا۔ اسی لئے اس عہدہ دار کا پورا نام "صاحب البرید والاخبار"[۲] یعنی ڈاک اور اطلاعات کا اعلیٰ ضابط بتایا گیا ہے۔ ان صیغہ راز کے فرائض بجالانے میں وہ براہ راست مرکزی حکومت کے عامل کی حیثیت سے محکمۂ مذکور کا صدر ناظم ہوتا تھا۔ صوبائی برید کے عامل، اپنے اپنے صوبے کے سرکاری حکام کے اعمال و افعال کی خبریں صدر ناظم کو اور یا براہ راست خلیفہ کو

---

۵۱ ابن الاثیر ۔ ۵ صـ ۲۴ ۔ نووی : "تہذیب" صـ ۲۶۵۔

۵۲ قدامہ ، صـ ۱۸۴۔

بھیجتے تھے اور خود والئ صوبہ بھی اُن کی اطلاعات سے مستغنی نہ تھا۔ متاخرین میں سے ایک مصنف نے[1] اس کی یہ مثال نقل کی ہے کہ متوکل کے عہد میں (عامل برید نے) والئ بغداد کی نسبت خلیفہ کو اطلاع دی کہ مکہ معظمہ کے حج سے واپسی میں یہ حاکم "ایک خوب صورت کنیز لے کر آیا ہے اور دوپہر سے رات تک اسی سے ملاعبت میں مشغول اور سرکاری کاموں سے غافل رہتا ہے"۔ (المنصور اپنے جاسوسی نظام میں تاجروں، خوانچہ فروشوں اور معمولی مسافروں تک سے خفیہ خبریں لانے کا کام نکالتا تھا اور ہارون الرشید وغیرہ دوسرے خلیفہ بھی ایسا ہی کرتے تھے[2] کہتے ہیں مامون کی خفیہ خبر رسانی کے محکمے میں کوئی سترہ سو بڑھیاں نوکر تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ "رومیوں کی سرزمین" میں عباسی جاسوس، زن و مرد دونوں، کثرت سے سوداگروں، سیاحوں، طبیبوں کے بھیس میں پھرتے تھے۔)

عدالت کا اِنتظام 326

(عدل و انصاف کرنے کا کام مسلم اقوام میں ہمیشہ سے مذہبی فرض سمجھا گیا ہے۔ یہ خدمت عباسی خلفا یا ان کے وزیر علمائے اسلام کے گروہ میں سے کسی فقیہ کے سپرد کرتے تھے جو مقدمات کی قضا یعنی فیصلہ کرنے کی بنا پر "قاضی" ہو جاتا[3] اور دارالخلافت میں یہ خدمت

---

۱ اتلیدی: "اعلام الناس" (قاہرہ ۱۲۹۷ھ) ص ۱۶۲۔

۲ دیکھو اغانی۔ ۱۵ ص ۳۶۔ ابن مسکویہ ص ۲۶۸ وغیرہ۔

۳ انگریزی سرکاری تحریروں میں یہ لفظ کئی کئی طرح سے لکھا ہوا ملتا ہے۔

انجام دیتا تو صدر قاضی یا "قاضی القضاۃ" کہلاتا تھا۔ سب سے پہلے یہ لقب مشہور فاضل امام ابو یوسف کے لئے استعمال ہوا (وفات ۷۹۸ء) جو خلیفہ مہدی اور اس کے دو جانشین فرزندوں، یعنی ہادی اور ہارون کے عہد حکومت میں اس خدمت پر مامور تھے[1] اسلامی اصول قانون کی رو سے قاضی ہونے کی شرطیں یہ تھیں کہ بالغ، مرد، آزاد شہری، مذہباً مسلمان، اخلاقاً بے عیب ہو۔ قوائے دماغی صحیح سالم ہوں۔ سماعت و بصارت میں فرق نہ ہو اور قانون کے احکام سے خوب واقف ہو۔ اور ظاہر ہے کہ قانون کے معنی شریعت اسلامی تھے۔ مگر غیر مسلموں کی نسبت ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ اُن کے دیوانی مقدمات خود اُن کے مذہبی سرگروہ یا عدالتی حاکم فیصل کرتے تھے یہ اسلامی قاضیوں کی حدود سماعت میں داخل نہ تھے۔ قاضیوں کی بھی ماوردی نے دو الگ الگ قسمیں قرار دی ہیں: اوّل، قضاءت عامہ مطلقہ، جس کے اختیارات بہت جامع اور وسیع تھے۔ دوسرے، قضاءت خاصہ، جو محدود و مخصوص اختیارات کی حامل تھی۔[2] قسم اوّل کے قاضی کے اہم فرائض میں نہ صرف فصل خصومات کی خدمت تھی بلکہ وہ یتامیٰ، مجانین اور نابالغ وارثوں کی املاک کا متولی اور اسلامی اوقاف کا نگراں ہوتا تھا۔ مذہبی قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دیتا تھا۔ مختلف صوبوں میں عدالتی نائب مقرر کرتا اور خاص خاص صورتوں میں جمعے کی نماز میں امامت کرتا تھا۔ محکمہ قضا کے قیام کے ابتدائی زمانے میں صوبائی قاضی والیوں کے حکم سے مقرر کئے جاتے تھے لیکن چوتھی

---

[1] ابن خلکان۔ ج ۲ ص ۳۳۲۔ [2] ماوردی، ص ۱۰۶۔

صدی ہجری میں عام طور پر وہ بغداد کے قاضی القضاۃ ہی کے نائب ہونے لگے تھے۔ ایک بعد کے ماخذ سے معلوم ہوتا ہے کہ (خلیفہ مامون کے عہد میں مصر کے قاضی کی تنخواہ چار ہزار درہم ماہانہ ہوگئی تھی[1]۔ ماوردی نے قاضیوں کی جو دوسری قسم محدود اختیارات کی بتائی ہے، ان کے کاموں کی تخصیص و تحدید ان کے تقرر کے پروانے میں کر دی جاتی تھی جو خلیفہ یا وزیر یا والئ صوبہ جاری کرتا تھا[2]۔

فوجی تنظیم

سچ پوچھئے تو (عربوں کی خلافت میں کوئی باقاعدہ، تنخواہ دار بڑی فوج کہ ہمہ وقت تیار، جنگی مشق و قواعد میں مصروف اور فوجی ضبط کی پابند رہے، کبھی قائم نہیں رکھی گئی۔ ایسی باضابطہ فوجی جمعیت تھی تو وہ خلیفہ کی فوج رکاب (= حرس یعنی پاسبان) ہی تھی جسے ایک مرکزہ کہنا چاہیئے کہ اسی کے گرد دوسرے سردار اپنے اپنے رسالے
327 لاکر جمع کرتے اور قبائل یا اضلاع کی بھرتیاں فراہم کی جاتیں اور کرائے کے سپاہی یا آفاقی شامل کر لئے جاتے تھے۔ تاہم ایک باقاعدہ سپاہ (= جُند) کا ذکر آتا ہے جو کہ مستقل طور پر جنگی خدمات انجام دیتی اور "مُرتزقہ"[3] یعنی ماہانہ تنخواہ (یا روزی) پانے والوں کے نام سے موسوم کی جاتی تھی۔ رضاکار سپاہی "مُتطوعہ" کہلاتے اور سرکاری

---

۱ سیوطی: "حسن" ۲ ص۱۰۱۔

۲ دیکھو رچرڈ گوتھیل کا مضمون مندرجہ رسالہ "ریویو.... ایتھنوگرافیک" (۱۹۱۰) ص۳۸۵۔

۳ طبری نے ان کا دوسرا نام "مُطوّعیہ" دیا ہے۔ ۳ ص۱۱۔ نیز دیکھو ابن خلدون۔ ۳ ص۲۶۰۔

راتب صرف اُس وقت پاتے تھے جب کہ اُن سے کام لیا جائے) ان کے دستے بدو قبائل، کسان اور عام شہری طبقے سے بھرتی ہوتے تھے (فوج رکاب کے سپاہیوں کی تنخواہ اوروں سے زیادہ تھی اور وہ بہتر اسلحہ اور وردی سے آراستہ کئے جاتے تھے) (سب سے پہلے عباسی خلیفہ (منصور) کے وقت میں پیادہ سپاہی کی تنخواہ ۹۶۰ درہم سالانہ کے قریب تھی[۱] مقررہ خوراک، بھتہ وغیرہ اس کے علاوہ ہیں۔ سواروں کو اس سے دُگنا مشاہرہ دیا جاتا تھا) مامون کے عہد میں جب کہ سلطنت انتہائے عروج پر تھی، عراقی فوج کی تعداد سوا لاکھ بتائی گئی ہے۔ پیادہ سپاہی کی تنخواہ اس وقت صرف ۲۴۰ درہم (اور سواروں کی اس سے دُگنی) رہ گئی تھی[۲] لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ خلیفہ منصور نے بغداد کی تعمیر کی تو بڑے راج معماروں کی یومیہ اُجرت ایک درہم کے قریب تھی اور معمولی مزدور ایک تہائی درہم کے قریب روزانہ مزدوری پاتے تھے[۳] جس کا مطلب یہ ہوا کہ فوجی خدمت کا معاوضہ نسبتہً بہت اچھا تھا ؏

(ابتدائی عباسی عہد میں فوج کی ہیئات ترکیبی یہ تھی کہ وہ حربیہ (یعنی پیادہ) رامیہ (= تیر انداز) اور فرسان (= سوار) پر مشتمل ہوتی۔ پیادے ڈھال، تلوار، برچھی سے اور سوار زرہ بکتر، خود، جنگی تبر اور لمبے لمبے نیزوں سے مسلح کئے جاتے تھے) عربوں کا طریقہ یہ تھا کہ تلوار

---

[۱] طبری۔ ۳ صفحہ ۱۰۰۔ ابن اثیر نے بھی اسے نقل کیا ہے۔ ۵ ۔۔۔ جز

[۲] جب مامون کی اپنے بھائی سے جنگ ہوئی تو اسے وہی ۹۶۰ درہم سالانہ کی شرح قبول کرنی پڑی کیونکہ اس کا بھائی امین اسی شرح سے تنخواہ دیتا تھا۔ طبری۔ ۳ صفحہ ۸۳۰ وغیرہ ؏

[۳] ایضاً۔ صفحہ ۳۲۶۔ خطیب۔ ۱ صفحہ ۰ ؏

شانے پر سے لٹکائی جاتی تھی ال متوکل نے اس کی بجائے عجمی طرز پر کمر کے گرد باندھنے کا رواج شروع کیا[1] تیر اندازوں کے ساتھ ایک جمعیت نفط اندازوں (= نفاطون) کی رکھی جاتی تھی - یہ لوگ مانع آتش لباس پہنتے اور دشمن پر آتشیں اشیا پھینکتے تھے[2] (مہندس یعنی قلعہ گیری کے ماہرین) لشکر کے ہمراہ ہوتے اور قلعہ شکن آلات، منجنیق، عرادہ، دبابہ وغیرہ ان کی تحویل میں رہتے تھے)۔ ایک ایسا ماہر
328 حیل ابن صابر ال منجنیقی گزرا ہے جس کو ناصر باللہ (۱۱۸۰ — ۱۲۲۵ء)
کے آخری ایام میں شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے فن حرب کی جملہ ضروریات مفصل تحریر کی تھیں اگرچہ کتاب کی تکمیل نہ کر سکا[3] (جنگی دواخانے اور اونٹوں پر پالکیوں کی صورت میں زخمیوں کی سواریاں میدان جنگ میں لشکر کے ساتھ چلتی تھیں۔ دوسری اصلاحات کی طرح، ان مفید لوازم کی ترویج کا فخر بھی ہارون الرشید سے منسوب کرتے ہیں کہ علم و حکمت سے جنگ و جدال میں خدمت لینے کا کام بھی اسی خلیفہ نے کیا ہے)

عباسیوں کا فروغ، جیسا کہ ہم پچھلے اوراق میں دیکھ چکے ہیں، عربوں سے زیادہ عجمی جنگ آزماؤں کا رہین منت تھا لہذا ان کے دور حکومت میں جس طرح عربوں کی سیاسی بالا دستی ختم ہوئی اسی طرح فوج میں بھی ان کا غلبہ نہ رہا (پہلے خلفائے عباسیہ کی سپاہ خاصہ

---

۱ ابن خلدون، ۳، ص ۲۷۵ ؛

۲ ابن خلدون، ۳، ص ۲۶۰ - آغانی - ۱۷، ص ۴۵ ؛

۳ ابن خلکان - ۳ - ص ۳۹۷ -

زیادہ تر خراسانی سپاہیوں پر مشتمل تھی اور یہی سپاہ عسکری نظام کا قوی ترین بازو ہوتی تھی) عرب عسکریوں کے دو حصّے بن گئے تھے۔ ایک شمالی عرب کے مُضَر قبائل سے مرکب تھا، دوسرا جنوبی عرب کے یمنیوں سے۔ غیر مُسلم لوگ جو نئے مسلمان ہوتے وہ کسی عرب قبیلے سے تعلق پیدا کر کے اسی کے موالی بن جاتے اور فوجی تنظیم میں بھی اسی قبیلے کے ساتھ جگہ پاتے تھے۔ المعتصم نے ترکوں کے ایک نئے جیش کا فوج میں اضافہ کیا۔ یہ لوگ اصل میں خلیفہ کے غلام اور فرغانہ اور وسط ایشیا کے دوسرے اقطاع کے باشندے تھے[۱]۔ یہ فوج شاہی کا نیا جیش تھوڑے ہی دن میں سارے دارالخلافت کے حق میں دہشت ناک ہوگیا اور خود خلیفہ کو عافیت اسی میں نظر آئی کہ ۸۳۶ء میں سامرہ میں نیا شہر بنا کر دفاتر حکومت کو وہاں منتقل کر لیا۔ خلیفہ المنتصر (۸۶۱-۸۶۲ء) کی وفات کے بعد یہ ترک بادشاہ گری کا کھیل کھیلنے لگے اور امور سلطنت پر کارگر اثرات ڈالنے لگے۔

(روحی بائی زنطی طریق کے مطابق مامون، معتصم اور بعض دوسرے عباسی خلفا کے زمانے میں فوج کے دس جوانوں کا سردار عریف کہلاتا تھا۔ پچاس کا سردار، خلیفہ اور سو کی قیادت کرنے والا، قائد[۲] (جیسے رومیوں میں سینچورین)۔ دس ہزار کے لشکر میں دس دستے یا پلٹنیں ہوتی تھیں، ان سب کے سپہ سالار کو امیر (= جنرل) کہتے تھے۔ سو سپاہیوں کی جماعت سے ایک جوق بنتا تھا اور ایسے چند جوق جمع

---

[۱] مسعودی ۷، صفحہ ۱۱۸۔

[۲] ابن خلدون - ۳ - صفحہ ۲۹۹ - مسعودی وغیرہ۔

ہونے سے جز ولشکر یا کردوس (= "کوہورت") کی تشکیل ہوجاتی تھی فان کریمر نے اس زمانے کے عرب لشکر کی حالت سفر میں جیتی جاگتی تصویر کھینچی ہے۔[1]

خلافت عباسیہ اپنے دور کی پہلی تمام صدی میں مضبوط اور خوش دل فوج کی سخت محتاج رہی۔ اس کی بقا کا انحصار ہی فوج پر تھا جو شام و ایران اور وسط ایشیا میں خلافت کے لئے لڑے
329 بائی زنطہ سے بھی جارحانہ جنگ جاری رکھ سکے۔ دور جدید کے ایک مصنف کی رائے میں "دسویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کی فوج کو دو چیزوں نے بہت خطرناک بنا دیا تھا: ایک تو ان کی تعداد، دوسرے ان کی نقل و حرکت کی غیر معمولی قوت"[2] لیکن صرف یہی بات نہ تھی۔ بلکہ فن حرب کے ایک رسالے میں، جس کی تصنیف اسی عصر کے قیصر لیو ششم "ال عاقل"[3] (۸۸۶ — ۹۱۲ ء) سے منسوب کی جاتی ہے، ہم یہ قول پڑھتے ہیں کہ "تمام (ملیچھ) قوموں میں وہ (یعنی عرب مسلمان) اعمال حربی کے بہترین ماہر اور سب سے دانا جنگ آزما ہیں"۔ ذیل کی عبارت لیو کے جانشین قیصر کونس ٹن ٹائن پورفی رو جنی ٹس (۹۰۹ تا ۹۱۳ ء) نے لکھی ہے اور عربوں نے اپنے بائی زنطی دشمنوں کے دل پر اپنی سپاہ گری کا جو نقش چھوڑا تھا، اس کی کیفیت پیش کرتی ہے:-

---

[1] "کل ٹور گشیختے" ۱ صہ ۲۲۷۔

[2] اومن: "آرٹ آف وار" صہ ۲۰۹۔

[3] دیکھو "ٹاک تی کا" "بیٹ ردو جیا گری کا" کے مجموعے میں جلد (۱۰۷)۔

"وہ ایسے طاقت ور اور جنگ جو ہیں کہ اگر اُن کا صرف ایک ہزار کا لشکر کہیں پڑا ہو، تو اُسے اپنی جگہ سے ہٹا دینا غیر ممکن ہو۔ وہ گھوڑوں پر نہیں بلکہ اونٹوں پر سوار ہوتے ہیں۔"

ایسے بای زنطی ماخذوں کے بیانات سے، جیسے قیصر نکی فورس فوکاس (۹۶۳ تا ۹۶۹ء) کی کتاب جنگ کی تدابیر پر ہی[۱] ظاہر ہوتا ہے کہ سردی اور برسات کا موسم عرب سپاہیوں کے مذاق کے خلاف تھا۔ اگر لڑائی میں ایک دفعہ ان کی جنگی صف ٹوٹ جاتی تو ان میں ایسا نظم وضبط نہ تھا کہ پھر اُسے مرتب کرلیں۔ نیز یہ کہ اُن کی پیادہ فوج عموماً لٹیروں کی بھیر ہوتی اور حربی عامل کے طور پر کوئی کارگر عنصر نہ تھی۔ بایں ہمہ یہ بات یقینی معلوم ہوتی ہے کہ بائی زنطی، عربوں کو کافر و وحشی کہنے کے باوجود اپنا سب سے قوی حریف سمجھتے تھے۔ البتہ دسویں صدی کے دوران میں یہ حریف رفتہ رفتہ کم خطرناک ہوتا گیا یہاں تک کہ صدی کے اواخر میں اقدام جنگ عادتاً بائی زنطیوں کی طرف سے ہونے لگا اور دمشق و بغداد تک ان کی زد پڑنے لگی۔

خلیفہ ال متوکل نے جب سے بیرونی دستے بھرتی کرنے شروع کئے، اسی وقت سے عبّاسیوں کی جنگی قوت میں زوال آنے لگا کیوں کہ اجنبی عناصر کے اضافے سے پوری فوج میں وحدت کی روح قائم نہ رہی اور قومی سربلندی کا جوش زائل ہوگیا۔ آگے چل کر ال مقتدر (۹۰۸ [illegible] ۹ء) نے یہ طرز عمل اختیار کیا کہ صوبے کے والیوں یا جنگی سپہ سالاروں

---

[۱] ایضاً۔ جلد (۱۱۳)۔

کو اُن کے اقطاع ٹھیکے پر دے دیا کہ وہ اپنی فوج کے مصارف مقامی محاصل سے پورے کرلیا کریں اور شاہی خزانے پر جو اُن دنوں گھٹتا جارہا تھا، بار نہ ڈالیں۔ خاندان بُویہ کے عہد اقتدار میں خود سپاہیوں کو نقد تنخواہ کی بجائے زمین جاگیر میں دے دی جاتی تھی۔ اسی سے جنگی جاگیرداری کے نظام کی بنا پڑی اور سلجوقیوں کے زمانے میں اُسے اور تقویت حاصل ہوئی۔ پھر تو یہ معمول ہوگیا کہ صوبہ داروں اور فوج کے امیروں کو اضلاع یا شہر سونپ دئے جاتے تھے کہ بالکل خودمختاری سے وہاں حکومت کریں اور سلجوقی سلطان کو صرف سالانہ خراج ادا کرتے رہیں اور جنگ کے موقع پر فوج کی مقررہ تعداد اس کے جھنڈے کے نیچے لاکر جمع کردیں۔ فوج کے اسلحہ تنخواہ وغیرہ وہ خود مہیّا کردیتے تھے۔

والیٔ صوبہ

(بنی اُمیّہ کے عہد میں سلطنت کے مختلف اقطاع اور ممالک پر امیر یا عامل مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ انتظام بائی زنطی اور ایرانی نمونے پر کیا گیا تھا اور عباسیوں کے دَور میں بھی کوئی بنیادی تبدیلی عمل میں نہیں آئی۔ عباسی ولایات کی فہرست وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔ اسی لئے اصطخری، ابن حوقل اور ابن الفقیہ اور یا اسی قسم کی کتابوں میں جو تقسیم ممالک دی گئی ہے، ضروری نہیں کہ وہ صوبائی ناموں سے ہر حال میں مطابقت رکھتی ہو۔ پھر بھی خلفائے بغداد کے ابتدائی دَور میں بظاہر اُن کے بڑے بڑے صوبے حسب ذیل تھے:

(۱) افریقہ، صحرائے لیبیا کا مغربی علاقہ، بہ شمول صقلیہ۔

(۲) ۔مصر؛ (۳)۔ شام و فلسطین جنھیں بعض اوقات الگ کر دیا جاتا تھا؛ (۴) ال حجاز اور ال یمامہ (عرب وسطی)۔(۵) ال یمن یا یا جنوبی عرب[۱]؛ (۶) ال بحرین و عمان ۔ اس صوبے کا دارالحکومت عراق کا بصرہ تھا؛ (۷) ال سواد ، یعنی جنوبی عراقِ عرب، جس میں دارالخلافہ بغداد کے علاوہ کوفہ اور واسط بڑے شہر تھے؛ (۸) ال جزیرہ ، یعنی دجلہ وفرات کا شمالی علاقہ (قدیم اشوریہ) جس کا صدر مقام موصل تھا؛ (۹) آذربی جان ۔ اس میں بڑے شہر تبریز، اردبیل اور مراغہ تھے؛ (۱۰) ال جبال (کوہستان ، یعنی قدیم مدیہ) اسے آگے چل کر عراق عجم کہنے لگے تھے[۲] اس کے بڑے شہر ہمدان (قدیم "اِک بٹانا") ال رے اور اصبہان (= اسپہان ، اصفہان) تھے؛ (۱۱) خوزستان ۔ بڑے شہر ال اہواز اور تستر[۳]؛ (۱۲) فارس، جس کا دارالحکومت شیراز تھا؛ (۱۳) کرمان اپنے موجودہ صدر مقام کا ہم نام؛ (۱۴) مکران ۔ اس میں موجودہ بلوچستان شامل اور حدود ان پہاڑوں تک وسیع تھیں جن کے نیچے دریائے سندھ بہتا ہے؛ (۱۵) سجستان یا سیستان ۔ اس کا دارالحکومت زرنج تھا؛ (۱۶ تا ۲۰) قہستان ، قومس ، طبرستان ، جرجان اور ارمنیہ؛ (۲۱) خراسان ۔ اس میں وہ علاقہ شامل تھا ، جو اب افغانستان کا شمال مغربی حصہ

---

[۱] یہ پہلے پانچوں صوبے اکثر "اقالیم مغرب" کے نام سے یاد کئے جاتے ۔ اور اس کے مقابلے میں مشرق کی ولایتیں "اقالیم مشرق" کہلاتی تھیں ۔

[۲] جنوبی علاقہ عراق عرب تھا ۔ اس لئے اسے عراق عجم کہنے لگے ۔

[۳] اس کا ایرانی تلفظ "شُستر" یا "شُش تر" ہے ۔

ہو گیا ہے۔ اس میں نے سابور، مرو، ہرات اور بلخ، نامی شہر تھے؛ (۲۲) خوارزم۔ اس کا اوّل اوّل دار الحکومت کاث رہا ؛ (۲۳) ال صغد (قدیم "سوگ دیانا") جیحون اور سیحون کے درمیان کا علاقہ جس کے دو شہر، سمرقند و بخارا مشہور تھے ؛ (۲۴) فرغانہ، ال شاش
331 (موجودہ تاش قند) اور ترکی ولایات؀ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مغربی ایشیا میں عثمانی ترکوں کی ولایات، جغرافی اعتبار سے قدیم عربی ولایتوں کے مطابق تھیں ؛

۳۔ اتنے وسیع اور دُور دست علاقوں میں، جب کہ وسائل آمد و رفت دشوار تھے، لامرکزیت کا ظہور ہونا، ناگزیر بات تھی اگرچہ دار الخلافہ (بغداد) سے اسے رد کرنے کی برابر سعی کی جاتی رہی۔ مگر اوّل تو مقامی امور میں والی کے اختیارات لامحالہ غالب آتے چلے گئے۔ پھر اس کا عہدہ موروثی ہونے کا میلان پیدا ہوا۔ (اصولاً والیوں کا عزل و نصب وزیر کی مرضی پر منحصر تھا کہ انہی کی تحریک پر خلیفہ تقرر کی منظوری دیتا اور وزیر کے عہدے سے الگ ہونے کے ساتھ والی بھی اپنے عہدے سے ہٹ جاتے تھے) (ماوردی نے جس طرح وزارت کی دو قسمیں کی ہیں، والیوں کے بھی وہ دو درجے قرار دیتا ہے؀: اوّل "امارۃِ عامہ" (جس میں والی کو جنگی معاملات، عمّال عدالت کے تقرر و نگرانی، حفظِ امن اور محاصل عائد کرنے کے اختیارات

؀ بی اسٹرینج نے "ایس ٹرن کے لی فیٹ" اور زیدان ڈکریمر نے اپنی کتابوں میں صوبوں کی الگ الگ فہرستیں مرتب کی ہیں ؛

؀ ص ۴۷ تا ۵۴ ؛

حاصل ہوتے تھے۔ وہ بدعات و محدثات سے قومی مذہب کا تحفظ، پولس کا انتظام اور جمعے کی نماز میں بھی امامت کرتا تھا۔ دوسری قسم "امارتِ خاصہ" وہ تھی جس میں والی کو محصول لگانے یا عدالتوں پر نگرانی رکھنے کا اختیار نہیں دیا جاتا تھا۔ لیکن یہ سب تقسیم و تعیین نظریاتی ہے۔ کیوں کہ درحقیقت والیوں کی ذاتی لیاقت، خلیفہ کی روز افزوں کم زوری اور صدر مرکز سے صوبے کی دوری کے تناسب سے صوبائی اقتدار بڑھتا تھا (صوبے کے سرکاری اخراجات قریب قریب ہر جگہ وہاں کے مقامی مداخل سے ادا کیے جاتے تھے۔ اگر مصارف کم ہوں تو فاضل رقم خلیفہ کے خزانے میں بھیج دی جاتی تھی۔ عدالت کا کام صوبائی قاضی کے سپرد ہوتا تھا اور مختلف اضلاع کے شہروں میں اس کے نائب یہ خدمت انجام دیتے تھے)۔

باب بست و ششم[26]

عباسی معاشرت 332

عباسیوں کو غیر ملکی عناصر کی مدد سے تختِ بادشاہی ملا تھا، لہذا اُن کے زمانے میں عرب کا بنیادی نظام معاشرت یعنی بدوی نمونے کی قبائلی تنظیم بالکل ختم ہوگئی۔ خلیفہ تک بیویوں کے انتخاب میں اور اپنے بچوں کی مائیں چننے میں عربی نسل و نژاد کا کوئی لحاظ نہ رکھتے تھے۔ عباسیوں میں صرف تین خلیفہ آزاد ماؤں کے بیٹے ہوئے ہیں: یعنی ابوالعباس۔ المہدی اور الامین[1]۔ آخرالذکر کو یہ خاص فضیلت حاصل تھی کہ باپ کی طرح اس کی ماں بھی جناب رسالت مآب[ص] کے قبیلے سے تھی۔ بنی اُمیہ میں بارھواں خلیفہ یزید ثالث پہلا تاجدار تھا جس کی ماں عرب قوم کی نہ تھی لیکن اُس کی نسبت بھی کم سے کم یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آخری ایرانی بادشاہ یزدجرد کی اولاد میں تھی جسے عرب سپہ سالار قتیبہ نے صغد میں گرفتار کیا اور حجاج

---

[1] ثعالبی: "لطائف" ص۳۔ الامین کی ماں کے متعلق دیکھو طبری۔ ۳ ص۹۳۱۔

(ابن یوسف ثقفی) نے اُسے خلیفہ ولید کی خدمت میں بھیجا تھا[۵۱]۔ برخلاف اس کے عباسیوں میں منصور ہی کی ماں بربر کنیز تھی۔ المامون ایرانی کنیز کے بطن سے تھا۔ الواثق اور المہتدی کی مائیں یونانی لونڈیاں تھیں۔ المنتصر کی، یونانی اشوری تھی۔ المستعین کی، اسلافی قوم کی (صقلبیہ)۔ المکتفی نیز المقتدر کی مائیں، ترکی کنیزیں تھیں۔ المستضی، ارمن کنیز کا بیٹا تھا[۵۲]۔ ہارون الرشید کی مشہور معروف ماں الخیزران غیر قوم کی لونڈی تھی اور وہی پہلی عورت گزری ہو جس نے عباسی خلافت کے معاملات میں خاصا درخور پیدا کرلیا تھا[۵۳]۔

عربوں کو اپنی محکوم قوموں سے خلط ملط کرنے کے سب سے کارگر اسباب، تعداد ازدواج، کنیزیں رکھنے کا رواج اور غلاموں کی تجارت تھے۔ پھر جب خالص عرب عناصر پس پشت ہٹنے لگے تو غیر عرب اور دوغلے نیز اُمّ ولد (= سابق) کنیزوں کی اولاد اُن کی جگہ سامنے آتی گئی۔ زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اشرافِ عرب کی بجائے اول اول ایرانی اور پھر ترک قوموں کے عمال کے جتھے سرکاری عہدوں پر 333
قابض ہو گئے۔ ایک شاعر اس گیت میں غیور عرب کے جذبات

---

۵۱ (ممالک ہند اور شاید ایران میں بھی عام طور سے مشہور ہو کہ خاندانِ یزدجرد کی ایک لڑکی حضرت عمرؓ کے زمانے میں گرفتار ہو کر آئی اور حضرت امام حسینؓ کے حرم میں داخل ہوئی اور آپ کی اولاد (: سادات حسینی) کا سلسلہ اسی سے چلا۔ مترجم)۔

۵۲ دیکھو ثعالبی، ص۷۵۔ نیز مسعودی۔

۵۳ اپنے فرزند خلیفہ ہادی کی موت اور چاہیتے بیٹے ہارون کو مسند نشین کرانے میں، لوگوں کو بدگمانی تھی کہ خیزران نے حصہ لیا۔ اس کے متعلق دیکھو طبری۔ ۳ ص۵۶۹۔ مسعودی وغیرہ۔

کا اظہار کرتا ہے:

اِنّ اولاد السراری کثروا یا ربّ فینا
ربّ ادخلنی بلاداً لا اریٰ فیہا ہجینا![1]

(ترجمہ۔ الٰہی ہرطرف لونڈی بچوں کی کثرت ہوگئی ہے۔ مجھے تو ایسے دلیس میں لے چل جہاں یہ رذیل نظر نہ آئیں!)

افسوس یہ ہے کہ اس عہد کے عرب تاریخ نویسوں کی ساری توجہ خلفا کے سوانح اور سیاسی واقعات پر مبذول رہتی تھی اور ان سے اتنی فرصت ہی نہ پاتے تھے کہ ان دنوں عوام کی جو اقتصادی زندگی اور معاشرت تھی اس کی خاطرخواہ کیفیت پیش کرتے۔ تاہم ان کی کتابوں میں جستہ جستہ عبارتیں مل جاتی ہیں اور زیادہ تر ادبی ماخذوں سے ایسی معلومات حاصل ہوتی ہے کہ زمانۂ حاضرہ میں قدامت پسند ایشیائی مسلمانوں کی عام طرز ماند و بود دیکھ کر یہ ممکن ہے کہ ہم اس گذشتہ معاشرت کا خاکہ دوبارہ تیار کرلیں۔

خانگی زندگی

عبّاسی دور کے آغاز میں عورتوں کو اسی قدر آزادی میسر رہی جتنی کہ بنی اُمیّہ کے زمانے میں ان کی بہنوں کو حاصل تھی۔ بے شبہ دسویں صدی عیسوی کے اواخر میں جب کہ (ایرانی) خاندانِ بُویہ کا اقتدار ہوا، سخت پردے کا رواج اور مرد و عورت کے الگ الگ رہنے کا طریقہ عام ہوگیا تھا، لیکن زیر نظر (ابتدائی) عہد عبّاسیہ میں

---

[1] مبرّد صفحہ ۳۰۲

ہم اونچے طبقے کی خواتین کا حال پڑھتے ہیں کہ نام وری پاتی اور امور سلطنت پر اثر انداز ہوتی ہیں، جیسے مہدی کی بیوی ہارون کی ماں الخیزران۔ مہدی کی بیٹی عُلیّہ۔ ہارون الرشید کی بیوی اور الامین کی ماں زبیدہ اور مامون کی بیوی بوران۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ عرب بیویاں میدان جنگ میں جاتی اور فوجوں کو لڑاتی ہیں۔ شعر کہتی ہیں اور ادبی مشاغل میں مردوں سے مسابقت کرتی ہیں اور اپنے گانے اور موسیقی کے کمالات، نیز بذلہ سنجی سے محفلوں کی رونق بڑھاتی ہیں۔ چناں چہ ایک ایسی عورت عبیدہ طنبوریہ (= ڈھولکی بجانے والی) تھی جس نے معتصم کے عہد میں اپنے جمال اور سرود و ساز کی مہارت سے، سلطنت بھر میں شہرت حاصل کر لی تھی[1]۔

زوال کے زمانے میں، جو حرموں کی کثرت، صنفی اخلاق کے انحطاط اور عیاشیوں کی افراط سے مخصوص ہے، عورت کا مرتبہ گر گیا اور اُس ادنیٰ سطح تک آ گیا جس کی کیفیت الف لیلہ کے قصّوں سے منکشف ہوتی ہے کہ ان میں عورتوں کو چھل فریب، چھپی یاری اور ہر قسم کے ذلیل جذبات اور ناشائستہ خیالات کا مخزن دکھایا گیا ہے۔ ابو بکر خوارزمی نے (وفات تخ ۹۹۳ یا ۱۰۰۲ء) کہ سب سے پہلا مولف ہے جس کے ادبی مکاتیب کا مجموعہ ہمارے زمانے تک سلامت رہا، کسی دوست کو تعزیت کا عجیب و غریب خط[2] تحریر کیا اور یقین دلایا

[1] اغانی۔ ۱۹ ص۱۳۴ (مولف نے کمال کیا کہ بظاہر پیشہ ور عورتوں اور شریف خواتین میں کوئی فرق نہیں کرتا؟ مترجم)۔

[2] "رسائل" (قسطنطنیہ، ۱۲۹۷ھ) ص۳۰۔

تھا کہ "ہم ایسے زمانے میں رہیں کہ اگر آج کل ہم میں سے کوئی..... اپنی لڑکی [illegible] سے بیاہ دے تو بہترین داماد پا جاے گا"۔

334 ملت اسلامی میں شادی قریب قریب ہر جگہ ایک واجب الادا فریضہ سمجھی جاتی رہی جس سے غفلت کرنا سخت ملامت کے قابل ہوتا ہے۔ اور بچوں کی نعمت، خصوصاً بیٹے خدا کا فضل مانے جاتے ہیں بیوی کا پہلا فرض شوہر کی خدمت، بچّوں کی غور پرداخت اور گھر کے کام کرنا ہیں۔ خالی وقت سوت کاتنے، کپڑا بننے میں صرف ہوتا ہے۔

زیر نظر عہد کے زنانہ لباس میں خلیفہ ہارون کی علّاتی بہن عُلیّہ نے عورتوں کے سر کے لئے جو نئی وضع کی خُمار (= قبعہ) ایجاد کی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک نیم گردی ٹوپی تھی جس کے نیچے ایک حلقہ بنا ہوتا اور اس میں (ماتھے کے) زیور لٹکاے جاسکتے تھے۔ عورتوں کے سنگھار کے دوسرے لوازم میں پازیب (= خل خال) اور کنگھن (= اساور) مذکور ہیں۔

مردوں کے لباس میں اس وقت سے اب تک بہت کم تغیر ہوا ہے۔ سر کی پوشش عام طور سے اونچی باڑ کی سیاہ کُلاہ (= قلنسوہ) اون یا نمدے کی بنی ہوئی ہوتی تھی۔ پچھلے باب میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اسے خلیفہ منصور نے رواج دیا تھا۔ ڈھیلے پائنچوں کا پاجامہ (= سراویل)، قمیص، سینہ بند، کفتان اور اوپر پہننے کے لئے عبا یا جُبّہ[1]

---

[1] لفظ "جُبّہ" اسپین سے کسی نہ کسی طرح عربی میں پہنچ گیا۔ اندلس کے اواخر قرن دہم کی ایک لغت میں یہ موجود ہے۔ پھر عربی سے یورپ کی وسطی اور جدید السنہ میں آگیا تھا۔ انگریزی میں "جِبٹ" پھانسی کے معنوں میں اسی کی ایک عجیب یادگار ہے۔

بھلے آدمیوں کا بس یہی پورا لباس تھا۔[1] سراویل (یا شلوار) اصل میں ایرانی چیز تھی[2]۔ علما کے لئے ہارون الرشید کے نامور قاضی امام ابو یوسف[3] نے ہدایت کی تھی کہ سیاہ عمامہ اور خاص قسم کا لبادہ (= طیلسان)[4] پہنا کریں؛

زیر نظر (ابتدائی عباسی) عہد کی عاشقانہ شاعری سے اندازہ کیا جائے تو زنانہ حسن کے قدیم عربی معیار میں بظاہر کچھ زیادہ فرق نہیں آیا تھا۔ ال نویری نے اپنی ادبی قاموس علوم[4] کی ایک جلد کا اچھا خاصا حصہ ایسے اقتباسات کے وقف کیا ہے جن میں سراپا ہی کی کیفیتیں بیان کی گئی ہیں۔ عورت کا قد ایسا نکلتا ہوا ہونا چاہیئے جیسے درختوں میں "خیزران" یعنی (بانس کی) چھڑ نکلی ہوتی ہے۔ چہرہ بدر کامل کی طرح گول۔ بال، رات سے زیادہ سیاہ۔ رخسار، سرخ وسفید۔ اور ان پر تل یا مسا، بس جیسے مرمرین لوح پر عنبر کی بوند ہوتی ہے۔ آنکھ (کی پتلی) سرمہ لگائے بغیر گہری سیاہ اور چشم غزال جیسی بڑی پلکیں غنودہ اور بیمار (= عربی میں سقیم) دہانہ تنگ اور موتی جیسے دانت مرجان میں جڑے ہوئے۔ سینہ انار کی مثل ابھرا ہوا۔ سُرین

---

[1] شام ولبنان کے بڑے بوڑھے اب تک اسی وضع کا لباس پہنتے ہیں؛

[2] جاحظ: "بیان" ۳ ص۹ نیز اس کے اور کفتان کے لئے دیکھو دوزی: "لوم دے، ولیت مان"؛

[3] ابن خلکان۔ ۳ ص۳۳۴۔ ابن ابی اصیبعہ وغیرہ؛

[4] "نہایہ" ۲ ص۱۱ و مابعد۔ عورتوں کا بیان کرنے کے لئے عربی زبان میں الفاظ کے خزانے بھرے ہیں۔ ان کی ایک مثال ابن قیم ال جوزیہ کی کتاب "اخبار النسا" ہے (قاہرہ ۱۳۱۹ھ)

پھیلی ہوئی اور انگلیاں لمچھوئی جن کے اگلے پور دے مہندی سے سُرخ رنگے ہوں ؛

ان دنوں نشست کے لئے رفتہ رفتہ "دیوان" کا خوب رواج ہوگیا تھا یعنی کمرے کے تین پہلوؤں سے ملاکر گدہ دار پتلی چوکیاں لگا دیتے تھے۔ بنی اُمیّہ کے زمانے سے کرسیوں کی شکل میں اونچی نشست کا طریقہ چل گیا تھا لیکن زمین پر چوکور چٹائی کے ٹکڑے (= عربی "مطرح")، بچھاکر ان پر گدّے تکئے لگانا اور آرام سے آلتی پالتی مارکر بیٹھنا زیادہ پسند کیا جاتا تھا۔ دستی قالین فرش پر بچھائے جاتے تھے۔ کھانا چھوٹی میز پر پیتل کی گول کشتیوں میں لاتے اور میز دیوان یا گدّوں کے سامنے لگادی جاتی تھی۔ خوش حال گھرانوں میں کشتیاں چاندی کی اور چوبی میز، ہاتھی دانت، سیپی یا سینگی سے منبّت ہوتی تھی ؛ یہ لوگ جو پہلے (جاہلی زمانے میں) بچھو، بھونرے، اور نیولے تک کھا جاتے[۵۱] اور اسے بڑی نعمت سمجھتے تھے، جن کے خیال میں چاول زہریلی غذا تھی[۵۲] اور جو چپٹی روٹی سے لکھنے (کے کاغذ) کا کام لیا کرتے تھے[۵۳] اب ان کا کھانے پینے کا ذوق ہی کچھ اور ہوگیا تھا کہ مہذب دُنیا کی نفیس ترین غذائیں انھیں مطلوب و

---

۵۱ مقدمہ ابن خلدون ص۱۰۳ (مؤلف نے انگریزی میں دوسرا لفظ "بیٹل" لکھا ہے جس کے معنی بھونرا ہوتے ہیں، عربی ترجمے میں "خنافس" تحریر ہے۔ مترجم)

۵۲ ابن الفقیہ، ص۱۸۷ ؛

۵۳ ابن خلدون ص۱۴۲۔ ہماری کتاب کے تیرھویں باب میں بدوی عربوں کے گنوارپن کا ذکر آچکا ہے ؛

مرغوب تھیں جن میں ایران کا بامزہ شوربا "سکباج" اور پُر تکلف شیرنیاں "فالوذج" وغیرہ شامل ہیں۔ اب اُن کے کھانے کے چوزوں کو پستے بادام اور دودھ پلا کے موٹا کیا جاتا تھا۔ موسم گرما میں مکانات برف سے ٹھنڈے کئے جاتے تھے[۱] غیر مُسکر مشروبات طرح طرح کے شربتوں کی شکل میں پلائے جاتے تھے[۲] اُنھیں شکر اور پانی کے علاوہ موز، شہ توت اور بنفشہ و گلاب کے عرق ملاکر خوش بودار بناتے اور دوسرے مشروبات کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ قہوے نے پندرھویں صدی عیسوی تک رواج نہ پایا تھا[۳] اور تمباکو نئی دنیا کی دریافت ہونے تک نامعلوم تھا۔ ایک لوّیں دسویں صدی عیسوی کا مصنف اپنے عہد کے شریف اور باتہذیب (= "ظریف") آدمی کے آداب و مذاق کی کیفیت ہمارے لئے لکھ کر چھوڑ گیا ہے[۴] کہ وہ حُسنِ اخلاق، مروّت اور اعلیٰ درجے کے مجلسی آداب سے متصف ہوتا ہے۔ تمسخر سے پرہیز کرتا ہے۔ منتخب احباب ہی سے 37
صحبت رکھتا ہے۔ صداقت کے بلند معیاروں پر قائم ہوتا ہے۔ وعدہ پورا کرنے کا پابند، راز داری کا اہل ہے۔ بے داغ جبّے اور بے پیوند کا لباس پہنتا ہے۔ دسترخوان پر چھوٹے لقمے لیتا اور بہت کم ہنستا ہے۔ نوالہ

---

[۱] ابن ابی اُصیبعہ۔ ۱ صفحہ ۱۳۹ ۔ یہی مصنف ایک قدیم تر کتاب سے برف بنانے کا نسخہ نقل کرتا ہے جو "سخت گرمی کے مہینوں میں پانی کو منجمد کرسکتا تھا" صفحہ ۸۲ ؀

[۲] اسی عربی مادّے کے لفظ شراب سے انگریزی میں سی رپ بنا ہے ؀

[۳] قہوہ چودھویں صدی میں جنوبی عرب پہنچا اور چند ہی سال بعد مکّہ معظمہ میں گھر گھر رائج ہوگیا سولھویں صدی کے آغاز میں یمن سے اسے صوفیہ قاہرہ لائے جو نیند کم کرنے کے لئے اسے مسجد ازہر میں پیا کرتے تھے۔ قہوے کا ہم دوسرے باب میں ذکر کر آئے ہیں ؀

[۴] ال وشّا "کتاب الموشیٰ" (لائے ڈن ۱۸۸۶ء) ؀

آہستہ آہستہ چباتا ہے۔ انگلیاں نہیں چاٹتا۔ لہسن پیاز کھانے سے بچتا ہے۔ مجلس میں، طہارت خانے میں، بازاروں میں عام جلسوں میں خلال استعمال نہیں کرتا؛

دوستوں کی صحبت اور خلوت میں اکثر مسکرات کا استعمال ہونے لگا تھا۔ اغانی اور الف لیلہ جیسی کتابوں میں ناونوش کے جس کثرت سے قصے لکھے ہیں اور اوباش ابونواس، (متوفی تخ سنہ ۸۱۰ء) یک روزہ خلیفہ، ابن المعتز (وفات سنہ ۹۰۸ء) اور دوسرے شعرا کے صدہا اشعار وغزلیات جن میں شراب کے گیت گائے گئے ہیں (اور خمریات موسوم ہیں) ان سب کے دیکھنے سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ امتناع مسکرات جو دین اسلام کے نمایاں قوانین میں داخل ہے، زیرنظر زمانے میں اس سے زیادہ کارگر نہ تھی جتنی کہ حال میں ولایات متحدہ کی د- بندش جس کے لئے وہاں کے آئین حکومت میں اٹھارویں ترمیم منظور کی گئی تھی۔ خلفا، وزرا، امرا اور قاضی تک مذہبی قدغن کی پروا نہ کرتے تھے[۱] ان صحبتوں میں شرکت کے لئے اہل علم، شعرا، مطرب گویے خاص طور پر پسند کئے جاتے تھے۔ یہ رسم ایرانیوں سے آئی تھی[۲] مگر عباسیوں کے ابتدائی دور میں اتنی عام ہوگئی تھی کہ ہارون الرشید ہی کے عہد میں پیشہ ور مصاحب وندیم پیدا ہونے لگے تھے۔ اس خلیفہ کے علاوہ، ہادی، امین، معتصم، واثق اور متوکل شغل کرتے تھے۔ منصور اور مہتدی محترز تھے۔ وہ تمام امیر و وزیر و

---

[۱] نویری: "نہایہ" ۴ صفحہ ۹۲؛

[۲] جاحظ: "تاج" صفحہ ۲۳۔ نواجی: "حلبہ" صفحہ ۲۲؛

دبیر جنھیں آب حرام کا چسکا تھا تعداد میں اتنے تھے کہ غریب نواجی اپنی کتاب میں سب کے لئے جگہ نکالنے سے مایوس ہی[1] کھجور کی شراب' خمر زیادہ مقبول تھی۔ ابن خلدون حجت کرتا ہی کہ ہارون اور مامون جیسے لوگ صرف نبیذ پیتے تھے[2] جو انگور، کشمش یا خرما کو پانی میں بھگو کر بنائی جاتی تھی اور اس میں خفیف سا خمیر اٹھ آتا تھا۔ یہ مشروب کم سے کم فقہائے اسلامی کے ایک گروہ یعنی احناف میں خاص شرائط کے ساتھ جائز کر دی گئی تھی[3]۔

ایسی رنگ رلیاں جن میں "بنت عنب" اور گانے بجانے کا خاص حصہ ہوتا، بارہا جما کرتی تھیں۔[4] ان جلسوں میں مہمان و میزبان اپنی ڈاڑھیاں مشک یا گلاب سے معطر کرتے اور تکلف کے رنگین کپڑے پہن کر (جنھیں ثیاب المنادمہ، یعنی یاران مجلس کا لباس کہا جاتا تھا) شریک بزم ہوتے تھے۔ عطریات چھڑک کر یا مجمروں میں بخور جلا کر کمرہ خوش بودار بنایا جاتا۔ گانے والیاں جو محفل میں بلائی جاتیں، عموماً بدچلن لونڈیاں ہوتی تھیں جیسا کہ اکثر حکایات سے ظاہر ہوتا ہی[5] اور یہ نوجوانوں کا اخلاق تباہ کرنے کے اعتبار سے بلائے عظیم بن گئی تھیں[6]۔ عہد منصور

---

[1] ص ۹۹۔ [2] مقدمہ ص ۱۶۱۔ قرآن مجید میں ممنوع شراب کے لئے خمر کا لفظ آیا ہی۔ لوگ تاویل کرتے تھے کہ چوں کہ رسول اللہ صلعم کے وقت میں مدینے میں صرف کھجور کی شراب ہوتی تھی لہذا شراب انگور پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا وغیرہ۔ دیکھو عقد۔ ۳۰۔ ص ۴۰۵ (خمر ہر قسم کی نشہ لانے والی شراب بلکہ جملہ مسکرات پر حاوی ہی۔ لائق مؤلف کا جانتے بوجھتے ایسا حاشیہ چڑھانا قابل حیرت ہی۔ مترجم)

[3] (مؤلف نے مشکوٰۃ وغیرہ کے حوالے سے لکھا ہی کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی نبیذ پی ہی۔ لیکن اسے سکر و تخمیر سے کیا تعلق ہی؟ مترجم) [4] نواجی ص ۳۱۔

[5] اغانی۔ ۹ ص ۹۵ وغیرہ۔ [6] وشا۔ ص ۹۲۔

میں کوفے کے ایک طرب خانے کی کیفیت پڑھ کر آج کل کے کسی "کیفے شان تان" (= فرانسیسی چکلہ) کا نقشہ یاد آ جاتا ہے جہاں کی خاص رنڈی سلمہ ال زرقا (= کبود چشم) تھی[1] یہود و نصاریٰ کو شراب فروشی کی اجازت تھی اور وہ چوری سے پلانے کا کام کرتے تھے۔ عام مسلمان مسیحی خانقاہوں اور زیادہ تر یہودیوں کے شراب خانوں کے وسیلے سے یہ شوق پورا کر لیتے تھے۔

حمّام

پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی یہ حدیث کہ "النظافت من الایمان" (= پاکیزگی ایمان کا جز ہے) آج بھی اسلامی ملکوں میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ آں حضرت (صلعم) سے پہلے جہاں تک ہمیں معلوم ہے، ملک عرب میں کوئی حمام نہ تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ (صلعم) سوائے طہارت و غسل کے، اور وہ بھی لنگی باندھ کر، حمام (خانوں) کو پسند نہ فرماتے تھے لیکن جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اُن دنوں عام حمام نہایت مقبول ہو گئے تھے۔ اور اُن سے صرف شرعی غسل و وضو اور طبی فوائد ہی کا کام نہ لیا جاتا تھا بلکہ وہ تفنن اور خاص عیش عشرت کی جگہ بن گئے تھے۔ عورتوں کے حماموں سے کام لینے کے خاص دن مقرر ہوتے تھے خطیب کی روایت کے مطابق ال مقتدر کے عہد (۹۰۸ تا ۹۳۲ ء) میں بغداد کے عام حماموں کا شمار ستائیس ہزار اور بعد میں ساٹھ ہزار تک پہنچ گیا تھا[2] عربی

[1] اغانی۔ ۱۳ ص ۱۲۸ نیز دیکھو ثریری ۵۔ ص ۴۲ ؛ [2] تاریخ ۱۔ ص ۱۱۷ و مابعد ؛

کتابوں کے اکثر اعداد کی طرح یہ تعداد بھی بہت مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ یعقوبی نے بغداد آباد ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد کی تعداد دس ہزار بتائی ہے[۱] مراکشی سیاح ابن بطوطہ ۱۳۲۷ء میں بغداد آیا تو اس کے مغربی حصے کے تیرہ محلے دیکھے کہ ہر محلے میں دو یا تین بہت وسیع حمام بنے ہوئے تھے، جن میں گرم و سرد آب جاری کا انتظام تھا[۲]

آج کل کی طرح اُن دنوں بھی حمام کے کئی کمرے، اُن میں رنگین میناکاری چوکوں کے فرش اور اندر کی دیواریں سنگ مرمر کی ہوتی تھیں بالکل وسط میں ایک بڑا ایوان ہوتا اور اس پر گنبد بناکر چینی کے گول چھوٹے چھوٹے بہت سے روزن چینی سے تیار کرتے تھے کہ اندر روشنی آتی رہے۔ بیچ میں پانی کا حوض گرم کیا جاتا اور اسی کی بھاپ اور گرمی سے حمام گرم رہتا تھا۔ گرد کے کمروں سے نشست و استراحت اور وہاں مشروبات و فواکہ کھانے پینے کا کام لیتے تھے۔

تفریحات

کھیل کود کے جلسے بھی فنونِ لطیفہ کی طرح انڈو یورپی قوموں کے تمدن کا جزو رہے ہیں۔ سامی تمدن میں بروے تاریخ ان کا حصہ نہ تھا۔ ان کھیلوں میں جسمانی محنت مشقت کی خاطر بھاگ دوڑ کی جاتی ہے اور یہ بات اہل عرب کے افادیت پسند مزاج اور ملک کے

---

[۱] "بلدان" صفحہ ۲۵۰۔

[۲] جلد ۲ صفحہ ۱۰۵۔

گرم موسم دونوں سے کوئی خاص مناسبت نہ رکھتی تھی ؛

خلافت عباسیہ کے دور میں بعض "والانی" بازیاں خاصی مقبول ہوگئی تھیں۔ اموی خلافت میں مکے کے ایک تفریح خانے کا ذکر جس میں چوسر، شطرنج وغیرہ کا انتظام تھا، پچھلے اوراق میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ عباسیوں میں اکثر دوسری جدتوں کی طرح شطرنج کھیلنے اور اُسے رواج دینے کا انتساب بھی ہارون الرشید سے کرتے ہیں[۵۱] شطرنج کا کھیل اصل میں تو ہندستان سے آیا تھا[۵۲] لیکن بغداد میں بہت جلد بہت پسندیدہ شغل بن گیا اور امیر اُمرا کے گھروں میں اُس نے پانسے کی چوسر کی جگہ لے لی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ ہارون الرشید نے شارلیمین کو جو تحفے بھیجے ان میں شطرنج کی بساط اور مہرے بھی تھے۔ محاربات صلیبیہ میں بھی یہی شطرنج کا تحفہ شاہ لوئی کو اسماعیلی امام ("شیخ الجبال") نے ارسال کیا تھا۔ ایک اور کھیل جو گھروں میں کھیلا جاتا تھا، نرد (= بیک گیمن، ولایتی چوسر) تھا۔ اس کی اصل بھی ہندستان کی بتاتے ہیں[۵۳]

میدانی کھیلوں کی فہرست میں تیر اندازی، چوگان[۵۴] (تعریب "چوکان") گیند کے کھیل (خصوصاً صولجان، ایک قسم کی ہاکی) تلوار کی پھنکیتی، نیزہ اندازی (= جرید) اسپ دوانی اور سب سے بڑھ کر

---

۵۱ مسعودی - ۸ ص ۲۹۶ ؛ ۵۲ " - ۱ ص ۱۵۹ ؛

۵۳ مسعودی - ص ۱۵۷ ؛

۵۴ فارسی لفظ کے معنی مُڑی لکڑی کے ہیں۔ یورپ میں بعض مقامات پر لکڑی کے ڈنڈے اور چوبی گیند سے کھیلتے تھے اور اسے "چگانہ" کہتے تھے۔ ممکن ہو یہ چوگان ہی سے بنا ہو ؛

صید و شکار داخل تھے[۵۱]۔ ملوک و امرا کے ندیموں کے لئے جاحظ نے جو ضروری اوصاف بیان کئے ہیں[۵۲]، وہ تیر اندازی، شکار، گیند اور شطرنج کھیلنا تھے کہ ان سب میں ندیم آقا کو ناراض کئے بغیر اس کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ خلفا میں چوگان کا شوق معتصم کو سب سے زیادہ رہا۔ اسی کے ترک سپہ سالار افشین نے مقابلے میں کھیلنے سے یہ کہہ کر انکار کردیا تھا کہ مجھے کھیل میں بھی امیر المومنین کا مخالف ہونا منظور نہیں[۵۲]۔ گیند کے ایک اور کھیل کا بارہا ذکر آتا ہے جس میں لکڑی کے چوڑے تختے (= طب طاب) سے کام لیتے تھے[۵۳]۔ ممکن ہے کہ یہ ٹینس کی ابتدائی صورت ہو[۵۴]۔ مورخ مسعودی نے رقہ کے گھڑ دوڑ کی ایک جگہ کیفیت تحریر کی ہے[۵۵] جس میں ہارون الرشید کا گھوڑا 340 بازی جیتا اور خلیفہ جو خود موجود تھا، بے حد خوش ہوا تھا۔ عقد میں[۵۶] ہم کئی نظمیں جیتنے والے گھوڑوں کی تعریف و توصیف میں مطالعہ کرتے ہیں۔ اسی ماخذ میں لکھا ہے کہ ان موقعوں پر شرطیں بھی بدی جاتی تھیں جن سے لوگوں میں جوش خروش بڑھ جاتا تھا۔

اموی دور کی طرح عباسی دور میں بھی خلفا اور شہزادوں کی سب سے دل پسند میدانی تفریح، شکار تھا۔ الامین خصوصیت سے

---

[۵۱] "تاج" ص۷۲ مزید صفات کے متعلق دیکھو نواجی ص۲۵۔

[۵۲] ابن العباس "آثار الاول" ص۱۳۰۔

[۵۳] ایضاً۔ نیز مسعودی، ۸ ص۲۹۶۔

[۵۴] "ٹینس" جسے فرانسیسی لفظ "تینے" سے مشتق سمجھتے ہیں، غالباً مصری شہر تنیس سے آیا ہے جو قرون وسطیٰ میں ململ کی صنعت میں مشہور تھا۔

[۵۵] ۲ ص۳۴۸۔ [۵۶] ۱ ص۶۳۔

شیر ببر کے شکار کا شوقین تھا[1] اور اس کا ایک بھائی جنگلی سوروں کا پیچھا کرنے میں اپنی جان ہی کھو بیٹھا[2] ابو مسلم خراسانی اور خلیفہ معتصم چیتے سے شکار کھیلنا بہت پسند کرتے تھے۔ قدیم عربی کتابوں کی تعداد کثیر جو شکار کھیلنے، پھاندنے اور شکاری پرندے سدھانے پر لکھی گئیں، گواہ ہیں کہ لوگوں میں ان بازیوں کا کس قدر شوق تھا۔

[3] باز اور شکرے سے شکار کا مذاق ایران سے عرب میں آیا تھا جیسا کہ ان کے متعلق عربی اصطلاحوں سے پتہ چلتا ہے۔ یہ شوق بالخصوص خلافت کے آخری ایام اور حروب صلیبیہ کے زمانے میں بہت ترقی کر گیا تھا۔ باز اور باشق (= شکرے) سے آج کل بھی ایران، عراق، شام کے علوی خطے اور دیر الزور میں قریب قریب اسی طرح شکار کھیلا جاتا ہے جیسا کہ الف لیلہ کے قصوں میں مذکور ہے۔ ہرن چیتل، خرگوش، مرغابی، جنگلی بط اور قطا (= ایک قسم کا جنگلی مرغ) کے شکار میں باز اور شکرے سے کام لیتے تھے اور کتوں سے درندوں کا شکار کھیلنے میں بھی یہ پرندے مدد دیتے تھے۔ مسلمان شکاری سب سے پہلے شکار کو جو ہاتھ آئے حلال کرنے کی فکر کرتے ہیں ورنہ (مُردہ کا) گوشت حرام ہو جاتا ہے[4]۔ اکثر موقعوں پر شکاریوں کی جماعت اس مقام کے

---

[1] مسعودی۔ ۶ ص ۴۳۲۔

[2] اغانی۔ ۹ ص ۹۷۔

[3] دیکھو فہرست۔ ص ۳۱۵۔ ابن خلکان نے ان موضوعات پر متعدد عربی کتابوں کے نام تحریر کئے ہیں ۲ ص ۱۴۳۔ ۳ ص ۲۰۹۔ ان میں ایک قدیم ترین رسالہ "کتاب الاعتبار" ہے (پرنسٹن ۱۹۳۰ء) نیز دیکھو مؤلف کی کتاب: "دی اینِ ایرب ..... وارئیر" (نیو یارک ۱۹۲۹ء)۔

[4] یہ احکام سورہ بقر، الانعام اور النحل میں آئے ہیں۔

کثرت سے ملنے کی امید ہو، حلقہ بنالیتی اور گھیرا ڈالے رکھتی۔ ایک قوسی شکل کا احاطہ تعمیر کرایا تھا جس کے دونوں سرے دجلہ پر ختم ہوتے تھے۔ ہانکا دینے والے شکار کو اس احاطے میں گھیر لانے کہ پھر وہ دیواروں اور دریا میں گھرا رہ جاتا تھا۔[۱] 341
آخری عباسی خلیفہ مستعصم اور سلجوق بادشاہ بھی اس ترکیب سے شکار کھیلتے تھے[۲]۔ آخری خلفا میں المستنجد (۱۱۷۰-۱۱۶۰) نے شکاریوں کی کئی جماعتیں تیار کی تھیں؛ بعض خلفا اور ملوک شیر اور ببر اپنے درباروں میں اس غرض سے رکھا کرتے تھے کہ ان کی رعایا اور ملاقاتیوں پر ہیبت طاری ہو جائے[۳]۔ بعض کو کتے اور بندر پالنے کا شوق تھا۔ مگر المقتدر کے وزیر کا ایک بیٹا سانپ، بچھو اور اسی قسم کے زہریلے جانور جمع کرنے کا شیدائی تھا جنھیں اپنے محل کے قریب ایک عمارت میں رکھتا اور ان کی غور پرداخت کرتا تھا[۴]؛

غلام

معاشرت کے نقشے میں سرفہرست خلیفہ، اس کا خاندان، بڑے بڑے عہدہ دار، قبیلہ بنی ہاشم کے افراد، پھر ان گروہوں کے متوسلین آتے تھے اور اسی آخری قسم میں ہم شاہی فوج اور عام لشکر کے سپاہیوں، یار دوستوں اور ندیموں، نیز موالی اور ملازمین کو شامل کر سکتے ہیں۔ ملازمین بیشتر غلام ہوتے تھے کہ غیر مسلم اقوام سے جنگ

---

[۱] "فخری" صـ۴۳؛ [۲] "آثار الاول" صـ۱۳۵؛
[۳] عقد، ۱ صـ۱۹۰۔ فخری، صـ۳۰؛ [۴] قطبی - ۱ صـ۱۳۴؛

وجہاد میں گرفتار کرکے یا زمانۂ امن میں بذریعہ خریداری فراہم
تھے۔ ان میں حبشی، ترک اور فرنگی قوموں کے بھی افراد تھے
یونانی، اسلافی لوگ ہوتے اور بربر و ارمن کا شمار بھی گورے رنگ
کے غلاموں میں کیا جاتا تھا۔ بعض غلام خواجہ سرا (= خصیان) حرم سرا
کے لئے رکھے جاتے اور ایک گروہ، جو ممکن ہے خواجہ سرا بھی ہوں،
غلمان کہلاتا تھا۔ ان پر آقا خاص مہربانی کرتے اور یہ زرق برق
وردیوں میں ملبوس ہوتے بلکہ اکثر زنانہ طرز پر جسم کو خوب صورت بناتے
اور عطر لگاتے تھے۔ ہارون الرشید کے عہد میں بھی غلمان کا نام آتا ہے[1]
لیکن بظاہر یہ الامین تھا جس نے ایرانیوں کی تقلید میں پہلی دفعہ
عربی دنیا کو غلمان سے روشناس کیا جن سے خلاف وضع فطری کام
لیا جاتا تھا[2]۔ المامون کے عہد میں ایک حاکم عدالت کے ہاں ایسے
چارسو امرد ملازمت میں تھے[3]۔ ابو نواس جیسے شاعر سرِ جلسہ اپنے
غیر فطری جذبات کا اظہار اور ان سادہ رو لونڈوں سے عشق بازی
کے اشعار سنانے میں شرم نہ کرتے تھے۔

کنیز جوان لونڈیوں سے، حرم بنانے کے علاوہ، گانے ناچنے کا کام
بھی لیا جاتا تھا۔ ان میں سے بعض خلفا کی کنیزیں خاصی صاحب اثر
ہوگئی تھیں۔ انہی میں ایک ذات الخال (= تل والی) تھی جسے
ہارون الرشید نے ستر ہزار درہم میں خریدا اور پھر بدگمانی کے جوش 342

---

[1] طبری۔ ۳ ص ۶۶۹۔ اسی کو ابن الاثیر نے نقل کیا ہے۔

[2] " " "

[3] مسعودی، ص ۴۷۔

میں کسی نوکر کو بخش دیا تھا۔ جب تک وہ اس کی خدمت میں رہی بادشاہ نے قسم کھائی تھی کہ ہفتے کے ایک مقررہ دن میں جو وہ فرمائش کرے گی اُسے پورا کیا جائے گا۔ چناں چہ اس نے سات برس کے لئے اپنے شوہر کو فارس کا والی مقرر کرالیا[۵۱] ایک اور مغنیہ سے پیچھا چھڑانے کے لیے خلیفہ کی بیوی زبیدہ خاتون کو دس چھوکریاں معاوضے میں پیش کرنی پڑیں جن میں سے ایک المامون اور دوسری المعتصم کی ماں بنی[۵۲] الف لیلہ میں ایک صاحب جمال و کمال کنیز تودد کی حکایت بیان کی گئی ہے (یہ افسانہ ۴۳۶ ویں سے ۴۶۲ ویں رات تک سنایا جاتا ہے) کہ علم طب، ہیئت، فقہ، فلسفہ، ریاضیات اور موسیقی کے نامی اُستادوں نے ا[illegible] کا ان علوم میں بڑی جرح قدح کے ساتھ امتحان لیا وہ ان سب میں [illegible]ی پوری اُتری کہ باید و شاید۔ دوسرے علوم کا تو ذکر ہی کیا ہے جیسے معنی و بیان، صرف و نحو، شاعری، تاریخ اور قرآنِ مجید کہ ان سے وہ عمدہ واقفیت رکھتی تھی۔ اسی کو دیکھ کر ہارون الرشید اُسے ایک لاکھ دینار میں خریدنے پر آمادہ ہو گیا تھا۔ یہ کہانی اس بات کی مثال ہے کہ بعض کنیزیں کیسی اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ ہوتی ہوں گی۔ ال امین کی ایک اور جدت یہ تھی کہ کنیزوں کی فوج تیار کرنے میں ساعی ہوا جن کے بال کٹوا کر لڑکوں کا لباس اور سر پہ عمامے بندھوائے جاتے تھے۔ یہ بدعت بہت جلد عوام و خواص دونوں طبقوں میں مقبول ہو گئی[۵۳] ایک عینی شاہد کا بیان ہے کہ میں ایک بار

---

۵۱ اغانی۔ ۱۵۔ ص۸۰ ۔ ۵۲ اغانی۔ ۱۶۔ ص۱۳۷ ۔

۵۳ مسعودی۔ ۸۔ ص۲۹۹ ۔

عیدِ فصح (یعنی ایسٹر کے انوار) کے دن مامون کی خدمت میں گیا تو دیکھا کہ بیس یونانی چھوکریاں بناؤ سنگھار کیے، زر زیور سے آراستہ سامنے رقص کر رہی ہیں۔ ان کے گلوں میں سونے کی صلیبیں اور ہاتھوں میں زیتون کی شاخیں اور کھجور کے پتے تھے۔ ناچنے والیوں میں تین ہزار دینار کی تقسیم پر یہ تماشا ختم ہوا[1]۔

غلاموں کی کثرت کا ایک اندازہ اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ خلیفہ کی حرم سرا میں لونڈی غلاموں کے جو شمار بتائے گئے ہیں ان پر ایک نظر ڈالی جائے۔ مثلاً ہم سے بیان کیا گیا ہے کہ المقتدر (۹۰۸ — ۹۳۲ ء) کے محل میں یونانی اور سوڈانی خواجہ سرا گیارہ ہزار رہتے تھے[2]۔ ایک روایت کی رو سے المتوکل کی حرموں کی تعداد جو اس کے تصرف میں آئیں چار ہزار تھی[3]۔ اسی خلیفہ کو اس کے ایک سپہ سالار نے دو سو غلام تحفہ بھیجے تھے[4]۔ معمول تھا کہ سپہ سالار اور والی خلیفہ یا وزیر سلطنت کی خدمت میں تحائف بھیجیں جن میں رعایا کی لڑکیاں بھی ہوتیں یا جبراً فراہم کی جاتی تھیں[5]۔ تحائف نہ بھیجنا سرکشی کی علامت خیال کیا جاتا تھا۔ المامون نے ایک تدبیر یہ سوچی تھی کہ جن لوگوں پر اسے شبہ تھا، انھیں اپنے معتمد علیہ غلام تحفۃً دے دیتا تھا کہ وہ جاسوسی کا کام کریں اور اگر ضرورت ہو تو ان مشتبہ اشخاص کا کام تمام کر دیں[6]۔

۱۔ اغانی۔ ۱۹ ص ۱۳۸ (اس عیسائی تہوار میں اسی طرح کا ناچ ہوتا ہے۔ مترجم)

۲۔ فخری۔ ص ۳۵۲۔ ۳۔ مسعودی۔ ۷، ص ۲۷۶۔ ۴۔ ایضاً۔

۵۔ طبری۔ ۳ ص ۱۲۷۔ جسے ابن الاثیر نے بھی نقل کیا ہے۔ ۶۔ عقد۔ ۱ ص ۱۹۶۔

معاشی حالت ۔ تجارت

عام لوگوں میں ایک بالائی طبقہ معاشی اعتبار سے امیروں کے درجے کے قریب پہنچتا تھا۔ اس میں اہل علم، اہل قلم، شعرا، اہل فن، سوداگر، کاری گر، مختلف پیشہ ور داخل ہیں۔ ان سے نیچے کے طبقے میں عوام الناس، مزدور، کاشت کار، گلہ بان اور دیہاتیوں پر مشتمل تھے۔ یہ اصل ملکی آبادی تھی جنھیں ذمیوں کا درجہ دیا گیا تھا۔ اہل علم اور دماغی کام کرنے والوں کا حال ہم تفصیل سے آیندہ باب[۱] میں بیان کریں گے۔ یہاں اسی قدر لکھنا کافی ہے کہ عباسیوں کے عہد اقتدار میں لوگوں کی عام تہذیبی حالت کسی طرح پست نہ تھی۔

سلطنت کی وسعت اور تمدن کی نمایاں ترقی ہی کا لازمہ تھا کہ ملک میں وسیع پیمانے پر بین الاقوامی تجارت کو فروغ ہوا شروع شروع میں بیش تر تاجر یہودی[۲]، مسیحی اور مجوسی تھے لیکن آگے چل کر مسلمانوں اور عربوں نے ان کی جگہ لی اور تجارت کی دنیا میں چھا گئے کیوں کہ وہ (عرب) تجارت کو ایسی حقارت سے نہ دیکھتے تھے جیسے کاشت کاری کو پھر زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ بغداد، بصرہ، سیراف[۳]، قاہرہ اور سکندریہ جیسی بندرگاہیں بری اور بحری تجارت کا نہایت بارونق مرکز بن گئیں۔

۵[۱] (یعنی اردو ترجمے کی دوسری جلد میں۔ مترجم)

۵[۲] دیکھو ابن خردادبہ۔ ص ۱۵۳۔

۵[۳] سیراف خلیج فارس پر ایران کے علاقے میں واقع تھا اور سیراف و عمان کے لوگ عباسی خلافت کے ابتدائی دور میں جہازرانی میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ (دیکھو مسعودی۔ ۱ ص ۲۸۱)۔

سمت مشرق کی طرف مسلمان تُجّار ممالک چین تک جا پہنچتے تھے۔ عربی روایات کے مطابق عبّاسیوں کے دوسرے خلیفہ ال منصور ہی کے عہد میں عرب تاجر بصرے سے چین جانے لگے تھے[۵۱]۔ تیسری صدی ہجری کے[۵۲] مشہور سوداگر سلیمان اور دوسرے مسلمان تاجروں کے بحری اسفار کی کتاب ہمارا سب سے قدیم ماخذ ہی جس سے عرب و ایران کے ہند و چین سے بحری روابط کا حال معلوم ہوتا ہی۔ چین کا ممالک مغرب کو سب سے پہلا اعلیٰ درجے کا تحفہ وہاں کا نفیس ریشم تھا۔ اسی لیے بحری تجارت کی بنا پڑی ورنہ اس کی برآمد ابتدا میں "ریشم کی بڑی شاہ راہ[۵۳]" کے ذریعے ہوتی تھی جو سمرقند اور چینی ترکستان سے گزرتی ہی۔ آج کل یہ راستہ متمدن قوموں نے چلنا ایسا چھوڑا ہی کہ شاید آباد دنیا کی کوئی شاہ راہ اس قدر کم آباد نہ رہی ہوگی۔ اُس وقت بھی تجارتی سامان عموماً کئی قافلوں اور مرحلوں میں منتقل ہو کر چلتا تھا۔ کوئی کارواں مشکل سے پورا فاصلہ خود طے کرتا۔ بایں ہمہ یہ یقینی ہی کہ عرب تاجروں کی آمد و رفت سے قبل ہی چین کے (عربوں سے) سفارتی تعلقات
344 قائم ہو گئے تھے۔ ایک افسانہ مشہور ہی کہ خود پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) نے فاتح ایران حضرت سعدؓ ابن وقّاص کو سفیر بنا کے چین بھیجا تھا۔ چنانچہ حضرت سعدؓ کی "قبر" آج بھی کینٹن میں زیارت گاہ

---

[۵۱] بردم بال: "اسلام اِن چائنا" (لندن ۱۹۱۰ء) ص۸ (حال میں بدرالدین صاحب چینی نے "چین و عرب کے تعلقات" پر جو اُردو کتاب لکھی اور انجمن ترقی اُردو نے شائع کی ہی، اس موضوع پر عمدہ معلومات بہم پہنچاتی ہی۔ مترجم)۔

[۵۲] "سلسلۃ التواریخ" (پیرس ۱۸۱۱ء)۔

[۵۳] کارٹر: دی ان وین شن ..... (نیو یارک ۱۹۲۵ء)

ہوئی ہے۔ قدیم چینی عمارتوں پر بہت سے کتبے لگے ہوئے ہیں جن میں اسلام اور چین کے تعلقات کا ذکر ہے۔ یہ محض مذہبی مشیخت کی بنا پر جعلی بنائے گئے ہیں[1] آٹھویں صدی عیسوی کے وسط تک کئی سفارتیں بغداد اور چین کے درمیان ضرور آئی گئیں لیکن ٹھیک معلوم نہیں کہ ارکان سفارت نے بحری راستے سے سفر کیا یا بری۔ اس صدی کی چینی تحریروں میں لفظ امیرالمومنین کو "ہن می مومونی" لکھا ہے۔ ابوالعباس (پہلے عباسی خلیفہ) کا نام "اے بولوبا" اور ہارون، "الون" کی شکل میں مرقوم ہے۔ ان خلفا کے عہد میں متعدد مسلمان چین میں آبسے تھے۔ شروع شروع میں ان کو "تاشیہ" کہا گیا ہے[2] اور آگے چل کر "ہوئی، ہوئی" (یعنی مسلم) کا نام دیا ہے[3] سب سے پہلا یورپی جس نے چین میں عربوں کے ہونے کا ذکر کیا، مارکو پولو معلوم ہوتا ہے[4]۔

مغرب کی طرف مسلمان تاجر مراکش و اندلس تک جایا کرتے تھے۔ (فرانس کے انجینیر) ڈلیسیپ نے گزشتہ صدی میں نہر سویز بنائی۔ اس سے ایک ہزار سال قبل ہارون کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہوا تھا[5] لیکن بحر متوسط میں عربوں کی تجارت نے کبھی زیادہ فروغ

---

[1] دیکھو "ژورنال ایشیاتیک" (۱۹۱۳ء) ۲ ص ۱۷۷۔

[2] پہلوی "تاجیک" موجودہ "تازی" بہ معنی عرب سے۔

[3] دیکھو ہیسن: "جورنل اوف دی نارتھ چائنا برانچ اوف دی رایل ایشیاٹک سوسائٹی" (۱۹۲۹ء) ۶۰ ص ۴۲۔

[4] مسلمانوں کی کوریا میں آبادکاری کے متعلق، (جسے عرب "ال شیلا" کہتے تھے) دیکھو ابن خردادبہ۔ ص ۱۷۰۔

[5] مسعودی۔ ۴ ص ۹۸۔

نہیں پایا) اسی طرح بحر اسود نے اس کا کوئی خیر مقدم نہیں کیا اگرچہ
شمال میں دریائے والگا کے علاقے والوں سے دسویں صدی عیسوی
میں ہم تجارت کی خوب گرم بازاری دیکھتے ہیں)۔ اسی طرح بحیرہ خزر
سے ایرانی شہر، اور دوسری طرف سمرقند و بخارا کے خوش حال و بارونق
شہر مع اپنے مضافات کے قریب واقع ہوئے تھے، لہٰذا یہ بحیرہ بھی
تجارتی آمدرفت کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔ مسلمان سوداگر عربی علاقوں
سے کھجور، شکر، سوتی اور اونی پارچہ، فولاد کے اوزار اور شیشے کے ظروف
لے کر جاتے تھے اور بیرونی ملکوں میں مشرق اقصیٰ سے مصالحے، کافور
ریشم، استعمالی اشیا وغیرہ لاتے اور افریقہ سے ہاتھی دانت، آبنوس،
اور حبشی غلاموں کی درآمد کرتے تھے۔

اس زمانے کے روتھ چائلڈ اور روک فیلو (یعنی کروڑپتی سرمایہ
داروں) کی وکالت کا اندازہ بغداد کے جوہری ابن ال حصّاص کی
مثال سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ ال مقتدر نے اس کے مال متاع میں سے
۱۶ کرور دینار (طلائی) ضبط کر لئے پھر بھی وہ دولت مند رہا اور
جواہر فروشوں کے ایک نامی گرامی خاندان کا مورث اعلیٰ ہوا[1]۔ بصرے
کے بعض تاجروں کی آمدنی دس لاکھ درہم سالانہ سے زیادہ تھی۔ ان کے
تجارتی جہاز دنیا کے دور دراز ملکوں میں آتے جاتے تھے۔ بصرے کا
345 ایک جاہل خراس والا اتنا متمول ہو سکتا تھا کہ سو دینار روزانہ فقیروں
میں تقسیم کر دے اور آگے چل کر خلیفہ معتصم کا وزیر مقرر کیا جائے[2]۔
سیراف کے شہر میں متوسط درجے کے تاجر کا مکان دس ہزار دینار سے

۱؎ قفطی۔ ا صـ۱۱۱؛ ۲؎ فخری" صـ۳۴۱؛

زیادہ قیمت کا ہوتا تھا۔ بعض مکان تیس ہزار دینار کے تھے۔ اور ایسے بحری تاجروں کی بڑی تعداد موجود تھی جن میں سے ہر ایک چالیس لاکھ دینار کی حیثیت رکھتا تھا[۵۱]۔ ان سیرافی تاجروں میں بعض بعض ساری زندگی "پانی پر بسر کرتے تھے" اور اصطخری نے ایک شخص کا حال سنا کہ وہ چالیس برس تختہ جہاز پر گزار چکا تھا[۵۲]۔

صنعت وحرفت

تجارت کی سرگرمیاں اتنے وسیع پیمانے پر جاری نہ رہ سکتی تھیں جب تک کہ ملک میں زراعت اور صنعت وحرفت اسی نسبت سے ترقی نہ کریں اور تجارت کی پشت بان نہ ہوں۔ سلطنت کے مختلف اقطاع میں دستکاری نے خوب فروغ پایا۔ مغربی ایشیا میں اس کے بڑے شعبے قالین، پردے، ریشم، سوتی اور اونی کپڑا، اطلس و دیبا (زربفت) کرسیوں[۵۳] کے گدّوں اور تکیوں کے غلاف کی صنعت بن گئے تھے۔ فرش فروش، اسبابِ خانہ داری اور کھانے پکانے کے ظروف بھی کثرت سے بنتے تھے۔ ایران وعراق کے صدہا کارخانے خاص خاص نشان ڈال کر قالین اور پارچہ تیار کرتے اور صنعت کے اعلیٰ معیار کو قائم رکھتے تھے۔ خلیفہ المستعین نے ایک قالین خاص فرمائش سے بنوایا جس پر تیرہ کروڑ درہم لاگت آئی کہ اس میں طرح طرح

۵۱ اصطخری - ص۱۲۷ - [illegible] قل - ص۱۹۵ - مقدسی - ص۴۲۶۔

۵۲ ص۱۳۸۔

۵۳ گدّے والی تکلف کی کرسی "صُفّہ" کہلاتی تھی - اسی سے انگریزی لفظ "سوفا" بنا ہے۔

کے پرندے سونے کے بنائے اور ان کی آنکھیں یاقوت وغیرہ قیمتی جواہرات سے بنائی تھیں[۵۱] بغداد میں ایک اموی شہزادے، عتّاب کے نام سے پورا محلہ عتّاب کہلانے لگا تھا۔ اسی محلے میں ایک نفیس دھاری کا کپڑا بارہویں صدی عیسوی میں بننا شروع ہوا اور محلّے کے نام پر "عتّابی" مشہور ہوگیا تھا[۵۲]۔ اسی کی نقل اندلس کے عربوں نے بنائی اور وہ "تبی" کے تجارتی عرف سے فرانس، اطالیہ وغیرہ ممالک یورپ میں مقبول ہوئی۔ انگریزی میں دھاری پڑی بلّی کے لئے "ٹیبی" کا لفظ آج تک اسی عربی کپڑے کی یادگار ہے۔ کوفے میں ریشم تیار کرنے لگے تھے اور ریشم کا جوڑ دے کر وہ مندیل (بڑا رومال) بناتے تھے جو سر پر لپیٹ لیا جاتا تھا اور ابھی تک "کوفیہ" موسوم ہے۔ فارس میں توّاج، فسا اور کئی بستیاں تھیں جنھیں قالین، کارچوب، زربفت، اور قبائیں بنانے کے بہت سے اعلیٰ درجے کے کارخانوں پر ناز تھا۔ یہ بیش بہا کپڑے صرف خاندانِ شاہی کے لوگوں کے واسطے تیار کئے جاتے تھے[۵۳] قبا اہلِ مشرق کے لباس فاخرہ میں داخل تھی۔ ان مصنوعات کے لئے فارسی الاصل لفظ طراز رائج تھا اور ہر تھان پر اس خلیفہ یا سلطان کا نام یا نشان کارچوب سے بنا دیا جاتا تھا جس کے لئے وہ تیار کیا گیا ہو خوزستان کی ولایت (قدیم سوزیانا) میں تستر اور سوس کے کئی کارخانے

---

۵۱ دیکھو ابشیہی – ۱ صـ ۱۴۴ ؛

۵۲ مقدسی نے اس کا ذکر کیا ہے، صـ ۳۲۳ – نیز دیکھو ابن حوقل، صـ ۲۶۱ یاقوت نے معجم البلدان میں اس کے ہجے غلط لکھ دئے ہیں۔ ا[illegible] ؛

۵۳ اصطخری – صـ ۱۵۳ – نیز دیکھو مقدسی، صـ ۴۴۲ ؛

ر "دمقس[51]" بنانے میں مشہور تھے۔ جس میں سنہری اشکال بنائی جاتی تھیں۔ نیز کتے ریشم (= خزّ) کے پردے یہاں بنتے تھے۔ ان کی ایک اور صنعت اونٹ اور بکری کے بالوں کا کپڑا اور خزّ کی عبائیں تھیں، جن کی دور دور شہرت تھی۔ شہر شیراز مخطط اونی چُغے، حریر و زربفت فراہم کرتا تھا۔ قرون وسطیٰ میں یورپ کی خوش حال عورتیں اپنے ہی بازاروں میں "تفتہ" کے نام سے ایران کا ریشمی تافتہ خریدا کرتی تھیں۔ خراسان اور ارمنیہ، فرش کی چادروں، پردوں، اور مسند تکیئے کے غلافوں کے لئے شہرہ آفاق تھے۔ ازمنہ وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں میں تمام وسط ایشیا کی بڑی بھاری منڈی بخارا تھا اور خود وہاں کے بُنے ہوئے سجّادے (= نماز کے غالیچے) خاص شہرت رکھتے تھے۔ ماوراء النہر میں صناعات اور تجارت نے جیسی نشوونما حاصل کی تھی، اس کا پورا تصوّر مختلف شہروں کی اشیائے برآمد کے ناموں سے ہو سکتا ہے جن کی فہرست مقدسی نے دی ہے[52]:

جست کے برتن، تانبے کے چراغ، صابون، قالین، نمدے کے جُبّے، سمور، عنبر، شہد، قینچی، چھُری، سوئیاں، تلواریں، کمانیں، اعلیٰ اور ترکی غلام، باز، گوشت وغیرہ وغیرہ۔ مصر و شام میں میزیں، صوفے، قندیل، جھاڑ فانوس، گل دان، پکانے کے ظروف، گلی برتن، بنتے تھے۔ مصر کا نفیس کپڑا دمیاطی (دمیاط سے) دبیقی (دبیق سے) اور تنیسی (تنیس سے[53]) دنیا بھر میں مشہور ہو گئے تھے اور انہی کی نقل

---

[51] مقدسی، ص۲۰۲-۴۔ اصل میں یہ کپڑا دمشق میں بنتا تھا۔ اسی لئے یہ نام پڑ گیا تھا۔

[52] ص ۳۲۳۔ [53] ص ۲۰۱ وغیرہ۔ یاقوت۔ ۲ ص ۶۰۳۔

ایران میں تیار کی جاتی تھی۔ مصر کے قبطیوں کی دستکاری نے عہد فراعنہ کے صنعتی فنون کو محدود صورت میں زندہ رکھا تھا۔

صور و صیدا اور شام کے دوسرے قصبات میں شیشہ بنایا جاتا تھا۔ یہ فنیقیوں کی صنعت تھی جو مصر قدیم کے بعد دنیا کی تاریخ میں سب سے پہلی شیشہ سازی اور اپنے پتلے پن اور صفائی میں ضرب المثل ہوگئی تھی[1] اب یہ شامی شیشہ میناکاری اور بوقلمونی سے طرح طرح کا بننے لگا تھا اور یہی اقسام حروب صلیبیہ کے واسطے سے یورپ پہنچیں اور وہاں کے کلیساؤں کے رنگین شیشوں کی پیش رو بن گئیں۔ ان شامی صناعی کے شیشوں اور آرائشی ظروف کی بڑی مانگ تھی کیوں کہ عام ضرورت کی چیزیں تھے اور تزئین کے بھی کام آتے تھے شیشے کے فانوس اور دیوار گیریاں جن پر مختلف رنگوں سے میناکا کام اور کتبات تحریر ہوتے تھے، مساجد و محلات میں آویزاں کی جاتی تھیں۔ دمشق رنگین چوکوں (= فسیفسا) اور کاشانی صنعت کا بڑا مرکز تھا۔ عربی نام "قاشانی"[3] اسی کاشان (یعنی قدیم مدیہ کے شہر[2]) سے منسوب ہے۔ یہ چار (یا چھ) پہلو کے چینی چوکے ہوتے تھے جن پر طرح طرح کے بیل بوٹے بنائے جاتے اور دیواروں یا عمارات کے
347 اندرونی اور بیرونی جانب خوش نمائی کے لئے لگائے جاتے تھے۔ ان کا عام رنگ گہرا یا ہلکا نیلا، سبز اور کبھی کبھی سرخ یا زرد ہوتا تھا۔

ہ۱ ثعالبی ۔ "لطائف" ص ۹۵۔

ہ۲ ابن بطوطہ کے سفرنامے کی تینوں جلدوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔

ہ۳ عربی میں "قاشان" کے لئے دیکھو یاقوت ۔ ۴ ص ۱۵۔

اس فن کا الام اور اشوری قوموں کے زمانے تک نشان ملتا ہے اور عہد عرب کے بعد بھی اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر تک دمشق میں یہ سلامت تھا۔

خاص طور پر لائق تحریر چیز کاغذ سازی کی صنعت ہے یہ آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں پہلے چین سے سمرقند میں لائی گئی[1] اس شہر کو مسلمانوں نے صدی کے اوائل یعنی ۷۰۴ء میں فتح کیا تھا۔ جو کاغذ یہاں بنتا تھا، وہ بے نظیر سمجھا جاتا تھا[2] صدی کے ختم ہونے سے قبل بغداد میں پہلا کارخانہ نمودار ہوا۔ رفتہ رفتہ دوسرے مقامات میں بھی یہ کام ہونے لگا۔ مصر کا کارخانہ ۹۰۰ء یا اس سے بھی کچھ پیشتر بنا تھا۔ مراکش میں کوئی دو صدی بعد یہ صنعت پہنچی۔ اندلس میں ۱۱۵۰ء کے قریب اس کا آغاز ہوا اور سفید و رنگین کاغذ بنائے جانے لگے۔ خلیفہ المعتصم کو بغداد، سامرہ وغیرہ کئی شہروں میں صابون اور شیشے کے کارخانوں کا بانی بتاتے ہیں۔ اس نے کاغذ سازی کی بھی قدر افزائی کی۔ کاغذ پر قدیم ترین عربی مخطوطہ جو ہمارے زمانے تک سلامت رہا، حدیث شریف پر ابوعبید القاسم ابن سلام (متوفی ۸۳۷ء) کی کتاب "غریب الحدیث" ہے۔ اس پر کتابت کی تاریخ ذوقعدہ ۲۵۲ھ (م

---

[1] عربی میں "قاشان" کے لئے دیکھو یاقوت ج ۴ ص ۱۵۔

[2] دیکھو فریڈرک ہرتھ کی جرمن کتاب چین پر (لائپزگ ۱۸۹۰ء) ص ۲۵۹۔ تبریز میں کاغذ کا سکہ (نوٹ) بھی چھاپا جاتا تھا۔ (۱۲۹۴ء) اس پر چینی اور عربی میں عبارت لکھی ہوتی تھی۔ اس قسم کی مہر کندہ طباعت کی اسلامی دنیا میں آن دنوں یہی ایک مثال ملتی ہے۔ کاغذ زر کی ایجاد بھی چین میں کی گئی تھی۔

نومبر دسمبر ۸۶۷ء) ثبت اور یہ جامعہ لائیڈن کے کتب خانے میں محفوظ ہی۔[۵۱] عیسائی اہل قلم میں سب سے پرانا عربی مخطوطہ متحف برطانیہ میں ابو قرہ (متوفی تخ ۸۲۳ء) کا دینیات کا ایک رسالہ، ربیع الاول ۲۶۴ھ (م ۸۷۷ء) کا مورخہ ہی۔[۵۲] اسلامی اندلس اور اطالیہ سے کاغذ سازی کی صنعت بارھویں اور تیرھویں صدی میں رفتہ رفتہ مسیحی یورپ میں پھیلی اور آگے چل کر جب یہاں آہنی حروف سے چھاپے کی ایجاد ہوئی (۱۴۵۰ــــ۱۴۵۵ء) تو اس عام تعلیم کا امکان پیدا ہوا جس سے آج یورپ و امریکہ مستفیض ہو رہے ہیں ؛

خلافت عباسیہ میں جوہری کا فن عروج پر پہنچا۔ موتی، یاقوت، پکھراج، نیلم اور الماس بادشاہوں شہزادوں کے مرغوب طبع تھے۔ عام لوگ عقیق، فیروزہ، سنگ سلیمانی پسند کرتے تھے۔ عربی تاریخ کے سب سے مشہور جواہرات میں ایک بڑا یاقوت تھا جو کئی ایرانی اکاسرہ کی ملکیت میں رہا اور آخر میں ہارون الرشید نے چالیس ہزار دینار میں خرید کر اس پہ اپنا نام کھدوایا۔[۵۳] یہ اتنا بڑا اور ایسا چمکتا تھا کہ رات کو اندھیرے کمرے میں رکھ دو تو چراغ کی طرح ضیا دیتا تھا۔ جیسا اوپر بیان ہوا، ہارون کی بہن اپنے سر کے زیور میں اور ملکہ پاؤں کی جوتی میں جواہرات لگاتی تھی۔ یحییٰ ابن خالد برمکی نے ایک دفعہ بغداد

---

۵۱ "پے لیوگرافیکل سوسائٹی، اورینٹل سیریز" (لندن ۱۸۸۰ء) ع ۶ ؛

۵۲ پورا نام "تھیوڈورس ابو قرہ" تحریر ہی" کتاب کا جرمن ترجمہ ہو گیا (بون، ۱۸۹۷ء) ؛

۵۳ مسعودی، ۷، صفحہ ۳۷۶ وغیرہ ؛

کے کسی سوداگر سے ایک مکلّل بہ جواہر صندوقچہ خریدنا چاہا اور ستر لاکھ درہم قیمت لگائی مگر سوداگر نے نہیں دیا[1] المکتفی کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وفات پر دو کرور دینار قیمت کے جواہرات و عطریات چھوڑے تھے[2] خلیفہ متوکّل کی ایک پُر تجمّل شاہانہ ضیافت میں سونے کی میزیں اور کشتیاں لگائی گئی تھیں جن میں جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ وہ ضیافت ہے جسے المامون کی شادی کے ساتھ "ملت اسلامی کی دو ایسی تقریبیں" کہا گیا ہے "جن کی تیسری نظیر نہیں ملتی"[3] اگرچہ ابن خلدون کا نظریہ ہے کہ عبّاسی خلفا ایسی عیش و عشرت کی زندگی نہ بسر کرسکتے تھے۔ لیکن وہ بھی مامون کی شادی کی تقریب میں سونے اور جواہرات کی غیر معمولی نمائش تسلیم کرتا ہے[4] مسعودی کا بیان ہے کہ تیرہواں عبّاسی خلیفہ المعتز سب سے پہلے جواہر نگار زرہ بکتر میں سونے کے زین پر سوار نکلا کرتا تھا ورنہ اس کے پیش رو خلیفہ صرف چاندی کا ساز و یراق استعمال کرتے رہے[5] آخری خلفا میں المقتدر (۹۰۸ — ۹۳۲ء) نے بہت زر و جواہر جمع کیا تھا۔ اُس نے بغداد کے سب سے بڑی جوہری خاندان کے بانی کا مال متاع ضبط کرلیا[6] اور ہارون کے مشہور یاقوت احمر وغیرہ جواہرات کے علاوہ ایک اتنا ہی مشہور دُرِّ بے بہا بھی اُس کی ملکیت میں آیا جس کا وزن تین

---

[1] طبری۔ ۳ ص۱۰۰۲ ۔ [2] ثعالبی، ص۲۲ ۔

[3] ایضاً [4] مقدمہ، ص۱۵ و ۱۴۴ ۔

[5] جلد ۷، ص۴۰۲ جسے ابن خلدون نے بھی اپنے مقدمے میں نقل کیا ہے۔

[6] جس کا ایک پچھلی فصل میں ہم ذکر کرچکے ہیں۔

مثقال تھا۔ مگر مقتدر نے یہ ساری دولت اڑا کر ختم کر دی[1]۔

سلطنت کے معدنی وسائل ہیں، جن کی بدولت جوہریوں کی صنعت چل سکی، خراسان کی سونے چاندی کی کانیں تھیں سنگ مرمر اور سیماب[2] بھی اسی ملک سے آتا تھا۔ ماوراء النہر سے یاقوت، لاجورد، باز ہر[3]۔ کرمان سے سیسہ اور چاندی[4]۔ بحرین سے موتی[5]۔ نے سابور سے فیروزہ اتنی مقدار میں نکلتا تھا کہ دسویں صدی عیسوی کے آخری نصف میں اس کی کان کا ۲۰، ۷ ، ۵۸ ، ۷ درہم سالانہ میں ٹھیکہ دیا گیا تھا[6]۔ عقیق، صنعا سے[7] اور لوہا کوہستان لبنان[8] سے آتا تھا۔ اسی معدنی پیداوار میں تبریز کا سنگ مرمر و رخام، نواح اصبہان کا سرمہ[9]، جرجستان کا قیر و نفط۔ شام و فلسطین کا سنگ مرمر و کبریت[10]

349 ماوراء النہر کا پارہ اور سنگ فتیلہ (= اس بس توس[11]) اور فرغانہ کا قیر و قطران[12] (= رال) شامل ہیں۔

---

[1] فخری، ص۳۵۳۔ ابن حوقل اور مقدسی بھی اس بے مثال موتی کا ذکر کرتے ہیں۔

[2] مقدسی، ص۳۲۶۔ [3] مقدسی، ص۳۰۳۔ انگریزی لفظ "لیزر دلی" اور "از ور" دونوں عربی لازورد سے بنے ہیں جو اصلاً ایرانی "لاژورد" تھا۔

[4] ابن الفقیہ ص۲۰۶۔ [5] مقدسی ص۱۰۱۔

[6] ایضاً۔ [7] ایضاً۔ [8] ایضاً۔

[9] اصطخری، ص۲۰۳ ثعالبی وغیرہ۔ ممکن ہے عربی لفظ کحل، یونانی "گلینا" سے آیا ہو۔ دیکھو "میوائرز ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال" ۸، ص۳۵۲۔ [10] مقدسی، ص۱۸۴۔

[11] ایضاً۔ (" اس بس توس" یونانی میں نہ بجھنے والے کے معنی رکھتا ہے اور قدیم یونانی اسے چونے کی قسم سمجھتے تھے۔ اسی سے عربی میں "حجر فتیلہ" ترجمہ کیا گیا تھا۔ آج کل یہ دھات غیر محرق ثابت ہوئی ہے جس میں آگ نہ لگے۔ اس طرح اب معنی بالکل بدل گئے ہیں۔ مؤلف نے قدیم عربی لفظ اختیار کیا اور ہم بھی اس کی پیروی درست سمجھتے ہیں۔ مترجم)

[12] ابن حوقل، ص۱۲۲۔

زراعت

خلفائے عباسیہ کے ابتدائی دَور میں زراعت کو بڑی تحریک پہنچی کیوں کہ ان کا نیا دارالخلافہ زراعت و فلاحت کے لئے بہت ہی موزوں جگہ واقع تھا۔ یہ دریا برار (کھادر) زمین کے وہ اقطاع ہیں جو السواد کہلاتے تھے ۔ دوسرے یہ فرماں روا خوب جان گئے تھے کہ زراعت ہی پر سلطنت کی آمدنی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اس فن کی ترقی کا ایک اور سبب یہ ہوا کہ زراعت قدیم باشندوں ہی کے ہاتھ میں رہی اور نئی (عرب) حکومت نے ان کی حیثیت کو کچھ نہ کچھ ضرور بہتر بنا دیا۔ سلطنت کے ہر حصے میں جو کھیت بنجر ہو گئے اور گاؤں اُجڑ گئے تھے، بہ تدریج ازسرِنو آباد اور مزروعہ بنا لئے گئے۔ مرکزی حکومت کو سب سے زیادہ توجہ دجلہ و فرات کی وادی زیریں کے بنانے پر تھی کہ مصر کی وادی نیل یا باغ عدن کے روایتی مقام کے سوا، ساری سلطنت میں زرخیز ترین علاقہ یہی تھا۔ فرات کی قدیم نہریں دوبارہ کھدوائی یا بالکل نئی بنائی گئیں اور ملک بھر میں ان کا "واقعی جال بچھا دیا گیا"۹؎ منصور کے کسی رشتہ دار مسمّی عیسیٰ نے پہلی بڑی نہر ازسرِنو کھدوائی جو فرات کے کنارے انبار سے چل کر بغداد پر دجلے سے آملتی تھی۔ یہ اُسی کے نام پر نہر عیسیٰ موسوم ہوئی اسی نہر کی ایک بڑی شاخ "صراۃ" تھی۔ دونوں دریاؤں کو ملانے والی ایک اور بڑی نہر صرصر، شہر مدائن کے شمال میں دجلے تک

۹؎ اصطخری، ص۸۵ ابن حوقل ص۱۶۶ ؎

پہنچتی تھی۔ تیسری اسی شہر کے جنوب میں آکر ملی اور "نہر الملک" (بادشاہ کی نہر) کہلاتی تھی[۵۱] دوآب کے اور جنوبی قطعات میں نہر کوثا اور صراۃ کبیر[۵۲] کی دو نہروں سے متعدد آب پاشی کے رجبے نکالے تھے۔ ایک اور نہر دجیل (یعنی چھوٹا دجلہ) شروع میں دجلہ و فرات کو ملاتی تھی مگر دسویں صدی عیسوی میں رفتہ رفتہ اٹ گئی اور پھر یہ نام ایک نئی نہر کو دیا گیا جو قادسیہ کے نیچے دجلے سے کاٹی اور عکبرے کے آگے اور جنوب میں، اسی دریا سے ملادی تھی۔ اس سے بھی کئی شاخیں نکالی تھیں[۵۳] ان کے علاوہ اور بھی کم مشہور نہریں کھودی گئی تھیں جن میں نہر الصلح قابل ذکر ہے۔ اسے خلیفہ ال مہدی نے شہر واسط میں جاری کیا تھا[۵۴] عرب جغرافیہ نویس خلفا کے نہریں کھودنے اور جاری کرنے کا جا بجا ذکر لکھتے ہیں حال آں کہ اکثر صورتوں میں یہ محض پرانی نہروں کو جو اہل بابل کے زمانے سے موجود تھیں، محض دوبارہ
350 کھدوانے اور پھر رواں کرنے کا کام ہوتا تھا۔ عراق کی طرح مصر میں بھی اصل ذمہ داری قدیم نہری نظام کو قائم رکھنا تھی۔ پہلی عالم گیر جنگ سے پہلے بھی دولت عثمانیہ نے سر ولیم ول کاکس کو عراق کے مسائل آب پاشی کا مطالعہ کرنے کی خدمت تفویض کی تو اس کی سفارشوں

---

۵۱ اصطخری، ابن حوقل اور خطیب نے اپنی "تاریخ" میں ان نہروں کے حالات تحریر کئے ہیں۔ ابن سرابیون نے ۹۰۰ء کے قریب بغداد و عراق کی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کا ترجمہ ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالے (۱۸۹۵ء صفحہ ۲۵۵ تا ۳۱۵) میں شائع ہوا تھا۔

۵۲ یاقوت۔ ۳ صفحہ ۳۷۷۔

۵۳ ۔ ۲ صفحہ ۵۵۵۔ اصطخری صفحہ ۷۷۔

۵۴ بلاذری، صفحہ ۲۹۱۔ قدامہ، صفحہ ۲۴۱۔

میں زور دیا گیا تھا کہ نئی نہریں بنوانے کی بجائے ضرورت یہ ہے کہ قدیم آب راہیں صاف کرادی جائیں[1] مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ خلافت عباسیہ کے زمانے سے اب تک سواد کی دریا بار زمین کی سطح میں بہت فرق آچکا ہے اور دجلہ و فرات دونوں دریاؤں نے تاریخی زمانے میں اپنی گزرگاہیں بہت کچھ بدل دی ہیں ؀

عراق کے خاص غلے اور فصلیں یہ تھیں : جو، گیہوں، چاول، کھجور، سیسم، کپاس اور سن۔ جنوبی کھادر کے قطعات خصوصیت کے ساتھ شاداب تھے اور ان میں گرم و سرد دونوں خطوں کے پھل ترکاریاں خوب کاشت ہوتی تھیں: جوز، سنترا، بادنجان، نے شکر، مصری باقلہ (= ترمس) اور پھولوں میں گلاب و بنفشہ کثرت سے پھولتے تھے ؀

زمین کی زرخیزی میں خراسان، عراق و مصر کا مقابلہ کرتا تھا۔ مال گزاری کی جدولیں جن کا گذشتہ اوراق میں ہم نے مطالعہ کیا، ظاہر کرتی ہیں کہ عباسی سلطنت میں سب سے زیادہ خراج دینے والے ملکوں میں اس کا شمار تھا۔ ملکی تقسیم کے اعتبار سے کم سے کم ایک مدت تک سجستان اور شمال میں ماوراء النہر کی ولایتیں خراسان میں شامل رہیں۔ لہٰذا آبادی کی عددی قوت میں وہ فوجی بھرتی کا بڑا معدن تھا۔ اسی لئے مامون کے حضور میں کسی نے اسے "عربی سلطنت" کا نام دیا تو اس پر تعجب نہ کرنا چاہیئے[2] ؀ عرب

---

[1] جو فارسی سے ہو آئس کی کتاب "اِری گیشن اوف میسوپوٹامیا" (لندن ۱۹۱۷ء) ص۱۱ ؀

[2] لیکن یورپی نی، ۲ : ص۵۵۵ ؀

جغرافیہ نویسوں کی رائے میں بخارا کے مضافات، (خصوصاً دسویں صدی کے سامانی عہد میں) سچ مچ باغ بن گئے تھے[۱] یہیں سمرقند و بخارا کے مابین وادیٔ صُغد کے وہ میدان تھے جنھیں زمین کی چار بہشتوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ باقی تین ارضی بہشتیں یہ تھیں: شعب بَوّان (= فارس میں بوّان کی گھاٹیاں۔) بصرے کے جنوب مشرق میں نہر اُبلہ کے چمنستان[۲] اور تیسری، دمشق کا غوطہ (یعنی ہرے بھرے باغوں کا میدان)[۳] ان باغوں میں انواع و اقسام کے پھل، پھول اور ترکاریاں ہوتی تھیں جیسے سیب، کھجور، خوبانی[۴]، شفتالو، آلوچہ، لیمو، سنترا، انجیر، انگور، انار، زیتون، بادام۔ اور بادنجان، ککڑی، پیاز۔ پھولوں میں گلاب و گل ریحان؛ ثعالبی نے لکھا ہے کہ خوارزم سے مامون اور واثق باللہ کے درباروں میں تربوز جست 351 کے خول میں برف بھر کر بھیجے جاتے تھے اور ایسا پھل سات سو درہم فی تربوز کے حساب سے بغداد میں بکتا تھا[۵]؛ قریب قریب سبھی ترکاریاں اور پھل جو مغربی ایشیا میں آج کل کاشت کیے جاتے ہیں، اُس زمانے میں جانے پہچانے ہوئے تھے، سوائے آم، آلو، ٹماٹر وغیرہ ایسے پودوں کے جنھیں زمانۂ حاضرہ میں نئی دنیا یا بعید مغربی مستعمرات سے لایا گیا ہے۔ ولایتی سنترا (= مالٹا) لیموں اور نارنگی کے خاندان سے ہے اور اصل میں ہندوستان یا ملایا اس کا وطن تھا۔ زیرِ نظر زمانے میں مغربی

---

[۱] اصطخری ص ۳۰۵۔ ابن حوقل نے بھی اسے نقل کیا ہے؛

[۲] ، ، ۔ مقدسی ص ۱۱۱؛ [۳] یاقوت، ا ص ۱۵۵ وغیرہ

[۴] یہ اصل میں چین کا میوہ تھا؛ [۵] ص ۱۲۹؛

ایشیا آیا، وہاں سے بحر متوسط کے سواحل تک پہنچا اور بالآخر اندلس کے عربوں نے اسے یورپ کے ملکوں میں پھیلا دیا[۱]۔ نے شکر کی کاشت فارس اور اہواز میں ہوتی تھی۔ وہاں شکر سازی کے بڑے بڑے کارخانے تھے۔ انھی کی دیکھا دیکھی یہ کاشت اور صنعت عباسیوں کے زمانے میں ملک شام کے ساحل پر ہونے لگی اور وہاں سے صلیبی مجاہد گنا اور شکر[۳] یورپ میں لے گئے۔ اس طرح یہ میٹھی چیز جس کا اصلی گھر غالباً بنگالہ تھا اور اسی وقت سے دنیائے تمدن کے باشندوں کی روزانہ غذا کا لازمی جزو بن گئی تھی، آہستہ آہستہ مغرب میں گھر کر گئی ہے۔

عربوں کی باغ بانی کا فن پھل ترکاری کی کاشت تک محدود نہ تھا بلکہ پھولوں کو اگانے میں بھی ترقی کی گئی تھی اور یہ کوشش خانہ باغ تک ہی نہیں رہی جنھیں ترنم ریز فواروں کے حوض کے اردگرد لگایا جاتا تھا بلکہ وسیع پیمانے پر تجارتی اغراض کے لئے بھی باغ تیار کئے جانے لگے تھے۔ دمشق، شیراز، جور وغیرہ شہروں میں گلاب، نیلوفر، بنفشہ اور سنترے کے ست کھینچے اور عطر بنانے کی صنعت ترقی پر تھی۔ ولایت فارس میں جور یعنی فیروزآباد کا پورا ضلع عطر گلاب کے لئے

ف۱ یہ قسم تلخی لئے ہوتی ہے۔ اسے عربی میں "ابو صفیر" کہتے تھے۔ انگریزی لفظ "اورنج" اندلس کے راستے عربی نارنج سے بنا جو فارسی "نارنگ" کی تعریب ہے۔ انگریزی "لیمن" بھی عربی "لے موں" (= فارسی لی موں) ہے۔

ف۲ ثعالبی، ص۱۰۱۔

ف۳ عربی "سکّر" (بہ تشدید کاف) اسی طرح انگریزی "کینڈی" اصل میں عربی قندہ یا قندی ہے جو فارسی سے لیا گیا تھا۔ "کین" بھی سامی الاصل لفظ عربی "قناہ" بہ معنی نرسل کے ہم معنی ہے لیکن یورپی زبانوں میں دوسرے ذرائع سے پہنچا تھا۔

مشہور تھا[۱] اور یہیں کا عرق گلاب ایک طرف مشرق میں چین اور دوسری طرف مغرب اقصیٰ کے ملکوں تک دساور جاتا تھا[۲] فارس کے سالانہ خراج میں روح گلاب کی تیس ہزار بوتلیں خلیفہ بغداد کی خدمت میں بھیجی جاتی تھیں[۳] سابور (= ایرانی شاپور) اور اس کی نواح میں دس قسم کے خوش بودار تیل یا اُبٹنے تیار کئے جاتے تھے۔ یہ بنفشہ، نیلوفر، زنبق، نرگس، سوسن، حنا اور نخیل، لیموں اور سنترے کے پھولوں کے ست سے بنتے تھے[۴] ان سب میں بنفشہ کا تیل مسلمانوں میں بہت ہی مقبول تھا جس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے منسوب کردی گئی تھی:

"فضل دھن البنفسج علی سائر الادھان کفضلی علی سائر الخلق"[۵]

پھولوں میں بظاہر سب سے زیادہ گلاب کی قدر کی جاتی تھی — اوپر جس شائستہ کنیز تودد کا ذکر آیا ہے اس کی رائے تھی کہ گلاب اور بنفشہ کی خوش بو سب سے اچھی، اور پھلوں میں انار و سنترہ سب سے بہتر اور ترکاریوں میں کاسنی افضل ہے[۶] ہم اس رائے کو دسویں اور بارہویں صدی کے درمیان کے زمانے کی عام پسند رائے کا اشاریہ خیال کریں تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک اور مبیّنہ حدیث نبوی گلاب کی مقبولیت کی آئینہ دار ہے: "الورد الابیض خُلق من عرقی فی لیلۃ المعراج

۱؎ شام میں آج کل بھی سرخ گلاب "ورد جوری" کہلاتا ہے۔

۲؎ ابن حوقل ص ۲۱۳۔ ۳؎ ثعالبی، ص ۱۰۹۔

۴؎ مقدسی، ص ۴۴۳۔ ۵؎ سیوطی: "حسن" ۲ ص ۲۴۲۔

۶؎ "الف لیلہ" داستان ص ۴۵۳۔

وخلق الورد الاحمر من عرق جبرئیل وخلق الورد الاخضر من عرق البراق[۱]۔ کہتے ہیں متوکل نے یہ کہہ کر کہ میں سلاطین کا بادشاہ اور گلاب ریاحین کا بادشاہ۔ پس وہ میری اور میں اُس کی صحبت کے لائق ہوں" حکم دیا تھا کہ اور کوئی گلاب کی کاشت نہ کرے اور اس کے عہد خلافت میں اُس کے محل کے سوا یہ پھول کہیں نظر نہ آتا تھا اور سوائے خلیفہ کے اور کوئی اس سے لطف نہ اُٹھا سکتا تھا[۲]۔

گلاب اور بنفشہ کی رقیب، ریحان (= گلِ مہندی) تھی۔ اس کی تعریف میں بھی ایک حدیث نقل کی جاتی تھی کہ آدم کے ساتھ تین چیزیں جنت سے دنیا میں اتاری گئی تھیں: ایک ریحان (= الآسہ) جو خوشبو دار پودوں کی سردار ہے۔ دوسرے گیہوں کی بال (= سُنبلہ) جو دنیا کی غذاؤں کی سردار ہے اور تیسرے کالی کھجور (= عجوہ) جو اثمار دنیا کی سردار ہے[۳]۔ دوسرے دل پسند پھول نرگس، گُلِ شَب (= منثور)، یاسمین، کوکنار و زعفران تھے۔

فلاحت سے ان دنوں لوگوں کو جیسی دلچسپی تھی، اس کی تصدیق کئی کتابوں سے ہوتی ہے جو اس دَور میں نباتات پر لکھی نیز یونانی سے ترجمہ کی گئی تھیں اور فہرست میں ان کے نام درج ہیں۔ انہی میں چند کتابیں عطرسازی پر اور ابن وحشیہ کی مجہول تصنیف "الفلاحت النباتیہ" کے نام آتے ہیں[۴]۔

۱۔ سیوطی ۱، ص ۲۳۶ (یہ اور اوپر کی حدیث صریحًا وضعی ہیں۔ مترجم)

۲۔ ثعالبی، ص ۲۳۵۔ سیوطی، ۱۱ ص ۲۳۶۔

۳۔ سیوطی۔ ۲ ص ۲۳۵۔ نیز دیکھو لین [illegible] الف لیلہ۔ ۱ ص ۲۱۹۔

۴۔ فہرست ص ۷۸ و ص ۳۱۷۔

ذمی : نصاریٰ

زراعت پیشہ لوگ سلطنت کی آبادی کا سب سے بڑا حصّہ اور سرکاری مال گزاری کا بڑا ذریعہ تھے۔ مزارعین ہی ملک کے قدیم یا اصلی باشندے تھے جن کی اب حیثیت ذمیوں کی ہوگئی تھی۔ عرب کھیتی کیاری کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتا تھا۔ شروع میں ذمی صرف اہلِ کتاب، یعنی یہود و نصاریٰ اور صابی مانے جاتے تھے مگر پھر ذمی کی تعریف میں توسیع کردی گئی جیساکہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں اور ان میں زرتشتی، مانوی، حرّانی صابی وغیرہ شامل کرلئے گئے۔ ان سب سے انہی قوموں کی مثل برتاو ہوتا تھا جن سے مذہبی رواداری کا معاہدہ تھا۔ قص[illegible] و دیہات میں یہ زراعت پیشہ ذمی اپنے قدیم تہذیب کی باقیات سے چمٹے رہے اور اپنی بولیاں بھی بولتے رہے جیسے شام و عراق میں ارامی اور سریانی۔ ایران میں فارسی اور مصر میں قبطی۔ ان میں جو لوگ اسلام لائے وہ عموماً شہروں میں اٹھ آئے اور

مگر شہروں میں بھی یہود و نصاریٰ اکثر بڑے بڑے مالی اور دفتری عہدوں پر مامور اور اعلیٰ پیشے رکھتے تھے۔ بارہا مسلمان آبادی نے اس بات پر ناراضی کا علانیہ اظہار کیا اور حکومت کی طرف سے امتناعی احکام بھی جاری کئے گئے لیکن بیشتر یہ فرقہ واری امتیاز کے ضوابط "کاغذ ہی پر روشنائی" بنے رہے۔ ان کے باقاعدگی سے نفاذ کی نوبت نہیں آئی۔

ہم بیان کرچکے ہیں کہ پہلا خلیفہ جس نے یہود و نص[illegible]

لباس پہننے کا حکم دیا اور سرکاری عہدوں سے خارج کیا، بنی اُمیہ کا متقی فرماں روا عُمر ثانی (ابن عبدالعزیز) تھا۔ اسی کے میثاق کو بارہا غلطی سے حضرت عمر فاروق رضؓ سے منسوب کیا گیا ہے۔ عباسیوں میں بظاہر ہارون الرشید پہلا خلیفہ ہے جس نے عمر ابن عبدالعزیز کے ان ضوابط میں سے بعض احکام دوبارہ نافذ کئے۔ ۸۰۷ء میں اس نے سرحدی اضلاع کے سب گرجا اور وہ جو اسلامی قبضے کے بعد تعمیر ہوئے تھے، منہدم کرنے کا حکم دیا اور فرمان جاری کیا کہ ذمی لوگ مقررہ لباس پہنا کریں[۱]۔ یہ سخت احکام المتوکل کے عہد میں انتہا کو پہنچے کہ اس خلیفہ نے ۸۵۰ء اور ۸۵۴ء میں یہ فرمان جاری کیا تھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے مکانوں پر شیاطین کے چوبی پتلے نصب کرائیں، قبریں زمین کی سطح کے برابر رکھیں۔ بالائی لباس، شہد کے رنگ کا یعنی زرد پہنا کریں۔ اپنے غلاموں کے کپڑوں پر دو زرد ٹکڑے، ایک سامنے ایک پیچھے، سی دیا کریں۔ صرف خچّر اور گدھے پر سوار ہوں اور (لکڑی کی) کاٹھی کے پچھلے حصّے پر دو چوبی گیندیں پہچان کے لئے لگائیں[۲]۔ اسی جداگانہ لباس کی وجہ سے ذمیوں کو "چتلا" (= ارقط) کہنے لگے تھے[۳]۔ ایک اور ناگوار تحدید جو ذمیوں پر عائد کی گئی وہ اُس عہد کے مسلمان فقہا کا یہ فتویٰ تھا کہ کسی مسلمان کے خلاف یہودی یا نصرانی کی شہادت قابل سماعت نہ ہوگی۔ اس کا سبب

---

۵۱ طبری، ۳ صفحہ ۹۲ ۔ ابن اثیر، ۶ صفحہ ۱۶۰

۵۲ طبری - ۳ صفحہ ۱۳۸۹

۵۳ جاحظ - "بیان" ۱ صفحہ ۴۹

یہ بتایا گیا تھا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی آسمانی کتابوں میں تحریف کر دی جیساکہ قرآن مجید میں الزام دیا ہے[۱] اور ایسی قوموں پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ آخری خلیفہ جس نے ذمیوں کے خلاف تشدد کے احکام کی تجدید و تاکید کی الحاکم باللہ فاطمی (۹۹۶ تا ۱۰۲۱ء) تھا۔

اس قسم کی بندشوں کے باوجود، دور خلافت میں عیسائیوں کے ساتھ مجموعی طور پر بڑی حد تک روا داری برتی جاتی تھی جس کا ثبوت کئی واقعات سے مل سکتا ہے۔ جس طرح کے مذہبی مناظرے امیر معاویہ اور عبد الملک کے مواجہ میں ہوا کرتے تھے، ایسے ہی عباسی خلفا کے سامنے ہوتے رہے۔ نسطوریوں کے بطریق ٹموتھی (= تیمی تاوس) نے ۷۸۱ء میں مسیحیت کی وکالت میں خلیفہ مہدی کے رو برو جو تقریر کی تھی وہ ایک رسالے کی صورت میں ابھی تک سلامت ہے[۲]۔ اسی طرح اِل کِندی کا ایک معروف رسالہ محفوظ ہے جس میں اسلام اور مسیحیت کی خوبیوں کا موازنہ کیا اور بتایا ہے کہ یہ ایک مذہبی مناظرے کی رُو داد ہے جو ۸۱۹ء کے قریب مامون کے سامنے ہوا تھا[۳]۔ علی الطبری (متوفی تخ ۸۵۴ء) کی مذہبی مباحث کی "کتاب الدین والدولہ"[۴] کہ دین اسلام کی شرح اور دفاع میں ایک نیم سرکاری تالیف ہے اور متوکل کے دربار میں خود خلیفہ کی مدد سے لکھی گئی تھی، ایک متین و

---

[۱] سورۂ بقرہ: ۷۹۔ مائدہ: ۱۳ (مؤلف نے آیات کے نشان ۷۰ اور ۱۶ دیئے ہیں مترجم)

[۲] آ۔ منگانا: "بلیٹن ... رے لینڈز لائبریری" ۱۲ صفحہ ۱۳۷ تا ۲۹۸

[۳] "رسالات عبد المسیح" (لندن ۱۸۸۰ء و ۱۸۸۵ء)

[۴] شائع کردہ منگانا (قاہرہ ۱۹۲۳ء)

معتدل تحریر ہے جس میں دینی حرارت و عصبیت سے مطلق کام نہیں لیا گیا اور کتاب مقدس کے جابجا حوالے دئے ہیں۔ یہ حوالے توراۃ کے سُریانی یا قدیم عربی ترجمے ہی سے منقول معلوم ہوتے ہیں۔ جب ندیم نے اپنی "فہرست" مرتب کی (یعنی ۹۸۸ء میں) اُس وقت تک عہد عتیق و جدید کے ایک سے زیادہ عربی ترجمے ہو چکے تھے[1] بلکہ بعض روایتوں کی رو سے بہت پہلے یعنی ہارون ہی کے زمانے میں کسی احمد ابن عبداللہ ابن سلام نے توراۃ کا عربی ترجمہ کرلیا تھا[2] اس بات کی بھی شہادتیں ملتی ہیں کہ ساتویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں توراۃ کے اجزا عربی میں سُریانی سے یا یونانی (سبعینیہ یونانیہ = سپتوا جنت) سے منتقل ہو چکے تھے۔ مورخ طبری ۶۱ھ کے احوال (جلد دوم) میں تحریر کرتا ہے کہ فاتح مصر (عمرو ابن العاص) کا فرزند عبداللہؓ "صحیفہ دانیال" پڑھے ہوئے تھا۔ لیکن عہد عتیق کا پہلا اہم عربی ترجمہ مصر کے سعید الفیومی (سادیا گیوں، ۸۸۲ تا ۹۴۲ء) نے تکمیل کو پہنچایا جو آج کے دن تک تمام عربی بولنے والے یہودیوں میں متداول ہے۔ ان تراجم سے مسلمانوں کو اختلافی مسائل کی طرف توجہ ہوئی اور کئی اہل علم نے مسیحی اعتراضات کے جواب لکھے جن میں جاحظ (متوفی ۸۶۹ء)
بھی شامل ہے۔ نویں صدی کے آخری نصف میں ہم عیسائی وزیروں 355
کے نام پڑھتے ہیں جیسے عبدون ابن سعید کہ بغداد کا ایک قاضی سرِ جلسہ اُس کی تعظیم کے لئے اٹھا تو حاضرین میں بہت چہ میگوئیاں ہوئی

---

[1] فہرست۔ ص ۲۳۔

[2] ممکن ہے کہ یہ جزوی ترجمہ ہو۔

تھیں[1]۔ المتقی (۹۴۰ تا ۹۴۴ء) کا ایک عیسائی وزیر تھا[2] اور اسی طرح آلِ بویہ کے ایک فرمان روا نے وزارت اسی مذہب کے آدمی کے سپرد کی تھی[3]۔ ان سے بھی کچھ پہلے خلیفہ المعتضد (۸۹۲ تا ۹۰۲ء) کے محکمہ جنگ کا صدر عیسائی تھا[4]۔ ان عیسائی حکام کی وہی تعظیم تکریم کی جاتی تھی جیسی مسلمانوں کی، کیوں کہ ہم پڑھتے ہیں کہ بعض مسلمان ان حکام کی دست بوسی پر اعتراض کرتے تھے۔ یاد ہوگا کہ خلفا کے ذاتی طبیب اکثر نسطوری فرقے کے عیسائی رہے۔ المکتفی نے ۱۱۳۸ء میں نسطوری کلیسا کی حفاظت کا ایک منشور لکھ دیا تھا۔ یہ حال میں شائع ہوا ہے اور زیر نظر عہد میں اسلامی حکومت اور کارکنانِ کلیسا کے دوستانہ تعلقات پر اور زیادہ روشنی ڈالتا ہے[5]۔

فرقہ نسطوریہ

عباسی خلفا کی مسیحی رعایا بیش تر کلیسائے شام کے دو فرقوں سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ عام طور پر یعقوبی اور نسطوری کہلاتے اور بدعتی سمجھے جاتے تھے۔ عراق کے عیسائیوں میں نسطوریوں کا غلبہ تھا۔ ان کا بطریق یا "جاثلیق" (کہ لفظ "کاتولی کوس" کی تعریب ہے) دار الخلافت بغداد میں قیام کا حق رکھتا تھا بحالیکہ یعقوبیوں کو کوشش کاوش کے

---

[1] یاقوت: "ادبا" ۲ ص ۲۵۹۔
[2] التنوخی: "الفرج بعد الشدۃ" ۲ ص ۱۴۹۔
[3] "تجارب الامم" از مسکویہ۔ (قاہرہ ۱۹۱۵ء) ۲ ص ۴۰۔ (اس عیسائی وزیر کا نام نصر ابن ہارون تھا)۔
[4] صابی، "وزرا" ص ۹۵۔
[5] ٹنکانا۔ تبلین ... ۲ ص ۱۲۴۔

باوجود یہ امتیاز کبھی میسر نہ آیا۔ نسطوری بطریق کا مرکز "دیر الروم"[۱] (= رومیوں یعنی عیسائیوں کی خانقاہ) موسوم تھا اور اس کے گرد بغداد میں عیسائیوں کا محلہ بن گیا تھا جسے "دارالروم" کہتے تھے بطریق کے ماتحت سات مطرانیات (= میٹ روپولی ٹن) ملک میں قائم تھے۔ جیسے بصرہ، موصل، نصی بین وغیرہ۔ اور ہر مطرانیہ کے تحت میں دو یا تین اُسقف (= بشپ) ہوتے تھے۔ حکام کلیسا نیا بطریق منتخب کرتے تو اس کی دستار بندی خلیفہ کی طرف سے کی جاتی اور وہ سلطنت کے جملہ نصاریٰ کا سردار تسلیم کیا جاتا تھا۔ ۱۰۹۱ھ میں یعقوبیوں کے بطریق نے کوشش کی کہ اپنا صدر مقام انطاکیہ سے بغداد میں منتقل کرے مگر نسطوری بطریق یا جاثلیق نے خلیفہ سے کہہ سن کر اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔[۲] یعقوبی فرقے پر خاص الزام یہ تھا کہ وہ بازنطیوں کے طرف دار ہیں۔ تاہم یعقوبیوں کی ایک خانقاہ بغداد میں موجود تھی[۳] اور ایک مرکز (= مطرانیہ) دارالخلافت سے قریب ہی تکریت میں بن گیا تھا۔ 356
عیسائیوں کی خانقاہوں کا شمار، جو بغداد کے مغربی حصّے کو چھوڑکر، صرف مشرقی حصّے میں واقع تھیں، یاقوت نے نصف درجن بتایا ہے[۴]۔

ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ مصر کے قبطی عیسائی یعقوبی فرقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی حال نوبہ کے کلیسا کا تھا اور وہ بھی سکندریہ کے بطریق کو اپنا امام تسلیم کرتے تھے۔ مصر کے مغرب میں ساحل کی تنگ پٹی

۱؎ یاقوت، ۲، صـ ۶۶۲۔

۲؎ نسطوری اور یعقوبی بطریقوں کے متعلق ملاحظہ ہو سمعانی جلد دوم (روم ۱۷۲۸ء)۔

۳؎ یاقوت، ۲، صـ ۶۶۲۔ ۴؎ ایضاً۔ لفظ "دیر" کے تحت میں۔

کے بربروں میں بھی کچھ لوگ عیسائی ہو گئے تھے لیکن اندرون ملک میں اکثر باشندے اپنی قبائلی تقسیم کے مطابق، الگ الگ عقائد اور مذہبی گروہوں میں منقسم تھے۔

نہایت حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خلفا کے زمانے میں ہم دین مسیحی کو بہت جان دار، بڑھ بڑھ کے قدم رکھنے والا مذہب دیکھتے ہیں کہ اپنے داعیوں کو ہندوستان اور چین کے دور دراز ملکوں میں بھیج رہا ہے۔ الندیم کی ایک ایسے مسیحی مبلغ سے جو چین ہو کر آیا تھا، بغداد کے مسیحی محلے میں[1] ملاقات اور مکالمت ہوئی اس نے یہ دل چسپ گفتگو اپنی کتاب میں تحریر کی ہے۔[2] یہی زمانہ ہے جب کہ چین کے شہر سیان فو میں ۶۷ نسطوری دُعاۃ کے نام اور کام کی یادگار کا مشہور کتبہ لگایا گیا اور ہندستان کا کلیسائے ملیبار میں طامس ولی کے عیسائی بطریق بغداد کے حلقۂ اقتدار میں داخل ہوئے۔ یہ واقعات گواہی دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی حکومت میں مشرقی شام کے عیسائی کیسا تبلیغی جوش رکھتے تھے۔ منگول و مانچو رسم الخط کی نسبت بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اصل میں یوغوری تحریر کی باقیات ہیں اور یہ یوغوری خط بلاشبہ نسطوریوں کے سریانی حروف ابجد سے نقل کیا گیا تھا۔

یہودی

یہودی بھی ذمّی اہل کتاب میں داخل تھے اور مجموعی طور پر عیسائیوں سے اچھے ہی رہے۔ حال آں کہ قرآن مجید میں چند مقامات پہ ان کی مذمت آئی ہے۔[3] ان کی تعداد قلیل تھی اور ان کی طرف سے کسی اندیشہ کا محل

[1] "دارالروم" جسے کتاب فہرست کے مرتب فلوگل نے ذیلی حاشیے میں غلطی سے قسطنطنیہ کہا۔

[2] ص ۳۴۹ [3] سورہ بقرہ ۱۱۱ تا ۲۴ - مائدہ ۱۷ و ۶۶۔

نہ تھا۔ ۹۸۵ء میں مقدسی نے دیکھا کہ[1] ملک شام کے اکثر صراف اور ساہوکار یہودی اور زیادہ تر اہلکار اور طبیب عیسائی تھے۔ بعض خلفا، خصوصًا المعتضد (۸۹۲ تا ۹۰۲ء) کے عہد میں دارالخلافت اور صوبوں میں ہم ایک سے زیادہ یہودیوں کو حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہوتے دیکھتے ہیں۔ خاص بغداد میں اُن کی خاصی بڑی آبادی بس گئی تھی[2] جو شہر کے سقوط تک پھولتی پھلتی رہی۔ تُدیلا کا بن جامین (= بن یامین 357 تطیلی)[3] ۱۱۶۹ء کے قریب اس بستی میں وارد ہوا تو دیکھا کہ وہاں دس مذہبی مدرسے اور تیئیس صومعے (= یہودی عبادت خانے) موجود ہیں[4]۔ ان میں سب سے بڑا صومعہ دھاری کے نفیس مرمرسے مزین اور سونے چاندی سے خوب آراستہ تھا۔ بن یامین بڑی تعریف کے ساتھ یہ کیفیت لکھتا ہے کہ بابلی یہود کا سرگروہ حضرت داؤدؑ کی اولاد سے مانا جاتا تھا اور اس کی بہت تعظیم تکریم ہوتی تھی۔ ارامی زبان میں اس کا لقب "ریش جالوثا" (یعنی عہدِ اسیری کا امیر[5]) اور حقیقت میں وہ خلافت عباسیہ کے جملہ یہود باشندوں کے رئیس کا مرتبہ رکھتا تھا جس طرح سلطنت کے تمام نصاریٰ پر مسیحی جاثلیق (یا بطریق) ایک حد تک اقتدار رکھتا تھا، اسی طرح ریش جالوثا کی اپنے مذہب والوں پر مذہبی حکومت چلتی تھی۔ یہ "عہدِ اسیری کا امیر" معلوم ہوتا ہے نہایت صاحبِ

---

[1] ص ۱۸۳ ۔ [2] یاقوت ج۴ ص ۱۰۴۵ ۔

[3] دیکھو اس یہودی بنی کا سیاحت نامہ مطبوعہ و مترجمہ ایڈلر، ۱ ص ۳۹ (لندن، ۱۹۰۷ء) ۔

[4] دوسرے سیاحوں نے یہ تعداد صرف تین لکھی ہے جو زیادہ قرین صواب ہے ۔

[5] عجب نہیں کہ بغداد کے بعض یہودی انہی اسیروں کی اولاد ہوں جنھیں ۵۹۷ ق م اور ۵۸۶ ق م بابل کا بادشاہ بخت نصر گرفتار کر لایا تھا ۔

ثروت، سکنی وزرعی جائیداد اور زرخیز باغوں کا مالک تھا۔ جس وقت خلیفہ کے دربار میں جانے کے لئے چلتا تو کارچوبی کام کا ریشمی لباس پہن کر نکلتا۔ سفید عمامے جگ مگ جگ مگ کرتے ہوتے اور خواصی میں بہت سے سوار ساتھ ہوتے تھے۔ اس کے آگے آگے نقیب یہ صدا لگاتا ہوا چلتا تھا کہ "ہمارے آقا، فرزند داوؑد کے لئے، راستہ دو"

صابئین

عرب مصنفوں کے اصلی صابی فرقۂ مندیہ[1] کے لوگ تھے جو نیم یہودی نیم عیسائی فرقہ تھا کہ اپنے آپ کو "نصوری یا دیحیٰی" کے نام سے بھی موسوم کرتا تھا۔ نصوری[2] کا مطلب پیروکار یا پابند (دین یحییٰ) ہے اور اسی سے عہد حاضر میں لوگ غلطی سے انھیں یوحنا دلی کے عیسائی خیال کرنے لگے۔ مندیہ فرقے والے نہ صرف ولادت کے بعد بلکہ شادی سے قبل اور اکثر دوسرے موقعوں پر اصطباغ کی رسم ادا کرتے تھے۔ نواح بابل کے نشیبی میدانوں میں رہتے تھے اور تاریخی اعتبار سے پہلی صدی عیسوی تک ان کا سراغ ملتا ہے۔ شاید ان کا اور اکثر اصطباغی فرقوں کا اصلی وطن فلسطین تھا۔ ان کی زبان مندیک، ارامی کی ایک شاخ ہے اور اس کا رسم خط نبطی اور تدمری تحریر سے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ قرآن شریف میں تین جگہ ان کا ذکر آیا ہے لہذا بابل کے یہ صابی ذمیوں میں شامل ہوگئے اور مسلمانوں نے ان کو بھی امان یافتہ (اہل کتاب) کی مد میں داخل کر لیا تھا۔ کتاب الفہرست کے قول 358

---

[1] یہ لفظ ارامی "یدع" سے مشتق ہے جس کے معنی جاننا یا عرفان کے آتے ہیں۔ یہ فرقہ خدا شناس تھا۔ اسی طرح "صابی" ارامی لفظ ہے۔ اس کے معنی "ڈوبا ہوا" ہیں۔ جنوب مغربی عرب کی قدیم طاقتور قوم سبا سے اس کا کوئی لغوی تعلق نہیں ہے۔

[2] "نصوری" کو غلطی سے "نصاریٰ" سمجھ لیا گیا ہے۔

کے مطابق[1] انہی میں جنوبی عراق کے دلدلی علاقے کے "مغتسلہ" (یعنی غسل کرنے والے) بھی محسوب ہوتے ہیں۔ بصرے کے مضافات میں جہاں کیچڑ رہتی ہے، ابھی تک اس فرقے کے پانچ ہزار افراد موجود ہیں۔ بہتے دریا کے کنارے سکونت رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ ان کے مذہبی اعمال میں آب رواں کے اندر غوطہ لگانا فرض اور بے شبہ ان کے مذہب کی ایک خصوصیت ہے۔ زمانہ حاضرہ کے بغداد میں صابی فرقے کی نمائندگی وہ لوگ کرتے ہیں جنھیں عام طور سے عمارہ کے نقرہ گر کہا جاتا ہے۔ ان کا پیشہ مینا کاری ہے[2]۔

ان بابلی صابیوں سے حرّان کے نام نہاد صابیوں کا عقائد و اعمال میں کچھ تعلق نہ تھا[3] لیکن عرب مصنفوں نے ان میں التباس کر دیا ہے۔ یہ حرّان کے "صابی" حقیقت میں ستارہ پرست لوگ تھے جنھوں نے مسلمانوں کی حکومت کے دور میں خود کو صابی کہنا شروع کر دیا تاکہ قرآن مجید میں صابئین کے ساتھ جو رواداری مرعی رکھی گئی ہے، اس کے فوائد سے بہرہ اندوز ہوں۔ اسی وقت سے یہ نام ان سے وابستہ چلا آیا اور یہ عجیب مذہب خاص خلافت بغداد کے مرکز کے قریب پھولتا پھلتا رہا یہاں تک کہ مغول نے اپنی یورش کے وقت ان کے آخری مندر کو منہدم کر دیا۔ یہ واقعہ ہے کہ اس فرقے میں بعض افراد اعلیٰ دماغی قابلیت اور علمی خدمات کی وجہ سے بہت نامور ہوئے اور اُن کی شہرت نے بھی مسلمانوں کو اس مذہبی فرقے کا محافظ بنانے میں مدد دی[4]۔ ان میں ثابت ابن قرّہ اور دوسرے حرّانی ہیئت دانوں کا اوپر

---

[1] صفحہ ۳۴۔ نیز دیکھو مسعودی، ج ۲، صفحہ ۱۱۲۔
[2] "مینا" ایرانی لفظ "مینو" بمعنی آسمانی سے مشتق ہے۔
[3] مسعودی نے اپنی کتاب کی چوتھی جلد میں ایک فصل اسی فرقے پر تحریر کی ہے۔
[4] ...

ذکر آچکا ہی۔ ثابت کے بیٹے سنان کو خلیفہ ال قاہر باللہ نے مجبور کیا کہ اسلام قبول کرے[1] صابی مشاہیر میں ایک شخص ابو اسحٰق ابن ہلال الصابی گزرا ہی جو خلیفہ ال مطیع (۹۴۶ تا ۹۷۴ء) اور خلیفہ الطائع (۹۷۴ تا ۹۹۱ء) دونوں کے دربار میں دبیر کی خدمت انجام دیتا رہا۔ ال بتانی علم ہیات کا ماہر اور ابن وحشیہ (زمانہ فروغ ۹۰۰ء) نبطی فلاحت پر ایک کتاب کا مصنف ہوا ہی۔ ممکن ہی علم کیمیا کا مشہور فاضل جابر ابن حیان بھی صابی ہو لیکن آخرالذکر تینوں اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے تھے[2]۔

مجوس اور دوسرے اہل ثنویت

زرتشتی (= مجوس) فرقے کا صرف ایک جگہ قرآن شریف میں ذکر آیا ہی[3] پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ذہن میں یہ لوگ اہل کتاب میں داخل نہ ہو سکتے تھے لیکن حدیث اور اسلامی فقہ نے انھیں اسی مد میں لے لیا ہی اور صابیوں کی اصطلاح اُن پر حاوی بتائی گئی ہی۔ عملی سیاسیات اور وقتی مصالح کا تقاضا تھا کہ ایران کی اتنی کثیر آبادی کے واسطے ذمیوں میں شمولیت کی گنجائش نکالی جائے جیسا کہ گذشتہ اوراق میں ہم پڑھ چکے ہیں۔ ایران فتح کے بعد، زرتشتی مذہب کا جو پہلے سرکاری مذہب تھا، خاتمہ نہیں ہوا۔ عوام کے آتش کدے نہ صرف ایران کی تمام ولایات بلکہ ایک طرف عراق اور دوسری طرف مشرق ہندستان وغیرہ مقامات میں بھی بدستور قائم رہے[4] زرتشتیوں 359

---

[1] فہرست ص ۳۰۲ ۔ [2] صابیوں کے متعلق مزید اطلاع شوولسون کی روسی کتاب سے جو ۱۸۵۶ء میں سینٹ پیٹرس برگ میں چھپی تھی۔

[3] سورۂ حج ۱۷۔ [4] مسعودی ۔ ۴ صفحہ ۸۶۔

ہندستان میں پارسی لوگ ہیں[۱] جن کے اسلاف آٹھویں صدی
کے اوائل میں ایران سے اِدھر ہجرت کر آئے تھے۔ لیکن اسلام قبول
والے زرتشتیوں میں بہت سے نامی گرامی اشخاص کا نام آتا ہے جن میں سب
پہلا شخص ابن المقفع تھا۔ اسلامی دینیات کے بعض پہلو ثنویت کا
اور بعض اسی کی نقل ہیں[۲]۔

مانی مذہب والوں کو شروع میں مسلمانوں نے غلطی سے زرتشتی یا عیسائی
سمجھا تھا۔ پھر انھیں بھی ذمیوں میں شامل کر لیا گیا۔ ایران کے اس بانی
ب یعنی مانی متوفی ۲۷۳ یا ۲۷۴ء کی شخصیت اور تعلیم، معلوم ہوتا ہے
ان اسلام کو خاص طور پر پسند آتی تھی جس کی دلیل یہ ہے کہ خلیفہ مہدی اور
دونوں نے اس میلان کو روکنے کے لئے سخت احکام جاری کئے تھے۔
امیہ کے آخری خلیفہ مروان کا اتالیق "زِندیق" ہونے کی بنا پر قتل کیا گیا
اور خود اس خلیفہ کی نسبت مانیت کا شبہ کیا جاتا تھا[۳]۔ ۷۸۰ء میں ال
نے حلب میں بہت سے چھپے ہوئے مانویوں کو سولی پر چڑھایا اور اپنی
ت کے آخری دو سال میں اُن کا قلع قمع کرنے کے لئے بغداد میں احتساب
قائم کیا تھا[۴]۔ یہ دار و گیر ہادی کے زمانے میں بھی جاری رہی۔ اسی طرح
الرشید نے ایک خاص حاکم مقرر کیا کہ ایسے ثنوی عقائد والوں کی

رس (یہ موجودہ فارس) سے۔ [۲] (اس عبارت میں اوّل تو پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کے ذہنی خیالا
نے ایسی واقفیت کا ادعا کیا ہے جو شاید آپ کے معاصرین بھی ذکر سکتے تھے۔ پھر ثنویت سے اسلامی
ایک مبہم رائے لکھ دی ہے۔ اسے بعد کے علمائے اسلام سے متعلق سمجھنا چاہیئے۔ مترجم)
۔ ابتدائی عرب مصنف زِندیق (اصل پہلوی "زن دیک") ان مسلمانوں کو کہتے تھے
خصوصاً مانوی عقائد کے قائل ہوں۔ بعد میں یہ لفظ بھی آزاد خیال یا ملحد قسم کے لوگوں پر بولا
دیکھو براؤن کی "تاریخ ادبیات ایران۔ جلد اوّل"۔

... فتوحات کے وقت اسلام لے آئے تھے پھر بھی خود شام
... خلافت بنی امیہ کے آخر زمانے تک عیسائی ملک نظر آتا رہا
تھا ... یہ صورت علانیہ بدلنی شروع ہوئی۔ ہارون الرشید اور متوکل
کے ... قوانین کا بھی اس اشاعت اسلام میں کچھ نہ کچھ ضرور حصہ تھا
... ں کو مسلمان بنانے میں بعض اوقات جبر سے کام لیا گیا ...
... لموں کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ مثلاً خلیفہ مہدی نے حلب ...
... ہزار تنوخی عیسائیوں کو حکم دیا اور وہ حسب الحکم مسلمان ہو گئے
... مذہب کا عام عمل تدریجی اور بلا جبر و اکراہ ہوا اگرچہ وہ ناگزیر سا
... وں کے ذاتی فوائد ہی یہ تقاضا کرتے تھے کہ اسلام قبول
... طرف ادائے جزیہ کی ذلت اور ملکی یا معاشرتی ... س
... کرنے کی رکاوٹیں تھیں، دوسری طرف ...
... دکھائی دیتا تھا اور یہ سب باتیں تبدیل ...
... تھیں۔

... ایران، سلطنت عرب ...
... زمانہ گزرنے تک ...
آبادی ... زرتشتہ
... ی ...

اس اسلام سب سے زیادہ آسانی سے پھیل گیا۔ اس کے قبطی (عیسائی)
اب چھوٹی سی اقلیت ہیں۔ نوبہ کی مملکت میں چھٹی صدی عیسوی کے
وسط میں عیسائیت شائع ہوئی اور بارہویں صدی بلکہ دو صدی بعد تک
یہاں کی آبادی عیسائی رہی۔ اسی طرح شمالی افریقہ کے عیسائی بربروں
میں اوّل اوّل اسلام کو زیادہ ترقی نہیں ہوئی۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں
کہ یہاں قدیم عیسائی عقائد کے بعض مشہور حمایت کرنے والے عالم پیدا
ہوئے۔ ۶۷۰ء میں عقبہ نے قیروان آباد کیا اور اُسے جارحانہ اقدام اور
اسلامی اثرات کا مرکز بنایا لیکن یہ اثرات آئندہ صدی میں اس وقت
زیادہ کارگر ہوئے جب کہ بربروں کو اسلامی عساکر میں بھرتی کرنے کی تجویز
شروع کی گئی اور یہ لوگ مال غنیمت کی امید میں مسلمانوں کے لشکر میں
اسلامی فوجیں جنھوں نے مغربی افریقہ کی فتح کی
نگیں بنایا، اُن کی پشت کی ہڈی بربر قبائل
سلے میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ عربوں کی
افریقہ میں چالیس اسقفی حلقے
کی تعداد پانسو بتائی

بارہویں صدی عیسوی
عربی لفظ قبائل

صدی